تبلیغی جماعت اور کتب فضائل

حقائق، غلط فہمیاں

مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

مکتبۃ الاتحاد دیوبند (الہند)

مفتی محمد ابوبکر جابر قاسمی

مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

شعبۂ نشر و اشاعت

مدرسہ خیر المدارس ٹرسٹ بورابنڈہ حیدرآباد

نامِ کتاب : تبلیغی جماعت اور کتبِ فضائل
حقائق - غلط فہمیاں
مصنّفین : مفتی ابوبکر جابر قاسمی، مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی
صفحات : ؟؟؟
سنِ طباعت : ۲۰۱۳ء م ۱۴۳۴ھ
کمپوزنگ : حافظ سید عبدالبصیر الیاس، فون: 9247896421
تزئین : قبا گرافکس، حیدرآباد، فون: 9704172672-91+
ناشر : مدرسہ خیر المدارس ٹرسٹ بورابنڈا حیدرآباد

ملنے کے پتے

- مدرسہ خیر المدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد، فون: 23836868 - 040
- دکن ٹریڈرس، پانی کی ٹانکی، مغلپورہ، حیدرآباد، فون: 66710230 - 040
- فضل بک ڈپو، جامع مسجد ملے پلی، حیدرآباد، فون: 9440039231 - 40 91+
- مکتبہ احیاءِ سنت، مسجدِ ٹین پوش لال ٹیکری، حیدرآباد، فون: 23325952 - 040
- مکتبہ فیض العلوم، سعید آباد، حیدرآباد، فون: 24557422 - 040
- ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد، فون: 66714341 - 040
- ہُدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد، فون: 24514892 - 040
- مکتبہ ابن کثیر، پانی کی ٹانکی، مغلپورہ، حیدرآباد، فون: 9346603305
- مکتبہ نعیمیہ دیوبند، یوپی

فہرست مضامین

کتب فضائل-حقائق، غلط فہمیاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ طبع جدید

تین سال پہلے یہ کتاب منظر عام پر آئی، الحمدللہ اس موضوع پر لکھی جانی والے دستیاب عربی اور اردو کتابوں کا نچوڑ اس میں آچکا تھا اور تقریبا ہر مکتب فکر کے اعتراضات کا اصولی جواب قرآن وسنت کی روشنی میں علمائے امت کے حوالوں سے نقل کیا گیا، ہر طرف سے غیر معمولی پذیرائی اور ہمت افزائی ہوئی، تین سال کے درمیان کئی ایڈیشن چھپے اور نکل گئے، اس کتاب کا محرک سعودیہ عربیہ کا طویل مدتی دعوتی سفر تھا، پھر اس کے بعد مصر میں بھی دعوتی کام کا موقع ملا، اس طرح مختلف اصحاب علم وفکر کو پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوگیا اور طبع شدہ منفی ومثبت مواد تک رسائی آسان ہوگئی۔

راقم کی طبیعت پر شدید تقاضا تھا کہ حوالجات پر از سر نو نظر ثانی ہونا چاہئے، بعض دلائل کا جن کی ان تین سالوں میں ضرورت محسوہوئی اضافہ ہونا چاہئے اور از سر نو مکمل گہرائی سے نظر ثانی اور تصحیح کا کام ہونا چاہئے۔

الحمدللہ بفضلہٖ تعالیٰ یہ سارے کام پایہ تکمیل کو پہنچے، مولانا مدثر حسین صاحب رضوان دامت برکاتہم، استاذ خیر المدارس بورابنڈہ، حیدرآباد، نے شبانہ روز کوششوں سے حرف بحرف تصحیح کی، جزاہ اللہ احسن الجزاء۔

''مستورات کی جماعتیں، فقہ وفتاوی کی روشنی میں'' والا مضمون اضافہ کے بعد کافی بڑا ہوگیا تھا، اپنے بڑوں سے مشورہ کے بعد یہ بات طئے ہوئی کہ متعلقہ حضرات سے اولا مکاتبت یا تبادلۂ خیال کرلیا جائے، اس سے قبل عوامی میدان میں اس قسم کے مسائل کو لانا خلاف مصلحت سمجھا گیا، آئندہ اجازت ملنے پر انشاءاللہ اسے علاحدہ طبع کیا جائے گا۔

ابوبکر جابر قاسمی

٩/ جمادی الثانی ١٤٣٤ھ مطابق ٢٠/ اپریل ٢٠١٣ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

بے بنیاد الزامات اور فضول تنقید سے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اور اُن کا کلام بھی محفوظ نہیں رہا، جبکہ دعوت تو اقدام اور عرض کا نام ہے جس میں دفاع بقدرِ ضرورت ہوتا ہے، اس لئے اکابرینِ امت اپنے طویل تجربہ اور نورِ بصیرت سے ناقدِ مخلص کے تئیں یہی فطری وطیرہ اپنائے رکھا کہ دعوت کے کام میں عملی شرکت اور قریب سے مشاہدہ کا مطالبہ کیا اور ناقدِ مفسد کو اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے مقلب القلوب سے اس کی ہدایت وانشراحِ صدر کیلئے دُعا کرتے رہنے کی تعلیم دی۔

جبکہ مشائخ نے لکھا ہے کہ شبہات اور شہوات آدمی کے دین کو تباہ کر دیتے ہیں، شہوات کا علاج تو یہ ہے کہ نفس کی تربیت کی جائے اور شبہات کا ازالہ راسخین فی العلم کی صحبتوں سے کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مہاجرِ مدنیؒ نے تبلیغی جماعت اور کتبِ فضائل پر کئے جانے والے طالبانہ اور معقول اعتراضات کا علمی انداز میں پوری سنجیدگی کے ساتھ مگر عمر اور صحت کے تقاضے سے مختصر جوابات دیئے، آج کل بھی اُسی قسم کے شکوک کارکنانِ دعوت یا قارئینِ فضائلِ اعمال (جن میں سادہ لوح عوام الناس کی کثرت ہے) کے دلوں میں مختلف پروپیگنڈے کے انداز میں پیدا کر کے اُنہیں دین کی عالمگیر نفع بخش ترین، قرآن وسنتِ انبیاء سے اقرب محنت سے بیگانہ کیا جارہا ہے، اِن سے متاثر متلاشیانِ حق کیلئے اپنے اکابر کی ہی منتشر تحریروں یا ان کے اجمال کے تفصیل کتابی شکل میں کی گئی ہے، اس کتاب کے ترتیب دیئے جانے کے دوران عوام وخواص کی طرف سے براہِ راست کئے جانے والے سینکڑوں استفسارات اور مختلف مکاتبِ فکر کے مغالطہ انگیز ہزاروں صفحات پیشِ نظر رہے، مگر ان کا حوالہ دینے سے مکمل گریز کیا گیا، تاحدِّ امکان کوشش کی گئی کہ تحریر مثبت، مدلل ہو اور خواص کے ساتھ متوسط اُردو داں طبقہ عوام بھی استفادہ کر سکے، اِسی لئے بعضے مرتبہ مضامین کا تکرار یا فنی اصطلاحات کو سہل کرنے کی سعی جا بجا محسوس ہوگی، تاہم اپنے باتوفیق ناظرین سے التجاء ہے کہ اگر وہ اہلِ علم میں سے نہ ہوں تو خلوِ ذہن، سلامتِ فہم اور طلبِ صادق کے جذبہ کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ اپنے اہلِ حق معتمد علماء کی نگرانی میں اِس کتاب کا مطالعہ کریں۔

دوسری اس سے اہم دردمندانہ التماس یہ ہے کہ دعوت کا کام صرف کتابوں سے پورا نہیں سمجھا جاسکتا، دعوت کی حقیقت، قرآن وحدیث واسلافِ امت کے عمیق علم اورنہایت وسیع تجربات اورغیر معمولی محتاط وحساس مصالح پر مبنی اُصول کا سمجھنا بقدرِ عملی شرکت ہوگا، مجاہدہ کے بغیر حقائق کا ادراک مشکل ہے، اس لئے اپنے اپنے مراکز اور مسجد بنگلہ والی بستی، حضرت نظام الدینؒ نئی دہلی میں حاضری اورکام کواس کے سرچشمہ سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ضروریاتِ زمانہ، تقاضہائے وقت کے اعتبار سے وہاں کے بتائے جانے والے اُصول ہی معیار ہیں۔

مصنفین کے پیشِ نظر بیشتر ثانوی درجہ کے مراجع رہے ہیں؛ اس لئے جن کتابوں سے اِستفادہ کیا گیا اُس کا حوالہ بھی نقل کردیا گیا۔

خدائے تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے میرے رفیق مفتی رفیع الدین صاحب قاسمی حفظہ اللہ کوجن کا ازاوّل تا آخر دیئے گئے بکھرے ہوئے موادکوجمع وترتیب دینے اورسبھی عربی تحریروں کو میری منشاء وہدایت کے مطابق ترجمہ وتلخیص کرنے اور مسوّدہ کواملاء کرنے میں بے حد تعاون رہا اورگاہے بگاہے اُن کے مفید مشورے بھی شاملِ کتاب رہے۔

میں شکرگذار ہوں ہمارے مربی ومرشد، استاذ العلماء حضرت شاہ جمال الرحمٰن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کا کہ حضرت والا نے کتاب کے معتدبہٖ حصہ کواپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود بعجلت ملاحظہ فرمایا (جن کا بعجلت دیکھنا ہماری دقیق نظر سے بہتر ہے) اور بابرکت تقریظ سے ہمت افزائی فرمائی، نیز میں تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں حضرت مفتیٔ دارالعلوم دیوبند، مفتی محمود حسن صاحب بلندشہری حفظہ اللہ کہ آپ نے مفصل استنادی تقریظ سے نوازا، اور میرے رفیقِ تدریس محترم مفتی حسام الدین صاحب (استاذ مدرسہ خیرالمدارس، بورابنڈہ، حیدرآباد) اور دیگر مخلص دوستوں کا جنھوں نے موادکی فراہمی، تصحیح ونظر ثانی میں کافی مدد کی۔فجزاهم اللّٰه منّا أحسن الجزاء، ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم،وتب علينا انك انت التواب الرحيم. آمين ياربَّ العالمين .

ابوبکر جابر قاسمی

یوسف گوڑہ، حیدرآباد، اے۔پی۔

۱۰؍رجب المرجب ۱۴۳۰ھ/۴؍جولائی ۲۰۰۹ء

مقدمہ

حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب بلند شہری مدظلہ العالی
مفتی دارالعلوم دیوبند

الحمدللّٰہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علٰی من لا نبي بعدہ

منتظر نظارے ہیں چشم خمار آلود کھول
اُٹھ کلید ِفتح بن- قفل درِ مقصود کھول

حضرت سید الاوّلین والآخرین احمد مجتبٰی محمد مصطفٰی ﷺ کی تشریف آوری پر تمام عالم جگمگا اٹھے، آپ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے اہم مقاصد میں سے تلاوتِ کتاب، تعلیمِ کتاب وحکمت اورتزکیۂ باطن ہے۔

حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے دیگرامانات کے مثل صفاتِ حمیدہ، اخلاقِ نبویہ اورکتاب وسنت کوسینہ سے لگایا تو کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔اکبرالہ آبادی مرحوم نے کیاخوب کہاہے ؎

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کردیا
دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا

اس کے بعد ہر دور میں اکابر واعاظم اپنے زمانہ کے حالات ملحوظ رکھ کرمناسب وسائل اختیار کرتے ہوئے امت کی آبیاری فرماتے رہے، کتاب وسنت کی طرف حکمت وبصیرت سے بلاتے رہے

جس کے نتیجہ میں بے شمار افراد اخلاقِ فاضلہ (صبر،شکر،توکل،قناعت،سخاوت،صدق واخلاص وغیرہ) سے مالا مال ہوکر کامیاب ہوئے اور بہت بڑی خلق خدا ان کی رہنمائی سے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئی اور تا قیامت انشاءاللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ

اسی سلسلۃ الذہب میں حضرت اقدس الحاج مولانا محمد الیاس صاحبؒ کاندھلوی ثم الدہلوی کا نامِ نامی بھی ہے حضرت کی ذاتِ گرامی محتاج تعارف نہیں، مسلمانوں کی تباہی اور روز افزوں بربادی کو دیکھ کر حضرت قدس سرہ کا قلب اطہر تڑپ اٹھا، نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض کی صحیح تشخیص فرمائی اور ہلاکت خیز طوفانوں سے امت کو بچانے کیلئے زندگی قربان کردی اور جماعتی انداز پر جس کام کو شروع فرمایا اپنے زمانہ کے اکابر اہلِ معرفت اہلِ سنت اہلِ علم اہلِ فضل وکمال سے اس کی صحت وصداقت، مقبولیت وحقانیت کو تسلیم کرالیا۔

جماعتِ تبلیغ

آج الحمدللہ پوری دنیا میں اس جماعت کی روشنی پھیلی ہوئی ہے بے شمار مخلصین اپنا مال اپنا وقت اپنی جان لگاکر محنت ومشقت برداشت کررہے ہیں اخلاق رذیلہ (حرص،حسد، حقد، کذب، حبِ جاہ، حبِ مال وغیرہ) سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر انتھک کوشش میں مصروف ہیں، اپنے اندر دینی پختگی پیدا کرنے کی خاطر چھ باتوں پر عمل کرتے اور عملی مشق کی نیت سے دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں اور وہ چھ باتیں قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہیں جن میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیل ملاحظہ کرنا ہوتو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی کتاب ''مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت'' اور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کی کتاب ''ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ'' کا مطالعہ کریں۔

نصاب

جماعتِ تبلیغ میں فضائل اعمال، منتخب احادیث، حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم مقرر ہیں، امت کے علماء وصلحاء کے درمیان یہ کتابیں بے حد مقبول ہیں، طباعت سے قبل ثقہ علماء کبار نے بھی دلائل کی کسوٹی پر ان کو پرکھ لیا ہے بالغ نظر علماء کرام کو تو ان کتابوں پر اشکال واعتراض نہیں البتہ اس کے

باوجود کچھ لوگوں کی جانب سے اشکالات ہوتے رہتے ہیں مثلاً فضائل اعمال سے متعلق خود حضرت شیخ الحدیث (مصنفؒ) رقمطراز ہیں: ''اس ناکارہ (حضرت شیخ الحدیثؒ) نے اس میں (کتب فضائل کی تصنیف واشاعت میں) صرف اپنی رائے پر مدار نہ رکھا تھا بلکہ متعدد اہلِ علم بالخصوص حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ (مظاہر علوم سہارنپور) اور حضرت قاری سعید احمد صاحب مفتیٔ (اعظم) مدرسہ مظاہر علوم یعنی والدِ ماجد حضرت اقدس مفتی مظفر حسین صاحبؒ سے حرفاً حرفاً اولاً نظر ثانی کرائی تھی اور جن چیزوں پر ان میں سے کسی نے بھی گرفت کی ان کو قلم زد کر دیا تھا اسی بناء پر ان میں سے ہر رسالہ میں تقریباً ایک ربع یا ایک خمس کے قریب اصل مسودہ سے کم ہے۔ (کتبِ فضائل پر اشکالات اور ان کے جوابات، ص:۴۴، مصنفہ حضرت شیخ الحدیثؒ)

حالاتِ زمانہ

آج کے پرُفتن دور میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اپنی اغراض کا سکہ جمانے کی خاطر دجل وفریب سے کام لینا خوبی کا کام سمجھا جانے لگا ہے خودرائی کی وباء عام ہو چکی ہے اعجاب کل ذی رأی برأیہ (علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنی رائے اور سمجھ کو سب سے اعلیٰ وبالا سمجھنے لگے گا) کا ظہور علی الوجہ الاتم ہو رہا ہے، اکابرِ امت کے حق میں ہفوات بکنا اور عام مسلمانوں سے اس پر دادِ تحسین حاصل کرنا خود رو محققین کی عادت بن چکی ہے اس طرح کے لوگوں کی طرف سے عامۃ جماعتِ تبلیغ نیز کتب فضائل وغیرہ پر اشکالات ہوتے رہتے ہیں علماءِ امت حسبِ موقع مختصر ومفصل جوابات دیتے رہے ہیں۔

کتابِ ہٰذا

ضرورت تھی کہ آج کل جو اشکالات کیے جاتے ہیں ان کے مفصل جواب پر مشتمل کوئی کتاب ہوتی، اس ضرورت کو الحمدللہ مفتی ابوبکر جابر قاسمی اور مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی مدظلہما نے پورا کر دیا، ماشاءاللہ مدلل اور عمدہ انداز پر اشکالات کا دفعیہ کیا ہے جیسا کہ ناظرینِ کتاب پر مخفی نہ رہے گا۔ اور ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید'' کا مصداق انشاء اللہ کتاب کو پائیں گے۔ احقر نے مسودۂ کتاب کو کئی مقامات سے بغور دیکھا مدلل ومبرہن مباحث کو دیکھ کر خوشی ہوئی جزاھما اللّٰہ تعالیٰ عنا وعن سائر المسلمین خیر الجزاء.

ضروری عرض

جماعت میں نکلنے والے افراد عامۃً بے پڑھے لکھے مسلمان ہوتے ہیں ان سے غلطی وکوتاہی کا ہونا کچھ مستبعد نہیں ہوتا، حضرت اقدس فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''یہ کام (جماعتِ تبلیغ) بہت عمومی حیثیت رکھتا ہے، ہر قسم کے آدمی اس میں آتے اور کام کرتے ہیں اور ہر ایک کی اصلاح اس کے حوصلہ کے موافق ہوتی ہے،اس لیے بے علم اور باعلم، ذہین اور غبی نئے اور پرانے، تجربہ کار اور بے تجربہ، متقی اور غیر متقی، ذاکر اور غافل، نستعلیق اور شکستہ، شہری اور دیہاتی، شستہ زبان اور اکھڑ سب کو تنقید کرتے وقت ایک معیار پر جانچنا اور ایک وزن سے تولنا صحیح نہیں بلکہ اصولاً غلط ہے، کسی سے اگر کوتاہی ہوجائے تو اس کو اصول نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ اصلاح کی طرف متوجہ کیا جائے گا۔اھ''(فتاویٰ محمودیہ:۱/ ۴۵۱، مطبوعہ میرٹھ)

والحمدللّٰہ اولا واخرا ظاھرا وباطنا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد نِ المصطفی وآلہ المجتبیٰ واصحابہ وازواجہ والذین اتبعوھم بإحسان فی الھدیٰ.

ھذا ما کتبہ احقر الزمن
العبد محمود حسن بلندشہری غفرلہ
ولوالدیہ واحسن الیھما والیہ
۲۳/ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ
مطابق ۱۷/ جولائی ۲۰۰۹ء، یوم الجمعہ

حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی

استاذِ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

دعوت وتبلیغ سے معروف دینی محنت اوراس کے مبارک آثار آج دنیا کے چپے چپے میں الحمد للہ نمایاں طور پر محسوس کئے جارہے ہیں، ایک ایسی محنت جوصورت میں بڑی سادی، نام ونمود سے عاری، اُصول میں بڑی سہل ہونے کے باوجود قوتِ تاثیر میں دنیا میں پائی جانے والی دیگر تحریکات کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مؤثر پائی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لاکھوں دین سے غافل قلوب دینِ حق کی طرف متوجہ ہوئے، سینکڑوں چرچ مساجد میں تبدیل ہوگئے ، بے شمار غیرآباد مساجد کو مصلی ، مدارس کو طلبہ، ربانی خانقاہوں کو سالکین اورمختلف میدانوں میں کارہائے دین انجام دینے والے معاونین ملے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا تغیر تھا جو بہتوں سے دیکھا نہ گیا، نتیجتاً مختلف مکاتبِ فکر کی جانب سے مخالفتوں کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں اس مخالفت کے پیچھے تو کچھ ایسے ہوں گے جو غلط فہمی کا شکار تھے، بعض کم علمی کے سبب، بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کے اغراض متاثر ہوتے ہوں گے۔

بہرحال جب یہ سلسلۂ مخالفت مختلف زاویوں سے ہونے لگا تو اس کے ذمہ داران کی جانب سے غلط فہمیوں کو زائل کرنے، شبہات کے دفعیہ، اعتراضات کے جوابات پر بعض مختصر اور بعض مبسوط کتابیں لکھی گئیں، اگرچہ اس جماعت کے طریقۂ کار میں معترضین کے جوابات میں مشغول ہونے کے بجائے اپنے کام میں مثبت طریقے سے لگے رہنا ہے پھر بھی بعض اہلِ علم نے اتمامِ حجت کیلئے لکھا ہے۔

جیسے ''تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات'' شیخ زکریاؒ، ''فضائلِ اعمال پر اعتراضات

کے جوابات'' شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ ، ''القول البلیغ فی جماعۃ التبلیغ'' شیخ ابوبکر جابر الجزائری، ''تحقیق المقال'' شیخ لطیف الرحمٰن بہرائچی، وغیرہ وغیرہ۔ جن میں بعض مختصر اور بعض مبسوط ہیں اور بعض صرف متعینہ اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہیں، بعض بحیثیتِ مجموعی اجمالی جواب پر مشتمل ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ قابلِ قدر اور بہت مفید ہیں۔

لیکن زیرِ نظر کتاب میں مولانا مفتی ابوبکر قاسمی سلمہ اور مولانا مفتی رفیع الدین قاسمی نے غالبًا اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ دفعِ اشکالات کا اہتمام فرمایا ہے، خواہ وہ اشکالات واعتراضات جماعت سے متعلق ہوں یا اس کے طریقۂ کار سے یا فضائلِ اعمال کتاب اور اس کے مندرجات سے، تمام ہی امور کا احاطہ کرتے ہوئے پہلے نفسِ مسئلہ پر بھرپور روشنی ڈالنے کے بعد پھر اعتراضات کا جائزہ اور جوابات کو سپردِ قلم فرمایا ہے، جس کو احقر بوجہِ کثرتِ مشاغل بالاستیعاب نہ دیکھ سکا، البتہ اس کا معتد بہ حصہ کا بعجلت مطالعہ کیا ہے۔

دونوں نوعمر مفتیانِ کرام فاضلِ دیوبند ہیں اور اس سے قبل کچھ علمی شہ پارے اور بعض کتب کے کامیاب ترجمے کر چکے ہیں، اور اب یہ اس قدر عمدہ کتاب گراں قدر تحقیقات پر ترتیب دی ہے، سو سے زائد کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے (جو قرآن وحدیث، تفسیر، فقہ، تصوف، تاریخ، سوانح وغیرہ پر مشتمل ہیں) خوب علمی مواد جمع فرمایا ہے، یقیناً یہ ان کی غیر معمولی محنت کا نتیجہ ہے اور صلاحیت واستعداد اور بلندئ فکر کے اعتبار سے دادِ تحسین کا مستحق ہے۔

امید ہے کہ غیر متعصب اَذہان کیلئے یہ کتاب باعثِ اطمینان اور غلط فہمیوں کے ازالہ میں معاون ثابت ہوگی، اہلِ علم سے خراجِ تحسین حاصل کرے گی، بڑی تعداد میں اہلِ علم وتبلیغ دونوں کو بالخصوص اور عمومًا سب کو بھرپور استفادہ کرنا چاہیئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔ آمین

محمد جمال الرحمٰن مفتاحی

تبلیغی جماعت
حقائق، غلط فہمیاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حقیقی ایمان ہی کامیابی کی جڑ ہے

دعوت کی اس تحریک کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کا ایمان بنے، چونکہ ایمان ہی وہ اصل مایہ ہے جس کے ذریعہ دنیوی واخروی زندگی کی حقیقی کامیابیاں حاصل ہوسکتی ہیں، اللہ عزوجل نے بھی قرآنِ کریم میں دنیوی واخروی فوز وفلاح کا جو وعدہ کیا ہے وہ اسی ایمان وایقان پر کیا ہے، آج امت کی ناکامی اور شکست وریخت اور ہر محاذ پر پچھڑ جانے کی وجہ یہی ہے کہ اس کے پاس یقین کی وہ دولت نہیں رہی جو ہر قسم کی فتح وغلبہ کی پیش خیمہ تھی، چنانچہ نصرت وکامیابی، عزت وعظمت، بلندی وسرفرازی، غلبہ وفتح، امن وسکون، زمین کی خلافت وجانشینی، دنیا میں رزق کی وسعت وکشائش یہ تمام اُمور جس کا ہر انسان متمنی ہوتا ہے وہ اسی حقیقی ایمان پر موقوف ہے؛ چنانچہ ہم آیاتِ قرآن کی روشنی میں بالتفصیل یہ بتلائیں گے کہ ایمان ہی پر اصل کامیابی کا دارومدار ہے۔

چنانچہ اللہ عزوجل نے ایک موقع سے اپنی مدد ونصرت کو ایمان ہی کے ساتھ متعلق فرمایا ہے، ارشادِ خداوندی ہے: " اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ " (۱) ''ہم پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی جس میں گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے'' (مراد اس سے قیامت کا دن ہے)۔

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ رقم طراز ہیں :

''یعنی دنیا میں ان کا بول بالا کرنا ہے، جس مقصد کیلئے وہ کھڑے ہوتے ہیں، اللہ کی مدد سے اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ حق پرستوں کی قربانیاں کبھی ضائع نہیں ہوتیں، درمیان میں کتنے ہی اُتار چڑھاؤ ہوں اور کیسے ہی امتحانات پیش آئیں مگر آخر ان کا مشن کامیاب ہوکر رہتا ہے۔ علمی حیثیت سے تو حجت وبرہان میں تو وہ ہمیشہ ہی منصور رہتے ہیں، لیکن مادی فتح اور ظاہری عزت ورفعت بھی آخر کاران ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ سچائی کے دشمن کبھی معزز نہیں

(۱) المؤمن:۵۱

رہ سکتے ،ان کا علو اور عروج محض ہنڈیا کا جھاگ اور سوڈے کا ابال ہوتا ہے،لیکن واضح رہے کہ جن مومنین کیلئے وعدہ کیا گیا ہے وہ حقیقی مومن اور متبع رسل ہیں۔''

ایمان والے ہی اس دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں میں کامیاب اور منصور رہتے ہیں، اس حوالے سے ارشادِ خداوندی ہے:'' وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ '' (۱) ''اور اہل ایمان کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا''۔

یعنی مومنین کاملین کی منجانب اللہ امداد واعانت ہوتی رہتی ہے۔اللہ عزوجل نے حقیقی عزت کا مستحق مومنین کو قرار دیا ہے: '' وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ '' (۲)''اور اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی۔''

یعنی اصل اور ذاتی عزت اللہ کی ہے، اس کے بعد اس سے تعلق رکھنے کے بدولت درجہ بدرجہ رسول کی اور ایمان والوں کی علو وسرفرازی اور سربلندی ان ہی مومنینِ کاملین کیلئے مقدر کی گئی ہے،ارشادِ خداوندی ہے:'' وَلَاتَهِنُوْ وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ''(۳) ''اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہوگے اگر تم پورے مومن رہے (ایمان وایقان کے راستے پر مستقیم رہنے میں تمہاری بلندی کا راز ہے)''۔

غالب اور فاتح بھی یہی مومنین کاملین رہیں گے:''وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ'' (۴)''اور جو شخص اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایمان دار لوگوں سے،سو اللہ کا گروہ ہی بلاشک غالب ہے''۔

امن وعافیت اور چین وسکون کا وعدہ بھی اللہ عزوجل نے اسی حقیقی ایمان پر کیا ہے:''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْ وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ '' (۵)''جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے انہی کے لئے امن ہے اور وہی راہ پر چل رہے ہیں۔''

مومن حقیقی ہی کو زمین کی خلافت اور جانشینی کا مستحق قرار دیا گیا ہے: '' وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَااسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ

---

(۱) الروم : ۴۸ (۲) المنافقون : ۸ (۳) ال عمران : ۱۳۹
(۴) المائدۃ : ۵۶ (۵) الانعام : ۸۳

مِنْ قَبْلِهِمْ " (۱)''تم میں جولوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالی وعدہ فرماتا ہے کہ ان کوزمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کوحکومت دی تھی۔(مثلاً بنی اسرائیل کو قبطیوں پر غالب کیا پھر عمالقہ پرغلبہ دیا اور مصروشام کی حکومت دی، یہ ہیں ایمان اور اعمال صالحہ کے ثمرات اور منافع)''۔

" فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ" (۲)

''جولوگ ایمان لے آویں اور اچھے کام کرنے لگیں ان کیلئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں ایمان اور اعمالِ صالحہ پر مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ایک دوسری آیت میں ایمان اور اعمالِ صالحہ پر بخشش ومغفرت اور اور بے پایاں اجروثواب کا وعدہ کیا گیا ہے: " وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ "(۳)''اور جولوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان کیلئے بخشش اور بڑا اجر ہے۔''

اس کے علاوہ بے شمار آیتیں ہیں جو ایمانِ کامل اور یقینِ مطلوب پر دنیا وآخرت میں، دوجہاں میں انعاماتِ خداوندی سے سرفراز کئے جانے پر دلالت کرتی ہیں۔

بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام اصلاحی صفات جن میں تقویٰ،توکل،اخلاص،مہمان داری، اپنی ذات پر اپنے بھائی کوترجیح دینا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان تمام اوصافِ حمیدہ کے زیور سے انسان اسی وقت مزین ہوسکتا ہے جبکہ اس کا ایمان بن چکا ہواور اس کا یقین مضبوط اور کامل ہو چکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو اپنے اس قول سے مخاطب فرمایا ہے:''اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا " (جولوگ ایمان لے آئے)احادیث میں بھی اِسی قسم کے الفاظ آئے ہیں جو ایمان کی اس حقیقی کیفیت پر دلالت کرتے ہیں: ''مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" (جوشخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو)چونکہ جب انسان اسلام کے درجہ سے ایمان اور اطمینان کے درجہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو ان کیلئے اللہ عزوجل کے احکام اور اوامر کی بجا آوری بالکل آسان ہوجاتی ہے، بلکہ اس کی ایمانی قوت خود اُسے ان احکام پر اس کی عملی زندگی میں نفاذ کیلئے ابھارتی ہے۔

آج ہمارے پاس وہ ایمان نہیں رہا جو نہایت ہی انوکھی اور تعجب خیز چیزیں ہم سے ظاہر کرواتا تھا، جو ہمیں اللہ کی حرام کردہ اشیاء سے بچا کر اس کی اطاعت شعاری کا خوگر بناتا تھا۔ مادی،شہوانی

---

(۱) النور : ۵۵ (۲) النور : ۵۵ (۳) الفاطر : ۷

اور نفسانی خواہشات کے ملبہ کی صفائی کا کام کرتا تھا،بس اس وقت ہمارے پاس ایمان کی صورت یا اس کی رواجی شکل رہ گئی ہے، بلکہ ہم صرف نام اور خاندان کے مسلمان رہ گئے ہیں۔اس پر طرّہ یہ کہ ایمان کے اس خالی دعوے نے ہمیں ایمان کی دعوت کی محنت سے مستغنی اور بے نیاز کر دیا ہے۔مسلمان اس وقت ایمان کی اس محنت کو عجیب وغریب نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ دعوت کا میدان تو غیر مسلم ہیں،مسلمان نہیں؟ پھر کیوں ان آیتوں میں مسلمانوں سے مزید ایمانی ترقی کا مطالبہ کیا گیا ہے: " یَااَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اٰمِنُوۡ" (۱)اے مومنو!ایمان لے آؤ: " قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا، قُل لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡا اَسۡلَمۡنَا، وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ " (۲)دیہاتیوں نے کہا ہم ایمان لے آئے آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے،لیکن مسلمان ہوئے ہو، ابھی تک ایمان کی حقیقت تمہارے دلوں میں جاگزیں نہ ہوسکی۔حضرت مولانا یوسف صاحبؒ فرمایا کرتے تھے:اگر ایمان ویقین کی دعوت کی یہ محنت نہ کی جائے تو غیر مسلموں کا اسلام میں داخلہ تو درکنار رہا،خود مسلمان ایمان کی ناپختگی کی وجہ سے دنیا کے مظاہر سے متاثر ہوکر رہی سہی ایمانی دولت سے بھی ہاتھ دھوبیٹھیں گے۔

دعوت کی اس محنت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فاسد یقین (چیزوں اور مالوں کے یقین) کو صحیح یقین (اللہ اور اعمال) سے بدل دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم بکثرت ایمان کا مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر اس قدر یقین اور اذعان حاصل تھا کہ وہ اس کے مقابل ظاہری،حسی،شعوری چیزوں اور تجربات اور مشاہدات تک کا انکار کر دیتے تھے۔ وہ اپنی اِسی ایمانی کیفیت کی تجدید اور اس میں نیاپن لانے کیلئے اللہ کی ذات وصفات،فرشتوں، تقدیر، قیامت کی علامات،قبر، برزخ، قیامت کے دن، جنت کی نعمتوں اور آخرت کے عذابات کا مذاکرہ کیا کرتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ کبھی اپنی اس ایمانی سطح میں کچھ کمی محسوس کرتے تو نفاق کا خدشہ کرنے لگتے۔ اس دعوت کی محنت سے صحابہ رضی اللہ عنہم والا یہی ایمان مطلوب ہے: " فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَا اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ فَقَدِ اھۡتَدَوۡا " (۳)اگر وہ تمہاری طرح ایمان لے آئیں گے تو راہ یاب ہو جائیں گے،"اٰمِنُوۡا کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ " (۴)"صحابہ رضی اللہ عنہم کے مانند ایمان لے آؤ"۔اس تحریر کی روشنی میں مسلمانوں کے ایمان ویقین میں تبدیلی لانے والی اس محنت کی ضرورت وحاجت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔(۵)

---

(۱) النساء : ۱۳۶ (۲) الحجرات : ۱۴ (۳) البقرۃ : ۱۳۸

(۴) البقرۃ : ۱۳ (۵) کلمة المترجم ، المنهج الدعوی السليم : ۳، ۴، ۵، ۶

اعمالِ صالحہ کی اہمیت قرآن وحدیث کی روشنی میں

دعوت وتبلیغ کی اس تحریک میں ایمان کے بعد سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا جاتا ہے وہ اعمال ہیں، چونکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ہی دارین کی کامیابی اور صلاح وفلاح کا دارومدار ہے۔ جس طرح گناہ اور بداعمالیاں حوادث اور پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں ایسے ہی اعمالِ صالحہ میں اللہ عزوجل نے وہ تاثیر اور قوت رکھی ہے کہ اسی کے ذریعے تمام خیرات اور برکات وجود میں آتے ہیں۔ اللہ کی مددیں اور نصرتیں نازل ہوتی ہیں، رزق میں وسعت اور کشائش عطا کی جاتی ہے، ذیل میں ہم چند آیات واحادیث کو پیش کریں گے جن سے اعمالِ صالحہ کی اہمیت اور اللہ کے فیصلوں کے نزول میں اس کی اثر انگیزی کا بخوبی پتہ چل جائے گا۔

چنانچہ درج ذیل آیات میں اللہ عزوجل نے ایمان اور تقویٰ کے اختیار کرنے پر آسمان وزمین کی برکتوں اور نعمتوں کے دروازے کھولنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن چونکہ ان لوگوں نے انکار کیا اور اپنی بداعمالیوں میں مبتلا رہے اس وجہ سے عذابِ خداوندی کے مستحق ٹھہرے۔

”وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰىٓ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ“ (۱)

”اگر ان بستیوں کے رہنے والے (پیغمبروںؑ پر) ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم (بجائے ارضی وسماوی آفات کے) ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں نازل کرتے لیکن انہوں نے تو تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔“

ایک دوسری جگہ بھی اللہ عزوجل نے اہلِ کتاب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر یہ لوگ توریت وانجیل پر عمل پیرا ہوتے، اس کے احکام کو بجالاتے تو ہم ہر جانب سے ان پر اپنی برکتوں اور نعمتوں کے دہانے کھول دیتے (یعنی اگر وہ اعمالِ صالحہ پر جمے رہتے تو ان میں دوام اور استقرار عطا کرتے)۔

” وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ، مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ، وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ “ (۲)

---

(۱) الاعراف : ۹۶ (۲) المائدۃ : ٦٦

''اوراگر یہ لوگ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے، ان میں سے ایک جماعت راہِ راست پر چلنے والی ہے اور زیادہ ان میں ایسے ہی ہیں کہ ان کے کردار بہت برے ہیں۔''

'' وَاَنْ لَّوِاسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنَاهُمْ مَّاءً غَدَقًا'' (۱)

''اگر یہ لوگ سیدھی راہ پر ہوتے تو ہم اُنہیں فراغت کے پانی سے سیراب کرتے (یعنی ہر قسم کی ظاہری و باطنی ہر قسم کی برکات سے سرفراز کرتے)۔''

'' وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَاتَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ '' (۲)

''اوراے میری قوم کے لوگو ! اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگواوراس کی طرف رجوع ہوجاؤ وہ تمہارے لئے بھرپور بارش نازل فرمائے گا (جس سے تمہاری غذائی مشکلات دور ہوں گی) اور تمہاری قوت کو اپنی غیبی قوت اس کے ساتھ شامل کرکے بڑھادے گا اور دیکھو مجرم بن کر اس سے روگردانی نہ کرو۔''

یعنی ان کے توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ کے ظاہری فوائد و برکات یہ ہوں گے کہ ان پر بارانِ رحمت خوب برسے گی، جس پر تمام غلے اور پھلوں کی پیداوار کا دارومدار ہے، پھر اس کے علاوہ مالی اور بدنی قوت بھی بڑھائے گا، اولاد میں برکت دے گا، خوشحالی میں ترقی ہوگی اور مادّی قوت کے ساتھ ساتھ روحانی قوت کا بھی اضافہ کردیا جائے گا، بشرطیکہ خداتعالیٰ کی طرف رجوع ہوجاؤ اوراس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔ (۳)

اور ایک موقع سے اعمال صالحہ پر روحانی وجسمانی اور ظاہر وباطنی ترقی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

''اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا، وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهَارًا ''(۴)

---

(۱) الجن : ۱۶ (۲) الھود : ۵۲

(۳) تفسیر فوائدِ عثمانی (۴) نوح : ۱۰-۱۲

’’اے میری قوم کے لوگو اپنے گناہوں کی معافی مانگو، وہ (اللہ) بہت بخشنے والا ہے (جب تم سچے دل سے رجوع کروگے تو وہ) تم پر بھرپور بارش نازل کرے گا اورتمہارے مال واولاد میں اضافہ فرمائے گا اورتمہارے لئے نہریں جاری کرے گا اورتمہاری زمین کو باغات والی زمین بنادے گا۔‘‘

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں علامہ عثمانی لکھتے ہیں :

یعنی ایمان واستغفار کی برکت سے قحط وخشک سالی دور ہوجائے گی اور اللہ تعالیٰ دھواں دار برسنے والا بادل بھیج دے گا جس سے کھیت اور باغ خوب سیراب ہوں گے، غلے پھل اور میوہ کی افراط ہوگی، مویشی وغیرہ فربہ ہوجائیں گے، دودھ گھی بڑھ جائیگا اورعورتیں جو کفرومعصیت کی وجہ سے بانجھ ہورہی تھیں اولاد کو جننے لگیں گی، غرض آخرت کے ساتھ دنیا کے عیش و بہار سے بھی وافر حصہ دیا جائے گا۔(۱)

ایسے ہی مندرجہ ذیل آیات میں نماز اور دیگر اعمالِ صالحہ کے بجالانے کو دنیا میں فتح ونصرت اور آخرت میں نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بتلایا گیا ہے :

’’ وَاَوۡحَيۡنَـا اِلٰـى مُـوۡسٰـى وَاَخِيۡـهِ اَنۡ تَبَـوَّاٰ لِـقَوۡمِكُمَا بِمِصۡرَ بُيُوۡتًا وَّاجۡعَلُوۡا بُيُوۡتَكُمۡ قِبۡلَةً وَّاَقِيۡمُواالصَّلٰوةَ، وَبَشِّرِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ‘‘ (۲)

’’اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ تم مصر میں اپنی قوم کیلئے گھروں کو برقرار رکھو (یعنی فی الحال مصر میں اپنے گھروں میں رہو) اور اپنے گھروں کو نماز کی جگہ قرار دے لو اور نماز قائم کرو اور اسی کے ساتھ اہل ایمان کو بشارت سنادو (کہ اللہ تم کو کامیاب کرے گا)۔‘‘

’’ مَـنۡ عَـمِـلَ صَالِحاً مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَمُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً، وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَاكَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ‘‘ (۳)

’’جو شخص کوئی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ایمان والا ہو تو ہم اُسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے (یہ دُنیا میں ہوگا اور آخرت میں) اُن کے اچھے کاموں کے بدلے میں اُن کو اجر دیں گے۔‘‘

---

(۱) تفسیر فوائدِ عثمانی (۲) یونس : ۸۷ (۴) النحل : ۹۷

یہاں تمام اعمال صالحہ کے متعلق عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جوکوئی مرد یا عورت نیک کاموں کی عادت رکھے، بشرطیکہ وہ کام صرف صورۃً نہیں بلکہ حقیقتاً نیک ہوں، یعنی ایمان اور معرفتِ صحیحہ کی روح اپنے اندر رکھتے ہوں تو ہم ان کو ضرور پاک، ستھری اور مزیدار زندگی عنایت کریں گے مثلاً دنیا میں حلال روزی غنائے قلبی، سکون وطمانیت، ذکر اللہ کی لذت، حب الٰہی کا مزہ اور ادائے فرض، عبودیت کی خوشی، کامیاب مستقبل کا تصور۔(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا“(۲)

”بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اللہ تعالیٰ ان کیلئے مخلوق کے دل میں محبت پیدا کردیں گے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَمُؤْمِنٌ فَلَایَخَافُ ظُلْمًا وَّلَاهَضْمًا“(۳)

”اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا، تو اسے اس کے عمل کا پورا بدلہ ملے گا اور اس کو نہ کسی زیادتی کا خوف ہوگا اور نہ ہی حق تلفی کا (یعنی یہ نہ ہوگا کہ گناہ کے بغیر لکھ دیا جائے اور نہ ہی کوئی نیکی کم لکھ کر حق تلفی کی جائے گی)“

”وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ“ (۴)

”اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر مشکل سے خلاصی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کردیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچاتے ہیں جہاں سے اس کو خیال بھی نہیں ہوتا۔“

”اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیَاةِ الدُّنْیَا، وَالْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَیْرٌعِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا“ (۵)

”مال اور اولاد تو دنیا کی زندگی کی (فنا ہونے والی) رونق ہیں اور اچھے اعمال جو ہمیشہ

---

(۱) تفسیر عثمانی (۲) مریم :۹۶ (۳) طٰهٰ :۱۱۲

(۴) الطلاق : ۲،۳ (۵) الکهف :۴۶

باقی رہنے والے ہیں، وہ آپ کے رب کے یہاں یعنی آخرت میں ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں اور امید لگانے کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں۔''

(یعنی اچھے اعمال پر جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ آخرت میں پوری ہوں گی اور امید سے زیادہ ثواب ملے گا،اس کے برعکس مال واسباب سے امیدیں پوری نہیں ہوتیں)۔

اِس کے علاوہ بے شمار آیات ہیں جن میں اعمالِ صالحہ کی اہمیت، ان کی قدر و قیمت، ان سے دنیا وآخرت کی کامیابی وسرفرازی، اس سے محبت الٰہی، رضائے خداوندی اور بے پایاں رزق کے حصول کی خوشخبریاں سنائی گئی ہیں۔

احادیث اور اکابر کے ملفوظات اور تحریروں سے اعمال کی اہمیت کا ثبوت

مندرجہ ذیل تحریر میں ہم احادیث اور اکابر کے ملفوظات اور تحریروں کی روشنی میں اعمالِ صالحہ کی اہمیت اور دنیا وآخرت میں ان اعمال پر ملنے والے فوائد وثمرات اور منافع ، اس کے برخلاف اعمالِ سیئہ (برے اعمال) کی وجہ سے دونوں جہاں کی ناکامیوں ونامرادیوں اور نتائج بد سے دوچار ہونے کو بتلائیں گے۔

درجِ ذیل حدیث میں اعمال صالحہ پر ترغیب اور برے اعمال کے خراب نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے:

عن أبی هریرة أن رسول الله ﷺ قال: بادروا بالأعمال سبعًا هل تنتظرون الّافقرا منسیا، أوغنًی مطغیاً، اومرضًا مفسداً، او هرماً مفندًا، اوموتاً مجهزاً، أو الدجّال فشرُّ غائبٍ یُنتظر أو الساعة؟ فالساعة ادهی وامرّ (۱)

''حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سات چیزوں کے پیش آنے سے پہلے نیک اعمال میں جلدی کرو۔ کیا تمہیں ایسی تنگ دستی کا انتظار ہے جو سب کچھ بھلادے، یا ایسی مالداری کا جو سرکش بنادے، یا ایسے بڑھاپے کا جو عقل کھودے یا ایسی موت کا جو اچانک آجائے۔ (یعنی وقت توبہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا) یا دجال کا جو آنے والی چھپی ہوئی برائیوں میں بدترین برائی ہے، یا قیامت کا؟ قیامت تو بڑی سخت اور بڑی کڑوی چیز ہے''۔

---

(۱) ترمذی: ستکون فتنة کقطع اللیل المظلم ،حدیث:۲۱۹۵،امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کو ان سات چیزوں کے آنے سے پہلے نیک اعمال کے ذریعہ اپنی آخرت تیار کرلینی چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان رکاوٹوں میں سے کوئی رکاوٹ آجائے اور انسان اعمال صالحہ سے محروم ہوجائے۔

ایک دوسری روایت میں زمانہ کے تغیر اور حالات کی تبدیلی اور لوگوں پر اس کے اثر انداز ہونے اور اعمال خیر سے محروم رہ جانے پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ (نیک) اعمال کرنے میں جلدی کرو اور ایسے فتنوں کے پیدا ہونے سے (پہلے پہلے کرلو) جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہوں گے، (کہ حق و ناحق کا امتیاز مشکل ہوجائے گا) ان میں صبح کو آدمی مومن ہوگا شام کو کافر، شام کو مومن ہوگا، صبح کو کافر اور اپنے دین کو تھوڑے سے دنیا کے سامان کے بدلے بیچ دے گا۔(۱)

حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: مرنے سے پہلے پہلے اللہ کی طرف رجوع (اور توبہ) کرلو اور مشاغل کی کثرت سے پہلے پہلے اعمال صالحہ کرلو اور اللہ جل شانہ کو کثرت سے یاد کرکے اور مخفی اور علانیہ صدقہ کرکے، اللہ کے ساتھ رابطہ جوڑ لو کہ ان چیزوں کی وجہ سے تم کو رزق عطا کیا جائے گا، تمہاری مدد بھی کی جائے گی اور تمہارے نقصان کی بھی تلافی کردی جائے گی۔(۲)

حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد اعمال کی اہمیت اور اُس کے دُنیاوی اور اُخروی زندگی کے بناؤ و بگاڑ میں اثر اندازی کو بتانے کیلئے کافی ہے۔ حدیثِ قدسی ہے:

إن اللّٰـه تعالٰی یقول: یا ابن اٰدم تفرّغ لعبادتی املأصدرك غنی، واسدّ فقرك، وان لاتفعل ملأتُ یدیك شغلًا، ولم اسدُّ فقرك (۳)

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: اے آدم کی اولاد تو میری عبادت کیلئے فراغت (کے اوقات نکال لے) میں تیرے سینے کو غنا (اور بے فکری) سے پر کردوں گا اور تیرے فقر

---

(۱) مسلم: الایمان/الحث علی المبادرة بالأعمال قبل تظاهر الفتن، حدیث: ۱۱۸

(۲) ابن ماجه، اقامة الصلوة / فرض الجمعة رقم: ۱۸۱، بوصیری نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے اور کہا ہے کہ: ابوسعید خدری کی روایت اس کی شاہد ہے جس کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے۔ (مصباح الزجاجة: ۱/۱۶۴، دار الجنان، بیروت)

(۳) ترمذی، باب ۳۰، حدیث: ۲۴۶۶، مع تحقیق محمد احمد شاکر، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔

(وفاقہ) کو دور کردوں گا اور اگر تو ایسا نہ کرے گا کہ میری عبادت کیلئے فارغ بنے تو تجھے مشاغل میں پھنسادوں گا اور تیرا فقر زائل نہ کروں گا۔

اور ایک صحیح حدیث میں ہے، اللہ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں: اگر بندے میری اطاعت (پوری پوری) کریں تو رات کو سوتے ہوئے ان پر بارش برساؤں گا اور دن میں آفتاب نکلا رہے (کہ کاروبار میں حرج نہ ہو) اور بجلی کی آواز بھی ان کے کان میں نہ پڑے (تاکہ ان کو ذرا بھی خوف وہراس نہ ہو)۔(۱)

ان روایات کی توضیح میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ فرماتے ہیں: لیکن ہم لوگ کمانے کے واسطے، عبادت ہی کے اوقات سب سے پہلے حذف کردیتے ہیں، جب اس طرح اللہ کی نافرمانیوں میں ہماری ترقی ہو تو پھر ہماری پریشانیوں اور تنگدستیوں میں اضافہ کیوں نہ ہو؟ دین سے بے پرواہ ہوکر مسلمان روٹی کا مسئلہ حل کرنا چاہیں تو کیسے ممکن ہے؟ جبکہ روٹی دینے والا یہ کہے کہ میں فقر نہ دور کروں گا، نہ دل کو مشاغل سے خالی کروں گا۔

برے اعمال کا خراب انجام

آج کل لوگ نہ جانے کیسی کیسی آفات اور پریشانیوں سے دوچار ہیں، زلزلے، طوفان، قحط، سڑک حادثات، بم دھماکے، نت نئی بیماریاں وغیرہ، اس قسم کے حوادث روزمرہ کے چیزیں ہوگئی ہیں، نئے نئے مصائب روزافزوں ہیں، جو کبھی پہلے برسوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجئے اخبار کا تہائی سے زیادہ حصہ قتل وغارت گری اور کشت وخون کے واقعات سے بھرا پڑا ہوگا یہ سب بداعمالیوں کے نتائج ہیں؛ چنانچہ اب ہم اعمال بد کے خراب نتائج پر دلالت کرنے والی چند روایات بھی ذکر کرتے ہیں :

حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مالِ غنیمت کو اپنی ذاتی دولت سمجھا جانے لگے، امانت کو مالِ غنیمت سمجھا جانے لگے یعنی امانت کو ادا کرنے کے بجائے خود استعمال کرلیا جائے، زکوۃ کو تاوان سمجھا جانے لگے، یعنی خوشی سے دینے کے بجائے ناگواری سے دی جائے، علم، دین کیلئے نہیں، بلکہ دُنیا کیلئے حاصل کیا جانے لگے، آدمی بیوی کی فرمانبرداری اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، دوست کو قریب اور باپ کو دور کرے، اور لوگ

---

(۱) مسند احمد : مسند ابی هريرة ،حديث:۸۷۰۸

مسجدوں میں کھلم کھلا شور مچانے لگیں،قوم کی سرداری فاسق کرنے لگیں،قوم کا سربراہ قوم کا سب سے ذلیل آدمی بن جائے،آدمی کا اِکرام اس کے شر سے بچنے کیلئے کیا جانے لگے۔اور اُمت کے بعد والے لوگ اپنے سے پہلے لوگوں کو برا کہنے لگیں،تو اس وقت سرخ آندھی،زلزلے،زمین کے دھنس جانے،آدمیوں کی صورت بگڑ جانے اور آسمان سے پتھروں کے برسنے کا انتظار کرنا چاہئے اور ایسے ہی مسلسل آفات کے آنے کا انتظار کرو جس طرح کسی ہار کا دھاگا ٹوٹ جائے اور اس کے موتی پے در پے جلدی جلدی گرنے لگیں:"وآیاتٍ تتابع کنظامٍ قطع سلكه فتتابع "(١)۔

ایک دوسری روایت میں اعمالِ بد کے بھیانک انجام کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے آنحضرت رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

عن عبداللّٰه بن عباس رضی اللّٰه عنهما أنه قال : ماظهر الغلول في قومٍ قط الّا ألقي في قلوبهم الرعب ولافشى الزنا في قومٍ الّاكَثُرَ فيهم الموت ولا نقص قوم المكيال والميزان الّاقُطِعَ عنهم الرزق، ولاحكم قوم بغير الحق الّافشى فيهم الدم، ولااخترق قوم بالعهد الأسلّط عليهم العدو (٢)

حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کسی قوم میں مالِ غنیمت کے اندر خیانت کھلم کھلا ہونے لگے تو ان کے دِلوں میں دُشمن کا رعب ڈال دیا جاتا ہے، جب کسی قوم میں زنا عام طور سے ہونے لگے تو اس میں اموات کی کثرت ہوجاتی ہے۔جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگے تو اس کا رزق اٹھالیا جاتا ہے یعنی اس کے رزق میں برکت ختم کردی جاتی ہے، جب کوئی قوم فیصلوں کے کرنے میں ناانصافی کرتی ہے تو ان میں خونریزی پھیل جاتی ہے، جب کوئی قوم عہد کو توڑنے لگے تو اس پر دشمن مسلط کردیئے جاتے ہیں۔

ان روایات کی روشنی میں خود ہم یہ طے کرلیں کہ ان میں سے کونسی برائی ہم میں موجود نہیں؟ تمام برائیاں بیک وقت ہم میں پائی جاتی ہیں، پھر اللہ کی مدد یں اور نصرتیں ہمارے اوپر کیوں کر نازل ہوں؟ کیوں ہم مصائب اور حوادث کا شکار نہ ہوں؟ یہ تمام مصائب تو ہمارے ہاتھوں کے کمائے

(١) رواہ الترمذی : باب ماجاء في علامة حلول المسخ الخسف ،حدیث:٢٢١٠،امام ترمذی نے اس حدیث کوغریب کہا ہے۔

(٢) مؤطامالك: باب ماجاء في الغلول :حدیث٩٨١، مع تحقيق محمد فؤاد عبد الباقی

ہوئے ہیں۔ پھران پر رونا کیسا؟ اگر حالات کی تبدیلی کے خواہاں ہیں تو اپنے اعمال پر نظر ثانی کرنی ہوگی، اوراعمالِ صالحہ کو اختیار کرنا ہوگا پھر یہ مصائب وحوادث کے بادل خود بخود چھٹ جائیں گے۔

اعمال ہی حالات کی دُرستگی کا واحد سبب ہیں

حضرت مولانا یوسفؒ ایک موقع سے یوں فرماتے ہیں :

''میں دنیا کو دارالاسباب مانتا ہوں مگر انسانوں کی اجتماعی وانفرادی کامیابی، سکون، تمکنت، محبوبیت، مرجعیت، قوت اور تمام اچھے حالات کا واحد سبب حضور ﷺ کی آمد کے بعد صرف حضورِاقدس ﷺ کے وجودِاطہر سے صادر ہونے والے اعمال ہیں، جب کسی فرد، خاندان، طبقہ، جماعت، قوم یا ملک میں حضور ﷺ والے اعمال آجائیں گے تو خدا اِن کو دارین میں کامیابی عطا کرے گا، چاہے ان کے پاس کائناتی اسباب ہوں یا نہ ہوں۔'' (۱)

اعمال کی اہمیت اور اُس کی تاکید

دین وشریعت میں اعمال کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ عزّ وجل نے تمام برکتیں، راحتیں اور دل ودماغ کا سکون اسی میں رکھا ہے اور اعمال ہی پر کامیابی کے وعدے فرمائے ہیں۔ اعمال کی اس خصوصی اہمیت اور انسان کی دنیوی اور اخروی زندگی میں اس اثر انگیزی کی وجہ سے دعوت وتبلیغ میں اس پر خاصی توجہ مبذول کی گئی ہے اور ہر موقع سے اس کی تاکید وتلقین کی گئی ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا یوسف صاحبؒ انسانی زندگی پر اعمال کی اسی تاثیر واہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''حالات کی بنیاد ملک ومال، زروزمین، راکٹ وغیرہ پر نہیں؛ بلکہ حالات کی بنیاد اعمال ہیں، انبیاءؑ، صحابہ رضی اللہ عنہم اور علماء حالات سنوارتے ہیں، حالات ملک ومال، چاندی، سونا کے بدولت ٹھیک نہیں ہوں گے، جو یہ سمجھتا ہے دھوکہ میں ہے، حقیقت یہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے حالات کو اعمال کے ذریعہ جوڑا ہے، حالات کو چیزوں کے ذریعہ نہیں جوڑا، جیسے عمل کرے گا ویسے حالات مرتب ہوں گے۔'' (۲)

ایک دوسرے موقع سے فرماتے ہیں :

---

(۱) تذکرہ حضرت جیؒ: ص/۵۱ (۲) ملفوظات حضرت مولانا یوسف صاحبؒ حصہ اول: ص/۱۰۱،۱۰۲

''حضور ﷺ والے اعمال کے بغیر کبھی بھی دنیا وآخرت میں کامرانی نصیب نہیں ہوسکتی، چاہے کائناتی اسباب کتنے ہی ہاتھ آجائیں؛ بلکہ کائناتی اسباب حکومت، تجارت، زراعت وغیرہ میں جب تک حضور ﷺ والے اعمال کی روح نہ آجائے یہ اسباب مردہ ہیں''(۱)

ایک مرتبہ حضرت جی انعام الحسن صاحبؒ دنیا کی بے وقعتی اور اعمالِ صالحہ کی وقعت واہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''مال ودولت، سونا چاندی، عہدہ ومنصب سب اللہ کے انعامات میں سے خصوصی انعام نہیں ہو بلکہ عمومی ہو اور اس کیلئے ایمان بھی شرط نہیں ہے۔ یہ چیزیں ایمان والوں کو بھی دے دیتے ہیں، اللہ کا خصوصی انعام ایمان ہے اور ایمان بھی وہ جو اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہو اور پھر ایمان اور اعمالِ صالحہ والوں میں سے خصوصی انعام ان پر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ دین کی محنت اور جدوجہد کیلئے قبول فرمائے، اس لئے ہمیں عملوں کا اہتمام کرنا ہے۔ عملوں پر جمنا ہے، عمل کی تاثیر دنیا میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اعمال کیلئے دن میں محنت کرنا ہے اور رات میں خدا سے مانگنا ہے، عمل ہی سے دنیا اور آخرت کی زندگی بنتی ہے، جتنی ہماری زندگی اعمال پر آجائیگی اتنے ہی ہم بنتے چلے جائیں گے اور جہاں پر بھی ہوں گے بنے ہوئے رہیں گے۔

ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں :

''حالات عمل کے تابع ہیں، اعمال اگر اچھے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا کے حالات بھی اچھے بنائیں گے، اعمال کی کوشش کے بقدر ہمارے دین ودنیا کے حالات درست ہوں گے، اس لئے ہمیں اعمال کی مشق کرنی ہے اور اعمال میں اپنے آپ کو لگانا ہے۔ اصل مسئلہ آخرت کا ہے۔ دنیا کا ہر مسئلہ تو ختم ہونے کیلئے ہے؛ لیکن آخرت کا بگڑنا بڑی پریشانی کی بات ہے۔ اعمال انسان کی فکر کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر انسان کو دنیا کی فکر ہوگی تو دنیا کے اعمال کرے گا اور آخرت کی فکر ہوگی تو آخرت کے اعمال کرے گا۔''

ایک موقع سے کہنے کے مقابلے میں کرنے کو ترجیح دیتے ہوئے قول کے مقابلے عمل کے وزنی اور موثر ہونے کو بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں :

---

(۱) ملفوظات حضرت مولانا محمد یوسف صاحب حصہ اول: ص ۸۳

''عملی تعلیم قولی تعلیم سے زیادہ قوی ہے، ایسی ہی عملی تشکیل سے زیادہ قوی ہے، اثر پیدا کرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بغیر عمل کا قول آخرت میں پکڑ وائے گا، قول کے مطابق اگر عمل نہ ہو تو نقصان کا سبب ہے۔ تقریر تو ہم خوب کرلیں، واہ واہ فرشتے بھی جھوم رہے ہوں، لیکن جب منبر سے اتر کر آئیں تو عمل کے اعتبار سے ہم کورے ہوں، یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔ '' كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ '' (۱)

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ فرماتے ہیں :

''ایک بزرگ کے سامنے کوئی شخص حجاج ظالم کو بددعا دینے لگا، انہوں نے فرمایا: ایسا نہ کرو، یہ جو کچھ ہو رہا ہے تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے، مجھے یہ خوف ہے کہ اگر حجاج معزول ہوجائے یا مرجائے تو تم پر بندر اور سوّر نہ حاکم بنادیئے جائیں (مقاصد حسنہ: ۳۶۱) اور ''اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ'' تو ضرب المثل ہے بعض لوگوں نے اس کو حدیث بتایا ہے (ذکرہ العجلونی في کشف الخفا: ۱/۱۶۶) مطلب یہ ہے تمہارے اعمال تمہارے حاکم ہیں، جیسے اعمال ہوں گے ویسے حکام مسلط کئے جائیں گے۔ (۲)

کفار کی دُنیا میں بداَعمالیوں کے باوجود خوشحالی کیوں؟

ایک اشکال اس جگہ عوام کو پیش آتا ہے، بلکہ بعض خواص بھی اس میں مبتلا ہوجاتے ہیں، وہ یہ کہ یہ حسنات وسیئات (خوبیاں اور برائیاں) جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ مسلمانوں کیلئے نافع اور نقصان رساں ہیں ایسے ہی کافروں کیلئے بھی ہیں اور ہونے چاہئیں کہ نقصان دہ چیز بہر حال نقصان دہ ہے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفار باوجود ان بداعمالیوں میں مبتلا ہونے کے خوشحال ہیں، دنیا میں فلاح یافتہ اور ترقی یافتہ ہیں اور مسلمان بدحال ہیں اور ان کی پریشانیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے شریعت کا کوئی گوشہ بھی تشنہ اور نا تمام نہیں چھوڑا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ایک نبی علیہ السلام نے اللہ جل جلالہ سے یہی اشکال عرض کیا تھا کہ اے اللہ تیرا ایک بندہ مسلمان ہوتا ہے نیک اعمال بھی کرتا ہے، تو اس سے دنیا ہٹا لیتا ہے اور بلائیں اس پر مسلط کرتا ہے اور ایک بندہ تیرا کافر ہوتا ہے وہ تیری نافرمانی کرتا ہے، تو اس سے

---

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم وادراک: ص/۳۳-۳۸ (۲) الاعتدال فی مراتب الرجال: ص/۱۰۰

بلائیں ہٹالیتا ہے اور دنیا اس کو عطا فرماتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے وحی بھیجی کہ میرے مومن بندے کی کچھ سیئات ہوتی ہیں ان کی وجہ سے یہ معاملہ کرتا ہوں کہ جب وہ میرے پاس پہنچے تو اس کی خوبیوں کا بدلہ دوں اور کافر کی بھی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں، اس لئے یہ معاملہ اس کے ساتھ کرتا ہوں، تاکہ جب وہ میرے پاس آئے تو اس کی برائیوں کا بدلہ دوں۔(۱)

دوسری حدیث میں وارد ہے :

ان اللّٰــــه لا یظلم المؤمن حسنة یعطی علیها فی الدنیا ویثاب علیهـا في الاٰخرة، واما الکافر فیطعم بحسناته فی الدنیا حتّی اذا افضٰی الی الاٰخرة لم تکن له حسنة یعطی بها خیرًا (۲)

حق تعالیٰ شانہ مومن کی کسی نیکی میں کمی نہیں فرماتے، مومن اس نیکی کے طفیل دنیا میں بھی (فلاح اور کامیابی) دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کا ثواب علیحدہ دیا جائے گا اور کافر اپنی اچھی عادتوں کی وجہ سے دنیا میں روزی عطا کیا جاتا ہے، لیکن جب آخرت میں پہنچے گا۔(تو ایمان نہ ہونے کی وجہ سے) کوئی بھی نیکی نہیں ہوگی۔

ایک جگہ ارشادِ نبوی ہے :

اذا أردالـلّٰــــه بـعبده الخیر عجّل له العقوبة واذا اراد بعبده الشر امسك عنه ذنبه حتی یوافی به یوم القیامة (۳)

جب حق تعالیٰ شانہ کسی بندہ پر نیکی اور بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کا بدلہ دنیا ہی میں لے لیتے ہیں (کہ دنیا کا عذاب ہر حال میں آخرت کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے) اور جب کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کا بدلہ روک دیا جاتا ہے اور قیامت میں اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

اور بھی مختلف عنوانات سے یہ مضمون کثرت سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کافر کیلئے چونکہ نیکیوں

---

(۱) المعجم الکبیر: احادیث عبد الله بن عباس، حدیث: ۱۲۷۳۵، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس میں محمد بن خلید الحنفی ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔(مجمع الزوائد : باب فیمن عوقب بذنب فی الدنیا، حدیث: ۱۷۴۷۳)

(۲) مسلم: المنافقین/ جزاء المؤمن بحسناته : حدیث: ۲۸۰۸،

(۳) الترمذی : الزهد/ الصبر علی البلاء : حدیث: ۲۳۹۶، امام ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے۔

کا کوئی معاوضہ آخرت میں نہیں ہے، اس لئے جو بھی کسی قسم کی بھلائی اور نیک عمل وہ دنیا میں کرتا ہے، اس کا معاوضہ اس کو دنیا ہی میں مل جاتا ہے، اور مسلمان کیلئے اعمال حسنہ کا مستقل بدلہ تو آخرت میں ہے اور برائیوں کا اکثر و بیشتر معاوضہ دنیا میں ملتا رہتا ہے، اس لئے وہ جس قدر بھی کوتاہیاں، معاصی اور گناہ کرتا رہتا ہے بدحالی اور پریشانی کا شکار ہوتا رہتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں دولتِ اقدس پر حاضر ہوا تو دیکھا حضور رضی اللہ عنہ کے گھر کی کل کائنات چند مٹھی جو اور دو تکئے کچے (بغیر دباغت دیئے ہوئے) چمڑے کے پڑے ہیں اور ایسے ہی ایک آدھ چیز اور پڑی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بورئیے پر لیٹے ہوئے ہیں نہ بدن پر چادر ہے، نہ بورئیے پر کوئی چیز بچھی ہوئی، جس سے بورئیے کے نشانات بدنِ اطہر پر ابھر آئے ہیں، میں یہ منظر دیکھ کر رونے لگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب پوچھا تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! کیوں نہ روؤں؟ کہ بدن اطہر پر بورئیے کے نشانات پڑے ہوئے اور گھر کی کل کائنات یہ ہے جو میرے سامنے ہے، فارس وروم خدا کی پرستش بھی نہیں کرتے اور ان پر یہ وسعت ہے اور آپ کی یہ حالت؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے ہوئے لیٹے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا: ”أوفي شكٍ انت يا ابن الخطاب اولئك قوم عجلت لهم طيباتهم في الحياة الدنيا “ اے خطاب کے بیٹے عمر! کیا تم اب تک شک میں پڑے ہوئے ہو؟ ان قوموں کی بھلائیاں ان کو دنیا ہی میں مل گئیں۔(۱)

لَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ، وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُوْنَ، وَزُخْرُفًا وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲)

اور اگر یہ (احتمال) نہ ہوتا کہ سارے آدمی ایک ہی طریقہ پر ہو جائیں گے (یعنی تقریباً سب ہی کافر بن جائیں گے) تو جو لوگ کفر کرتے ہیں ہم ضرور چاندی کی بنا دیتے ان کے گھروں کی چھتوں کو اور ان سیڑھیوں کو جس پر وہ چڑھتے ہیں اور ان کے گھر کے کواڑوں کو بھی اور ان کیلئے تخت بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر وہ تکیہ لگا کر بیٹھتے

(۱) بخاری، المظالم/الغرفة والعليه المشرفة في السطوح وغيرها : حديث:۲۴۶۷۱

(۲) الزخرف :۳۵

اور(یہ سب چیزیں) سونے کی (بھی بنا دیتے کہ کچھ حصہ چاندی کا ہوتا اور کچھ سونے کا) اور یہ سب کچھ ساز وسامان کچھ بھی نہیں، مگر دنیوی زندگی کا چندروزہ سامان اور آخرت آپ کے رب کے یہاں پرہیز گاروں کیلئے ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ مومن گھبرا جائیں گے (اور اپنی تکلیف کے مقابلہ میں دوسرے کی اتنی راحت دیکھ کر تکلیف زیادہ محسوس کریں گے) تو میں کفار پر لوہے کی پٹیاں باندھ دیتا (یعنی لوہے کا خول ان پر چڑھا دیتا کہ وہ کبھی کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھاتے اور ان پر دنیا کو بہا دیتا۔(۱)

کافروں کیلئے دنیا میں یہ راحتیں اس لئے ہیں کہ دنیا اللہ کے نزدیک نہایت ہی ذلیل چیز ہے۔ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ: اگر اللہ جل شانہ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی نہ ملتا۔(۲)

حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: جب تو کسی کو دیکھے کہ وہ باوجود معاصی اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے دنیا کی (نعمتیں) پا رہا ہے تو یہ استدراج اور ڈھیل ہے پھر حضورِ پاک علیہ السلام نے یہ آیت قرآن تلاوت فرمائی: فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوا بِمَآ اُوْتُوٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۔(۳) ترجمہ: پس جب وہ بھول بیٹھے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی، تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھولدیئے (یعنی خوب نعمت اور ثروت عطا کی) یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں میں جو ان کو دی گئی تھی خوب اترا گئے (اور مستی میں ان کا کفر بڑھ گیا) تو ہم نے ان کو دفعۃً (اچانک) پکڑ لیا، پھر تو وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے۔

ان تمام مجموعی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کفار کو جو خوشحالی، فارغ البالی اور راحت دنیا میں عطا کی جاتی ہے وہ اس لئے ہے کہ ان کے نیک اعمال کا انجام بدلہ دنیا ہی میں انہیں دیا جاتا ہے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، یا ان پر ان نعمتوں کی کثرت بطورِ استدراج اور ڈھیل کے ہوتی ہے، پھر اچانک اللہ عزوجل ان کی پکڑ کر لیتے ہیں۔

---

(۱) المعجم الكبير :۱۸/حدیث:۸۰۸،علامہ ہیثمی نے فرمایا ہے کہ: اس کے رجال ثقہ ہیں۔(مجمع الزوائد:۱۰/۲۸۶)

(۲) الترمذی : الزهد/ هوان الدنيا: حدیث:۲۳۲۰،امام ترمذی نے اس روایت کو صحیح اور غریب کہا ہے۔

(۳) الانعام :۴۴،مسند احمد: حدیث عقبۃ بن عامر،حدیث:۱۷۳۴۹،محقق شعیب الارنوط کہتے ہیں کہ: یہ حدیث حسن ہے، اور اس کی سند رشدین بن سعد کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس سند کے باقی رجال ثقہ ہیں۔

''تبلیغ'' کا نام اس کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے حجاب بن گیا

عموماً لوگوں کو دعوت وتبلیغ کے نام سے مروجہ کام کو سمجھنے کیلئے اس کام کو تبلیغ، کے نام سے موسوم کیا جانا ہی دراصل اس کام کی حقیقت ونوعیت سمجھنے کیلئے حجاب بن گیا ہے۔ اکابر کے قول کے مطابق اس کام کی حقیقت بس اتنی ہے کہ جیسے اذان کے ذریعے لوگوں کو نماز کیلئے اکٹھا کیا جاتا ہے اورلوگ مجتمع ہوکر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کے اس عمل پر تنظیم یا تحریک کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، اس کا مقصدِ اصلی بھی بس صرف اتنا ہے کہ لوگ دعوت کی اس عملی محنت کے ذریعے دین وایمان کی حقیقت کو اپنی زندگی میں لے آئیں۔ چنانچہ خود حضرت مولانا الیاس صاحبؒ اس بات کی بے پناہ مخالفت کرتے تھے کہ ان کے اس دین کی عمومی بیداری اور شعور پیدا کرنے والے کام کو ''تبلیغ'' کے نام سے موسوم کیا جائے۔ فرماتے ہیں:

''اپنے اس کام کا نام تبلیغ یا تبلیغی جماعت ہم نے نہیں رکھا بلکہ نام رکھنے کے مسئلہ پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، بس آپ سے آپ یہ نام چل پڑا اور ایسا مشہور ہوا کہ کبھی کبھی ہم بھی یہی نام لیتے ہیں''۔

تبلیغ کے اِس مشہور عنوان سے جو تصورات لوگوں کے دل ودماغ میں پیدا ہوتے ہیں اور جس غلط فہمی میں وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کو بالتفصیل حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ یوں بیان کرتے ہیں:

میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ اس کام کیلئے ''تبلیغ'' کا عنوان اور اس کے کرنے والوں کیلئے ''تبلیغی جماعت'' کا نام بہت سوں کیلئے غلط فہمیوں اور ذہنی الجھنوں کا سبب بنتا ہے، تبلیغ کے اس لفظ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ وعظ ونصیحت کا کام ہے اور تبلیغی جماعت' وعظ نصیحت کرنے والوں کی کوئی ٹیم یا پارٹی ہے اس لئے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس جماعت کے ہر فرد کو اتنا علم ضرور ہونا چاہئے، جتنا کہ وعظ ونصیحت کیلئے ضروری ہے، اسی طرح عملی حیثیت سے بھی اس میں کوئی نمایاں کمی نہ ہونی چاہئے، پھر جب وہ پھرنے والی تبلیغی جماعتوں میں بعض ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں جنہیں صحیح وضو کرنا بھی نہیں آتا اور جن کی وضع اور صورت بھی شریعت کے مطابق نہیں ہوتی تو ان کے دلوں میں سخت اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب وہ دیکھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے سب سے زیادہ اصرار اس بات پر کرتے ہیں کہ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر اس کام کیلئے باہر نکلیں اور لمبے لمبے سفر کریں تو بھی حیرت ہوتی ہے، بہرحال اس طرح کے سارے اعتراضات صرف اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ یہاں تبلیغی جماعت کا کام وعظ ونصیحت سمجھا جاتا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں تبلیغ سے

مراد ایک خاص نظام عمل ہے یعنی ایک خاص قسم کے دینی اور دعوتی ماحول میں خاص اصولوں کے ساتھ کچھ خاص اعمال واشغال کی پابندی کرتے ہوئے خاص پروگرام کے مطابق زندگی گذارنا جس سے ایمانی کیفیت میں ترقی ہو۔ دین سے تعلق اور واقفیت بڑھے، اعمال واخلاق کی کچھ اصلاح ہواور دین کیلئے جانی ومالی قربانی کی عادت پڑے الغرض یہاں تبلیغ سے مراد یہی عملی پروگرام ہے اوراس کیلئے ہر مسلمان کوخواہ اس کے عمل وعلم میں کتنی ہی کمی ہو اِس کی دعوت دی جاتی ہے بلکہ جہاں تک بس چلتا ہے کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے اوران کوساتھ لینے کیلئے کوئی شرط نہیں لگائی جاتی بلکہ اس امید پران کولے جایا جاتا ہے کہ انشاءاللہ جماعتی ماحول اوراس کی فضا سے یہ متاثر ہوں گے اوراللہ تعالیٰ جو دراصل ہادی اور مقلب القلوب ہیں ہم سب پر اپنا فضل فرمائے گا اس لئے جماعتوں میں ہرطرح کےاور ہرقماش کےلوگ ہوتے ہیں۔(۱)

چنانچہ اِس کام کی وجہ سے اُمت میں فرائض ونوافل زندہ ہورہے ہیں،لوگ سالہاسال کی چھوٹی ہوئی زکوٰۃ ادا کررہے ہیں، حجاج کرام کی تعداد بڑھ رہی ہے اور وہ حقیقتِ حج کے اُصول اورموسمِ حج کونبوت والے اعمال میں گذارنے کی فکرکررہے ہیں،ماں بہنوں میں عفت وحیاءاور پردہ زندہ ہورہاہے، دینی ودُنیوی نہایت پسماندہ علاقوں میں بدعات ورسومات کوچھوڑ کرسنتِ نبوی ﷺ پر چلنے والے جیالے پیدا ہورہے ہیں، آفریقہ میں فقر وافلاس میں مرغی کے انڈوں، ذریعہ معاش، پالتو جانوروں کو بیچ کردعوتِ دین کی محنت کیلئے صحابہؓ والی قربانیاں زندہ ہورہی ہیں، یوروپ وامریکہ میں مغربیت ومادّہ پرستی کا علاج ہورہا ہے، سیم وزراور ڈالر وپاؤنڈ کی پرکشش تنخواہوں کی طمع کو چھوڑکر وہاں کے باشندے دینی مدارس میں اپنی اولاد کوداخل کروارہے ہیں، غیرسودی بنک کاری کے بارے میں علماء سے رُجوع ہورہے ہیں، تیسری طرف عربستان میں سیاست وحکومت سے لے کرمعمولی مزدورتک زہدوقناعت ،فکرِآخرت کے مزاج پرآرہے ہیں، اباحیت پسندی،قومیتِ عربی اورخدابیزارتہذیب وتمدن کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے،افرادِاُمت میں دینی حمیت وغیرت پروان چڑھ رہی ہے، کالجوں ویونیورسٹیز اورایسے ممالک جہاں سے عریانیت وبے حیائی کے نت نئے اندازایجاد کئے جاتے ہیں، میں چہروں پرداڑھی، سروں پرعمامے اورجسم پرمسنون لباس کی ایسی نورانیت چھلک رہی ہے جو دینی مدارس میں پائی جاتی ہے، ظاہر ہے اِن تمام انقلابات کو

(۱) جماعت تبلیغ پراعتراضات کے جوابات : ۱۳۱-۱۳۲

بپا کرنے والی محنت کو صرف تبلیغ کا نام دینا سراسر ظلم اور اُس کی حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے اور محض لفظ تبلیغ کو لے کر اُس کی شرعی حیثیت طئے کرنا بھی نامعقول معلوم ہوتا ہے۔

تبلیغ اور تبلیغی کے فرق کو ملحوظ رکھیں

یہ عام وخاص سمجھتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا کام کوئی تنظیموں اور عام اداروں کی طرح نہیں کہ جس میں ممبری کا فارم پر کیا جائے اور غلطی پر جماعت سے خارج کرنے کا اخباری اعلان کیا جائے، بلکہ یہ تو ہر فردِ اُمت کو پورے دین پر قائم کرنے اور پورے دین کا داعی بنانے کی عام محنت ہے، جس کی ہمہ گیریت اور عالمگیریت خیر القرون کے دور کے بعد سے بے مثال ہے۔ اس میں عربی، عجمی، شہری، دیہاتی، عالم، جاہل، کالا، گورا، مہذب، غیر مہذب اور مختلف المزاج متنوع طبیعتوں کے لوگ داخل ہیں اور داخل ہورہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کام کو ان کی اصلاح کا ذریعہ بنارہا ہے؛ اس لئے یہ چیز ناممکن ہے کہ کچھ بے اصولی کرنے والے، غلط ترجمانی کرنے والے افراد اس میں نہ ہوں بلکہ کسی بھی دین ودنیا کے جس شعبہ میں انسان کام کررہے ہیں ان سے اس قسم کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں؛ لیکن کسی فرد کی جزئی غلطی کو لے کر یا کسی محلّہ اور علاقہ والوں کی بے اعتدالی یا غلط روی کو دیکھ کر نفس تبلیغ کو مجروح کرنا یا پورے کام کرنے والوں کو مطعون کرنا اور کام کے دیگر بے شمار انقلابی تبدیلیوں سے صرفِ نظر کر لینا، کسی خداترس، وسیع النظر، صاحبِ فہم آدمی کا کام نہیں ہوسکتا ہے، جیسے اکثر مسلمانوں کی عملی کوتاہیوں کی وجہ سے اسلام نہیں چھوڑا جاسکتا اور جیسے ڈرائیور کی غلطی کو گاڑی کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے اسی طرح کسی تبلیغی کے غلو کو دیکھ کر اسے اصولِ دعوت کا نقص نہیں کہا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا الیاس صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

”یہ کام دھوبی گھاٹ کا کام ہے، جہاں ہر قسم کے پاک ناپاک کپڑے دھلے جاتے ہیں“

اس کام پر اس اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت وتائید معلوم ہوتی ہے کہ جس تناسب سے اس کام کی عمومیت واجتماعیت ہے اس نسبت سے مزاجِ دعوت سے منحرفین کی تعداد اور ضمنی فاسد اثرات بہت کم ہیں۔ ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں:

”دعوتوں، تحریکوں اور انقلابی واصلاحی کوششوں کی تاریخ بتلاتی ہے کہ جب کسی وقت کسی دعوت وتحریک پر کچھ زمانہ گذر جاتا ہے یا اس کا دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر ہوجاتا

ہے(اور خاص طور پر جب اس کے ذریعہ نفوذ واثر اور قیادت کے منافع نظر آنے لگتے ہیں) تو اس دعوت وتحریک میں بہت سی ایسی خامیاں، غلط مقاصد اور اصل مقصد سے تغافل شامل ہوجاتا ہے جو اس دعوت کی افادیت وتاثیر کو کم یا بالکل معدوم کردیتا ہے، لیکن یہ تبلیغی دعوت ابھی تک (جہاں تک راقم کے علم ومشاہدہ کا تعلق ہے) بڑے پیمانہ پر ان آزمائشوں سے محفوظ ہے۔اس میں ایثار وقربانی کا جذبہ، رضائے الٰہی کی طلب اور حصولِ ثواب کا شوق، اسلام اور مسلمانوں کا احترام واعتراف، تواضع وانکسارِ نفس، فرائض کی ادائیگی کا اہتمام اور اس میں ترقی کا شوق، یادِالٰہی اور ذکرِ خداوندی کی مشغولیت، غیر مفید اور غیر ضروری مشاغل سے امکانی حد تک احتراز اور حصولِ مقصد، رضائے الٰہی کیلئے طویل سفر اختیار کرنا اور مشقت برداشت کرنا شامل اور معمول بہ ہے۔

جماعت کی یہ خصوصیت اور امتیاز، داعیٔ اوّل کے اخلاص، انابت الی اللہ، اس کی دعاؤں، جدوجہد وقربانی اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رضا وقبولیت کے بعد ان اصولوں وضوابط کا بھی نتیجہ ہے جو شروع سے داعیٔ اوّل (حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کیلئے ضروری قرار دیئے اور جن کی ہمیشہ تلقین وتبلیغ کی گئی وہ کلمہ طیبہ کے معانی وتقاضوں پر غور، فرائض وعبادات کے فضائل کا علم، علم وذکر کی فضیلت کا استحضار، ذکرِ خداوندی میں مشغولیت، اکرامِ مسلم اور مسلمانوں کی حق شناسائی وادائیگی، ہر عمل میں تصحیحِ نیت واخلاص، ترک مالا یعنی اللہ کے راستے میں نکلنے اور سفر کرنے کے فضائل وترغیبات کا استحضار اور شوق یہ وہ عناصر اور خصائص تھے جنھوں نے اس دعوت کو ایک سیاسی، مادّی تحریک اور استحصالی فوائد حصولِ جاہ ومنصب کا ذریعہ بننے سے محفوظ فرمایا اور وہ ایک خالص دینی دعوت اور حصولِ رضائے الٰہی کا ذریعہ رہی۔
یہ اُصول وعناصر جو اس دعوت وجماعت کیلئے ضروری قرار دیئے گئے کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور رضائے الٰہی کے حصول ودین کی حفاظت کیلئے ایک پاسباں ومحافظ کا درجہ رکھتے ہیں۔ان سب کے ماخذ کتابِ الٰہی، سنت واحادیث نبوی ﷺ ہیں''۔(۱)

(۱) مقدمہ منتخب احادیث : ۵-۶ (یہ تحریر حضرت مفکرِ اسلامؒ نے ۲؍ذی القعدہ ۱۴۱۸ کو رقم فرمائی ہے)

سالکین اور واصلین کے دو طبقے

دین کے ہر شعبہ میں دو قسم کے طبقے ہوتے ہیں، ایک سالکین کا، دوسرے واصلین کا، سالکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس شعبۂ تزکیہ یا مدارس یا تبلیغ کے کام میں متبدی ہیں یا ابھی تک اس شعبہ کے مخصوص مزاج وطریقۂ کار کو اس کے اکابر سے حاصل نہیں کئے ہیں، ہر دور میں ایسے اشخاص کے ذریعہ سے اس کام کو نقصان پہنچا ہے اور اس شعبۂ دین کی شبیہ مسخ ہوئی ہے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہوئی ہیں۔

"واصلین" یا "کاملین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس شعبۂ دین کے مزاج ومذاق کو پی چکے ہیں اور اس کے اکابرین کے فیض یافتہ ہیں، گرچہ وہ بہت کم ہوتے ہیں "وقلیل من عبادی الشکور" انہی لوگوں کو اس شعبہ کا نمونہ اور آئیڈیل سمجھا جانا چاہئے ورنہ آدمی کسی بھی دینی شعبہ میں کام نہیں کرسکتا۔

کارکنانِ دعوت کی اصلاح کا مثالی نظام

اس کام کے عالمی اور عمومی ہونے کے پیش نظر ہی اس میں غیر معمولی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ جماعتوں کی روانگی کے وقت دی جانے والی تفصیلی ہدایات (خدا کرے کہ وہ متروک یا رسمی نہ رہ جائیں)، واپس ہونے پر کارگذاری اور غلطیوں کی اصلاح، دومہینہ کی ترتیب پر مراکز کو بلاکر تربیت دینا۔ اجتماع میں قدیم کارکنوں سے خصوصی نشست رکھ کر امراضِ نفسانیہ پر تنبیہ، نیز پوری دنیا کے تمام ممالک کے ذمہ دار افراد کو سال دوسال میں اور بعض کو تین مہینہ چار مہینہ میں کسی نہ کسی جگہ مرکز نظام الدین، بنگلہ دیش یا رائے ونڈ یا حرمین شریفین کے اجتماعات میں حالات وزمانے کے مطابق ہدایات دینے کا مربوط ومستحکم نظام قائم کیا گیا ہے۔ عہدوں اور مناصب کی تقسیم یا دستور اور اصول کی تدوین کا کوئی ایسا رواجی مغربی نظام نہیں ہے کہ کوئی مخلص فرد داخل ہوکر اصلاح کرنا بھی چاہے تو اصلاح نہ کرسکے بلکہ ہر صاحبِ فہم اس کام میں لگ کر، اس کام کی منطق سمجھ کر مناسب طریقے سے تبدیلی لاسکتا ہے۔ اِسی بات کو مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "نماز میں شریک ہوکر لقمہ دوگے تو نماز درست ہوگی۔ خارج صلوۃ کا لقمہ لینے سے نماز خراب ہوجاتی ہے"۔ تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے کہ کسی بھی کام کے اصول وقواعد اور ان کے مصالح سمجھے بغیر

رائے زنی کرنا اکثر و بیشتر بے بنیاد اور غیر سودمند ہوتا ہے۔

وسائل اور مقاصد میں فرقِ مراتب کا لحاظ ضروری ہے

ہر شعبۂ دین میں کچھ اعمال کی حیثیت وسائل و ذرائع کی ہوتی ہے اور کچھ اعمال مقاصد کا مقام رکھتے ہیں۔ جیسے دینی مدارس میں نصاب اور ابتدائیہ، ثانویہ، فضیلت، عالمیت اور تخصصات ودرجات کا تعین، اساتذہ وطلبہ کی قیام گاہوں کی تعمیرات، ششماہی وسالانہ امتحانات کی ترتیب، تکمیلِ حفظ قرآن ودستار بندی کے جلسے، سفراء ومحصلین، زکوۃ وعطیات کا استعمال وغیرہ وغیرہ چیزیں وسائل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں کا ہر عمل ہیئت کذائی کے ساتھ قرآن وحدیث وعہد تابعین سے ثابت نہیں ہے اور نہ ثابت ہونا ضروری ہے، بلکہ اتنا کافی ہے کہ وہ مخالف شرع نہیں ہیں اور یہ سب کچھ احداث للدین ہے نہ کہ احداث فی الدین، اس لئے انہیں بدعت نہیں کہا جاسکتا ہے "وللوسائل حکم المقاصد" (وسائل کا وہی ثواب اور حکم ہے جو مقاصد کا ہے) کے تحت علوم دینیہ کے حصول کے سارے فضائل طلبۂ مدارس اور ان سے متعلقہ اُمور کیلئے بیان کئے جاتے ہیں۔

اِسی طرح تزکیاتی نظام کو لے لیجئے، سارے شرعی تصوف کا مقصد اخلاقِ حمیدہ مثلاً صبر، شکر، اخلاص وغیرہ سے آراستہ کرنا اور اخلاقِ رذیلہ مثلاً ریا، کبر، حبّ دنیا وغیرہ سے پاک کرنا ہے۔ اس لئے متبع شریعت شیخ کامل کی طرف سے تلقین کئے جانے والے ذکر، شغل، مراقبے وغیرہ اور ان کے خاص طریقے، اُن مقاصد کی تکمیل کے لئے ذرائع ہیں، جیسے کوئی شخص قرآن حفظ کرتے ہوئے اِذَالسَّمَاءُ انْفَطَرَتْ کے کلمات کو الگ الگ یوں یاد کرتا ہے اِذَالسَّمَاءُ ن، اِذَالسَّمَائن پھر فَطَرَتْ فَطَرَتْ یاد کرتا ہے، پھر اس کے بعد دونوں کو ملا کر "اِذَالسَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" کہتا ہے جائز ہے، باوجود یہ کہ الفاظ و جملہ بے معنیٰ ہو رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تلاوت نہیں ہے اور نہ تلاوت مقصود ہے، بلکہ مقصود ذہن میں جمانا ہے۔ اسی طرح اِلَّا اللّٰہُ، اِلَّا اللّٰہُ، اِلَّا اللّٰہُ یا اَللّٰہُ، اللّٰہ کی ضرب مخصوص طریقے سے لگانا بھی (جن میں ہر ادا کی عقلی اور نفسیاتی وجہ ہے اور شریعت میں اس کی اصل بھی ہے) بدعت نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی ذکر اللہ کا ذہن میں جمانا ہے اور اہل فن کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ یہ ترتیب رسوخِ ذکر میں بے حد مفید ہے، جیسے وہاں تلاوت کرنے والا اس حالت میں تالی نہیں ہے، بلکہ مبتدی للتلاوۃ ہے، اسی طرح یہ شخص ذاکر نہ ہوا بلکہ مبتدی للذکر ہوا، لیکن چونکہ نماز کا انتظار بھی نماز کے حکم میں ہے اسی طرح یہ بھی حکماً ذاکر ہے اور شیخ

کامل مریض کی استعداد، کیفیتِ مرض وغیرہ کو دیکھ کر خاص مقدار طئے کرتا ہے، صرف بطور معالجہ کے، مقصد تو مسنون اذکار میں جان پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مقصد حاصل ہونے کے بعد ایسے طریقے چھڑوائے جاتے ہیں۔

اب نظامِ دعوت وتبلیغ کو لیجئے۔ اس کے چلّے، چار ماہ، سہ روزہ، عشرہ وغیرہ پورے شریعت کی طرف لانے کا مجرب نافع ذریعہ ہے۔ قرآن، سیرت اور مزاجِ صحابہؓ کے سب سے زیادہ قریب اور عالمی سطح پر مبشرات کے ذریعہ مؤیّد ہے، نہ عملاً اس کی تحدید کی جاتی ہے کہ اس سے کم وقت دینے والے کو قبول نہ کیا جائے، البتہ شعبہ کی طرح نصاب کی تکمیل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے تاکہ نفع مکمل ہو، اس کو اعتقاداً منصوص کا درجہ نہیں دیا جاتا ہے، اس لئے ان وسائل کو بھی بدعت کہنا غلط ہے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: یہ مکتوب بنام حضرت ندویؒ ہے :

''اندر سے طبیعت جو یاہے کہ یہ بات معلوم ہو کہ کس چیز کی تحریک ہے، اتنی مختصر ہمیشہ کیلئے معروض ہے کہ اصل جو تبلیغ ہے وہ صرف دو اَمر کی ہے اور باقی جو ہیں اس کی شکل اور صورت بٹھانے کیلئے ہیں تو وہ دو چیزیں ایک مادّی ہے اور ایک روحانی ہے۔ مادّی سے مراد جوارح سے تعلق رکھنے والی ہے۔ سو وہ تو یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی لائی ہوئی باتوں کو پھیلانے کیلئے ملک بہ ملک اور اقلیم بہ اقلیم جماعتیں بنا کر پھرنے کی سنت کو زندہ کر کے فروغ دینا اور پائیدار کرنا۔'' (۱)

جب وسائل مقاصد بن جاتے ہیں...

کسی بھی دین کے شعبہ میں وسائل مقاصد بن جاتے ہیں اور حقیقی مقاصد سے نگاہیں اوجھل ہوتی ہیں تو وہ وسائل بدعت ہو جاتے ہیں، جیسے غالی صوفیاء نے تصورِ شیخ یا ذکر کے خاص ابتدائی تربیتی وسائل کو مقاصد بنالیا اور اصل مقصود صفتِ احسان اور پابندیٔ شریعت کو پس پشت ڈال دیا اور وسائل کو فرائض ومقاصد سے زیادہ اعتقاداً وعملاً اہمیت دی اور وہ بدعتی بن گئے۔ اس لئے اکابرِ دعوت اس پہلو پر ہمیشہ زور دیتے رہے ہیں کہ یہ ہماری نقل وحرکت بے روح اور سفرِ بے منزل نہ رہ جائے، ورنہ سب سے بڑی نادانی ہوگی۔ بقول مولانا ابراہیم دیولہ صاحب دامت

(۱) ارشادات ومکتوب حضرت مولانا الیاس صاحبؒ بنام حضرت ابوالحسن علی ندویؒ : ۱۷۵، مرتبہ افتخار احمد فریدی

برکاتہم کے کہ: ''مقصد کو بھلا کر کام کرنا ایسا ہے جیسا کہ ڈول رسی لے کر پانی کو بھول جائے یا اذان دے کر نماز کو چھوڑ دے، چنانچہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ فرمایا کرتے تھے :

''اس بندۂ ناچیز کی نظر کے اندر وہ تبلیغ جس کیلئے آپ کو بھی بلایا تھا اور خود بھی کوشاں ہے،اس کا منتہا دنیا کے مسلمانوں میں صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کو شریعت کے ماتحت اور شریعت کے مطابق کرنا ہے۔تبلیغ کی ابجد اور الف، ب، ت،عبادات سے ہے اور عبادات کے کمال کے بغیر ہرگز معاشرت اور معاملات تک اسلامی امور کی پابندی نہیں پہنچ سکتی۔سو مخلصین کی صحیح اسکیم یہ ہونی چاہئے کہ تبلیغ کی ابجد الف، ب، ت یعنی عبادات کو دنیا میں پھیلانے کی اسکیم شروع کر کے اس کے منتہا تک پہنچانے کی کوشش میں لگ جائیں۔ معاملات ومعاشرت اور باہمی اخلاق کی درستگی کے ذریعہ سیاست تامۃ تک رسائی ہوگی۔اس کے سوا کسی جزئیات میں پڑ جانا،اپنے سرمایۂ درد کو شیطان کے حوالے کر دینے کے سوا کچھ نہیں''۔(۱)

یہ کوئی تنظیم نہیں دینی محنت ہے

یہ پیش نظر رہے کہ تبلیغ یہ کوئی تنظیم نہیں ہے، بلکہ یہ صرف نہجِ نبوت پر دینی جدوجہد اور اصلاح حال کیلئے ایک متحرک نظام ہے۔ چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اس تبلیغی تحریک کی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں :

''تبلیغی جماعت کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ممبر یا رکن ہے نہ صدر یا سکریٹری جیسا اس کا کوئی عہدیدار ہے، نہ کہیں اس کا دفتر ہے،کوئی رجسٹر جس میں جماعت سے تعلق رکھنے والوں کے نام لکھے جاتے ہوں، نہ اس کا کوئی فنڈ ہے۔بس یہ ایسی جماعت ہے،جیسی ہماری مسجدوں میں روزانہ پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے''۔(۲)

مولانا سید ابوالاعلی مودودی مرحوم اس تبلیغی تحریک کی سادگی، اخلاص، جدوجہد وعمل، نہجِ نبوت سے اس کی قربت اور اس کے خاموش انقلاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

(۱) مولانا الیاس صاحبؒ اور اُن کی دینی دعوت: آٹھواں باب

(۲) تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات-از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ : ۱۵-۱۶

''یہ قابلِ قدر نتائج جو گنتی کے چند برسوں میں برآمد ہوئے ہیں محض اخلاص اور محنت وکاوش کا ثمرہ ہیں۔ وہاں نہ کوئی کمیٹی ہے، نہ چندہ ہے، نہ اس تحریک کا کوئی جداگانہ نام ہے، نہ اس کے ممبر بھرتی کیئے جاتے ہیں، نہ کوئی امیر و رئیس پشت پر ہے، کوئی اخبار نکلتا ہے، نہ تو قواعد پریڈ اور یونیفارم اور باجوں اور جھنڈوں کے نمائشی مظاہرے ہوتے ہیں، نہ اپنے کارناموں کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اکیلے آدمی (الیاسؒ) نے جو ٹھوس کام کیا ہے، وہ ہماری بڑی بڑی انجمنوں اور ان کے بلند بانگ تحریکوں سے آج تک بن نہ آیا جس کے نام آپ رات دن اخبارات میں دیکھتے ہیں۔ حقیقۃً اس نوعیت کی تحریک ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں یا تو حضرت شیخ احمد مجدد سرہندیؒ نے اٹھائی تھی یا حضرت سید احمد بریلویؒ نے اس کا احیاء کیا تھا، اب مولانا الیاس صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے اسے تازہ کرنے کی توفیق بخشی ہے''۔(۱)

دعوت وتبلیغ اور دیگر تحریکات اور تنظیمیں

دعوت وتبلیغ دراصل دینی جدوجہد اور ایمانی ماحول بپا کرنے والی تحریک ہے۔ اس کا اپنا ایک دائرۂ عمل اور کچھ اُصول وضوابط ہیں جس کی مکمل پابندی اور اُس کے حدود میں رہ کر کام کیا جاتا ہے۔ رہی دیگر تحریکات اور تنظیمیں اِس کے تعلق سے اِس کا رویہ نہایت وسعتِ قلبی اور کشادہ دلی پر مبنی ہے۔ ہر تحریک سے وابستہ شخص کو اپنے کام کے ساتھ دعوت کی اِس جدوجہد کی بھی تلقین کی جاتی ہے، لیکن کسی کے ساتھ معاندانہ رقیبانہ یا حریفانہ رویہ اپنایا نہیں جاتا، اگر کوئی غلط تحریک سے وابستہ شخص بھی ہو تو اس کی غلطی کی نشاندہی اور اس کو اشتعال انگیز کیئے بغیر اپنی دعوت، اُس کا طریقۂ کار اُس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس سے اس تحریک اور محنت سے وابستہ ہونے اور اُس کے اثرات ومنافع سے (جو کسی بھی شخص سے پوشیدہ اور مخفی نہیں) مستفید ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ شخص خود اپنی غلطی پر مطلع ہو جاتا ہے، خواہ کوئی بھی تحریک یا تنظیم اگر اس سے مسلمانوں کا کسی بھی طرح سے کوئی مفاد وابستہ ہے تو اسے بنظرِ تحسین دیکھا جاتا ہے۔ ہر ایک کی صلاحیتوں (جبکہ اللہ عزوجل نے ہر ایک میں ایک خاص قسم کی امتیازی صلاحیت ودیعت کی ہوئی

---

(۱) تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات-از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ: ۲۶-۲۷

ہوتی ہے) سے استفادہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے اس مدعا پر اکابرین تبلیغ خصوصاً حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا رویہ ملاحظہ ہو، جو اس بات کا واضح اور بین ثبوت ہے کہ دیگر تنظیموں کے ساتھ اِس تحریک کا سلوک نہایت ہی وسعتِ نظری پر مبنی ہے۔ ہم اِس حوالہ سے چند ایک واقعات ذکر کیے دیتے ہیں :

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ فرمایا کرتے تھے :

''میں ہر مومن کو اپنا محسن سمجھتا ہوں کہ اس نے ایمان لاکر میرے بوجھ کو کم کر دیا، ورنہ اُس تک دعوت کا پہنچانا بھی میری ذمہ داری ہوتی''۔

حضرت مولانا کے اِس ارشاد کو ملاحظہ کیجئے کہ جو شخص ہر مومن کے ساتھ اِس قدر فراخ دل، کشادہ ذہن ہو، اور وہ یہ باور کرتا ہو کہ اُس کا صاحبِ ایمان ہونا اُس پر احسان ہے، کیا وہ کسی بھی ایسی تحریک یا تنظیم کو جو مسلمانوں کے مفاد کیلئے متحرک ہو اپنا حریف باور کر سکتا ہے؟ جبکہ یہ شخص نہ صرف مومن مسلمان ہے بلکہ مسلمانوں کے مفاد میں لگا ہوا ہے۔

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے عجیب وسیع دل عطا کیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اِس دل میں کتنی گنجائش تھی، کتنی وسعت تھی، وہ ہر ایک کو اپنا سمجھتے تھے، وہ ہر کسی میں کوئی نہ کوئی پہلو اپنائیت کا ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ محمد علی جوہر جو ایک بڑے سیاسی لیڈر اور انگریزی کے بہترین صحافی تھے، ان کے انگریزی اخبار ''کامریڈ'' کے ادارہ اور ان کی تقریریں انگریزی حکومت کو ہلا دیتی تھیں، اس خالص سیاسی پس منظر اور مصروفیت رکھنے والے مولانا محمد علی جوہر میں بھی، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے اپنائیت کا پہلو ڈھونڈ لیا تھا۔ حضرت مولانا نے محمد علی جوہر کو ایک خط لکھا، وہ خط چھپ چکا ہے (دیکھئے کیسے صلاحیتوں کو کھینچا جاتا ہے) لکھتے ہیں کہ :

''مدتوں سے آپ برطانیہ کے مقابلے میں لگے ہوئے ہیں اور ایک زمانے سے اس فقیر کے دل کی ایک تمنا ہے۔ وہ اب آپ کو لکھتا ہے کہ اگر آپ اپنی صلاحیتیں ان یوروپ والوں کو اِسلام کی دعوت دینے میں لگا دیں تو دو میں سے ایک نتیجہ نکلے گا، یا تو یوروپ والے اِسلام قبول کر لیں گے اور دنیا میں بہار آجائے گی اور اگر وہ دعوت دیئے جانے کے باوجود اِسلام قبول نہ کریں تو جو اللہ کا قہر، دعوت کے کام کو اپنا کام نہ بنانے کی وجہ

سے ہماری طرف متوجہ ہے وہ قہران کی طرف متوجہ ہوجائے گا۔(۱)

کسی فقہی مسلک یا سلسلۂ تصوّف کی دعوت نہیں!

پورے کام کا بنیادی ڈھانچہ اوراس میں دعوت دیئے جانے والے اعمال اس قسم کے رکھے گئے ہیں کہ اس میں کسی خاص فقہی مکتبۂ فکر یا متعین سلسلۂ تصوّف کی بو بھی محسوس نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ علم کے نمبر کے تحت سارے عالم میں یہ بھی بات چلائی جاتی ہے کہ مسائل اپنے اہلِ حق علماء سے معلوم کرلیں، چاہے وہ کسی بھی فقہی مسلک سے وابستہ ہوں اور جب حلقۂ تعلیم میں قرآن سیکھنے کیلئے جوڑیاں بنتی ہیں تو عمومی طور پر (خصوصاً جبکہ عرب کے مختلف مسالک سے منسوب افراد ہوں) تشہداور دُعائے قنوت وغیرہ یا فرائض وطریقۂ نماز کا مذاکرہ نہیں کیا جاتا کیونکہ اس میں فقہاءِ امت کی آراء مختلف ہیں، الحمدللہ اس کی وجہ سے اُمتِ مسلمہ میں سے فرقہ واری عصبیت ختم ہورہی ہے اورایک ہی جماعت میں حنفی، شافعی، سلفی اور نجدی مختلف المشرب لوگ پوری اجتماعیت کے ساتھ منہجِ واحد پر کام کررہے ہیں۔

اسی طرح ذکر والے نمبر کے ذیل میں یہ کہا جاتا ہے کہ جولوگ کسی پیرومرشد سے بیعت ہیں وہ اُن کا بتایا ہوا معمول پورا کریں ورنہ صبح وشام سومرتبہ تیسرا کلمہ، دُرودِ شریف اوراستغفار کی تسبیح پوری کریں، نہ کسی خاص سلسلۂ تصوّف کی تشہیر کی جاتی ہے نہ کسی مشخص پیر کی طرف دعوتِ بیعت دی جاتی ہے اور جس زمانہ میں عموماً حضرت جیؒ وغیرہ سے ایک جمِّ غفیر بیعت لیا کرتا تھا وہ خود ذاتی اصرار سے لیا کرتا تھا، مگر جب ایک طبقہ نے اکابرِ دعوت کے یہاں مرادحقیقتِ بیعت کو مسخ کر کے عرب علماء کرام میں غلط فہمیوں کا بازار گرم کردیا تو بطورِ احتیاط کے اس کو بھی اجتماعاً ترک کردیا گیا۔

تبلیغ کے اس عمومی نہج پر کام کی ضرورت

ہندوستان اور دیگر ممالک کے اس بے دینی، لاعلمی وجہالت اور دین کے فساد وبگاڑ اوراعمال واخلاق کے خرابی کے اس دور میں تبلیغ کی اسی ایمان اور کلمۃ والی محنت ہی لوگوں کے اصلاحِ حال اوران میں عمومی دینی رجحان کے بیدار کرنے میں زیادہ موثر ہوسکتی ہے۔اس بارے میں مولانا مودودی مرحوم یوں لکھتے ہیں :

(۱) ارشادات ومکتوبات حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ : ص ۱۱

''اس وقت ہندوستان کے مسلمان عام طور پر جس حالت میں مبتلا ہیں وہ اس کی متقاضی ہے کہ ان کو اَز سرِ نو اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور پھر انہیں اس طرح مسلمان بنایا جائے جس طرح نبی کریم ﷺ نے اہلِ عرب کو بنایا تھا، ان کا اخلاقی تنزل، ان کی دینی سردمہری، ان کی احکام اسلام سے غفلت، ان کی قوتوں کا انتشار، ان کے خیالات کی پراگندگی، ان کا مختلف راستوں پر بھٹکنا، رہبر اور رہزن میں امتیاز کئے بغیر ہر پکارنے والے کی آواز پر دوڑ چلنا یہ سب نتائج ہیں اس ایک چیز کے کہ یہ لا الہ الا اللہ کے مرکز سے ہٹ گئے ہیں... ہماری بنیادی غلطی، جس کی وجہ سے ہماری مفید تحریکیں ناکام ہو رہی ہیں، یہی ہے کہ لفظ ''مسلمان'' جو اِن کیلئے بولا جاتا ہے، اس سے ہم دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کو واقعی و حقیقی مسلمان سمجھ کر ان سے توقع رکھتے ہیں کہ یہ مسلمان کی طرح کام کریں گے۔ حالانکہ درحقیقت یہ احکام کے مخاطب نہیں ہیں، بلکہ کلمۂ طیبہ کے مخاطب ہیں، جب ان کے دلوں میں کلمہ لا الہ الا اللہ نہیں اترا ہے پھر ان سے احکام کی وہ اطاعت اور مسلمانہ روش کیوں کر ظاہر ہوسکتی ہے؟... مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی کامیابی کا اولین سبب یہی ہے کہ انہوں نے کلمہ طیبہ کی تبلیغ سے کام کی ابتداء کی، پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے وہ ہر اس حکم کی تعمیل کرتے چلے گئے جو اِن کو خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے سنایا گیا... اب جو لوگ دین کا احیاء چاہتے ہیں، ان کیلئے اس کے سوا کوئی راہ عمل نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان فرض کر کے آگے کی منزلوں پر پیش قدمی کرنے کا طریقہ چھوڑ دیں اور ان میں از سرِ نو پہلے قدم سے دین کی تبلیغ شروع کریں۔(۱)

پھر آگے لکھتے ہیں :

''علیٰ ھذا یہ مناسب نہیں کہ نمائشی کام کے ان طریقوں کی پیروی کی جائے جو آج عمل کی کثرت سے رائج ہو رہے ہیں اور عموماً جنہوں نے دماغوں کو مسحور کر رکھا ہے، لوگ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جھنڈے، نعرے، وردیاں کپڑے سڑکوں پر مارچ کرنا اور مصنوعی جنگیں کرنا جن کا مجموعی نام عسکری تنظیم رکھا گیا ہے کامیابی کیلئے ضروری ہیں، کیوں کہ یہی چیزیں عوام کو کھینچتی ہیں اور انہی کے لاگ سے ہزاروں لاکھوں

(۱) تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات-از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ : ۲٦-۲۷

آدمی جمع ہوتے ہیں، اسی طرح لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی تحریک کو چلائے اس کیلئے ایک اخبار بھی ضروری ہے جس کے ذریعے وہ باہر کی دنیا کو ہمیشہ اپنے کارناموں کی رپورٹیں پہنچاتا رہے۔ آج کل بعض تحریکوں نے ایسا جادو لوگوں کے دماغوں پر کر دیا ہے کہ بعض مخلص آدمی بھی جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ان کا ذہن خواہ مخواہ اس طرز کی کاروائیوں کی طرف جاتا ہے، اس کیلئے تو صحیح طریقہ وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام اختیار کرتے ہیں، یعنی یہ کہ ایک شخص خالص خدا کی خوشنودی کیلئے پتا مار کر ایک جگہ بیٹھے، خاموشی کے ساتھ دعوت واصلاح کا کام کرے، رفتہ رفتہ لوگوں کے دل اور ان کی زندگیاں بدلے اور برسوں کی لگاتار محنت سے مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تیار کرے جو تعداد کے اعتبار سے چاہے مٹھی بھر ہو، مگر ایمان اور عمل صالح کی دولت سے بہرہ ور ہو‘‘۔(۱)

غیر مسلموں کو اسلام میں لانے کیلئے پہلے اپنی اصلاح کی ضرورت

اس وقت عموماً یہ رجحان فروغ پایا گیا ہے کہ تبلیغ ودعوت کی یہ جد وجہد بجائے مسلمانوں کے غیر مسلموں میں کی جائے تو زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوگی، اسلام کا حلقۂ اثر بڑھے گا، لوگ خدا کی نافرمانی وناراضگی اور جہنم کے راستے سے بچ کر اللہ کی رضا اور جنت کا راستہ اختیار کر کے ہمیشہ کی کامیابی سے سرفراز ہوں گے... حالانکہ اس طرح کا نظریہ قرون اولیٰ کی دعوت وتبلیغ کی جدوجہد سے بالکل میل نہیں کھاتا، اولاً ہم مسلمان خود اعمال واخلاق اور اسلام کے وہ مجسم اور تصویر بن جائیں کہ ہمارے طرز وادا اخلاق ومعاملات کو دیکھ کر غیر خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آئیں؛ چنانچہ یہ کام غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کیلئے اور مشرف باسلام ہونے کے بعد تربیت کیلئے سب سے بڑا معاون ہے۔

اسلام کی اشاعت وحفاظت دونوں کا اصل وکارگر طریقہ اپنے اسلام کو ہر اعتبار سے مضبوط ومحفوظ اور مکمل بنانا ہے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں :

’’دین کی حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے، ایک بیرونی حملوں کو روکنا، دوسرے خود اندرونی استحکام، یعنی خود اپنی دینی حالت کو مکمل کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اگر کوئی بادشاہ

(۱) تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات-از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ : ۳۱-۳۲

ساری فوج برخاست کردے، لڑائی کے سارے ساز وسامان کو برباد کردے، سارا خزانہ لٹادے، اب اگر کوئی غنیم حملہ کردے اور بادشاہ لڑائی کیلئے آمادہ بھی ہوجائے تو کیا ظفریاب ہوسکتا ہے؟ بس وہی حالت ہوگئی۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

حضرات! مکرر کہتا ہوں کہ اندرونی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے۔ خود اپنے اندر اسلام کو راسخ کرنا، شریعت کا اتباع کرنا، یہی اندرونی حفاظت ہے۔ کامل مسلمان بن جاؤ۔ احکامِ شریعت کی پورے طور سے پابندی کرو، خواہ مخواہ لڑو مت۔

صاحبو! ہر شئے کا ایک اثر ہوتا ہے، اسلام کامل کا بھی ایک اثر ہے، واللہ جو کام خارجی قوت سے نہیں ہوتا وہ داخلی قوت سے ہوجاتا ہے، پہلے زمانہ میں ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر ان کے اعمال، ان کی معاشرت کو دیکھ کر اسلام میں لوگ داخل ہوتے تھے، زور زبردستی سے نہیں، مگر اب ہمارے اعمال خراب، اخلاق خراب، معاشرت گندی، معاملات خراب، اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو کیا دیکھ کر ہو؟''(۱)

اسی کو مولانا مودودی مرحوم یوں فرماتے ہیں :

''عوام میں کام کرنے والوں کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اسلام کا پیغام ان لوگوں تک محدود نہیں جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ سارے انسانوں کیلئے عام ہے، لہٰذا انہیں مسلم غیر مسلم سب کے پاس اس پیغام کو لے کر پہنچنا ہے، لیکن غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانے کیلئے یہ باتیں ضروری ہیں :

اولاً ان موانع اور رکاوٹوں کو دور کریں جن کی وجہ سے غیر مسلم اسلام کے خلاف ہوگئے ہیں، مسلمان عام طور پر یہ ذہنیت پیدا کرلیں کہ ان کی تنظیم واصلاح کا مقصد غیر مسلموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو مسابقت کیلئے تیار کرنا نہیں ہے، بلکہ خود مسلمان بننا اور دوسروں تک اسلام کی نعمت پہنچانا ہے۔ ہر مسلمان میں انصاف پسندی، فیاضی، ہمدردی، ملاطفت کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں۔

عام مسلمانوں کو اپنے معاملات اور اپنے طرز زندگی کے اعتبار سے اتنا بلند ہونا چاہئے کہ محض ان کو دیکھ کر ہی ہر شخص ان سے متاثر ہوجائے، جس کی فطرت میں نیکی سچائی،

---

(۱) تجدیدِ تعلیم وتبلیغ : ۱۱۷، از مولانا عبدالباری ندویؒ

راست بازی، انصاف، حسن اخلاق، صفائی ستھرائی اور پاکیزہ زندگی کی قدر پہچاننے کی کچھ بھی استعداد موجود ہو، اگر عام مسلمین میں یہ اوصاف پیدا ہوجائیں اور غیر مسلم باشندے اپنے گرد وپیش کی مسلمان آبادی کو اخلاقی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں برتر پانے لگیں تو یقین مانئے کہ کسی کو ان سے یہ کہنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے گی کہ تم مسلمان ہوجاؤ۔

عام مسلمانوں میں ہندوانہ اثرات کے تحت اونچ نیچ اور چھوت چھات کے جو خیالات پیدا ہوگئے ہیں، ان کی بیخ کنی کرنا چاہئے''۔(۱-۲-۳)

تبلیغی کام کوئی مضمون یا کتاب نہیں، ایک عمل اور زندگی ہے

لوگ عموماً تبلیغی کام کو تحریروں، کتابوں یا لوگوں کی زبانی سن کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ تبلیغ کا یہ کام محض عمل اور زندگی ہے، بغیر عملاً شرکت کے اس کے حقیقی مفہوم اور اس کی اہمیت وافادیت اور اثر انگیزی کو سمجھنا مشکل ہے، چنانچہ مولانا منظور نعمانیؒ تبلیغ کے اس پہلو کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتنی مدت کے بعد مولانا الیاس صاحبؒ کی طرف سے یہ اطلاع آئی کہ فلاں تاریخ کو میں جماعت کے ساتھ لکھنو جانے والا ہوں، آپ بریلی سے لکھنو پہنچ جائیں، میں وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا، حضرت مولانا دہلی سے تشریف لائے، پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ آپ بس میرے ساتھ رہیں اور جب تک ایک ہفتہ پورا نہ ہوجائے، کام کے

(۱) تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات-از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ: ۲۶-۲۷

(۲) اس تحریر کے ذریعہ جو لوگ غیر مسلموں میں کام کررہے ہیں اُن کی تحقیر یا تنقیص مقصود نہیں بلکہ اپنے موقف کو مدلل کرنا مقصود ہے جو ہر کسی کام کرنے والے کو اپنے کام کے تئیں ہونا چاہئے۔

(۳) ہم نے مولانا مودودی مرحوم کے جو اقتباسات مختلف عناوین کے تحت ذکر کئے ہیں، یہ دراصل مولانا کے اس مضمون سے مستفاد ہیں جو انہوں نے ''ترجمان القرآن'' کے شعبان ۱۳۵۸ھ (اکتوبر ۱۹۳۹ء کے شمارہ میں ''ایک اہم دینی تحریک'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ مولانا کی یہ تحریر اپنے اُس میوات کے دورہ، اس کی روداد، وہاں مولانا الیاس صاحبؒ کی تبلیغی تحریک کے مفید اور نتیجہ خیز اثرات، میوقوم میں اس تحریک کے احیاء سے پہلے کے حالات اور ان کے اُجڈ اور گنوار پن اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، اعمال کا شوق، اخلاقِ حسنہ سے ان کا اتصاف، ان تمام اُمور کا احاطہ کیا ہے، اس وقت یہ مولانا کی تحریر مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کی ''تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات'' نامی کتاب میں شامل ہے۔

بارے میں آپ مجھ سے کوئی سوال اور کوئی بات نہ کریں، جو کچھ بات کرنی ہو ہفتہ پورا ہونے کے بعد کریں۔ میں نے اپنے آپ کو اس کا پابند کرلیا۔ پانچ چھ دن گذرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ امت میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کا یہ نہایت صحیح طریقہ ہے یہ یقین دن رات کی رفاقت اور مشاہدہ سے ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اگر حضرت والا مجھے گفتگو فرما کر مطمئن کرنا چاہتے تھے، تو غالباً میں مطمئن نہ ہوتا۔''

قرآنِ مجید سے بھی اس حکمت عملی کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلۂ بیان میں فرمایا گیا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی (جس کا نام زُلیخا مشہور ہے اور جس کے گھر میں حضرت یوسف علیہ السلام ایک زرخرید غلام کی حیثیت سے رہتے تھے) ان پر فریفتہ ہوگئی تو مصر کی عورتوں میں اس کا چرچا پھیل گیا اور اس کی سہیلیوں نے اس کی اس حرکت کو بہت ہی ذلیل حرکت سمجھا، تو قرآن مجید میں بیان فرمایا گیا کہ جب زُلیخا کو ان سہیلیوں کی لعنت وملامت کی باتیں پہنچیں تو اس نے یہ تدبیر کی کہ ان سب کی دعوت کی اور ان کے سامنے کھانے کی ایسی چیزیں رکھی گئیں جن کو چھری سے کاٹ کاٹ کر کھانا تھا، اس لئے ہر ایک کو چھری بھی دے دی گئی اور ٹھیک اسی وقت زُلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا، وہ بیچارے غلام کی حیثیت میں تھے فوراً حاضر ہو گئے، جب مہمان عورتوں کی ان پر نظر پڑی تو ان کے ہوش غائب ہو گئے، قرآن شریف میں ہے کہ انہوں نے اس بے ہوشی اور وارفتگی کے عالم میں چھریوں سے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ (قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ) پھر زُلیخا نے اُن سے کہا: ''ذٰلِكُنَّ الَّذِىْ لُمْتُنَّنِىْ فِيْهِ'' (یوسف: ۳۲) ''یہی ہے وہ جس کی محبت میں گرفتاری پر تم مجھے ملامت کرتی تھیں اب یہ خود تمہارا کیا حال ہوا؟''۔ تو زلیخا نے ان عورتوں کی لعنت وملامت کا جواب دینے اور ان کو مطمئن کرنے کیلئے ان سے لمبی چوڑی بات نہیں کی، کوئی مقالہ پڑھ کر نہیں سنایا، بس حضرتِ یوسف علیہ السلام کو ایک نظر دکھلا دیا، تو حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے اسی حکمت عملی کے مطابق عمل کیا۔'' (۱)

(۱) تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات - از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ: ۴۶-۴۸

عوام میں دین کے بنیادی امور کا شعور بیدار کرنے والی تحریک

دراصل دعوت وتبلیغ کی اس تحریک کے ذریعہ یہ چاہا جارہا ہے کہ عوام میں دین کے بنیادی اُموراور اُمہاتِ عقائد سے جو غفلت اور ضعف بڑھتا جارہا ہے اس کی اصلاح اور درستگی اور دین کا صحیح فہم وادراک پیدا کیا جائے، خواص اور اہلِ دین اور اہلِ طلب میں گرچہ دین کی کچھ تڑپ اور فکرِ مدارس اور خانقاہی نظام اور اہل اللہ سے وابستگی اور تعلق کی وجہ سے کچھ برقرار بھی تھا لیکن عوام کا بڑا طبقہ جو مسلمانوں کا اکثری طبقہ ہے، اس کی اصلاح ودرستگی اوراس کے عقائد واعمال کی دُرستگی اور دین کی ان میں سچی تڑپ اور کڑھن پیدا کرنے کیلئے اس تحریک کا آغاز ہوا اوراسی وقت سے یہ تحریک اپنے اس مقصد کی تکمیل میں تندہی کے ساتھ اپنے وسیع وعریض دائرہ عمل میں سرگرداں ہے۔

چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ عوام میں دینی بیداری اوران کو مقصدِ زندگی سے وابستہ کرنے میں اس تحریک کے موثر کردار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اُمہات عقائد میں ضعف پیدا ہوگیا تھا اور بڑھتا جارہا تھا اور خود مولانا (الیاسؒ) کے گہرے الفاظ میں ''اُمّہاتِ عقائد'' میں اُمہات ہونے کی شان نہیں رہی تھی، ان میں بناتِ عقائد (ضمنی وفروعی عقائد) کی تربیت وپرورش کی طاقت نہیں رہی تھی، خدائی اور محمد ﷺ کی رسالت کا یقین کمزور ہوتا چلا جارہا تھا' آخرت کی اہمیت کم ہوتی جارہی تھی۔ خدا کی بات کا وقار اور رسول اللہ ﷺ کے کلام کا وزن اور دین وشریعت کا احترام کم ہورہا تھا۔ اجروثواب کا شوق (ایمان واحتساب) دل سے اُٹھتا جارہا تھا......

پھر آگے فرماتے ہیں :

آپ (الیاسؒ) نے یہ اچھی طرح محسوس کرلیا کہ ایسی حالت میں کہ مسلمانوں میں ایمان ویقین رُوبہ تنزل ہیں، دین کی قدروعظمت دِلوں سے اُٹھتی جارہی ہے، عام مسلمان دین کی ابتدائی اور بنیادی چیز سے محروم ہوتے جارہے ہیں لہٰذا ان تکمیلی شعبوں کا قیام جو دین کے جڑ پکڑ جانے کے بعد کی چیزیں ہیں، ذراقبل از وقت کی باتیں ہیں، ایسی حالت میں نئے دینی اداروں کا قیام تو الگ رہا، پرانے اداروں اور دینی مرکزوں کی زندگی بھی ایسی حالت میں خطرہ سے باہر نہیں......مولانا کو اس کا پوری شدت سے احساس ہوا کہ اس وقت سب سے مقدم طلب کی تبلیغ اور مسلمانوں

میں اپنے مسلمان ہونے کا احساس پیدا کرنا ہے اور یہ دین سیکھے بغیر نہیں آتا اور دنیاوی چیزوں سے زیادہ اس کیلئے سیکھنے کی ضرورت ہے، یہ احساس اور طلب اگر پیدا ہوگئی تو باقی مراحل ومنازل از خود طئے ہوجائیں گے، اس وقت کے مسلمانوں کا عمومی مرض بے حسی اور بے طلبی ہے، لوگوں نے غلط فہمی سے سمجھ لیا ہے کہ ایمان موجود ہے، اس لئے ایمان کے بعد کی چیزوں کا درجہ ہے ان میں مشغول ہوگئے، حالانکہ سرے سے ایمان پیدا کرنے ہی کی ضرورت باقی ہے' قرونِ اولیٰ کے مقابلے میں تعلیم وتبلیغ اور ارشاد واصلاح میں ایک عظیم تغیر یہ ہوا کہ ان کا دائرہ طالبین کیلئے محدود ہوکر رہ گیا، اہلِ طلب کیلئے تعلیم واصلاح اور ہدایت وارشاد کا پورا انتظام اور اہتمام تھا، لیکن جن کو اپنے مرض کا احساس ہی سرے سے نہیں اور جو طلب سے خالی ہیں ان کی طرف سے توجہ بالکل ہٹ گئی، حالانکہ ان میں طلب کی تبلیغ کی ضرورت تھی''۔

اس احساس وطلبِ دیں اور اسلام کے اُصولوں ومبادی کی تلقین کے ذرائع

کلمہ طیبہ

اِسلام کا کلمہ طیبہ ہی اللہ کی رسی کا وہ سرا ہے جو ہر مسلمان کے ہاتھ میں ہے، اسی سرے کو پکڑ کر آپ اسے پورے دین کی طرف کھینچ سکتے ہیں، وہ کش مکش نہیں کرسکتا، مسلمان جب تک اس کلمہ کا اقرار کرتا ہے اس کو دین کی طرف لے جانے کا موقع ہے۔

اب مسلمانوں کی اس وسیع وعریض اور منتشر آبادی میں دین کا احساس وطلب پیدا کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ ان سے اس کلمہ ہی کے ذریعہ تقرب پیدا کیا جائے اور اسی کے ذریعہ خطاب کیا جائے کلمہ یاد نہ ہوتو یاد کرایا جائے، غلط ہوتو اس کی تصحیح کی جائے، کلمہ کے معنی ومفہوم بتائے جائیں اور سمجھایا جائے کہ خدا کی بندگی وغلامی اور رسول ﷺ کی تابعداری کا اقرار ان سے کیا مطالبہ کرتا ہے؟

نماز

اِس طرح ان کو اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کی پابندی پر لایا جائے جن میں سے سب سے عمومی سب سے مقدم نماز ہے، جس میں اللہ نے یہ قابلیت رکھی ہے کہ وہ سارے دین کی استعداد وقوت پیدا کردیتی ہے، جس بندگی کا کلمہ میں اقرار تھا اس کا یہ پہلا اور سب سے کھلا ثبوت ہے۔

علم وذکر

پھراس شخص کی مزید ترقی اوراستحکام کیلئے اس کواللہ سے تعلق پیدا کرنے اوراس تعلق کو بڑھانے کی طرف متوجہ کیا جائے اوراللہ کوزیادہ سے زیادہ یادکرنے کی ترغیب دی جائے......نیز یہ بات اس کے ذہن نشین کی جائے کہ مسلمانوں کی طرح زندگی گذارنے کیلئے اللہ کی مرضی ومنشا اوراس کے احکام وفرائض معلوم کرنے کی ضرورت ہے، دنیا کا کوئی ہنراورکوئی فن بے سیکھے اور کچھ وقت صرف کئے بغیرنہیں آتا، دین بے طلب کےنہیں آتا اوراس کوآیا ہواسمجھناغلطی ہےاوراس کیلئے اپنے مشاغل سے وقت نکالنا ضروری ہے۔

اکرامِ مسلم

اِس چلنے پھرنے میں اخلاق کودرست رکھے،خصوصًا مسلمان کے ساتھ برتاؤاورسلوک میں بہتررویہ اختیار کرےاس زمانے کا یہ رواج ہوگیاہے کہ آدمی اپنی ذات کومجموعۂ محاسن اوردوسرے کو مجموعۂ معائب سمجھتاہے،اس تحریک نے اس نظریہ کوبدل دیا کہ اپنے عیوب اورکوتاہیوں پرنظررکھے اوردوسروں کے محاسن وہنرپر،اس کے ان محاسن سے منتفع ہونے کی کوشش کرے،اس کے عیوب اگرکچھ نظرآئیں توان کی پردہ پوشی کرےاوراس کے محاسن کوان عیوب پرغالب اورفتح مند کرنے کی کوشش کرے،اس طرح سے آپس کی رقابتیں اوردشمنی ختم ہوجائیں گی اورتبلیغ اوردینی جدوجہد کی راہیں کھلیں گی۔

تصحیحِ نیت

یعنی ہرعمل کے بارے میں جووعدے ووعید اللہ نے فرمائے ہیں ان کے موافق اس امر کی تعمیل کے ذریعہ اللہ کی رضااورموت کے بعدوالی زندگی کی درستی کی کوشش کرنا۔(۱)

دعوت وتبلیغ

اُمت کی اصلاح کایہ کام اتنابڑااوراتنا پھیلا ہواہے کہ اس کیلئے چندافراداورچند جماعتیں کافی نہیں،اس کیلئے عام مسلمانوں کی مسلمانوں میں کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔اس لئے بقول

---

(۱) تلخیص مولانا الیاسؒ اوراُن کی دینی دعوت : ۲۷۷-۲۹۱

مولانا الیاسؒ اگر کروڑوں کے واسطے لاکھوں نہیں اٹھیں گے تو کس طرح کام ہوگا، نہ جاننے والے جتنے کروڑ ہیں، جاننے والے اتنے لاکھ نہیں......مولانا کے نزدیک اس کیلئے عالم اسلام میں ایک عمومی اوردائمی حرکت وجنبش کی ضرورت ہےاور یہ حرکت وجنبش مسلمانوں کی زندگی میں اصل اور مستقل ہے، سکون ووقوف اور دنیا کا اشتغال عارضی ہے......مسلمانوں نے جب سے اس جماعتی زندگی اور اصلی کام کو چھوڑ دیا یا ثانوی درجہ دے دیا اس وقت سے ان کا انحطاط شروع ہوگیا، اسی روحانی اور اندرونی ضعف کا عنوان خلافتِ راشدہ کا خاتمہ ہے......اور یہ تبلیغ دو طرح کی ہوگی ایک مادّی تبلیغ: یعنی اعضاء وجوارح سے تعلق رکھنے والی سو وہ تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی باتوں کو پھیلانے کیلئے ملک بہ ملک اور اقلیم در اقلیم جماعتیں بنا کر پھرنے کی سنت کو زندہ کر کے فروغ دینا اور پائیدار کرنا ہے، روحانی سے مراد جذبات کی تبلیغ یعنی حق تعالیٰ کے حکم پر جان دینے کا رواج ڈالنا۔

معروفات کی ترویج، منکرات کے ازالہ کا مؤثر ذریعہ

جب ماحول اور فضاء کو ہموار اور درست کرلیا جاتا ہے، خیر کو رواج دینے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اسی بھلائی کے فروغ مسلسل جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں ماحول اس قدر درست اور صحت افزاء ہوجاتا ہے کہ وہاں برائیوں اور منکرات کے جراثیم کو پنپنے کے مواقع ہی نہیں رہتے، بجائے منکرات اور برائیوں کے ایک ایک کر کے دور کرنے کی کوشش کے معروفات (بھلائیوں) کو اس قدر رواج دیا جائے کہ لوگ بس اسی کے خوگر اور عادی ہوں اور کسی بھی منکر کے ارتکاب کیلئے ماحول اس قدر اجنبی اور ناآشنا ہوجائے کہ اس برائی کے ارتکاب کی جرأت اور ہمت ہی نہ ہوسکے۔

اس کو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ یوں فرماتے ہیں:

> ”مگر اس ماحول سے مختلف اللہ تعالیٰ نے مولانا کی بصیرت پر یہ نکتہ منکشف فرمایا کہ منکرات کے مٹانے کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک ایک منکر مٹانے کے درپے ہوا جائے، ایک منکر مٹانے کیلئے بعض اوقات عمریں گذر جاتی ہیں اور وہ پھر بھی نہیں مٹتا اگر وہ مٹ بھی جاتا ہے تو وہ صرف ایک مقامی اصلاح ہوتی ہے اور بعض اوقات ایک دوسرا منکر پیدا ہوجاتا ہے، دنیا میں اس وقت صدہا منکرات ہیں، عمریں ختم ہوجائیں تو بھی وہ سب نہیں مٹ سکتے۔

مولانا کے نزدیک صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان منکرات سے بحالتِ موجوہ براہِ راست

تعرض نہ کیا جائے، بلکہ ایمانی شعور اور دینی احساس کو بیدار کیا جائے اور معروفات (بھلائیوں) کی تکثیر و ترویج کی جائے۔

مولانا (الیاسؒ) مقامی و جزئی اصلاح کے قائل نہ تھے، وہ فرماتے تھے کہ دور سے فضا بدلتے ہوئے اور معروفات پھیلاتے ہوئے آؤ یہ منکرات آپ اپنی جگہ پر بغیر کسی جھگڑے کے مضمحل ہو جائیں گے، معروفات کو جتنا فروغ ہوگا منکرات کو زوال ہوگا۔ ایک سلیم الفطرت میواتی نے جو مولانا کے خاص تربیت یافتہ ہیں مجھ سے کہا کہ ایک دن میں چھڑکاؤ کر رہا تھا، سب طرف چھڑکاؤ کیا اور جہاں کھڑا تھا وہ جگہ خشک رہ گئی' سب طرف سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں تو وہ جگہ خود بخود ٹھنڈی ہوگئی، اس وقت یہ نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ اگر میں نے اس جگہ چھڑکاؤ کیا ہوتا اور اس کے گرد و پیش خشک رہتا تو وہ جگہ بھی ٹھنڈی نہ ہوتی۔

مولانا کے یہاں اصل دین کی کوشش اور دین کے متفق علیہ اجزاء کی اشاعت و ترویج کو اس زمانہ کے تمام فتنوں اور امراض کا علاج، سنتوں کے فروغ اور ہر دینی خیر و برکت کے پھیلنے کا سبب سمجھتے تھے، آپ کے نزدیک صحیح ترتیب یہ تھی کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کو ایمان اور دین کے سایہ کے نیچے لانے کی کوشش کی جائے۔''(۱)

دعوت کو مثبت اور ایجابی انداز میں پیش کرنے میں جس قدر وہ مؤثر ہوا کرتی ہے مخاطب اس کو جس قدر جلدی قبول کرتا ہے، منفی اور سلبی طرز اختیار کرنے سے اس میں اس قدر اثر انگیزی نہیں ہوتی، بلکہ اس پہلو میں خطرات اور خدشات کا بھی اندیشہ ہے، اس لئے منکر پر نکیر کرنے سے بہتر یہ ہے کہ معروف کو رواج دینے کی کوشش کی جائے۔

ایک مرتبہ حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ تک یہ بات پہنچائی گئی کہ دعوت و تبلیغ میں اس کا مثبت پہلو یعنی ''اَمر بالمعروف'' تو بہت ہے، لیکن اس کا دوسرا رخ یعنی ''نہی عن المنکر'' نہیں، جبکہ نص قرانی میں دونوں کا حکم ایک جگہ ہے، تو آپؒ نے اس موقع سے فرمایا :

''ہم لوگ نہی عن المنکر ایک دم نہیں کرتے! بلکہ آدمی کو پہلے اپنے سے قریب اور مانوس کرتے ہیں اور جب ہمارے ساتھ اس کو تعلق ہو جاتا ہے تو پھر اس کو برائی سے روکنے

(۱) مولانا الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت : ۳۰۴-۳۰۷

کی ترغیب دیتے ہیں،جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ متاثر ہو کر اس کو قبول کرتا ہے''۔

اور ایک موقع سے آپ سے اِسی قسم کا سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''مقصود کیا ہے؟ اظہارِ منکر؟ یا اِزالہ منکر؟ تو سوال کرنے والے نے کہا کہ مقصود تو ازالہ منکر ہی ہے تو فرمایا کہ اب تم دیکھو کہ وہ حضرات جو جماعت میں ہیں۔ پہلے کے بہ نسبت ان میں منکرات کا اضافہ ہوا ہے یا ازالہ؟''

اور ایک موقع سے اِسی قسم کی ایک تحریر آپ کے پاس آئی تو آپ نے جواب میں لکھا :

''ہم اس کام کے ذریعہ سے امت میں اچھائیاں لانے کی کوشش کررہے ہیں،خرابیاں دور کرنے کی کوشش نہیں کررہے ہیں اس لئے کہ روشنی لانے کیلئے تو محنت کی ضرورت ہے،لیکن اندھیرا بھگانے کیلئے کسی محنت کی ضرورت نہیں،جیسے جیسے روشنی آئے گی، اندھیرا خود ختم ہوجائے گا اس لئے قرآن پاک میں ہے" إن الحسنات یذھبن السیئات "(الھود:١١٤) بھلائیوں کے فروغ سے برائیاں مٹ جاتی ہیں۔''(١)

پوری اُمتِ مسلمہ محنت کا میدان ہے

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے کسی ایک علاقے،شہر،ضلع یا صوبہ یا ملک کو خاص طور پر اپنی محنت کا میدان نہیں بنایا کیونکہ اگر ایک ہی مقام پر اپنی کوشش اور توجہ کو مرکوز رکھا جائے اور دوسرے مقام کی طرف قطعاً توجہ نہ جائے تو مثبت اثرات کے ظاہر ہونے پر خوش فہمی یا قناعت پیدا ہوجاتی ہے اور منفی ردِعمل پر سخت ہمت شکنی اور شکستہ دلی پیدا ہوجاتی ہے اور دونوں صورتوں میں دوسرے مقامات قطعاً محروم رہ جاتے ہیں،مقامات کا تعدد وتنوع اور نئے خون کے ملنے کی وجہ سے ہمت افزائی اور کام میں تازگی رہتی ہے اس طرح ہر زمین اپنی مخفی استعداد اور صلاحیتوں کو حسبِ توفیق اُجاگر کرتی ہے، یہی بات مولانا الیاس صاحبؒ نے ابوالحسن علی ندویؒ کو اپنے ایک مکتوب میں لکھی ہے :

''تبلیغ کیلئے کسی خاص جگہ کو مخصوص کرلینا اور باقی مواضع کو اس کے بعد پر رکھنا ایک سنگین بنیادی غلطی ہے،خطرناک اور زہریلا خیال ہے، یہ ہرگز ہرگز اس کو دل میں جگہ نہ دے اور اس خیال کو دل میں نہ آنے دے۔''(٢)

---

(١) دعوت کی بصیرت اور اُس کا فہم و اِدراک : ١٨٢-١٨٤

(٢) اِرشاد و مکتوبات بانیٔ تبلیغ : ٢٢٢، مرتب افتخار احمد فریدی

علم وذکر کی عمومی اور بنیادی محنت

اس عنوان کے تحت دراصل ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ تبلیغ کے طرز دعوت میں علم وذکر کو خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن علم وذکر کا وہ عام مفہوم نہیں جو عموماً لوگوں کے دماغوں میں بسا ہوا ہے کہ علم سے مراد کتابوں کے نقوش اور تحریریں اور ذکر سے مراد چند خاص قسم کے اوراد واذکار، بلکہ حضرت مولانا الیاسؒ نے یہاں پر علم وذکر کو خاص اس معنی کے ساتھ محدود نہیں رکھا ہے؛ بلکہ علم وذکر سے مراد تمام اعمال واشغال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں، اس کے دھیان اور استحضار کے ساتھ ان اعمال کو انجام دینا، یعنی پوری انسانی معاشرت ذکر میں تبدیل ہو جائے اور علم سے مراد بغیر کسی ساز وسامان کے اہلِ علم کی صحبت واختلاط اور رفاقت واجتماع میں تھوڑے سے محدود وقت میں اپنے ماحول سے نکل کر نیک ماحول کو اختیار کرتے ہوئے چلت پھرت کے ذریعہ نفسِ دین کو حاصل کیا جائے جیسا کہ دورِ رسالت کا اس حوالہ سے طریقۂ کار تھا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ علم وذکر کے اس عمومی طریقۂ کار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس تحریک کے اصول وارکان میں ذکر وعلم کا لفظ بار بار آیا ہے، مولانا (الیاسؒ) اس کی عام دعوت دیتے تھے، چونکہ اس وقت سارے ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں مدت سے علم وذکر کی دو خاص اصطلاحیں اور دو خاص طریقے رائج تھے، ذکر کیلئے مروجہ اوراد و وظائف اور علم کیلئے کتابوں اور مدارس کا ایک مخصوص نظام' ان دونوں طریق ونظام کے بغیر ذکر وعلم کا حصول مستبعد اور تقریباً خارق عادت سمجھا جانے لگا تھا' لیکن یہ امت کیلئے عمومی طریق نہیں تھا اور اس راستہ سے امت کے مشغول اور عام افراد اور اس کا سواد اعظم ذکر وعلم کے منافع سے محروم ہو رہا تھا، چونکہ مذکورہ بالا علم کو ذکر کے خصوصی طریق سے خواصِ اُمت اور عالی ہمت اور اہلِ طلبہ ہی استفادہ کر سکتے تھے۔

ذکر کے متعلق مولانا کا یہ فرمانا تھا کہ غفلت تو حرام ہے؛ لیکن ذکر، ذکر لسانی وذکر لفظی میں محدود نہیں زندگی کے مختلف احوال واعمال واشغال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں دھیان کرتے ہوئے ان کے مطابق ان اعمال واشغال کو انجام دینا ذکر ہے، اس طرح پوری معاشرت اور پوری زندگی ذکر میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

ذکر لسانی ولفظی کو بھی مولانا کے نزدیک دین کی جدوجہد اور حرکت وسعی کے ساتھ ملانے کی خاص ضرورت ہے۔ یہی صحابۂ کرام کی زندگی کی ساخت تھی کہ وہ دین کی دعوت وجہاد اور دین کے فروغ کیلئے سعی وعمل کے ساتھ ذکر کو ضم کرتے تھے اور یہی طریق اب بھی ہونا چاہئے۔

علم کے متعلق بھی مولانا کی تحقیق یہ تھی کہ دین کے تعلیم وتعلّم کو کتابوں کے نقوش اور مدارس کے حدود میں محدود کردینا قرونِ متاخرہ کا طریقہ اور امت کے بڑے طبقہ کو اس دولت سے محروم کردینے کے مترادف ہے، اس طرح امت کا بہت مختصر طبقہ دین کے علم سے منتفع ہوگا، وہ اکثر محض نظری اور ذہنی طور پر۔ دین کے تعلیم وتعلّم کا فطری اور عمومی طریقہ جس سے لاکھوں افراد بلا کسی ساز وسامان کے تھوڑے وقت میں علم دین نہیں نفس دیں حاصل کرسکتے ہیں، وہ اختلاط واجتماع صحبت، سعی وعمل میں رفاقت اور اپنے ماحول سے نکلنا ہے، جس طرح زبان وتہذیب اہل زبان اور مہذب وشائستہ لوگوں کی صحبت واختلاط سے حاصل کی جاتی ہے اور یہی ان کے سیکھنے کا فطری طریقہ ہے، اسی طرح دین کا صحیح علم اہلِ دین کی صحبت واختلاط رفاقت واجتماع سے حاصل ہوسکتا ہے، یہی اس کے حصول کا فطری طریقہ ہے کہ اس کے بہت سے اجزاء ایسے ہیں جو قلم کی گرفت سے باہر ہیں، دین ایک جاندار اور متحرک شئے ہے، کتابوں کے نقوش جامد ہیں، جامد سے متحرک کا حاصل ہونا قانونِ فطرت کے خلاف ہے، دین کا کچھ حصہ جوارح سے تعلق رکھتا ہے، کچھ حصہ ذہن سے، وہ بیشک کتابوں کے صفحات سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کے نزدیک مسلمانوں کے ہر طبقہ کو دین سیکھنے اور اپنی زندگی میں حقیقی دین داری پیدا کرنے کیلئے نیز دینداروں اور علم دین رکھنے والوں کو اپنی سطح سے ترقی کرنے کیلئے اپنے مشاغل سے کچھ وقت نکالنے اور اپنے کو اس وقت کیلئے فارغ کرنے کی ضرورت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی چار چیزوں سے عبارت تھی: تعلیم، ذکر، تبلیغ وخدمت دین، کسب معاش، اب پہلے کی تین چیزوں کی جگہ چوتھی چیز (معاش اور دنیا کی کمائی) نے لے لی ہے اور زندگی کی پوری وسعت کو اس طرح اس نے گھیر لی ہے کہ

کسی چیز کیلئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہی،......اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ دین اور اہلِ علم اور کم از کم اہلِ طلب اور علماء کی رفاقت ہو، جو سب اس مقصد کیلئے جمع ہوتے ہوں، سابق ماحول کے اثرات وخیالات سے حتی الامکان دور اور آزاد ہوں اور اتنا وقت گذرے کہ بہت سے وہ منازل ومراحل آجائیں جو انسانی زندگی کیلئے ضروری ہیں اور اس کے متعلق احکام وآداب بروقت اور برموقع معلوم ہوں۔اس دوران اپنے سر کی آنکھوں سے پورے اجزائے دین کا مطالعہ ہو، صرف عبادات وفرائض ہی کے احکام وآداب نہیں، بلکہ معاشرت، تہذیب واخلاق، معاملہ وگفتگو، سلوک وحسن ِخدمت اور رفاقت وصحبت کا شرعی طریق اور اس کے آداب وضوابط اور سونے، کھانے، اٹھنے، بیٹھنے کے آداب ومسائل سیکھے جائیں اور ان کو برتا جائے اور اس کے ساتھ دین کے جذبات اور امنگیں اور دین کی روح بھی پیدا کی جائے...اس دوران فضائل ومسائل کا بھی مذاکرہ ہو، فضائل دینی زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہیں، مسائل ان کے ضوابط اور احکام ہیں اور دونوں ضروری ہیں؛ لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو روح اور جسم میں۔

اِسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ان حالات وواقعات کا بھی مذاکرہ رہے، جن سے دین کے جذبات اور ولولے پیدا ہوں اور ان کی اقتداء کا شوق ہو"۔(۱)

دعوت وتبلیغ میں علم کے اسی عمومی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے حضرت جی انعام الحسن صاحبؒ فرماتے ہیں :

"تعلیم دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو خصوصی تعلیم جو کہ مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے، جن لوگوں میں دین کے علم کو حاصل کرنے کی طلب ہوتی ہے وہی ان مدرسوں میں آتے ہیں، دوسرے وہ تعلیم جو عمومی ہے وہ یہ دعوت وتبلیغ ہے، تاکہ ان کے اندر طلب پیدا ہو۔ یہ عمومی تعلیم اس خصوصی تعلیم سے زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ جب عمومی تعلیم کی فضا بنے گی تو اس کا اثر خصوصی تعلیم پر پڑے گا اور عمومی تعلیم سے خصوصی تعلیم زندہ ہوگی، اس لئے مدرسہ والوں کو تعلیم کے ساتھ دعوت کے کام کو بھی اس اہمیت کے

(۱) تلخیص مولانا الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت: ۳۰۸-۳۱۶

ساتھ کرنا چاہئے، تاکہ عمومی وخصوصی دونوں تعلیم زندہ ہوں‘‘۔

ایک موقع سے فرمایا:

’’علم اور عمل ایک ہی ہے، شئے کا وجودِ ذہنی علم ہے اور اس کا وجودِ خارجی عمل ہے، جب تک ذہن میں موجود ہے تو اس کو علم کہیں گے اور جب بدن میں آجائے اور جسم سے ظاہر ہونے لگے تو عمل ہے، عمل میں آنے پر ذہنی چیز کو تقویت ملتی ہے‘‘۔

ایک مرتبہ فرمایا:

’’دعوت کا مقصد یہ ہے کہ ہر شعبہ والے اپنے کام کے ساتھ دین کی محنت میں لگیں، ان سے شعبے ہرگز ہرگز چھڑانے نہیں ہیں، بلکہ انہی شعبوں میں رہتے ہوئے دینی اور دعوتی کام کرنا ہے‘‘۔

ایک جگہ یوں فرمایا:

’’علماء کا عوام کے ساتھ اگر رابطہ قائم رہا تو یہ امت چلنے والی ہوگی اور علماء اس کو چلانے والے ہوں گے اور اگر چلنے والے نہ ہوں تو علم کا یہ چراغ جل کر ختم ہوجائے گا اور اس کی روشنی سے کسی کو فائدہ نہ ہوگا‘‘۔(۱)

اِس محنت کا مقصود ماحول کا بگاڑ دور کرنا ہے

یہ حقیقت ہے کہ انسان ماحول کا اثر قبول کرتا ہے، جس ماحول میں وہ اٹھتا بیٹھتا ہے اگر وہ دیندارانہ اور شریف ہو تو وہ خود بھی شریف اور دیندار ہوتا ہے، اگر اس کے اردگرد اور آس پاس کا ماحول فساد اور بگاڑ، بے راہ روی اور بدچلنی کا ہو تو وہ خود بھی بگڑتا ہے، اس دعوت وتبلیغ کے ذریعہ یہ چاہا جارہا ہے کہ ماحول کے بگاڑ اور فساد کو دور کیا جائے، بایں طور کہ ایمان واعمال والا ماحول پیدا کیا جائے، چنانچہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ ماحول کو بنانے کی اس محنت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’جیسا ماحول ہوتا ہے، ویسا آدمی بن جاتا ہے، اگر ماحول دین کا ہوتا ہے تو آدمی کے اندر دین آتا ہے، ماحول اگر دنیا کا ہوتا ہے تو دنیا آتی ہے، ہمیں اصل محنت ماحول کے بنانے کی کرنی ہے، تاکہ ہم دین پر چلنے والے اور دین کی کوشش کرنے والے بن

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم وادراک: ۱۱۹-۱۲۹

جائیں، یہ گشتوں کا کرنا، تعلیم کرنا، تسبیحات پڑھنا اور نمازوں کا اہتمام کے ساتھ پڑھنا یہ چار کام ہیں ان چار کاموں کو اہتمام سے کروگے تو اس سے ماحول بنتا جائے گا، جس جگہ نماز کا ماحول ہو وہاں پر بے نمازی کو اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، وہ بھی نماز پڑھنے لگتا ہے، اگر تسبیح پڑھنے کا ماحول ہے تو تسبیح پڑھنے لگتا ہے، اس لئے ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارا ماحول دینی ماحول بنے ''۔

ایک موقع سے یوں فرماتے ہیں :

''ہدایت کسی کے قبضہ میں نہیں ہے، وہ صرف خدائے پاک کے قبضے میں ہے اور خدائے پاک اس وقت ہدایت دیتے ہیں جب ہدایت کا سبب اختیار کیا جائے، ہر چیز کیلئے اللہ جل شانہ نے سبب بنایا ہے، جب سبب کو اختیار کیا جاتا ہے تو وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ پیسہ حاصل کرنے کیلئے دوکان کو، غلہ حاصل کرنے کیلئے کھیتی کو اور اولاد حاصل کرنے کیلئے نکاح کو سبب بنا رکھا ہے اور ان اسباب کے ذریعے سے ان چیزوں کو خدائے پاک وجود مرحمت فرماتے ہیں، ایسے ہی ہدایت ہے، ہدایت کا سبب اللہ تعالیٰ نے دین کی کوشش کو بنایا ہے جتنی دین کی کوشش کریں گے، اُتنا ہی اللہ جل شانہ ہدایت کے فیصلے فرمائیں گے۔ ہمیں خدا سے ہدایت اتروانے کیلئے دن کو کوشش کرنا ہے اور راتوں کو دعائیں کرنا ہے''۔(۱)

ذات اور شخصیت کے بجائے اصول اور کام پر زور

اکابرِ تبلیغ (خصوصاً مولانا الیاس صاحبؒ، مولانا یوسف صاحبؒ اور مولانا انعام الحسن صاحبؒ) ہمیشہ سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کام کی ترقی اور عروج ذات اور شخصیت پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اخلاص واستخلاص اور اصولوں پر جمنے میں اور یہ کہ کام سے تعلق رکھنے والوں کے اعمال واخلاق جس قدر بلند ہوں گے اسی قدر اس دعوتی کام کا معیار بلند ہوگا۔

چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ، مولانا الیاس صاحبؒ کی کسرِ نفسی اور دعوت کے ساتھ ان کی شخصیت کو نہ جوڑنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''مولانا کی سیرت وسوانح کے سلسلہ میں ہم عرصے تک متأمل رہے، مولانا ہمیشہ اس کی

---

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم وادراک : ۳۶-۳۸

تاکید فرماتے رہے کہ ان کی دعوت کو ان کی شخصیت کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے، وہ کسی طرح اس کے روادار نہ تھے کہ ان کی شخصیت کی طرف دعوت دی جائے، آخر میں اس کو بھی ناپسند فرماتے تھے کہ دعوت کے تعارف کے سلسلہ میں ان کا نام لیا جائے یہ احتیاط، تواضع، بے نفسی اور اخلاص کے علاوہ اہم دینی مصالح پر مبنی تھی"۔(۱)

حضرت مولانا یوسف صاحبؒ اپنی ذات کے بے وقعت و بے عظمت ہونے اور کام کے اہم اور عظیم ہونے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"تم میں سے بہت سے میری زیارت اور مصافحہ کی نیت سے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں، اس کام کی عظمت کو سمجھو، جس کی وجہ سے خدا نے تمہارے دلوں میں میری محبت اور عقیدت ڈالی ہے، اس کام میں اپنا وقت، جان اور مال لگاؤ اور اس کام سے جڑو، میری ذات تو فانی ہے"۔(۲)

حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ ایک مرتبہ بنگلہ دیش کے اجتماع میں شریک نہ ہو سکے، اپنی عدم شرکت کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بندہ نے تمام احباب سے بہت ہی زیادہ رائے لی، آپ کے یہاں کیلئے، مگر کسی کی بھی رائے نہ ہوئی، بندہ گو جسمانی حاضری نہ دے سکا؛ لیکن بندہ کی دعا اور دل کی پکار آپ کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے، بندہ آئے تب بھی اور نہ آئے تب بھی، بلکہ اپنی عدم حاضری بعض وجوہ سے حاضری سے زیادہ مفید ہے، حاضری میں مخلوق پر نظر آسکتی ہے، غیر حاضری میں صرف خالق پر نظر جمنے کا قوی امکان ہے، حاضری میں بوجھ اوروں پر ہوتا ہے، غیر حاضری میں سارا بوجھ آپ سب پر ہوگا، جو تمام فتوحاتِ غیبی کیلئے کنجی کا کام دے گا۔ آدمی کی نگاہ جب ذات پر ہوتی ہے تو کام نہ ہونے پر رجوعِ الی اللہ بڑھتا ہے، کام کے نہج کے صحیح ہونے کا فکر بڑھتا ہے اور کام ہونے پر اپنے اندر خدا کا شکر پیدا ہوتا ہے"۔(۳)

---

(۱) مقدمہ از مولانا منظور صاحب نعمانیؒ : مولانا الیاس صاحبؒ اور اُن کی دینی دعوت : ۳۳

(۲) ملفوظات حضرت مولانا یوسف صاحبؒ، جلد اول : ۳۶-۳۸

(۳) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم و ادراک : ۴۱-۴۲

اِجتماعات اصل نہیں کام اصل ہے

اکابر تبلیغ شروع ہی سے اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ دعوت وتبلیغ کی بنیاد اجتماعات پر نہیں ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اصولوں کی پختگی کے ساتھ اجتماعی نقل وحرکت مسلسل ومتواتر ہو، چنانچہ حضرت مولانا یوسف صاحبؒ اس پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اس کام میں اجتماعات نہ بنیاد ہیں نہ مقصود، بلکہ اپنے نہج پر نہ ہونے کی بناء پر مضر ہیں، اس لئے ماہانہ اجتماعات بالکل نہ کئے جائیں، ہر جگہ مقامی اِجتماعات ہفتہ واری اپنی نوعیت کے ساتھ یعنی پوری شب بیداری ہو، اور اوقات کا مطالبہ کرتے ہوئے کئے جائیں''۔(۱)

حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ بھی مختلف انداز سے ان اجتماعات کی ترغیب نہ دے کر مسجد وار محنت کو بڑھانے اور ہر جگہ سے جماعتیں نکالنے پر زور دیتے تھے۔

حافظ یوسف صاحب فرماتے ہیں :

''حضرت جی انعام الحسن صاحبؒ بھی یہ نہیں فرماتے تھے کہ اجتماعات یا جوڑ کرو، لیکن جب اس کیلئے کوئی جماعت تاریخ لینے آتی تو فرماتے تھے کہ ایسی محنت کرو کہ علاقہ والے سو فیصد نمازی بن جائیں، تعلیم کرنے والے اور تسبیحات ادا کرنے والے بن جائیں''۔

ایک موقع سے فرمایا :

''اجتماع میں ہمارا نقصان ہے، ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہر آدمی دعوت پر محنت کرے، اجتماع طے ہونے پر اجتماع والوں کا کام تو یہ رہ گیا کہ جماعتیں بھیجی جائیں اور جماعتوں کا کام اجتماع سے نکلنا رہ گیا، اس سے قوتِ دعوت نکل جاتی ہے اور اجتماع کے بغیر کوشش کرنے سے ہر ایک میں دعوت کی قوت آجاتی ہے اور کام میں عمومیت آتی ہے''۔

ایک مرتبہ یوں فرمایا :

''کام کا آج استقبال ہے، لیکن ساتھ میں بہت سے خطرات بھی ہیں، کام جتنا نام ونمود سے محفوظ رہے گا اتنا ہی اچھا ہے، اجتماع میں اسمیت اور ہنگامہ ہوتا ہے۔ نتائج ظاہر

(۱) ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حصہ اول : ۴۳

ہونے کا انکار نہیں ہے، پہلے منفعت والا پہلو غالب تھا، اب مضرت والے پہلو کے غالب ہونے کا شبہ ہے لہٰذا اجتماعات سے بچتے ہوئے کام ہو تو اچھا ہے۔ "استعینوا علی حوائجکم بالکتمان" آج بلا ارادہ اجتماعات کی کثرت بڑھ گئی ہے، تجزیہ کیا جائے تو اس میں مضرت زیادہ ہے، جی چاہتا ہے کہ کام ہو اجتماع نہ ہو، یہ اسلم راستہ ہے۔ جماعتیں پھرنے سے تو ماحول بنتا ہے، لیکن اجتماعات سے ہنگامیت آتی ہے اور اجتماعات کی وجہ سے جماعتوں کی کارکردگی میں ضعف آتا ہے"۔(۱)

ناموافق جگہوں میں کام کا طریقہ

موافق اور مساعد ماحول میں کام کرنا اتنی بڑی ہنرمندی نہیں ہے جتنا کہ ناموافق اور مخالفانہ ماحول میں اپنے اصول اور نہج کی حفاظت کرتے ہوئے کام کرنا ہنرمندی ہے، کام کرنے والے کی استعداد اور صلاحیت کا بہترین اندازہ بھی ایسے ہی موقع پر ہوتا ہے، اس لئے حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ اپنی مجالس میں بار ہا بار یوں فرمایا کرتے تھے کہ :

"ماحول کی ناموافقت اور مخالفت سے گھبرانا نہیں چاہئے، اس لئے کہ کرنے والی ذات صرف اللہ جل شانہ کی ہے اور وہ جب کرنے پر آتے ہیں تو اصنام (بتوں) سے بھی توحید ظاہر کراتے ہیں اور باطل کے نقشوں سے حق کی آواز اُٹھنے لگتی ہے"۔

چونکہ مرکز نظام الدین سے اطرافِ عالم میں جانے والی جماعتوں کو ہر جگہ یکساں ماحول نہیں ملتا کہیں مخالفت ہوتی ہے، کہیں مسجد میں قیام کی ممانعت ہوتی ہے اس لئے ایسے ماحول میں اگر کام کرنا پڑ جائے تو حضرت مولانا کی اوّلین نصیحت اور تاکید یہ ہے کہ حتی الامکان نرمی کی جائے، اگر مخاطب اپنے سخت رویہ پر جما رہے تو پھر خاموشی اختیار کر لی جائے۔

دعوت وتبلیغ کی تمام محنت اور ترتیب مسجد سے چلتی ہے، اب اگر کسی مسجد کا کوئی ذمہ دار متولی وغیرہ بیان کرنے سے منع کر دے تو ایسے موقع پر کیا کیا جائے؟ تو اس مشکل کا حل اس طرح بیان فرماتے ہیں :

"اگر کسی مسجد میں متولی بیان کرنے سے منع کریں یا اس کا خطرہ ہو تو بھی ان کو حکمت سے دعوت دی جائے، بجائے بیان کی اجازت لینے کے دین کی دعوت دیں، اگر وہ

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم وادراک : ۱۷۲-۱۷۸

اسے قبول کرلے تو ایسے میں اجازت خود بخود ہوگئی اور اگر وہ بالکل روک دے تو پھر ضد نہ کریں، بلکہ دوسری مسجد میں کام کریں''۔

ریل میں اذان بآواز بلند دینے یا نہ دینے کے متعلق جب حضرت مولانا سے دریافت کیا گیا تو موقع محل کی رعایت کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ :

''ریل میں اذان زور سے دینے کے بارے میں کوئی کلیہ نہیں، بعض مرتبہ زور سے اذان دینے سے دینی فضا بنتی ہے تو وہاں زور سے دیں اور بعض مرتبہ صبح کے وقت لوگ اگر نیند میں ہوں تو اس موقع پر زور سے اذان دینے سے اغیار کی نیند میں خلل پڑ کر وحشت کا سبب بن سکتا ہے، تو اس موقع پر آہستہ اذاں دیں غرض موقع ومحل کو دیکھ کر زور یا آہستہ دے''۔(۱)

فضائلِ اعمال ہی کیوں؟

مولانا الیاس صاحبؒ نے قرآن وحدیث، قوت نسبت اور فہم وفراست سے اس دینی محنت کا ایک خاص تعلیمی رُخ طے کیا۔ اسی تعلیمی رخ کا ایک بنیادی حصہ یہ ہے کہ ہماری اجتماعی نصابی تعلیم فروعی اور فقہی مسالک اور مکاتبِ فکر میں سے کسی ایک کی دعوت یا جانب دار نہ ہو، تا کہ اُمت کے تمام طبقات شریعت کے متفق علیہ ابواب کی طرف دعوت پر مجتمع ہو جائیں۔

چونکہ اُمت کا ستّر، اسّی فیصد طبقہ آج اساسی روحِ ایمان، جذبۂ قربانی، دین کے مٹنے کا غم، قرآن سے تعلق، نماز، روزہ، حج وزکوۃ کی اہمیت وفرضیت اور حقیقت سے خالی ہے، مزید برآں دنیا کی حرص ومحبت، بخل وطمع کا دوردورہ ہے (جو ساری بے دینی کی جڑ ہے)۔ اس لئے مولانا الیاس صاحبؒ نے اپنے وقت کے سب سے بڑے محدث، شیخ طریقت، استاذ الاساتذہ کے قلم سے ان عناوین پر آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ شریفہ، ان کی تشریحات اور اکابرِ اُمت کے واقعات وملفوظات کو (جو صحیح سند سے ثابت ہوں اور شوق وذوق کو ابھارنے والے ہوں) جمع کروایا۔ اس بات کا دعویٰ کبھی نہیں کیا گیا کہ اس میں ساری شریعت آگئی۔ لہٰذا ہم اور کارکنان دعوت دوسری تفسیر وحدیث اور فقہ کی کتابوں سے مستغنی ہیں بلکہ اُمت کا یہ مزاج بنایا جارہا ہے کہ دینی طلب پیدا ہو جانے کے بعد عبادات، معاملات اور معاشرت کے دقائق اور مسائل مطالعۂ کتب، تفسیری علوم کا حاصل کرنا

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم وادراک : ۵۵

اور خود عالم بننا ہوتو اپنے اہلِ حق علماء سے رجوع ہو جائیں، نتیجتاً مغربی ممالک میں اور دینی طور پر پسماندہ افریقی ممالک میں اور رشیا جیسے ممالک میں مدارس اور کتب خانے آباد ہو رہے ہیں اور عالمی سطح پر بھی یہ نظام طے کرنا ضروری تھا کہ غیر عربی داں طبقہ تو اپنی اپنی زبان میں ترجمہ شدہ فضائل اعمال پڑھے اور عربی داں طبقہ ریاض الصالحین، حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم پڑھیں کیونکہ کتب فضائل کے مکمل اجزاء عربی میں نقل بھی نہیں ہوئے ہیں اور عالمِ عرب کی علمی اور ذہنی فضاء کے اعتبار سے یہی کتابیں مناسب سمجھی گئیں، ورنہ ہر آنے والے کا اپنے فقہی، تصوفی، کلامی اور سیاسی مسلک کی کتاب لے کر آنے سے بہت سے اختلافات پیدا ہو جاتے جیسے مدارس میں داخل ہونے والے طالبِ علم کو ابتدائی تین چار سال تو ترجمۂ قرآن بھی نہیں پڑھایا جاتا بلکہ اُردو، نحو، صرف، بلاغت کے فنون کے ذریعہ اس کے اندر فہمِ قرآن کی استعداد پیدا کی جاتی ہے، لہٰذا اہلِ مدارس سے سالِ اوّل میں درسِ تفسیر کا مطالبہ کرنا، اس کی استعداد سے ناواقفیت اور نظامِ تعلیم وتربیت کے اُصول سے جہالت کی علامت ہے، اسی طرح جو محنت اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد میں جذبۂ ایمانی کو جگانے، طلبِ دین کی آگ بھڑکانے اور فکرِ آخرت سے تڑپانے کیلئے وجود میں آتی ہے اس سے اس قسم کا مطالبہ بھی درست نہیں ہے۔ تکمیلی مراحل کی تعلیم کیلئے مدارس اور علمائے کرام کے حلقہائے درسِ تفسیر وحدیث میں جن کا منعقد ہونا اور پھیلنا دعوت وتبلیغ کی محنت کا طبعی نتیجہ اور حتمی ارتقائی مرحلہ ہے، چنانچہ پورے عالم میں جہاں کہیں دعوت کی یہ محنت فروغ پارہی ہے وہاں سے زندہ دل، روشن ضمیر، باحمیت، سلیم الطبع، صحیح الفہم، شریعت کے رمز شناس علماء کو بھیجنے کے شدید مطالبے آرہے ہیں۔

بخاری، مسلم وغیرہ کیوں نہیں؟

بلاشبہ حدیث کی چھ کتابیں اور بالخصوص بخاری ومسلم صحیح احادیث کے نقل کرنے میں ایک اِمتیازی مقام رکھتے ہیں۔

لیکن جو شخص ان کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالے گا تو اسے اندازہ ہوگا کہ یہ تمام کتابیں فقہی (مسائل) کی ترتیب پر ہیں اور بالعموم ان کتابوں کے آخری حصہ میں آداب، مناقب، سیرت، تفسیر جیسے عناوین کے تحت فضائل مذکور ہیں۔

نیز اِن کتابوں کے طرزِ تصنیف وترتیب اور اندازِ تبویب سے اندازہ ہوتا ہے اور ان کے سوانح نگار نے بھی لکھا ہے کہ یہ سب یا تو مجتہد مطلق یعنی خاص فقہی مسئلہ کے بانی تھے یا چار فقہی

مسالک حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی میں سے کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ تھے، چنانچہ دیگر ائمہ کی طرح امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاریؒ کے مقلّد ومجتہد ہونے اور نیز شافعی ہونے کے بارے میں کافی اختلاف ہے۔ بعض نے ان کو مجتہد مطلق اور بعض نے منتسب اور بعض ان کو شافعی کہتے ہیں۔ علامہ سبکی اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ امام بخاریؒ کو طبقاتِ شافعیہ میں شمار کرتے ہیں۔(۱)

حضرتِ امام مسلم ابوالحسین مسلم بن الحجاج (المتوفی ۲۶۱ھ) بھی شافعی المسلک تھے چنانچہ نواب صدیق حسن صاحب بھوپالیؒ نے ''اتحاف النبلاء''ص ۵۷ میں اس کی تصریح کی ہے۔

''حضرتِ امام احمد بن شعیب نسائیؒ (المتوفی ۳۰۳ھ) اور حضرتِ ابوداؤد سلیمان بن اشعثؒ (المتوفی ۲۷۵ھ) کو حافظ ابن تیمیہؒ حنبلی کہتے ہیں، (بحوالہ فیض الباری ج ۱، ص ۵۸ طبع مصر) اور نواب صاحب ان دونوں کو شافعی المذہب کہتے ہیں (ابجد العلوم ص ۸۱۰)۔ امام ترمذیؒ ابوعیسیٰ محمد بن سورۃؒ (المتوفی ۲۷۹ھ) شافعی تھے۔ فیض الباری ج ۱، ص ۵۸ میں اس کی تصریح ہے اور بقول حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ حضرت امام عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ (المتوفی ۲۷۳ھ) کے بارے میں ظن غالب یہی ہے کہ وہ شافعی تھے اور سنن ابن ماجہ کی فقہی رنگ میں خاص تبویب اور احادیث سے طرزِ استدلال کافی حد تک اس بات کو واضح کرتا ہے۔''(۲)

ان میں سے مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی تو وہ کتابیں ہیں جن میں فقہی مسائل کے اختلافات اور ہر فریق کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ جیسے نماز میں قرأت سے پہلے بسم اللہ زور سے پڑھنے اور آہستہ پڑھنے کی احادیث، رفعِ یدین، امام کے پیچھے قرأت کرنے نہ کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم ائمہ تابعینؒ کون ہیں اور ان کی اِستدلالی احادیث کیا ہیں؟ اس طرح کی تفصیل نقل کی گئی ہے۔

اہلِ علم طبقہ جانتا ہے کہ یہ کتابیں صرف ترجمہ کے ساتھ پڑھنا مفید نہیں ہے بلکہ ان کے عناوین، احادیث کے مختلف پہلو تشنہ بحث ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتابیں یونیورسٹیوں اور جامعات میں خصوصاً درس نظامی میں دورۂ حدیث یعنی عالمیت کے آخری سال میں پڑھائی جاتی ہیں۔

---

(۱) اِنصاف مع ترجمہ اردو کشاف، ص ۶۷

(۲) طائفہ منصورہ، از مولانا سرفراز صفدر خان صاحبؒ: ۱۱۱-۱۱۲

یہ ساری کتابیں صاحبِ کتاب کے طئے شدہ اُصول پر اُترنے والی احادیث مع اسناد نقل کی گئی ہیں لیکن دوسری بعد کے زمانے میں لکھی گئی کتابیں مذکورہ احادیث سے اور سیرت، تاریخ، سوانح، علماء کی تشریحات، شوق دلانے والے واقعات، متعلقہ عنوان کے اسرار ورموز سے خالی ہیں کیونکہ یہ چیزیں زمانے کی ضروریات اور تقاضے، مصنف ومرتب کے مقاصد میں سے تھیں بھی نہیں۔تقریباً یہی حال علامہ منذری کی ''الترغیب والترھیب'' اورعلامہ نوویؒ کی ''ریاض الصالحین'' جیسی فضائل کی کتابوں کا ہے۔ ان میں مزید ایک بات یہ بھی ہے کہ یا تو وہ بہت مبسوط ہیں یا بہت مختصر اور لکھنے والے کے ذہن میں احادیث کا جمع کرنا مقصد ہے، کسی خاص قسم کی فکر ومحنت پر کھڑا کرنا مطلوب نہیں۔

اس لئے حضرت شیخ الحدیثؒ نے ان رسائل وفضائل میں (جن میں اکثر مولانا الیاس صاحبؒ کے حکم سے لکھے گئے) مزاجِ دعوت بنانے والے اور اہم اعمالِ شریعت پر مشتمل مواد کو تفسیر، حدیث، سیرت، تاریخ، اسماء الرجال، مصالح شریعت، شرعی تصوف کی ۸۴ کتابوں سے جمع کیا ہے، جن میں تقریباً ہرفن کی اہم کتاب آگئی ہے۔
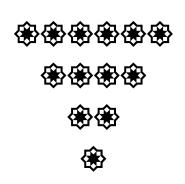
جہاد کا شرعی مفہوم اور اُس کی اقسام

ذیل کی تحریر میں ضمناً جہاں جہاد سے متعلق مخالفینِ اسلام کے جوابات دیئے گئے ہیں وہیں ناقدینِ دعوت کی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا گیا ہے کہ لفظِ ''جہاد'' صرف ''قتال''، یعنی مسلح لڑائی ہی کے ساتھ خاص ہے اور یہ کہ اہلِ دعوت جہاد بمعنی قتال کا انکار کرتے ہیں اور جہاد کی روایتوں میں معنوی تحریف کر کے اپنے کام پر چسپاں کرتے ہیں اور بسط وتفصیل کے ساتھ اکابرینِ اُمت کی تحریروں کی روشنی میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جہاد کی متعدد اقسام ہیں جس کا ایک فرد قتال یعنی مسلح لڑائی بھی ہے۔قرآن کریم میں اکثر لفظ جہاد راہِ خداوندی میں کی جانے والی ہر مخلصانہ جدوجہد کیلئے استعمال ہوا ہے۔لہٰذا اہلِ دعوت کا ان آیات کو اپنے کام کے فضائل کیلئے بیان کرنا درست ہے نیز قتال کی بتدریج مشروعیت کے مراحل کیا ہیں اور کونسی آیات کونسے مرحلے اور کونسے زمانے سے متعلق ہیں۔ بہت سے لوگ محض قتال سے متعلق آیتوں کے ترجمہ کو لے کر، اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ وہ کونسے حالات کیلئے نازل کی گئی ہیں لوگوں کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو جہاد فرض ہو چکا ہے،لیکن اہلِ دعوت اس جذبہ کو سرد کرنے کا کام کررہے ہیں۔

جہاد کا حقیقی اور شرعی مفہوم

بہت سے غیر مسلم، بلکہ مسلمانوں کو بھی یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ لوگ جہاد کو جنگ کے مرادف قرار دیتے ہیں، جو دراصل قتل وغارت گری' خون خرابہ اور فساد وبگاڑ کی باعث ہوتی ہے، اسلام جہاد کے معنی جنگ کے کیوں کر لے سکتا ہے؟ جبکہ اسلام تو سراپا امن وسلامتی کا مذہب ہے، بلکہ اسلام تو دنیا میں آیا ہی اس لئے ہے کہ جنگ بمعنی قتل وغارت گری اور فساد وبگاڑ کا خاتمہ ہو؛ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَاهَا اللّٰهُ (۱)

جب بھی ان لوگوں نے قتل وغارت گری اور جنگ وقتال کی آگ بھڑکانا چاہی تو اللہ نے اُسے بجھادیا۔

یہ ہے جنگ وقتال کی حقیقت اس کے بالمقابل جہاد تو سراپا رحمت اور نعمت ہوا کرتا ہے' اس سے مقصود انسانیت کو ظلم وستم جہالت وگمراہی کی تاریکی سے نکال کر علم وشرافت اور عدل وانصاف کی روشنی میں لانا ہوتا ہے۔

راغب اصفہانیؒ نے جہاد کی حقیقت یوں بیان کی ہے :

''جہاد اور مجاہدہ کہتے ہیں: دُشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت اور قوت کے صرف کرنے کو اور جہاد تین طرح کا ہوتا ہے: ظاہری دشمن سے مقابلہ کرنا، شیطان سے مقابلہ کرنا، نفس سے مقابلہ کرنا، اور جہاد کی یہ تینوں قسمیں باری عزوجل کے اس ارشاد میں داخل ہیں:'' وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ '' (الحج:۷۸) (ترجمہ: اللہ عزوجل کیلئے پورا پورا مجاہدہ کرو)۔(۲)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی جہاد کی ایسے ہی تعریف کی ہے :

''جہاد کہتے ہیں: کفار کے مقابلہ میں اپنی پوری طاقت اور وسعت کا صرف کرنا اور اس کا اطلاق نفس، شیطان اور فساق سے مقابلہ کیلئے بھی ہوتا ہے''۔(۳)

(۱) المائدة : ۶۴

(۲) مفردات القرآن لراغب الاصفهانی ،۱/۱۹۸،دار القلم ، دمشق

(۳) فتح الباری :۶/۳،دار المعرفة ، بیروت ، لبنان

اِن مختلف عبارات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد کا اطلاق محض قتال اور لڑائی پر نہیں ہوتا ہے ؛ بلکہ جہاد ہر اس محنت اور مجاھدے کو کہا جاتا ہے جس سے مقصود اسلام کی سربلندی اور سرفرازی ہو۔خواہ یہ جہاد بذریعہ تلوار اور ہتھیار کے ہو، یا اموال، اعمال اور قلم وتحریر کے ذریعے۔

لفظِ جہاد کا استعمال نفس سے مقابلہ کیلئے بھی ہوتا ہے اس پر یہ حدیث دال ہے :

"المجاهدمن جاهد نفسه فى طاعة اللّٰه" (۱)

''مجاہد وہ شخص ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے مقابلہ کرے''۔

ایسے ہی یہ آیت بھی اس بات پر دال ہے کہ جہاد کا اطلاق جہاد باللسان پر بھی ہوتا ہے ارشاد خداوندی ہے :

" يَا اَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ"(۲)

''اے نبی ﷺ! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان کے تعلق سے سخت رویہ اختیار کیجئے''

یہ آیت اپنے ظاہری مفہوم میں منافقین سے قتال کے وجوب کو ثابت کررہی ہے حالانکہ منافقین سے قتال جائز اور درست نہیں، چونکہ منافق اس کو کہتے ہیں جو بظاہر مسلمان ہو اور اندرون میں کافر ہو چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کی تفسیر یوں منقول ہے، اِس آیت میں آنحضرت ﷺ کو منافقین سے جو جہاد کا حکم دیا گیا ہے وہ جہاد باللسان ہے۔(۳)

لفظِ جہاد کے مفہوم میں وُسعت اور عموم ہے

ارشاد خداوندی ہے:" وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ"(۴) اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو۔

اس آیت میں جہاد کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔حضراتِ مفسرینؒ نے اس آیت کی تفسیر میں کئی اُصول نقل فرمائے ہیں اور تصریح کی ہے کہ اس مقام میں جہاد کا لفظ کفار کے ساتھ لڑائی کرنے کیلئے مختص نہیں ہے، بلکہ قتال کفار کے ساتھ لڑائی کے علاوہ دوسرے معانی کو بھی شامل

---

(۱) مسند احمد: حدیث بلال، حدیث:۲۳۹۵۸، محقق شعیب الارنوط نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

(۲) التوبة : ۷۳

(۳) تفسير ابن ابى حاتم :۱۸۴۲/۶، مكتبة نزار مصطفي الباز ، مكة المكرمة

(۴) الحج : ۷۸

ہے۔ چنانچہ مفتی بغداد شہاب الدین، ابوالفضل علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"والجهاد كماقال الراغب، استفراغ الوسع فی مدافعة العدو وهو ثلاثة اضرب ، مجاهدة العدّو الظاهر كالكفّار ومجاهدة الشيطن ومجاهدة النفس (هی اكبرمن مجاهدة العدوالظاهر كما يشعر بما اخرج البيهقی وغيره عن جابرٍ قال! قدم على رسول الله ﷺ قوم غزاةٍ ، فقال : قدمتم خيرمقدمٍ من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر، قيل ماالجهاد الاكبر؟ قال مجاهدة العبدهواه، وفی اسناده ضعف منقفذ فی مثله " (۱)

''اِمام راغبؒ کے کہنے کے مطابق دشمن سے دفاع میں اپنی طاقت وقوت کوخرچ کرنا جہاد ہے اوراس کی تین قسمیں ہیں: ظاہری دُشمن مثلاً کفار کے دفاع میں قوت خرچ کرنا اور شیطان کے ساتھ مقابلہ کرنا اوراس کے حملوں کا دفاع کرنا اور ظاہری دشمن سے جہاد کرنے سے یہ نفس کا جہاد جہادِ اکبر ہے،جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جسے امام بیہقی وغیرہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا کہ غازیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں آئی، آپ ﷺ نے ان کا خیرمقدم کیا اورفرمایا کہ تم جہادِ اصغر سے لوٹ کر جہادِ اکبر کی طرف آئے۔کہا گیا کہ جہادِ اکبر کیا ہے؟ کہا آدمی کا اپنی خواہش کے خلاف جہاد کرنا اوراس کے اسناد میں ضعف ہے، لیکن ایسے موقعوں پر وہ ضعف قابل معافی (قابلِ قبول) ہے یعنی قابل گرفت نہیں۔''

حضرت مولانا قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

" قلت ليس المراد بالجهاد فی هذه الاٰية المحاربة مع الكفار خاصة بل المرادمنه الاخلاص فی الاقوال والأعمال والأحوال كلها ويحصل ذلك بالجهاد مع النفس ومخالفة الهوی " (۲)

''میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں جہاد سے مراد خاص کر کفار کے ساتھ لڑائی کرنا نہیں،

(۱) روح المعانی : ۱۷/۱، مکتبہ احیاء التراث الإسلامی، بیروت (۲) تفسیر مظہری : ۳۵۳/۶

بلکہ اس سے مراد اقوال میں اعمال میں اور تمام احوال میں خلوص مراد ہے اور یہ جہاد مع النفس اور خواہش نفس کی مخالفت سے بھی حاصل ہوتا ہے۔''

مفتی شفیع صاحبؒ اس آیت کی تفسیر میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :

''مجاہدہ کسی مقصد کی تحصیل میں اپنی پوری طاقت خرچ کرنے اور اس کیلئے مشقت برداشت کرنے کے معنی میں آتا ہے' کفار کے ساتھ قتال میں مسلمان اپنے' قول وفعل اور ہر طرح کی امکانی طاقت خرچ کرتے ہیں؛ اس لئے اس کو بھی جہاد کہا جاتا ہے''(۱)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت پر حاشیہ میں لکھتے ہیں :

''لفظ مجاہدہ میں ہر قسم کی زبانی' قلمی' مالی' بدنی کوشش اور جہاد کی تمام قسموں کو (جہاد مع النفس' جہاد مع الشیطان جہاد مع الکفار' جہاد مع البغاۃ، جہاد مع المبطلین) شامل ہیں۔''(تفسیر عثمانی)

ارشادِ خداوندی ہے: وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (۲) اور قرآن سے ان کا زور وشور سے مقابلہ کیجئے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسر بیضاویؒ لکھتے ہیں :

" لأنّ مجاهدة السفهاء بالحجج اكبر من مجاهدة الأعداء بالسيف " (۳)

''یعنی دعوت وتبلیغ کا جہاد اس لئے جِهَادًا كَبِيرًا ہے کہ دلائل کے ذریعہ جہلاء کے ساتھ جہاد کرنا، دشمنوں کے ساتھ تلوار کے ذریعہ جہاد کرنے سے بڑا ہے''

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جِهَادًا كَبِيرًا کی تفسیر یوں فرماتے ہیں :

شديدًا بالقلب واللسان والسيف والسنان (۴)

حضرت تھانویؒ بیان القرآن میں لکھتے ہیں: ''یعنی عام اور تام تبلیغ کیجئے۔''

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

''معنی آیت کے یہ ہیں کہ تو ان کے ذریعہ مخالفینِ اسلام سے جہاد کر بڑا جہاد۔ قرآن

---

(۱) تفسیر معارف القرآن : ۲۸۸/۶-۲۹۰ (۲) الفرقان : ۵۲

(۳) بیضاوی مع حاشیۃ شیخ زادہ : ۳۰۳/۶، دار الکتب العلمیۃ، بیروت (۴) مظھری : ۴۶/۷

کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلق خدا کو ان کی طرف توجہ دے لانے کی ہر کوشش کرنا ہے خواہ زبان سے ہو یا دوسرے طریقوں سے"(۱)

وَالَّـذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲) اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھاویں گے۔

اس آیت میں لفظ جہاد اپنے وسیع اور عام معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ امام محی السنۃ المعروف بغوی آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

" وقيـل الـمـجـاهـدة هى الصبر على الطاعات' قال الحسن' افضل الجهاد مخالفة الهوىٰ' وقال الفضيل بن عياض' والذين جـاهـدوا' فى طلب العلم لنهدينّهم سبل العمل به' وقال سهل بـن عبـدالـلّـه: والذين جاهدو فى اقامة السنة لنهدينّهم سبيل الـجـنّة' وروى ابن عباس رضی اللہ عنہ والـذيـن جـاهـدو فـى طاعتنا لنهدينّهم سبل ثوابنا."(۳)

"اور کہا گیا کہ عبادات پر صبر کرنا مجاہدہ ہے، حسنؒ فرماتے ہیں، خواہش کی مخالفت کرنا، افضل جہاد ہے، فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں: جو لوگ علم حاصل کرنے میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان کو اس پر عمل کرنے کے راستے دکھاتے ہیں اور سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں جو لوگ اقامت سنت میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو جنت کی راہ دکھاتے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو لوگ ہماری اطاعت میں کوشش، محنت اور مجاہدہ کرتے ہیں، ہم اُن کو ثواب کے راستے دکھاتے ہیں۔"

مفتئ بغداد سید محمود آلوسی حنفیؒ آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"اطـلـقت المجاهدة لتعمّ مجاهدة الاعادى الظاهرة والباطنة بـانـواعـهـما " (۴) "یعنی مجاہدہ کے لفظ کو مطلق چھوڑا گیا تا کہ یہ ظاہری اور باطنی دُشمنوں کے ساتھ مجاہدہ کی تمام اقسام کو عام اور شامل ہو جائے۔"

---

(۱) معارف القرآن : ۲۸۵/۶ (۲) العنکبوت : ۶۹

(۳) تفسیر بغوی : ۲۵۶/۶، دارطیب، الریاض

(۴) تفسیر روح المعانی : ۱۴/۲۱، دار احیاء التراث الإسلامی

یہی بات (تفسیر بیضاوی، ص: ۵۳۴، تفسیر مدارک ص ۴۵۷ ج ۳، تفسیر مظہری ص ۲۱۶ ج ۷) میں لکھی ہے۔ اُردو کی تمام تفاسیر میں بھی ان تینوں آیات کو اس کے عمومی معنی پر محمول کیا گیا ہے۔

احادیث میں جہاد کا وسیع مفہوم

وعنه قال قال رسول الله ﷺ افضل الجهاد کلمة حقٍ عند سلطان جائرٍ (۱) اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے بہتر جہاد اس شخص کا ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا جہاد بلکہ اس سے افضل ہے۔

حضرتِ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر جہاد پر جانے کی اجازت چاہی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اُس نے کہا ہاں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تم اُنہیں کے درمیان رہ کر جہاد کرو۔(قال ففيهما فجاهدْ)۔(۲)

اِس سے معلوم ہوا کہ والدین کی اچھی طرح خدمت کرنا بھی جہاد ہے۔

حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله (۳) (حقیقی) مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت وعبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصلاحِ نفس کی کوشش اور محنت جہاد ہے جس کو صوفیاء کرامؒ مجاہدۂ نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرتِ انس رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) سنن النسائی، فضل من تکلم بالحق عند امام جائر ،حدیث : ۴۲۰۹،تحقیق ابو فتح ابو غدة، عبدالقوی منذری کہتے ہیں کہ: اسے نسائی نے صحیح سند سے ذکر کیا ہے: الترغیب : الترغیب فی الأمر بالمعروف والنهی عن المنكر ،حدیث:۳۴۸۱

(۲) بخاری، باب الطیب للجمعة،حدیث: ۳۰۰۴

(۳) مسند احمد، حدیث: ۲۳۹۵۸،مع تحقیق شعیب الأرنؤط

مشرکین، یعنی دشمنانِ اسلام سے اپنی جان اور مال اور زبان کے ذریعے جہاد کرو:"جاھدوا المشرکین بأموالکم وأنفسکم وألسنتکم"(۱)

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ جانی جہاد کے ساتھ مالی جہاد بھی ہوتا ہے اور لسانی بھی۔

اِن آیات واحادیث سے یہ پتہ چلا کہ جہاد' قرآن وحدیث میں اپنے وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے، حضورِ اکرم ﷺ نے قتال کفار کے ساتھ ساتھ لفظ جہاد کوئی اور معانی میں بھی استعمال فرمایا ہے اور یہ سب معانی اللہ اور اُس کے رسول کی مراد ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے مبارک عمل سے ان کو متعین فرمایا ہے۔ لہٰذا قتال کفار دعوت وتبلیغ، مقابلۂ نفس وشیطان، خواہشات نفس کا مقابلہ، دفاعِ منافقین، قرآن کے معقول دلائل سے باطل پرستوں کا مقابلہ، ظالم حکمرانوں کو حق کی بات کہنا، اطاعت والدین، زبان کے ذریعہ مال کے ذریعہ، تیر وتلوار کے ذریعے ہر قسم کے دشمنوں کا مقابلہ ودفاع وغیرہ یہ سب شرعی جہاد ہیں۔

اِن آیات واحادیث اور ائمہ سلف کے اقوال کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ جہاد کا حقیقی اور صحیح مفہوم یہ ہے کہ دنیا کو اخلاقی دینی اور معاشرتی بگاڑ اور فساد سے نکالنے کیلئے اپنی پوری طاقت اور قوت صرف کی جائے۔

اُمت کے اسی فریضے کو اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

" كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ " (۲)

"تم بہترین امت ہو، لوگوں کی نفع رسانی کے لئے نکالی گئی ہو، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

جہاد کی مختلف قسمیں

مذکورہ بالا توضیح کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام میں جہاد ایک نہایت ہی مقدس اور شریف عمل ہے' جو دراصل دعوت دین کیلئے اختیار کیا جاتا ہے' اس کی نوعیت ان دیگر لڑائیوں

(۱) ابوداؤد: باب کراھیة ترك الغزو، حدیث:۲۵۰۴، حاکم کہتے ہیں کہ: یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے، المستدرك: کتاب الجهاد، حدیث:۲۴۲۷، دار الکتب العلمیة

(۲) آل عمران: ۱۱۰

اور جنگوں کی نہیں ہوتی جو سرکش اور طاقت وغرور کے نشے میں چور ممالک اپنی عظمت وہیبت کا سکہ اقوام عالم پر بٹھانے، مظلوم اور کمزور ممالک کے وسائل اور ذرائع پر قابض ہونے کیلئے کیا کرتے ہیں۔اسلام میں جہاد کا اطلاق محض قتال پر نہیں ہوتا۔ بلکہ جہاد کی دیگر قسمیں بھی ہیں، دعوت کا جہاد، مال کا جہاد، نفس کا جہاد، تلوار کا جہاد، قلم کا جہاد۔ جہاد کی ان مختلف قسموں میں سے سب سے اہم ''جہاد بالدعوۃ'' اور ''جہاد بالسیف'' ہے۔

جہاد بالدعوۃ (دعوت کی راہ میں مجاہدے برداشت کرنا)

اسلام میں حقیقی جہاد دراصل یہی ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے محنت ومجاہدہ کیا جائے لوگوں میں اسلام کے پیغام حق وصداقت کو پہنچانے کیلئے کوشش اور سعی کی جائے، چونکہ حضور ﷺ کی بعثت ساری انسانیت کیلئے ہوئی ہے، آپ ﷺ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا بھی نہیں ہے، اب کون شخص اس دعوتِ حق کو پہنچانے اور اسلام کا پیام ہر سو عام وتام کرنے کے فریضہ کو انجام دے گا؟ اللہ عزوجل نے آنحضرت ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی امت کو یہ عظیم ذمہ داری سونپی ہے ارشادِ خداوندی ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱)

تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، انہیں اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

ارشادِ نبوی ہے: " بلغوا عني ولو اٰية " میری ایک بھی بات تمہیں معلوم ہو تو اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔

دعوت کی راہ میں نرمی اور رفق کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد خداوندی ہے :

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ"۔ (۲)

---

(۱) آل عمران : ۱۰۴

(۲) بخاری، باب ماذکر عن بنی اسرائیل، حدیث: ۳۲۷۴،مع تحقیق مصطفي ديب البغا

آپ اپنے رب کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

حضورِ اکرم ﷺ نے بھی جب اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو دعوت کے کام پر روانہ فرمایا تھا تو ان لوگوں کے ساتھ نرمی اور سہولت کا معاملہ کرنے کا حکم دیا تھا: " وانکم بعثتم میسرین ولم تبعثو معسرین" (۱) "تمہیں سہولت اور آسانی کا معاملہ کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، مشکل اور تنگی پیدا کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا"۔

ان آیات واحادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی کہ اسلام تو سراپا دین رحمت ورافت اور دعوت ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے مختصر سے عرصہ اور مدت میں نہ صرف دنیا کے تقریباً حصے پر بلکہ وہاں کے لوگوں کے قلوب پر بھی فتح پائی ہے۔

جہاد بالسیف (تلوار کا جہاد)

جہاد بالسیف یعنی تلوار دُشمنوں کے مقابلہ میں اُس وقت اختیار کی جائے گی جبکہ دعوت کے تعلق سے مذکورہ بالا طریقۂ کار' کارگر نہ ہوسکے۔

یعنی اسلام کی طرف دعوت دینے میں حکمت وموعظمت رفق ونرمی تمام ابتدائی طریقے استعمال کئے جاچکیں، دلائل وبراہین مناظرہ ومباحثہ ہر طریقے سے جب اسلام کی حقانیت ان کے سامنے آجائے پھر بھی وہ جہالت پر اڑے رہیں تو پھر تلوار کا استعمال کیا جائے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

" فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْ سَبِيْلَهُمْ"(۲)

"سو جب اشہر حرم گذر جاویں تو ان مشرکین کو جہاں چاہو مارو اور پکڑو باندھو اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو"۔

---

(۱) النحل :۴۰،بخاری : باب صب الماء علي البول فی المسجد ،حدیث:۲۱۷

(۲) التوبة : ۵۰

اس آیتِ کریمہ میں جہاد کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں کو بجبر و اِکراہ اسلام میں داخل کیا جائے، بلکہ جہاد کے نتیجہ میں لوگوں میں اسلام میں داخل ہونے کا راستہ آسان ہوجائے، کفروشرک اور ضلالت وجہالت کی شان وعظمت ان کے دلوں سے نکل جائے جوکہ دراصل اس دنیا میں فتنہ وفساد بگاڑ وخراب کا سبب بنا ہوا ہے' اگر جہاد کا مقصود جبراً اسلام قبول کرانا ہوتا تو پھر جزیہ کی ادائیگی کی مشروعیت کا حکم کیوں ہوتا اور ذمی اپنے مذہب پر عمل پیرا رہتے ہوئے امن وامان کے ساتھ اسلامی ممالک میں قیام پذیر کیوں ہوتے؟ بلکہ دراصل اسلام یہ چاہتا تھا کہ جہاد کے نتیجے میں جب وہ ممالک فتح ہوجائیں تو وہاں کے باشندگانِ اسلام کی حقانیت وصداقت کا اپنے سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کریں اور خود بخود بغیر کسی زور وزبردستی کے مسلمان ہوجائیں۔ اسلام کے مفتوحہ علاقوں اور وہاں کے باشندگان کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے' پوری تاریخ میں آپ کو ایسا ایک بھی واقعہ نہیں ملے گا کہ کسی کو زور اور زبردستی سے اسلام قبول کرایا گیا ہو۔

مذکورہ بالا تحریر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی جہاد محض قتل وغارتگری کا نام نہیں ہے بلکہ مقصود اسلامی جہاد کا اعلاء کلمۃ للہ اور اسلام کی سربلندی ہے اور جہاد کی حقیقت میں وہ تمام کوششیں اور محنتیں داخل ہیں جو اسلام کی سرفرازی اور سربلندی کیلئے کی جارہی ہوں' گویا جہاد کا اطلاق محض کفار سے قتل ہی پر نہیں بلکہ برائی کی روک تھام کیلئے ہاتھ کے زبان کے بلکہ دل کے استعمال (کم ازکم دل سے برائی کو خراب سمجھنا) بھی جہاد کی حقیقت میں شامل ہے۔

مشروعیتِ جہاد کے مختلف مراحل

قرآن وحدیث میں ذکر کردہ جہاد اور اس کے احکام کی حقیقت تک رسائی کیلئے یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ آغازِ اسلام سے جہاد کو اُس کے مختلف تشریعی مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ بیک وقت کفار سے دوبدو مقابلہ کی اجازت نہیں دی گئی۔

مشروعیتِ جہاد کے چار مراحل ہیں :

۱- ابتدائی مرحلہ میں یہ حکم تھا کہ کفار کے مظالم کو برداشت کرتے ہوئے دین حق کی تبلیغ واشاعت میں پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ لگا جائے' حضورِ اکرم ﷺ نے اِس مرحلہ میں اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو قتال سے منع فرمادیا تھا' یہ اسلام کی دعوت وتبلیغ کا ابتدائی

مرحلہ تھا' آپ ﷺ کے مکہ میں اقامت پذیر رہنے کے دوران اس پہلے مرحلہ کے احکام کو قرآن نے دُہرا دُہرا کر بیان کیا ہے' چنانچہ اِرشادِ خداوندی ہے :

''فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْن'' (۱)''آپ اوامر خداوندی کی لوگوں میں آواز لگاتے رہیں اور کفار سے اعراض برتیں''۔

دوسری جگہ ارشاد باریٔ عزوجل ہے: ''خُذِالْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ'' (۲)''معافی تلافی کو خوب اپنایئے' بھلائی کا حکم کرتے رہئے اور ناسمجھ لوگوں سے اپنی توجہ ہٹا لیجئے''۔

اس ابتدائی مرحلہ کی مدت کے دوران آپ ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے یوں ارشاد فرمایا تھا: ''مجھے عفو ودرگزر کا حکم دیا گیا ہے' لہٰذا تم لوگ قتال نہ کرو: ''انی امرتُ بالعفوِ فلا تقاتلو'' (۳)

امامِ قرطبیؒ اپنی تفسیر میں یوں ارشاد فرماتے ہیں: ولم یوذن للنبی فی القتال مدۃ اقامۃ بمکّۃ (۴) حضورِ اکرم ﷺ کو آپ کی مکی زندگی کے دوران قتال کی اجازت مرحمت نہیں ہوئی۔

۲- دوسرا مرحلہ جنگ کے جواز کا ہے' اس مرحلہ میں بھی جہاد مسلمانوں پر فرض نہیں کیا گیا، اس مرحلہ کے تعلق سے سورۃ الحج میں اِرشاد خداوندی ہے :

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ' الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ، وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُفِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا، وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ' اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۵)

''لڑنے کی اُن کو اجازت دی گئی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو غالب کردینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے

(۱) الحجر : ۹۴ (۲) الاعراف : ۱۹۹

(۳) نسائی ، باب وجوب الجهاد، حدیث : ۳۰۸۶ ،حاکم اور ذہبی کہتے ہیں کہ: یہ بخاری کی شرط پر صحیح ہے، المستدرك : كتاب الجهاد ،حدیث:۲۳۷۷،عبد الفتاح ابوغدة

(۴) تفسیر قرطبی : ۴۱۵/۳،مؤسسة الرسالة ، بیروت (۵) الحج : ۳۹

محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے سے زور نہ گھٹا تا تو نصاریٰ کے خلوت خانے اور یہودی عبادت گاہیں اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے اور بیشک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا' بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبہ والا ہے''۔

ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

وقال غير واحدٍ من السلف هذه اوّل ايةٍ نزلت فى الجهاد ، واستدل بهذه الاٰية على أن السورة مدنية(۱)

''بیشتر اسلاف کا کہنا یہ ہے کہ: یہ جہاد کے متعلق سب سے پہلی آیت ہے' اسی آیت کی وجہ سے اس سورت کو مدنی قرار دیا گیا ہے''۔

۳- تیسرے مرحلے میں مسلمانوں کیلئے دُشمن کا دفاع ضروری قرار دیا گیا پھر بھی انہیں ابتدائے قتال کی اجازت مرحمت نہیں ہوئی۔ اس تیسرے مرحلہ کے حوالہ سے ارشادِ خداوندی ہے:

وَقَاتِلُوا فِى سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۲) ''اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلو' واقعی اللہ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے''۔

یہ بھی ارشاد خداوندی ہے :

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ، سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوْا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاُولٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا.(۳)

اور اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں تو اللہ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر : ۳۴۹/۱،مؤسسة الرسالة ، بیروت

(۲) البقرة : ۱۹۰ (۳) النساء : ۹۱-۹۲

تعالیٰ نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی، بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں، جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں گر جاتے ہیں۔ سو یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے امن رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو تم ان کو پکڑو اور قتل کرو، جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو اُن پر صاف حجت دی ہے۔

۴- چوتھا مرحلہ کفار سے ابتدائی طور پر قتال کی فرضیت کا ہے خواہ وہ کفار کسی دین سے یا کسی جنس سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں، ان کی جانب ہی سے مسلمانوں کے خلاف قتال کا آغاز کیوں نہ ہوا ہو، یا تو وہ اسلام لے آئیں یا تو جزیہ ادا کریں، چونکہ مقصود کفر کے دبدبے کو ختم کرنا، دین کو اعزاز اور رتبہ بخشنا اور یہ اعلاء کلمۃ اللہ ہے، جہاد کے اِس چوتھے مرحلے کی ابتداء سن ۹ ھ میں حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زیر قیادت ادا کردہ حج کے چار مہینے کے بعد ہوئی ہے، اس چوتھے مرحلہ کا اعلان حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کے زبانی اسی حج کے موقع سے ہوا تھا، اس چوتھے مرحلے کو اللہ عزوجل نے سورۃ التوبہ میں مفصل ذکر فرمایا ہے، اسی کے حوالے سے ارشاد خداوندی ہے :

"فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱)

''سو جب اَشہرِ حرم گذر جاویں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ مارو، اور پکڑو، باندھو، اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے، بڑی رحمت کرنے والے ہیں''۔

اِسی سورت میں ارشادِ خداوندی ہے :

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (۲)

---

(۱) التوبۃ : ۵۰ (۲) التوبۃ : ۲۹

''اہلِ کتاب جو کہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں''۔

سورۃ الانفال میں اللہ عزّ وجل کا ارشاد ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۱) اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فسادِ عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

یہ مشروعیتِ جہاد کے مختلف مراحل ہیں جس کا علماء اسلاف نے جابجا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، ہم یہاں چند علماء کے اقوال ذکر کرتے ہیں: حضرت امام شافعیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"وانزل اللّٰه فيما يثبته به اذا ضاق من اذاهم: "وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِيْنَ، وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" ففرض عليهم ابلاغهم وعبادته، ولم يفرض عليهم قتالهم. وأبان ذلك فى غير اٰيةٍ من كتابه ...... ثم اذن اللّٰه لهم بالجهاد ...... ثم اذن لهم بأن يبتدؤا المشركين بقتالٍ قال اللّٰه عزّوجل "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ" واباح لهم القتال بمعنى ابانه فى كتابه فقال: وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ" ولما مضت لرسول اللّٰه ﷺ مدة من هجرته انعم اللّٰه فيها على جماعات باتباعه حدثت لهم بها مع عون اللّٰه عزّوجل قوة بالعدد، لم يكن قبلها، ففرض اللّٰه عليهم الجهاد بعد اذ كان اباحةً،لا فرضًا، فقال تبارك تعالٰى: "كتب عليكم القتال"(۲)

''جب کفار کی تکلیفوں کی وجہ سے آپ کو تنگی محسوس ہوئی تو آپ کی ڈھارس باندھنے

(۱) الانفال : ۳۹

(۲) احکام القرآن للشافعی :۹/۲ تا : ۱۹،دار الکتب العلمیۃ ، بیروت

کیلئے اللہ عزوجل نے آیت نازل فرمائی ''ہم یہ بات جانتے ہیں کہ آپ کو ان کی باتوں سے تنگی محسوس ہوتی ہے، آپ اپنے رب کی تعریف کرتے رہئے، نماز ادا کرتے رہئے، موت تک اپنے رب کی عبادت میں مصروف رہئے'' اولاً ان پر دین کی اِشاعت اور اللہ عزّ وجل کی عبادت فرض کی گئی، قتال ان کیلئے مشروع نہ کیا گیا، کتاب اللہ کی متعدد آیات میں یہ بات بتلائی گئی ہے...... پھر اللہ نے انہیں جہاد کی اجازت دے دی...... پھر ان کو مشرکوں سے قتال کے ابتداء کی اجازت دی گئی، ارشادِ خداوندی ہے : ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ'' (اُنہیں اِجازت دی گئی جن سے قتال کیا جاتا ہے) ان کیلئے قتال کو مباح قرار دیا گیا، مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ بات اپنی کتاب میں ظاہر فرمائی، ارشاد خداوندی ہے: اللہ کے راستے میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں'' پھر جب حضور ﷺ کی ہجرت پر ایک لمبی مدت گذر گئی، اس دوران اللہ عزّ وجل نے آپ کے پیروؤں کی جماعتوں پر انعام واکرام فرمایا، جس کی وجہ سے ان کی عددی قوت میں اضافہ ہوا، اس سے پہلے یہ تعداد نہ تھی، چنانچہ اللہ عزوجل نے ان پر قتال کو فرض فرمایا بعد اس کے کہ وہ ان کیلئے صرف مباح تھا ارشاد خداوندی ہے ''تم پر قتال فرض کیا گیا''۔

شمس الائمہ سرخسیؒ نے بھی اپنی کتاب ''مبسوط'' میں مشروعیتِ جہاد کے اِن ہی مراحل کو ذکر کیا ہے۔(۱)

علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" میں یوں فرماتے ہیں :

حضورِ اکرم ﷺ کو ابتداء میں اپنی زبان سے کفار کے مقابلے کا حکم دیا گیا تھا، ہاتھ کے استعمال کی ممانعت تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان کے سامنے دعوت پیش کرتے، ان کو نصیحت فرماتے، دلائل وبراہین سے ان کا جواب دیتے...... آپ کو قتال سے اس وجہ سے منع کیا تھا کہ مسلمانوں کے اندر مدافعت کی قوت نہ تھی، بالکل نہتے مجبور تھے، پھر جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی پھر کچھ لوگ آپ کے اعوان وانصار ہوگئے، تو آپ کو قتال کی اجازت دی گئی پھر جب ان کی عددی

(۱) المبسوط :۲/۱۰

طاقت میں کافی اضافہ ہوگیا تو ان پر جہاد فرض کر دیا گیا۔صرف مصالحت کرنے والوں سے قتال فرض نہیں تھا۔ چونکہ یہ لوگ بیک وقت تمام کفار سے نہیں نمٹ سکتے تھے، جب مکہ فتح ہوگیا، تو قریش عرب بادشاہوں کے قتال سے رُک گئے پھر آپ ﷺ کے پاس عرب کے وفود اسلام قبول کرنے کیلئے آئے پھر اللہ عزوجل نے آپ کو تمام کفار سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کے ساتھ ایک متعینہ وقت کیلئے معاہدہ تھا قتال کرنے کا حکم دیا۔(۱)

مشروعیتِ جہاد کے ان مختلف مراحل کا ذکر ابن رُشد نے ''بداية المجتهد ''(۲) ابنِ قیم نے ''زادالمعاد '' (۳) میں کیا ہے۔

کیا جہاد کے اِبتدائی مراحل منسوخ تھے یا ابھی باقی ہیں؟

اِس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں،بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہر نئے مرحلے کی مشروعیت کے بعد اس سے پہلے مرحلے کا حکم منسوخ ہوگیا۔لہٰذا ابتدائی تین مراحل اس وقت منسوخ ہیں،اس وقت صرف ایک آخری مرحلہ کا حکم باقی ہے۔دوسرے لوگ ان کی اس بات کی مخالفت کرتے ہیں چنانچہ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابتدائی مراحل بھی منسوخ نہیں ہیں بلکہ ان چاروں کا تعلق ان سے مربوط احوال کے ساتھ ہے' مسلمانوں کی جو پوزیشن اور حالت ہوگی' اسی قسم کے احکام عائد ہوں گے جنھوں نے یہ بات کہی ہے ان میں علامہ بدرالدین الزرکشی سرفہرست ہیں؛ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

''انه ليس فی مراحل الجهاد نسخ' بل يعمل بكل مراحله عندالحالة المشابهة للحالة التی شرعت فيها ''(۴) جہاد کے ان مراحل میں نسخ کا عمل ہوا نہیں ہے، بلکہ ان چاروں مراحل پر اس کی مشروعیت کے مطابق احوال کے درپیش ہونے پر عمل کیا جائے گا۔''

آگے فرماتے ہیں :

''بعض لوگوں نے ایک دوسرے طریقے سے نسخ کی تین قسمیں کی ہیں تیسری صورت یہ ہے کہ جو حکم کسی وجہ سے دیا گیا ہو' پھر اس سبب کے موجود نہ رہنے سے احکام اُٹھا لئے گئے

---

(۱) الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح : ۲۳۷/۱، تحقیق: علی حسن ناصر، دارالعاصمۃ، ریاض

(۲) بداية المجتهد: ۳۷۱/۱ (۳) زادالمعاد :۱۶۰/۳۰

(۴) البرهان فی علوم القرآن : ۴۱/۲-۴۲

ہوں'' جیسے کمزوری، تعداد کی کمی کے وقت صبر اور جو اللہ سے ملاقات کی امید نہ رکھتے ہوں ان کی مغفرت کا حکم' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا واجب نہ ہونا، پھر ان احکام کو منسوخ قرار دے کر دوسرے احکام کو واجب کرنا، یہ دراصل نسخ نہیں ہوتا بلکہ ''نسأ'' (بھلانا) ہوتا ہے۔جیسے ارشاد خداوندی ہے:'' اَو نُنسِهَا '' یا ہم اُسے بھلا دیتے ہیں۔مسلمانوں کی طاقت وقوت میں اضافہ ہونے پر ان کیلئے قتال کا حکم اور کمزوری کی حالت میں تکالیف پر صبر کا واجب ہونا، الغرض یہ نسخ نہیں ہوتا بلکہ نسأ (بھلا دیا جانا) ہوتا ہے پھر اس قسم کے احوال اور اسباب کے درپیش ہونے پر ان احوال کے مناسب حال احکام جاری ہوں گے صبر اور عفو ودرگذر کے احکام محکم ہیں (ردوبدل نہیں ہوا ہے) ان کا تعلق کمزوری، بے بسی اور مجبوری کے احوال سے ہے، قتال کا مباح ہونا اس سے بلند درجہ حالت پر ہے، دفاعی قتال کا وجوب اس سے اوراونچی حالت میں ہے' ابتدائی قتال کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کی مکمل قدرت اور طاقت سے متعلق ہے''۔

دفاعی اور اقدامی جہاد کے احکام میں فرق

جب مذکورہ بالاتحریر کی روشنی میں دفاعی اور اقدامی جہاد دونوں کا مشروع اور محکم ہونا ثابت ہو چکا، یہ بھی جان لیں کہ جہاد کی ان دونوں قسموں کے احکام الگ الگ ہیں' اگر کسی مسلمان کی جان ومال یا عزت وآبرو پر حملہ ہو یا کسی آبادی میں مسلمان حکومت یا عوام کی اجازت کے بغیر دشمن نے اسلامی سرحد پر ہلہ بول دیا ہو تو دفاعی جہاد فرض عین ہے، چونکہ انہیں جنگ پر مجبور کر دیا گیا ہے، جو کچھ طاقت میسر ہو اُس سے مقابلہ کرنے اور دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی، کیوں کہ انھیں اس پر مجبور کر دیا گیا اس کے بالمقابل صحیح قول کے مطابق اقدامی جہاد صرف فرضِ کفایہ ہے۔

دفاعی جہاد کے متعلق حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے :

من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد ، ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون اهله فهو شهيد

جو شخص اپنے مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو شخص دین کی حفاظت کی خاطر مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنی جان بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے اہل

وعیال کی حفاظت کی خاطر مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔

اس لئے فقہاء کرامؒ نے دفاعی جہاد کیلئے کوئی شرط نہیں رکھی ہے:

...... وواجب على الناس اذ جاء العدو ان ينفروا المقل منهم والمكثر ولا يخرجوا الى العدو الّا باذن الأمير الّا ان يفجأهم عدو غالب يخافون غلبه، فلا يمكن أن يستأذنوه

لوگوں پر واجب ہے کہ جب دشمن آجائے تو کم وبیش جو بھی تعداد ہو، نکل جائے، امیر کی اجازت کے بغیر دشمن کے مقابلے میں نہ جائے، سوائے اس کے کہ زور آور دشمن اچانک آجائے، جس کے غالب ہونے کا اندیشہ ہو اور امیر سے اجازت حاصل کرنے کا موقع نہ ہو۔

دفاعی جہاد کے متعلق امام جصاصؒ احکام القرآن میں یوں اِرشاد فرماتے ہیں :

ومعلوم فى اعتقاد جميع المسلمين أنه اذاخاف اهل الثغور من العدوّ ولم تكن فيهم مقاومة لهم، فخافو اعلى بلادهم وانفسهم وذراريهم أن الفرض على كافة المسلمين ان ينفر اليهم' من ان يكفّ عاديتهم عن المسلمين وهذا لاخلاف فيه بين الأئمة، اذليس من قول احدٍ من المسلمين بإباحته القعود عنهم حتى يستبيحوا دماء المسلمين وسبى ذراريهم.

تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر سرحدی مسلمانوں کو دُشمن سے خطرہ درپیش ہو اور ان میں مقابلہ کی سکت نہ ہو، انھیں اپنے ملک، اپنی جان اور آل واولاد کے متعلق اندیشہ ہونے لگے تو مسلمانوں کیلئے ''نفیر عام'' فرض ہوگا، تاکہ مسلمانوں کا ان کے دُشمنوں سے بچاؤ ممکن ہوسکے۔ اس بارے میں اُمت کا بالکل اختلاف نہیں ہے۔ کوئی مسلمان ایسے وقت اتر کر مسلمانوں کے قتل وخون کے حلال ہونے اور ان کے آل واولاد کے قیدی اور غلام بنائے جانے کا موقع نہیں دے سکتا۔

رہا اقدامی جہاد تو جمہور علماء کا کہنا ہے کہ یہ قدرت اور وسعت کے ساتھ فرضِ کفایہ ہے کچھ

مسلمان اس فریضہ کو انجام دیتے ہیں تو باقی لوگوں سے یہ ساقط ہو جائے گا، مگر یہ کہ وہ لوگ رضا کارانہ طور پر اس کیلئے تیار ہو جائیں، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ سے یہ روایات ملتی ہیں کہ وہ اقدامی جہاد کے فرضِ عین ہونے کے قائل ہیں۔(۱)

حافظ ابن حجرؒ نفیر عام کے واجب ہونے سے متعلق باب میں ارشاد فرماتے ہیں:

کیا جہاد فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ علماء کے اس بارے میں دو مشہور قول ہیں اور یہ دونوں مذہب شافعی سے متعلق ہیں...... سہیلی کا کہنا ہے کہ جہاد حضرت انصار رضی اللہ عنہم پر فرضِ عین تھا، دیگر لوگوں پر نہیں، اس بات کی تائید حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے "لیلة العقبة" (گھاٹی کی رات) میں ان سے اس بات کی بیعت لینے سے ہوتی ہے کہ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں گے۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ ابتدائی جہاد انصار رضی اللہ عنہم اور مہاجرین رضی اللہ عنہم دونوں کے حق میں فرضِ عین تھا، دیگر لوگوں کے حق میں فرضِ کفایہ تھا، اس کے باوجود بھی ان دونوں کے حق میں یہ عام بات نہیں تھی، بلکہ انصار رضی اللہ عنہم کیلئے فرضِ عین اس وقت تھا جب کہ مدینہ پر کسی نے شب خون مارا ہو اور مہاجرین کے حق میں جس وقت ابتداءً کسی کافر سے مقابلہ کرنا ہو، اس کی تائید واقعہ بدر سے ہوتی ہے۔

پھر آگے فرماتے ہیں:

والتحقیق انّه کان عینًا علی من عینه النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فی حقه ولولم یخرج، الحال الثانی: بعد النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فهو فرض کفایة علی المشهور الآن تدعوالحاجة الیه کأن یدهم العدو، ویتعیّن علی من عیّنه الامام، ویتأدیّ فرض الکفایة بفعله فی السنة مرة عندالجمهور، ومن حجتهم أنّ الجزیة تجب بدلًا عنه، ولاتجب فی السنة اکثر من مرّةٍ اتفاقًا...... والتحقیق ایضًا انّ جنس جهاد الکفّار یتعیّن علی کل مسلمٍ، امّابیده، وامّا بلسانه، وامّابماله، وامّا بقلبه، واللّٰه اعلم. (۲)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر : ۳۱۲/۴، دار احیاء التراث العربی

(۲) فتح الباری : ۳۸۱۳۷/۶، دار المعرفة، بیروت

''تحقیق یہ ہے کہ جہاد اس کے حق میں فرضِ عین ہے جس کو حضورِ اکرم ﷺ نے متعین و متشخص کیا ہو۔ دوسری حالت: حضورِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد مشہور قول کے مطابق فرضِ کفایہ ہے۔ مگر یہ کہ کوئی ایسی سخت ضرورت درپیش ہو کہ دشمن نے اچانک ہلہ بول دیا ہو یا جس پر امام نے فرضِ عین قرار دیا ہو۔ جمہور کے یہاں فرض کفایہ کی ادائیگی سال میں ایک مرتبہ اس کام کے انجام دینے سے ہو جاتی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ جزیہ جہاد کا بدل ہوتا ہے اور وہ سال میں باتفاق ایک سے زیادہ بار واجب نہیں ہوتا ... تحقیق یہ بھی ہے کہ جنس جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے، یا تو اپنے ہاتھ سے، یا زبان، یا مال سے یا دل سے واللہ اعلم''

بغویؒ نے شرح السنہ میں بھی جہاد کی دو قسمیں کی ہیں۔ فرضِ عین، فرضِ کفایہ، سرحد سے قریب لوگوں کیلئے فرضِ عین قرار دیا ہے، دور والوں کیلئے فرض کفایہ، مگر یہ کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہو اگر کفار اپنی جگہ مقیم ہوں، مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہوں تو امام المسلمین کسی سال کو بغیر غزوہ کے جانے نہ دے۔(۱)

اِقدامی جہاد کا مقصد

اقدامی جہاد اس لئے نہیں کیا جائے گا کہ لوگوں کو قبولِ اسلام پر مجبور کیا جائے، بلکہ محض اس جدوجہد کا مقصد اس روئے زمین پر احکام خداوندی کا نفاذ ہے، جو کہ سراسر عدل وانصاف پر مبنی اور فطرتِ انسانی کے موزوں اور لائق ہیں۔ اسلام نے ابتدائی جہاد کے دو مقصود قرار دیئے ہیں۔ یا تو کافر مذہبِ اسلام کو گلے لگالیں، یا وہاں کے باشندگان جزیہ ادا کریں۔ پھر وہ اپنے عقیدہ پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ جزیہ یہ تھوڑا سا سامان ہوتا ہے جو ان کے جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے بدلہ لیا جاتا ہے۔ جہاد کے مقصد کو آیت کریمہ میں یوں بتلایا گیا ہے ''حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ'' دُنیا سے فتنہ فساد بگاڑ و خراب کا جہاں خاتمہ ہو جائے تو جنگ بھی تھم جائے۔ ربیع بن عامرؓ نے رستم کے سامنے اسلامی جہاد کا مقصود یہ بتلایا تھا ''ہمیں اللہ عزوجل نے اس لئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو لوگوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لگائیں۔ دُنیا کی تنگی سے انہیں آخرت کی وسعتوں سے ہمکنار کریں، دیگر مذاہب و ادیان کے جور و ظلم سے نکال کر اسلام کا سایہ عطا کریں''۔

(۱) شرح السنة : ۱۰/۳۷۴

جب کفار بندوں پر اللہ کے احکام کے اجراء کو قبول کرلیں، جزیہ ادا کر کے ہماری تابعداری میں آجائیں، تو اس طرح جہاد کا مقصود حاصل ہو چکا، لہٰذا وہ تلوار یا دیگر اسلحے کی بنیاد پر قبولِ اسلام پر مجبور نہ کئے جائیں گے۔(۱)

خلاصۂ کلام

اب تک کی پیش کی گئی تحقیقات کا خلاصہ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریر ہے آپؒ رقمطراز ہیں :

''ہماری اُردو زبان میں ''جہاد'' اس مسلح جنگ ہی کو کہتے ہیں جو اللہ ورسول کے حکم کے مطابق دین کی حفاظت ونصرت کیلئے دشمنانِ حق سے کی جائے' لیکن اصل عربی زبان اور قرآن وحدیث کی اصطلاح میں جہاد کے معنی حریف کے مقابلہ میں کسی مقصد کیلئے پوری جدوجہد اور امکانی طاقت صرف کرنے کے ہیں' جو احوال وظروف کے لحاظ سے جنگ وقتال کی شکل میں بھی ہوسکتی ہے اور دوسرے طریقوں سے بھی...(قرآنِ مجید میں جہاد کا لفظ جابجا اسی وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے)۔''

رسول اللہ ﷺ منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد قریباً ۱۳ برس مکہ معظّمہ میں رہے، اِس پوری مدت میں دین کے دُشمنوں، کافروں، مشرکوں سے نہ صرف یہ کہ جہاد بالسیف اور جنگ وقتال کی اجازت نہیں تھی، بلکہ اس کی ممانعت تھی اور حکم تھا۔ کُفُّوا اَیدِیُکُم...... (۲) (یعنی جنگ اور قتال سے اپنے ہاتھ روکے رکھو)......سورۃ ''الفرقان'' اسی مکی دور میں نازل ہوئی ہے، اس میں رسولِ اقدس ﷺ کو خطاب کرکے اِرشاد فرمایا گیا ہے :'' فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا '' (۳) مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے نبی ﷺ! آپ ﷺ ان منکروں کی بات نہ مانئے اور ہمارے نازل کئے ہوئے قرآن کے ذریعہ سے بڑا جہاد کرتے رہئے!...ظاہر ہے کہ اس آیت میں جس جہاد کا حکم ہے اس سے مراد جہاد بالسیف اور جنگ وقتال نہیں ہے، بلکہ قرآن کے ذریعہ دعوت وتبلیغ کی جدوجہد ہی مراد ہے اور اسی کو اس آیت میں صرف جہاد ''نہیں'' بلکہ ''جہادِ کبیر'' اور ''جہادِ عظیم'' فرمایا گیا ہے۔

---

(۱) ملخص : تکملہ فتح الملھم :۳/۵،۱۱

(۲) النساء:۷۷ (۳) الفرقان:۵۲

اِسی طرح سورۃ العنکبوت کی آخری آیت ہے: ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ'' (۱) مطلب یہ ہے کہ جو بندہ (راہِ خدا میں) جہاد کرے گا وہ اپنے ہی نفع کیلئے (خدا کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا) خدا سب سے بے نیاز ہے۔

اسی سورۃ عنکبوت کی آخری آیت ہے: وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا، وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (۲) یعنی جو بندے ہماری راہ میں یعنی ہماری رضا حاصل کرنے کیلئے جہاد و مجاہدہ کریں گے اور مشقتیں جھیلیں گے ان کو ہم اپنے راستوں (یعنی اپنے قرب ورضا کے راستوں) کی ہدایت کی نعمت سے نوازیں گے۔ ظاہر ہے کہ سورۃ عنکبوت کی ان دونوں آیتوں میں بھی ''جہاد'' سے جہاد بالسیف' مراد نہیں لیا جاسکتا' بلکہ راہِ خدا میں اور اس کے قرب ورضا کیلئے جدوجہد اور محنت ومشقت ہی مراد ہے جس صورت میں بھی ہو۔ بہرحال دین کی راہ میں اور اللہ کیلئے ہر مخلصانہ جدوجہد اور جان ومال اور عیش وآرام کی قربانی اور اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال' یہ سب بھی اپنے اپنے درجہ میں جہاد فی سبیل اللہ کی شکلیں ہیں اور ان کا راستہ ہروقت اور دنیا کے ہر حصے میں آج بھی کھلا ہوا ہے۔ ہاں جہاد بالسیف اور قتال فی سبیل اللہ بعض پہلوؤں سے اعلیٰ درجہ کا جہاد ہے' اور اس راہ میں جان کی قربانی اور شہادت مومن کی سب سے بڑی سعادت ہے' جس کیلئے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے دلی شوق اور تمنا کا اظہار فرمایا۔ (۳)

جہاد کی آیات واحادیث کو تبلیغی اسفار کی فضیلت پر محمول کئے جانے کے درست ہونے کو گرچہ قتال اور کفار سے مقابلہ آرائی، دشمنوں کے سامنے تیر وتفنگ سے لیس ہوکر اپنے جان کے نذرانے کو ہاتھ میں دشمنوں کے ٹڈی دل میں گھس جانا اس کی اس کی فضیلت واہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن مقصود جہاد کا اعلاء کلمۃ اللہ ہے، اس لئے جہاد کے اس مقصود اصلی کو پیش نظر رکھ کر کیا ان آیات واحادیث کو تبلیغی اسفار پر منطبق کیا جاسکتا ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں:

''تبلیغ والے جہاد کی احادیث کو اپنے تبلیغی اسفار کی تائید میں پیش کرتے ہیں، یہ اشکال ہوتا ہے اور تعجب اس پر ہے کہ یہ اشکال عوام کے بجائے اہل علم کی طرف سے زیادہ آیا، اہل علم کی طرف سے اس قسم کے اشکالات کا وارد ہونا زیادہ موجبِ تعجب ہے، اس لئے

(۱) العنکبوت:۶ (۲) العنکبوت:۶۹ (۳) معارف الحدیث:۴۲۰۹

جہاد کے اسفار میں قتال گرچہ عرفا زیادہ معروف ہے، لیکن لغت اور نصوص جہاد کو قتال کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے، اصل جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کی سعی ہے، جس کا درجۂ مجبوری اور آخری درجہ بھی قتال ہے، قتال اصل مقصود نہیں ہے، بلکہ بدرجۂ مجبوری ہے"

پھر حضرت نے تفصیلا مفسرین کے اقوال اور احادیث کی روشنی میں یہ بات ثابت کی ہے کہ ہر اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش پر جہاد کا اطلاق یہ دور رسالت سے ہی چلا آرہا ہے۔(۱)

آگے حضرت مولانا الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ کا یہ قول نقل کیا ہے "یہ سفر" (یعنی سفرِ تبلیغ) غزوات ہی کے سفر کے خصائص اپنے اندر رکھتا ہے اور اس لئے امید بھی ویسے ہی اجر کی ہے، یہ اگر چہ قتال نہیں ہے مگر جہاد ہی کا ایک فرد ضرور ہے، جو بعض حیثیات سے گرچہ قتال سے کمتر ہے مگر بعض حیثیات سے اس بھی اعلی ہے، مثلا قتال میں شفاء غیظ اور اطفاء شعلۂ غضب بھی ہے اور یہاں اللہ کے لئے صرف کظمِ غیظ ہے اور اس کے دین کے لئے لوگوں کے قدموں میں پڑ کے اور ان کی منتیں سماجتیں کر کے بس ذلیل ہونا ہے" (۲) پھر آگے حضرت مولانا یوسف صاحبؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ: "مولانا یوسف صاحبؒ نے نہٹور ضلع بجنور کے خصوصی اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: حضور اقدس ﷺ نے جتنے بھی وفود، لشکر، قبائل اور علاقوں میں بھیجے ہیں وہ سب دعوت کیلئے تھے، حضور ﷺ کے تمام جہادوں کی تعداد ایک روایت کی بناء پر ۲۳ ہے اور دوسری روایت کی بنا پر ۳۹ ہے، ان میں سے نو کے متعلق یہ لکھا ہے کہ "بَعَثَ مُقَاتِلاً" آپ ﷺ نے جنگ کے لئے بھیجا، بقیہ سب کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ دعوت کے لئے بھیجا تھا" (سوانح یوسف عزیزی)۔(۳)

کیا تبلیغ میں ذکر کرنے سے سات لاکھ نیکیاں ملتی ہیں؟

اس حوالہ سے پہلی روایت یہ ہے: الذکر في سبیل اللّٰہ یضعف فوق النفقة سبع مائة ضعف (۴) اللہ تعالیٰ کے راستے میں ذکر کرنے کا ثواب خرچ کرنے سے سات سو

(۱) ملاحظہ ہو تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات: از:۲-۴، مطبوعہ مکتبہ خلیلیہ، لاہور

(۲) حوالہ سابق:۳ (۳) حوالہ سابق:۶

(۴) کنز العمال: الفرع الثالث فی اداب المتفرقة (للرمی) حدیث: ۱۰۸۷۹، مطبوعہ مؤسسة الرسالة، بیروت، مناوی کہتے ہیں کہ: یہ روایت ایسی سند سے مروی ہے جس میں کوئی حرج نہیں۔ (جامع الأحادیث: ۲۶۲/۷)

گنا زیادہ ہے۔

اس بارے میں ایک دوسری روایت ہے:

عن معاذ بن انس رضي الله عنه ، لمن اكثر في الجهاد في سبيل الله من ذكر الله فانّ له بكل كلمة سبعين الف حسنة منها عشرة اضعاف مع الذى له عند الله من المزيد والنفقة على قدر ذلك (۱)

''حضرتِ معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس شخص کیلئے خوشخبری ہے جو جہاد میں اللہ کے راستے میں کثرت سے ذکر کرے، اس لئے کہ ہر لفظ کے عوض میں سات لاکھ نیکیاں ملتی ہیں، مزید برآں اللہ تعالیٰ اُسے اور نوازے گا، خرچ کرنے کا ثواب اس قدر ہے''۔

(۱) کنز العمال: الباب الاول فی الترغیب فیه، کتاب الجهاد من قسم الاقوال حدیث: ۱۰۵۸۴
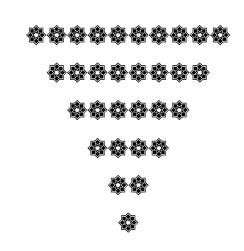
فی سبیل اللہ کا شرعی مصداق

بہت سے اہلِ علم کو بھی یہ شبہ رہا ہے کہ قرآن وحدیث میں وارد ''فی سبیل اللہ'' کا لفظ صرف قتال ہی کے ساتھ خاص ہے، ذیل کے مبسوط مضمون میں مفسرین کے اقوال کی روشنی میں اس کو واضح کیا گیا ہے کہ سارے قرآن میں کہاں ''فی سبیل اللہ'' کا مصداق قتال ہے اور کہاں اس کا مفہوم سارے اعمالِ خیر پر مشتمل ہے نیز احادیثِ شریفہ میں مذکور فی سبیل اللہ کے معنی میں اکثر وبیشتر وسعت ہونے کو شروحِ حدیث سے ثابت کیا ہے، جس سے خود بخود اس غلط فہمی کا ازالہ ہوجاتا ہے کہ اہلِ دعوت کا ''فی سبیل اللہ'' والی آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ شریفہ (جبکہ وہ قتال کے ساتھ مخصوص نہ ہوں) کا دعوت وتبلیغ کے فضائل کے طور پر ذکر کرنا غلط ہے۔

لفظِ ’’فی سبیل اللہ‘‘ قتال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جو لفظ ’’فی سبیل اللہ‘‘ آیا ہے وہ قتال اور جہاد کے ساتھ مخصوص نہیں اور جو لوگ لفظ ’’فی سبیل اللہ‘‘ کو محض جہاد کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں یہ دعویٰ بلا دلیل ہے ان کے اس قول کی اصل نہ کتاب وسنت میں ملتی ہے اور نہ چودہ سوسال کی تاریخ ان کے اس قول کی تائید کرتی ہے۔

لفظِ ’’فی سبیل اللہ‘‘ کا حقیقی مطلب

فی سبیل اللہ: اس کا حقیقی مطلب ہر وہ راستہ اور طریقہ ہے جو خوشنودیٔ رب کیلئے اختیار کیا جائے، لہٰذا یہ قتال، دعوت، حصولِ علم، جماعت کی حاضری اور حج وغیرہ تمام اُمور کو شامل ہوگا۔

علماء نے یہ وضاحت کی ہے کہ فی سبیل اللہ کو جو کفار سے قتال کے ساتھ محدود کیا جاتا ہے دراصل وہ ’’قصر العام علی اھم افرادہ‘‘ کے قبیل سے ہے یعنی مختلف معانی کو مشتمل لفظ سے اس میں سے سب سے اہم معنی مراد لیا جائے' ورنہ تو لفظ ’’فی سبیل اللہ‘‘ احیاء دین کے تمام شعبوں کو شامل ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ اپنے تمام افراد کیلئے عام ہے تو پھر محدثین نے ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ کے متعلق تمام احادیث کو ’’کتاب الجہاد‘‘ میں کیوں ذکر کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے چونکہ امام بخاریؒ نے فی سبیل اللہ کی روایت کو کتاب الجمعہ میں نماز جمعہ کیلئے جانے کی فضیلت کے تحت اور بیہقی نے ’’السنن الکبریٰ‘‘ میں اور منذری نے ’’الترغیب والترھیب‘‘ میں جمعہ کی نماز اور اس کیلئے چل کر جانے کی فضیلت کے تحت یہ روایت ذکر کی ہے: ’’ومن اغبرّت قدماہ فی سبیل اللّٰہ حرمہ اللّٰہ علی النار‘‘ (۱) جس کے دونوں پیر اللہ کے راستے میں غبار آلود ہوں اللہ عز وجل اس پر جہنم کی آگ کو حرام فرما دیتے ہیں۔

ان ابواب کے تحت اس روایت کا ذکر یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام بخاریؒ بیہقیؒ اور منذریؒ وغیرہ لفظ ’’سبیل اللہ‘‘ کو تمام اُمورِ خیر کیلئے عام قرار دیتے ہیں' اسے جہاد وقتال کے ساتھ مخصوص قرار نہیں دیتے۔

---

(۱) بخاری : باب المشی الی الجمعة : ۲۳۹۸

وہ احادیث جولفظِ ''فی سبیل اللہ '' کے عام ہونے پر دال ہیں

امام بزارؒ نے اپنی مسند میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اس دوران ایک جوان وہاں آیا' جب ہم لوگوں نے اس نوجوان کو دیکھا تو کہنے لگے کیا ہی بہتر ہوتا کہ یہ نوجوان اپنی جوانی اور اپنی چستی پھرتی اور طاقت وقوت کو اللہ کے راستے میں صرف کرتا (لوأنّ هذا الشاب يجعل شبابه ونشاطه وقوّته فی سبیل الله) فرماتے ہیں کہ حضورِاکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ ہماری بات سنی تو یوں ارشادفرمایا: (وما سبیل الله الا من قتل؟) کیامحض شہید ہی اللہ کے راستے میں ہوتا ہے؟(ومن سعى على والديه ومن سعى على عياله ففی سبيل الله ومن سعى على نفسه ليعفها ففی سبيل اللّٰه ومن سعى على التكاثر فهو في سبيل الشيطان) جوشخص اپنے والدین اوراہل وعیال کی کفالت کیلئے جدوجہد کرتا ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں ہوتا ہے' جوشخص اپنے نفس کی پاکیزگی اور عفت کیلئے کوشش کرتا ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں ہوتا ہے جو مال کی زیادتی کیلئے کوشش کرتا ہے وہ شیطان کے راستے میں ہوتا ہے۔(۱)

اس سند کے رجال کی تحقیق کیلئے رسالہ'' اَوَلَیۡسَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اِلَّا مَنۡ قُتِلَ'' ملاحظہ کیا جائے۔

اس روایت کو ملاحظہ کیجئے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان اصحاب رضی اللہ عنہم پر جو''سبیل اللہ'' کو قتال کے ساتھ مخصوص قرار دے رہے ہیں کیسے رد کیا ہے؟

کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے امام طبرانیؒ نے الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ اسی روایت کی تخریج کی ہے۔(۲)

بیہقی نے سننِ کبری میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے مانند روایت کی تخریج کی ہے۔

---

(۱) شعب الایمان : الحادی والسبعون من شعب الایمان ،حدیث:۱۰۳۷۷،علامہ مزوری نے کہا ہے کہ:یہ روایت مرسل ہےاوراس کی سند ثقہ ہے۔(البر والصلة : باب بر الوالدين والأبناء : حدیث:۱۶۰،دار الوطن الرياض)

(۲) المعجم الکبیر :حدیث:۲۸۲،علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ:اس کو طبرانی نے روایت کیا ہےاوراس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

خطیبِ بغدادیؒ نے "کتاب المتفق والمفترق" کے حوالہ سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔(۱) فرماتے ہیں :

ہم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک پہاڑ پر تھے۔ پھر ہم ایک وادی کی طرف آئے' وہاں ہم نے ایک نوجوان کو بکریاں چراتے ہوئے دیکھا، اس کی نوجوانی پر مجھے رشک ہوا، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کون نوجوان ہوسکتا ہے کاش اس کی یہ نوجوانی اللہ کے راستے میں لگتی؟ (لو کان شبابه فی سبیل اللّٰه) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر رک جاؤ! ہوسکتا ہے یہ اللہ کے راستے میں ہو، اور تم کو معلوم نہ ہو(مه یا عمر فلعله فی بعض سبیل اللّٰه وانت لا تعلم)فرماتے ہیں: پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نوجوان کو بلایا، فرمایا: اے نوجوان! کیا تمہارے اہل وعیال ہیں، اس نے کہا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون؟ اس نے کہا: میری ماں ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عمر! اگر تلوار کا شہید ہی شہید شمار ہوگا تو امت کے شہداء کی تعداد کم ہوجائے گی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جل کر' گر کر' دیوار منہدم ہونے سے' پیٹ کی بیماری' ڈوب کر مرنے' جس کو بھیڑیا نے کھالیا ہو' اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھانے والوں کو شہداء میں شمار فرمایا۔(۲)

امام ترمذیؒ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:(من خرج فی طلب العلم فهوفی سبیل اللّٰه حتی یرجع)جو شخص طلبِ علم کی غرض سے سفر کرے وہ بھی اللہ کے راستے میں ہے۔(۳)

علامہ مناویؒ نے مذکورہ روایت میں "فی سبیل اللہ" کی تشریح میں یوں کہا ہے: اس کا حکم جہاد کے حکم کے مانند ہے۔ چونکہ طلبِ علم سے دین زندہ ہوتا ہے۔ کیا ان احادیث کے موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ لفظِ "سبیل اللہ" عام نہیں ہے؟۔(۴)

(۱) المتفق والمفترق :۳۲۱/۱۱،رقم:۱۵۶

(۲) کنز العمال : عن سعید بن مسیب ،حدیث:۱۱۷۵۶،مؤسسة الرسالة ، علامہ متقی الہندی فرماتے ہیں: اس روایت میں ایک شخص غالب ہیں، دارقطنی نے انہیں ضعیف کہا ہے، احمد بن کامل القاضی نے کہا کہ: میں ان کی حدیث میں مذمت کو نہیں جانتا، "اللسان" میں کہا ہے کہ: ان کا سلمہ اندلسی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔

(۳) ترمذی، باب فضل طلب العلم، حدیث:۲۶۴۷، مع تحقیق : احمد محمد شاکر :۱۵۶، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔

(۴) فیض القدیر:۱۲۴/۶، مکتبة التجاریة الکبری ، مصر

فی سبیل اللہ کے عام ہونے پر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعینؒ کے آثار

اس بارے میں جب ہم صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعینؒ کے آثار کا تتبع کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی ''سبیل اللہ'' کے عام ہونے کے قائل تھے۔

امام مالکؒ نے ''موطا'' میں یحییٰ بن سعید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ملک شام کی جانب لشکر روانہ فرمایا: پھر آپ رضی اللہ عنہ یزید بن ابوسفیان جو اس علاقہ کے گورنر تھے ان کو روانہ کرنے کیلئے ساتھ چلنے لگے۔ یزید نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شاید یوں کہا: یا تو آپ سوار ہو جائیں یا میں اُتر جاتا ہوں، حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہ تو تم اترو گے اور نہ ہی میں سوار ہوں گا'' میں اپنے ان قدموں کو اللہ کے راستے میں شمار کرتا ہوں ''اِنی أحتَسِب خطَايَ هٰذِه فی سَبيلِ اللّٰه'' پھر آپ اُن لوگوں کو وصیت کرنے لگے۔(۱)

اِس روایت پر غور کیجئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جن کو انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے بڑا رتبہ حاصل ہے لشکر کی روانگی کے دوران جو قدم ان کے اٹھ رہے ہیں اسے فی سبیل اللہ شمار کر رہے ہیں۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ اِس طرح کی ایک دوسری روایت حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایک مرتبہ حج کے سفر پر تھے، بڑے بڑے وجیہ اور شریف لوگ ان کے بازو سوار ہو کر چل رہے تھے، ان سے کہا گیا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند! کیا آپ سوار نہیں ہوں گے؟ انہوں نے کہا: نہیں، چونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''من اغبرّت قدماه فی سبيل اللّٰه تعالى لم تمسّهما نار جهنّم'' جس کے دونوں پیر اللہ کے راستے میں گرد آلود ہوں گے تو انہیں جہنم کی آگ نہ چھو سکے گی۔(۲)

یہ حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ جنھیں نوجوانانِ جنت کا سردار کہا گیا ہے یہ حج کیلئے سفر کرنے والے کو جہاد کیلئے جانے والے کے مانند قرار دے رہے ہیں، گویا خود امام حسن رضی اللہ عنہ ''سبیل اللہ'' کو عام قرار دے رہے ہیں، کیا ان کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جہاد کی احادیث کو غیر محمل پر لا دا ہے، یا مطلق کو مقید کیا ہے، یا عام کی تخصیص کی ہے۔

دارمی نے حسن درجے کی سند سے نافع سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں: ایک شخص

---

(۱) موطا، باب النهی عن قتل النساء والولدان فی الغزو، حدیث:۹۶۵، مع تحقیق فؤاد عبد الباقی

(۲) شرح السير الكبير: باب وصايا الأمراء فی البعث :۳۰/۱

ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا' کہنے لگا ایک شخص نے مجھے یہ وصیت کی ہے اور اس نے اونٹ اللہ کے راستے میں دیا ہے (وجعل ناقة فی سبیل اللہ) اور یہ جہاد کا زمانہ نہیں ہے' کیا میں اسے حج کیلئے بطور سواری کے استعمال کر سکتا ہوں' ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حج اور عمرہ یہ بھی اللہ کے راستے ہیں (الحج والعمرة فی سبیل اللہ)۔(۱)

ان تمام روایات کی تفصیلی اسنادات کیلئے رسالہ " أولیس فی سبیل اللہ إلا من قتل" ملاحظہ ہو۔

امام بخاریؒ نے حسن عن ابی العجلان کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے' جس میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول مذکور ہے: یابنیّ! ان فی سبیل اللہ کل عمل صالحٍ (اے میرے بیٹے! ہر نیک کام اللہ کا راستہ ہے)۔(۲)

یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو ہمارے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نقشِ راہ ہیں، انہوں نے "فی سبیل اللہ" کو عام مانا ہے اسے قتال کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے' چنانچہ انہوں نے تمام امورِ خیر لشکر کی روانگی' نماز جمعہ کیلئے آمد' حج وعمرہ بلکہ ہر نیک عمل کو فی سبیل اللہ شمار کیا ہے۔

تابعینؒ بھی فی سبیل اللہ کے عام ہونے کے قائل ہیں

امام مجاہدؒ سے مروی ہے کہ ان سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جس نے یوں کہا: "کل شئي لی فی سبیل اللہ" میری ہر چیز فی سبیل اللہ ہے' امام نے کہا: " لیس سبیل اللہ واحدًا، کل خیر عملہ فھو فی سبیل اللہ" (اللہ کا راستہ ایک نہیں' ہر عمل خیر اللہ کا راستہ ہے)۔(۳)

مجاہدؒ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر تلامذہ میں سے ہیں جو فی سبیل اللہ کو عام قرار دے رہے ہیں۔

---

(۱) دارمی، باب اذا اوصی بشیٔ فی سبیل اللہ، حدیث: ۳۳۰۴، حسین سلیم اسد کہتے ہیں کہ: اس کی سند صحیح ہے۔

(۲) الادب المفرد، باب قول الرجل للصغیر یا بنی، حدیث: ۳۶۹، البانی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبۃ : فی الرجل یوصی بالشیٔ فی سبیل اللہ من یعطاہ، حدیث: ۳۰۸۳۹، مع تحقیق کمال یوسف، طبع ریاض، اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔

یزید بن ابومریم راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ میری ملاقات عبایہ بن رفاعۃ سے ہوئی، میں اس وقت جمعہ کیلئے جارہا تھا۔انہوں نے یوں فرمایا: ابشر فان خطاك هذه فی سبیل الله (تمہارے لئے بشارت ہو کہ تمہارے یہ قدم فی سبیل اللہ شمار ہوں گے)۔ (۱)

یہ تابعینؒ ہیں جنھوں نے آنحضرت ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے علوم قرآن وحدیث کو حاصل کیا ہے یہ بھی لفظ سبیل اللہ کو عام قرار دے رہے ہیں اوراس میں ہر طاعت اور عمل خیر کو شامل فرمارہے ہیں جس میں دعوتِ داعی اور طلب علم وغیرہ تمام اُمور داخل ہیں۔

قرآنی آیات اور آیاتِ فی سبیل اللہ کے عام ہونے پر مفسرین کے اقوال

پہلی بات یہ پیش نظر رہے کہ لفظ سبیل اللہ قرآنِ کریم میں متعدد افعال کے ساتھ ملحق ہوکر آیا ہے، وہ افعال جن کے ساتھ سبیل اللہ ملحق ہوکر آیا ہے وہ گیارہ ہیں :

(۱) الصد عن سبيل الله (۲) الاضلال عن سبيل الله
(۳) الانفاق فی سبيل الله (۴) الاحصار فی سبيل الله
(۵) الهجرة فی سبيل الله (۶) الجهاد فی سبيل الله
(۷) الصدقة فی سبيل الله (۸) الضرب فی سبيل الله
(۹) النفر فی سبيل الله (۱۰) الاصابة فی سبيل الله
(۱۱) القتال فی سبيل الله

۱۔ الصدعن سبیل اللّٰہ (اللہ کے راستہ سے روکنا)

۱- فَقَدُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ: يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهُرِالُحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلُ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ، وَصَدٌّ عَنُ سَبِيلِ اللّٰهِ ......الخ (البقرة:۲۱۷)

۲- قُلُ يٰاَهُلَ الُكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنُ سَبِيلِ اللّٰهِ مَنُ اٰمَنَ ......(آل عمران:۹۹)

۳- (النساء:۱۶۰) ۴- (الاعراف:۴۵) ۵- (الاعراف:۸۶)

۶- (الانفال:۳۶) ۷- (الانفال:۴۷) ۸- (التوبۃ:۳۴)

(۱) ترمذی : فضل من اغبر قدماه فی سبیل الله ،حدیث:۱۶۳۲،امام ترمذی فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔

۹- (ھود:۱۹)　۱۰- (ابراھیم:۳)　۱۱- (النحل:۸۸)

۱۲- (النحل:۹۴)　۱۳- (الحج:۲۵)　۱۴- (محمد:۱۰)

۱۵- (محمد:۳۲)　۱۶- (محمد:۲۳)　۱۷- (المجادلۃ:۱۶)

۱۸- (المنافقون:۲)

اس لفظ کے ساتھ یہ اٹھارہ آیتیں ہیں۔ یہ تمام آیات اعمالِ خیر کو شامل ہیں یہ قتال کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔

چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ کا ارشاد: (لم تصدون عن سبیل اللّٰہ) قال: أي: عن دین اللّٰـہ (یعنی اللہ کے دین سے)

وقال ربیع والقتادة:ای:لم تصدون عن الاسلام وعن نبی اللّٰہ (اللہ اوراس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے)۔(۱)

اِمام طبریؒ نے کہاہے : لم تصدون عن طریق اللّٰـہ ومحجّتہ التی شرعھا لأنبیائه واولیائه وأھل الایمان (کیوں تم لوگ اللہ کے راستے اورانبیاء علیہم السلام اولیاء کرامؒ اوراہل ایمان کیلئے اللہ کے مقرر کردہ طریق سے روکتے ہو؟(۲)

دیگر مفسرین نے بھی اللہ کے دین سے روکنے کے معنی لکھے ہیں۔

۲- اضلال عن سبیل اللّٰہ (اللہ کے راستے سے گمراہ کرنا)

۱- اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ، وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ (الانعام:۱۱۶)

۲- (الحج:۹)　۳- (لقمان:۶)　۴- (ص:۶)

اِن تمام آیات میں لفظ سبیل اللہ عام ہے اور تمام اُمورِ خیر کو شامل ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے : یضلون عن سبیل اللّٰہ قال وعن دین اللّٰہ (اللہ کے دین سے)۔(۳)

---

(۱) تفسیر ابن ابی حاتم :۱۷/۳،حدیث:۳۸۸۲،۳۸۸۳،مکتبة نزار مفطفي ، ریاض

(۲) طبری ۵۳/۶،موسسة الرسالة ، بیروت

(۳) تفسیر ابن ابی حاتم :۱۳۷۵/۴، حدیث: :۷۸۱۲

طبریؒ نے کہا ہے: (يضلوك عن سبيل الله): يضلوك عن دين الله "اللہ کے دین سے گمراہ کردیں گے"۔(۱)

۳- الانفاق فی سبیل اللّٰہ (اللہ کے راستے میں خرچ کرنا)

۱۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ ......الخ (البقرة : ۲۶۱-۲۶۲)

۲۔ (محمد:۳۸)۳۔(الحدید:۱۰)۴۔(التوبۃ:۳۴) ۵۔(البقرۃ:۱۹۵)۶۔(الانفال:۶۰)

یہ تمام آیتیں جہاد اور دیگر بھلائی اور خیر کے کاموں میں اموال کے صرف کرنے کیلئے عام ہیں۔

اِمام فخر الدین رازیؒ رقم طراز ہیں: یہ جان لو کہ انفاق: خیر کے مواقع میں اموال کے صرف کو کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بے خرچ کرنے والے کو (منفق) نہیں کہا جاتا، اگر انفاق، فی سبیل اللہ کے ساتھ ملا کر آئے تو اس سے دین کے تمام راستے مراد ہوتے ہیں، چونکہ سبیل راستے کو کہتے ہیں "سبیل اللہ" اللہ کا راستہ اس کا دین ہے، اس میں تمام مواقعِ خیر میں خرچ مراد ہوگا، جس میں حج، عمرہ، جہاد بالنفس، کسی کو جہاد کیلئے تیار کرنا، صلہ رحمی، صدقات، اہل وعیال پر خرچ، زکوۃ کفارات اور دیگر اُمور شامل ہوں گے۔(۲)

۴- الاحصار فی سبیل اللّٰہ (اللہ کے راستے میں روکے جانا)

فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ. (البقرة:۲۷۳)

اس سے اکثر مفسرینؒ نے اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم مراد لیا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت اور حصولِ علم کیلئے وقف کر دیا تھا اور ان کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مقاتلؒ نے بھی یہی کہا ہے۔(۳)

---

(۱) طبری :۶۵/۱۲،مؤسسة الرسالة ، بيروت

(۲) تفسیرِ کبیر : ۱۱۶/۵،دار الكتاب العلمية ، بيروت

(۳) البحر المحيط : ۲۴۷/۲،دار الفكر ، بيروت

اس میں وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جنہوں نے اطاعتِ خداوندی اور اعمال واشغال اور تحصیلِ علم کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیا ہو۔

٥- الهجرة فی سبیل الله (اللہ کے راستے میں ہجرت کرنا)

١۔ ارشادِ خداوندی ہے: وَمَنۡ يُهَاجِرۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يَجِدۡ فِى الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِيۡرًا وَّسَعَةً ...... الخ (النساء:١٠٠)

٢۔ (النساء:٨٩) ٣۔ (الحج:٥٨) ٤۔ (النور:٢٢)

اکثر محققینؒ نے "هجرة فی سبیل اللہ" سے مراد منع کردہ چیزوں سے رک جانا اور مامورات کو اپنانا بتایا ہے۔(١)

ہجرت کی چند قسمیں ہیں :

١) ہجرت اِلی المدینہ ابتدائے اسلام میں۔

٢) دارالحرب میں اسلام لانے والے کی ہجرت۔

٣) حرام کردہ چیزوں کا ترک کرنا۔

٤) منافقین کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شرکت کرنا۔

٦- الجهاد في سبيل اللـه (اللہ کے راستے میں مشقتیں اُٹھانا)

١۔ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ. (الحجرات:١٥)

٢۔ (الانفال:٧٢) ٣۔(الانفال:٧٤) ٤۔(التوبۃ:١٩۔٢٠) ٥۔(التوبۃ:٤١)

٦۔ (النساء:٩٥) ٧۔(المائدۃ:٥٤) ٨۔(التوبۃ:٨١) ٩۔(الصّف:١٠۔١١)

امام قرطبیؒ سورۃ الحجرات مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں یوں رقم طراز ہیں:

"وَجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ"(٢)

یعنی انہوں نے اس کو سچ کر دکھایا، اس کے بارے میں شکوک میں مبتلا نہ ہوئے، یعنی جہاد اور دیگر اعمال کے ذریعہ اسے سچ کر دکھایا۔

---

(١) كذا فی تفسير الكبير :٧٠/٤، النساء:٨٩، قرطبی فی الجامع لاحكام القرآن فی تفسير سورة النساء الاية :٨٩
(٢) تفسير قرطبی :٣٤٩/٦

ابوحیان اندلسیؒ نے اِس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے :

"یشمل جمیع الطاعات البدنیة والمالیة" (۱)"یعنی تمام بدنی اور مالی عبادات کو یہ آیت جامع ہے۔"

اِمام بیضاویؒ اس آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں :

"ای في طاعته والمجاهدة بالأموال والأنفس تصلح للعبادات الماليه والبدنيه باسرها" (۲)"یعنی یہ جہاد بالمال والنفس تمام مالی اور بدنی عبادات کو شامل ہے"۔

مذکورہ تمام آیتیں جہاد اور دیگر وجوہِ خیر اور بھلائی کے کاموں کو شامل ہیں۔(ہر آیت کے تعلق سے مفسرین کے اقوال کو معلوم کرنے کیلئے" أولیس فی سبیل الله الا من قتل" رسالہ ملاحظہ ہو)۔

۷- الصدقة فی سبیل الله (اللہ کے راستے میں صدقہ کرنا)

اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ .(التوبة:۶۰)

اللہ عزوجل کے ارشاد "وفی سبیل اللّٰہ" میں امام شافعیؒ اور ابو یوسفؒ اور جمہور علماءؒ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سبیل اللہ سے"وہ مجاہدین مراد ہیں جو مصروفِ جہاد ہوں"۔

۸- الضرب فی سبیل الله (اللہ کے راستے میں سفر کرنا)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلَمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا، ......الخ (النساء:۹۴)

یہاں کلمہ سبیل اللہ سے جہاد بمعنی قتال ہے اس پر تمام ائمہ تفسیر متفق ہیں۔

جریر طبری یوں فرماتے ہیں: "اذا ضربتم فی سبیل اللّٰہ" (۳)(یعنی دُشمنوں سے جہاد کیلئے تم جب نکل پڑو)۔

---

(۱) البحر المحیط :۱۱۶/۸ (۲) انوار التنزیل واسرار التاویل :۲۲۱/۲

(۳) تفسیرِ طبری : ۷۰/۹،مؤسسة الرسالة ، بیروت

۹- النفر فی سبیل اللّٰہ (اللہ کے راستے میں نکلنا)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَالَکُمْ إِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ......الخ (التوبہ:۳۸)

اس آیتِ مبارکہ میں بھی النفر فی سبیل اللّٰہ سے جہاد بمعنی قتال کے مراد ہونے میں اکثر مفسرین متفق ہیں۔

۱۰-الاصابة فی سبیل اللّٰہ (اللہ کے راستے میں زخمی ہونا)

اِرشادِ خداوندی ہے: وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ، فَمَاوَھَنُوْا لِمَآاَصَابَھُمْ فِيْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَاضَعُفُوْا وَمَاسْتَکَانُوْا، وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ (اٰل عمران:۱۴۹)

اِس آیت کی تفسیر اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ لمااصابھم فی سبیل اللّٰہ یعنی تم کو جو بھی زخم لگے یا دورانِ قتال سختیاں اور پریشانیاں درپیش ہوئیں اور تمہارے کچھ ساتھی قتل ہوجائیں۔

جمال الدین القاسمی نے "مجالس التاویل" میں "وماضعفوا" کی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں یعنی "وہ لوگ جہاد یا دُشمن یا دین کے بارے میں کمزور نہ ہوئے" اُنہوں نے سبیل اللہ کو عام مانا ہے۔(۱)

۱۱- القتال فی سبیل اللّٰہ (اللہ کے راستے میں جنگ کرنا)

۱۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: وَلَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِيْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا، بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّاتَشْعُرُوْنَ۔(البقرۃ:۱۵۴)

۲۔ (البقرۃ:۱۹۰) ۳۔(البقرۃ:۲۴۴) ۴۔(البقرۃ:۲۲۴)

۵۔ (آل عمران:۱۳) ۶۔(آل عمران:۱۵۷) ۷۔(آل عمران:۱۴۴۔۱۶۷)

۸۔ (آل عمران:۱۶۹) ۹۔(النساء:۷۴ تا ۷۶) ۱۰۔(النساء:۸۴)

۱۱۔ (محمد:۴) ۱۲۔ (المزمل:۲۰) ۱۳۔(التوبہ:۱۱۱۔۱۱۲)

---

(۱) مجالس التاویل: ۱۴۸/۲

یہ تمام آیتیں جہاد بالسیف (تلوار کا جہاد) سے متعلق ہیں، لیکن تیسری آیت وقاتلوا في سبیل اللّٰہ کے ذیل میں علامہ قرطبیؒ یوں فرماتے ہیں: ''اِس آیت میں امت محمدیہ سے قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں جو خطاب ہے، اُس قتال میں جمہور کے قول کے مطابق اعلاء کلمہ کی نیت ہو اللہ کے راستے بہت سارے ہیں اور یہ سبیل اللہ عام ہے ارشاد خداوندی ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ (یوسف:۱۰۸) ''(۱)

امام مالکؒ کہتے ہیں: ''اللہ کے راستے بے شمار ہیں۔ ہر راستہ جس کے خلاف یا جس کی تائید میں قتال کیا جائے ان میں اس سب سے اوّلین اور سب سے بڑا وہ دین اسلام ہے''۔

اِن آیات اور ائمہ مفسرین کی توضیح وتشریح کی روشنی میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ انھوں نے فی سبیل اللہ کے اِن تمام آیات کو ان کے عموم پر محمول کیا ہے، کیا ان ائمہ کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے آیات کو عموم پر کیوں محمول کیا ہے؟ یا ان کے بارے میں کسی کو یہ کہنے کی جسارت ہوسکتی ہے کہ انہوں نے (نعوذ باللہ) آیات میں تحریف وتزویر کا ارتکاب کیا ہے؟۔

احادیثِ جہاد کے عام ہونے پر محدثینؒ کے اقوال

اِمام بخاریؒ نے عبایہ بن رفاعۃ سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں: میری ابوعبس سے ملاقات ہوئی میں جمعہ کی نماز کیلئے جا رہا تھا، فرمانے لگے: میں حضورِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: (من اغبرّت قدماہ فی سبیل اللّٰہ حرّمہ اللّٰہ علی النار) جس شخص کے دونوں پیر اللہ کے راستے میں گرد آلود ہوں اس پر اللہ عزّ وجل جہنم کی آگ حرام کر دیتے ہیں۔

امام بخاریؒ (۲) نے اور ترمذیؒ (۳) نے اس روایت کو جمعہ کیلئے جانے کی فضیلت کے تحت ذکر کیا ہے ایسے ہی بیہقیؒ اور منذریؒ نے بھی اس روایت کو اس باب میں ذکر کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سبیل اللہ جہاد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر عملِ خیر کو یہ لفظ شامل ہے۔ ورنہ یہ ائمہ اس روایت کو جمعہ کیلئے جانے کی فضیلت میں کیوں ذکر کرتے؟

چنانچہ علامہ عینیؒ نے اس روایت کے ذیل میں لکھا ہے :

---

(۱) تفسیر القرطبی: ۲۳۶/۳، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔

(۲) بخاری: باب المشي إلي الجمعة، حدیث: ۸۶۵

(۳) ترمذی: فضل من اغبرت قدماہ، ۱۶۳۲، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب صحیح کہا ہے۔

ومطابقته للترجمة أن الجمعة تدخل في قوله "في سبيل اللّـه"

اس حدیث کی ترجمہ الباب کے ساتھ مطابقت اس طرح ہے کہ جمعہ بھی ''سبیل اللہ'' میں داخل ہے اور جمعہ کا حکم بھی جہاد کے مانند ہے۔(۱)

یہی بات عسقلانیؒ نے فتح الباری میں کہی ہے۔(۲)

اگر لفظ فی سبیل اللہ کو عام نہیں مانا جاتا ہے اور اس کی عمومیت کو غلط ٹھہرایا جاتا ہے اور اس طرح کی احادیث کو تمام اعمالِ خیر پر محمول کرنے کو احادیث میں تحریف گردانا جاتا ہے تو نعوذ باللہ ان محدثین اور شارحین کو بھی محرفینِ احادیث میں سے ماننا پڑے گا۔

اِمام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں کتاب الامارہ کے جہاد اور خروج فی سبیل اللہ کی فضیلت کے تحت حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا يكلم احد في سبيل اللّـه۔ واللّـه اعلم لمن يكلم فی سبيل اللّــه إلا جاء يوم القيامة وجرحه يثعب واللون لون دمٍ، والريح ريح مسك "(۳)

''جس کسی کو بھی اللہ کے راستے میں زخم لگتا ہے، اللہ کے راستے میں زخم خوردہ کو اللہ زیادہ جانتا ہے، قیامت کے دن وہ اس حالت میں آئے گا کہ اس کا زخم رس رہا ہوگا، رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی''۔

نوویؒ نے (شرح مسلم) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ذیل میں یوں لکھا ہے:

"واللّـه اعلم بمن يكلم في سبيل اللّـه" اللہ کے راستے میں زخم خوردہ کو اللہ زیادہ جانتا ہے۔اس میں اس کی جانب اشارہ ہے کہ یہ ثواب اس شخص کو حاصل ہوگا جس کی نیت خالص ہو اور اس نے محض اسلام کی سربلندی کیلئے قتال کیا ہو، علماء نے یوں کہا ہے: یہ فضیلت اگرچہ ظاہری اعتبار سے کفار سے قتال کے متعلق ہے، اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو باغیوں، ڈاکوؤں سے قتال کیلئے چلا ہو اور جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی میں لگا ہوا ہو۔(۴)

---

(۱) عمدة القاری : ۲۹۶/۶،دار الكتب العلمية

(۲) فتح الباری : ۳۹۱/۲،دار المعرفة ، بيروت

(۳) صحيح مسلم : باب فضل الجهاد والخروج ،حديث:۱۸۷۶

(۴) شرح مسلم للنووی :۲۲/۱۳،دار احياء التراث العربی ، بيروت

یہ اور اس طرح کی دیگر روایات سبیل اللہ کے عام ہونے اور اس میں تمام وجوہ خیر کے شامل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اِس کی مزید تفصیل رسالہ ''أَوَلَيْسَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّا مَنْ قُتِلَ'' (مطبوعہ اتحاد بک ڈپو دیوبند) میں ملاحظہ کیا جائے۔

حضرت مولانا زکریا صاحبؒ ''فی سبیل اللہ'' کے لفظ کو ہر کار خیر میں شامل ہونے کے متعلق آیات وروایات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''میرا مقصود اس تحریر کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ جو لوگ خروج فی سبیل اللہ صرف جہاد معروف کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں ان کے لئے تنبیہ ہے کہ فی سبیل اللہ کا لفظ جہاد معروف کے ساتھ مخصوص نہیں، تفسیر مظہری میں ''قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کی تفسیر میں لکھا ہے ''عن الإسلام والطاعات'' اسی طرح سے کثرت سے تفسیر مذکور میں سبیل اللہ کی تفسیر طاعات اللہ سے کی گئی ہے، اس لئے طاعات سے جو لوگ روکنے والے ہوں ان پر تشدد میں بھی مضائقہ نہیں، اگر قدرت ہو اور کوئی فتنہ نہ ہو، تعجب اس پر ہے کہ ان اکابر ثلاثہ کے متبعین میں سے کسی کی طرف سے یہ مضمون سنتا ہوں کہ تبلیغ والے خروج فی سبیل اللہ میں جو جہاد کے ساتھ مخصوص ہے، خروج للتبلیغ کو شامل کرتے ہیں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے، بہر حال اس سیہ کار کے نزدیک تو خروج فی سبیل اللہ کی آیات واحادیث میں یہ لوگ اپنے تبلیغی اسفار کو داخل کریں تو نہ کوئی اس میں اشکال ہے نہ تردد ہے اور جہاں تک اس کوتاہ نظر کی معلومات کا حاصل ہے وہ مفسرینؒ کے کلام میں فی سبیل اللہ کا لفظ قتال کے ساتھ مخصوص نہیں پایا، اس لئے اہل تبلیغ کا ان آیات اور روایات سے خروج للتبلیغ جو فی سبیل اللہ کا اعلیٰ فرد ہے پر استدلال بے محل نہیں ہے۔(۱)

حضرت مولانا یونس صاحبؒ جونپوری، شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور اس حوالے سے فرماتے ہیں کہ: ''فی سبیل اللہ'' کے دو اطلاق ہیں:

ایک خاص جہاد اور یہی معنی عند الاطلاق متبادر ہوتے ہیں، اس لئے کہ اہل عرف نے عام طور پر اس میں استعمال کیا ہے، دوسرے ہر وہ کام جو اللہ کے لئے ہو، حضرت شیخ محدث دہلوی شرح مشکوۃ میں لکھتے ہیں: ''وفی سبیل الله كناية عن السعی إلى الجهاد، هو المتعارف فی الشرع، وقد يراد به السعی إلى الحج والرزق الحلال كذا فی حاشية الترمذی''(۲)

---

(۱) جماعت تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات: ۸، از حضرت مولانا زکریا صاحب

(۲) شرح مشكاة لشيخ محدث دهلوی: ۱/۱۹۶

یہ دونوں استعمال حضراتِ محدثینؒ وفقہاء عظامؒ نے بھی کیا ہے، امام بخاریؒ بخاری شریف ”كتاب الجمعة “ (۱۲۴) میں ترجمہ منعقد کرتے ہیں۔”باب المشي إلى الجمعة “، اس میں حدیث ذکر کرتے ہیں:”من اغبرت قدماه في سبيل الله حرمه الله على النار“ بعض شراح نے اثبات ترجمہ میں دور دراز کی تاویلیں کی ہیں، لیکن بندہ کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ بخاری نے فی سبیل اللہ کے لفظ سے استدلال کیا ہے، كما صرح به العيني۔

اوراس سے زیادہ قوی یہ ہے کہ خود صحابی نے فی سبیل اللہ کے مفہوم کو جہاد سے اعم سمجھا ہے، جیسا کہ بخاریؒ کی پوری روایت سے واضح ہے، حضرت ابوعبس عبدالرحمٰن بن جبیر نے فی سبیل اللہ کو جہاد سے عام مرادلیا ہے، اس لئے تو”مشی فی سبیل اللہ “ کی فضیلت کے مقام میں اس حدیث سے استدلال کیا ہے:”من اغبرت قدماه فی سبیل اللہ حرم اللہ علی النار“ پھر آگے فقہاء ومحدثین کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: جب فی سبیل اللہ کا اطلاق جہاد کے ماسوا پر ہوسکتا ہے تو پھر اس عموم میں تبلیغی اسفار کو داخل ماننے میں بظاہر کوئی استبعاد نہیں جب کہ دونوں کی غرض اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہے یعنی جہاد بالسنان اور تبلیغی اسفار جہاد باللسان والبیان ، البتہ جو فضائل خاص طور سے جان فروشی اور سر کٹانے کے بارے میں وارد ہوئے ہیں اس میں ان اسفار کو داخل ماننا اشکال سے خالی نہیں۔(۱)

فتاوی دارالعلوم زکریا میں اس حوالہ سے لکھا ہے:

”تبلیغی حضرات کا جہاد فی سبیل اللہ یا مطلق فی سبیل اللہ کی آیات اور احادیث کو دعوت وتبلیغ پر محمول کرنا بالکل درست اور صحیح ہے ، وجہ یہ ہے کہ محدثینؒ نے بھی اس قسم کی روایات کو کارِ خیر پر محمول فرمایا ہے، ہاں جہاد بمعنی قتال کی نفی جائز نہیں ؛ بلکہ وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ اور دشمنوں کی سرکوبی کا ایک اہم ذریعہ ہے“(۲)

---

(۱) الیواقیت الغالیه فی تخریج الاحادیث العالیة :۴۸/۱-۴۹:ازافادات:حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری مدظلہ۔

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فتاوی دارالعلوم زکریا:۴۵۹/۱،زمزم پلشرز،کراچی

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

کیا دورِ رسالت میں اصحابِ رسول ﷺ کی جماعتیں مسلمانوں میں بھیجی گئیں؟

عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں میں اس طرح کی جماعتیں روانہ کرنے کا رواج نہیں تھا وہاں مسلمانوں کی جماعتیں کفار کے پاس روانہ کی جاتی تھیں تو پھر کیوں کر یہ نیا طریقہ ایجاد کرلیا گیا؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر (بھلائی حکم دینا' برائی سے روکنا) یہ اُمت کا فریضہ ہے۔ اِس فریضہ کی ادائیگی کی جو بھی مباح صورت ہوگی اس کو غلط نہیں کہا جاسکتا، کیا اشاعتِ علمِ دین کیلئے مدارس کا موجودہ طریقہ' مدرسین کو اسباق کی تقسیم، گھنٹوں کی پابندی، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات وغیرہ جو نہایت ضروری باور کئے جاتے ہیں کیا علمِ دین کے نشر کا یہ طریقہ دورِ رسالت میں تھا؟ کیا کتابوں کی تصانیف اور ان کی طباعت شروح وحواشی کے سارے مروجہ طریقے حضور ﷺ کے دور میں تھے؟ کیا کوئی عقلمند یہ کہہ سکتا ہے حضورِ اکرم ﷺ کے زمانے میں توپ اور بندوق سے لڑائی نہیں ہوتی تھی، لہٰذا وہ بدعت ہے، تیروں سے جہاد ہونا چاہیئے، اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس جماعتیں نہیں بھیجی جاتی تھیں، دوسری بات یہ کہ ہر نئے کام کو علی الاطلاق بدعت نہیں کہا جاسکتا ہے، کتبِ احادیث اور صحابہ کے سوانح میں بیسیوں واقعات آپ کو ایسے مل جائیں گے جس میں آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعتوں کو مسلمانوں کی تعلیم واصلاح کیلئے روانہ فرمایا تھا، ہم یہاں بطورِ نمونہ کے چند واقعات نقل کرتے ہیں: حاکم نے عاصم بن عمر بن قتادہؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ :

ان ناسًا من عضلٍ والقارّة وهما حيان من جديلة اتوا النبى ﷺ بعد احد فقالوا ! : إن بأرضنا اسلامًا، فابعث معنا نفرًا من اصحابك يقرء و ننا القرآن ويفقهوننا فى الاسلام ! فبعث

رسول اللّٰہ ﷺ معهم فی ستة نفرٍ منهم مرثد بن ابی مرثد حلیف حمزه بن عبد المطلب وهو امیرهم. (۱)

عضل وقارہ (جو کہ جدیلہ کے دو قبیلے ہیں) کے چند لوگ جنگِ اُحد کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا کہ ہمارے یہاں لوگ اسلام لا چکے ہیں، آپ ﷺ اپنے چند ساتھیوں کو ہمیں قرآن اور دین سکھانے بھیج دیں، آنحضرت ﷺ نے مرثد بن ابو مرثد کی قیادت میں چھ نفر کی جماعت روانہ فرمائی۔

❁ ایک دوسری روایت میں حضرتِ معاذ اور ابوموسی رضی اللہ عنہما کو اہلِ یمن کی تعلیم قرآن کیلئے روانہ کرنے کا ذکر ملتا ہے، ابونعیم نے ''حلیہ الاولیا'' میں ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ:" انّ رسول اللّٰہ ﷺ بعث معاذًا واباموسی الی الیمن وأمرهما ان یعلما الناس القرآن "(۲)

نبی کریم ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ اور ابوموسی رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ فرمایا اور انہیں وہاں تعلیم قرآن پر مامور فرمایا:

❁ ایسے ہی ایک روایت میں ہے حضرتِ عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے قبیلۂ قیس کی ایک جماعت کی طرف بھیجا کہ میں ان کو جا کر دین کی باتیں سکھلاؤں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں وہاں گیا تو میں نے ان کو وحشی اونٹوں کی طرح پایا کہ جن کا مقصد زندگی اونٹ اور بکریاں تھیں میں ان کی یہ حالت دیکھ کر حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں واپس آیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں ان کی غفلت ذکر کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے عمّار! تجھے اس سے زیادہ تعجب کی بات سناؤں، ایک قوم جو دین کو جانتی بھی ہوگی اور ان سے زیادہ غفلت میں ہوگی:"یاعمّار! الا اخبرك بأعجب منهم، قوم علموا ماجهل اولئك ثم سهو کسهوهم"(۳)

(۱) مستدرك حاكم، باب ذكر المناقب مرثد بن ابی مرثد الغنوی، حدیث: ۴۹۷۹، اس روایت کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ذہبی نے اس کو تلخیص سے حذف کر دیا ہے۔

(۲) حلیة الاولیاء: ابوموسی الاشعری: ۲۵۶/۱، دار الکتاب العربی، بیروت، یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے

(۳) ترغیب، فصل عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ، حدیث: ۲۲۰، مع تحقیق ابراهیم شمس الدین، مطبوعة بیروت، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: طبرانی نے اس روایت کو ایسی سند سے نقل کیا ہے جس میں اعور ہیں، جن کی ابن حبان نے توثیق کی ہے۔ (الزواجر: الکبیرة الخامسة والأربعون: ۱۷۹/۱، المکتبة العصریة، بیروت)

ایسے ہی حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مختلف اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کو دینی تعلیم بہم پہنچانے انہیں غفلت و جہالت اور بے خبری سے نکال کر اللہ کی معرفت اور دینی تعلیمات سے آگہی عطا کرنے کیلئے روانہ فرمایا تھا۔ اِس طرح کے متعدد واقعات صحابہ رضی اللہ عنہم کو جماعتوں اور سرایا کی شکل میں روانہ کرنے کے ''حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم'' میں مذکور ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد مسلمانوں کو راہِ ہدایت دکھلانا تھا۔ چند ایک واقعات ہم ذکر کرتے ہیں :

- ابنِ سعد نے حارثہ بن مضرب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ خط جو انہوں نے اہل کوفہ کے نام لکھا تھا پڑھا ہے: حمد وصلوۃ کے بعد! میں نے تمہارے پاس عمّار کو بحیثیت امیر، عبداللہ کو معلّم اور ان کا وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں، یہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے عالم فاضل حضرات ہیں، لہٰذا تم لوگ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا، میں تمہارے واسطے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اپنے سے بڑھ کر تصور کرتا ہوں۔(۱)
- ابنِ سعد ابوالاسود الدؤلی سے ایک دوسری روایت نقل کی ہے، جس میں اپنی بصرہ آمد اور وہاں عمر ابن بن الحسنین ابوالنجید کا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی جانب سے اہل بصرہ کے واسطے علم دین سکھانے کیلئے مامور ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔(۲)
- ابنِ سعد اور حاکم نے محمد بن کعب القرظی سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ:

دورِ نبوت میں پانچ حضرات معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، ابوایوب رضی اللہ عنہ اور ابودرداء رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کا کام کیا تھا۔ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے ان کے نام ایک نامہ ارسال کیا، جس میں انہوں نے اہل شام کی بے شمار آبادی اور ان کی کثرت کا ذکر کیا تھا اور ان کو دین وقرآن کی تعلیم دینے کیلئے چند معلمین کو روانہ کرنے کو کہا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ان پانچ حضرات کو بلایا اور ان سے کہا: اہلِ شام نے چند معلمین کو بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے، کیا تم میں سے تین حضرات اگر چاہو تو قرعہ اندازی کے ذریعے

---

(۱) الطبقات الکبری لابن سعد : ۲۵۵/۳، محقق احسان عباس ، دار صادر ، بیروت

(۲) مجمع الزوائد: باب فی عمران بن حصین، حدیث: ۱۶۰۳۵، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کے رجال صحیح کی رجال ہیں، ابن حجر نے اس کی سند کو اصابہ میں صحیح کہا ہے ۔

سے تعین کے ذریعے اپنے آپ کو پیش کر سکتے ہیں، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تو بوڑھے ہو چکے تھے، ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ بیمار تھے، اس لئے باقی تین حضرات نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر جانے کیلئے تیار کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنے اس تعلیم وتعلم کی ابتداء مقام حمص سے کرو اس لئے کہ وہاں کے لوگ ذہین وفطین ہوتے ہیں، پھر جب کچھ لوگ وہاں کے قابل استعداد ہو جائیں تو تم میں ایک شخص ان لوگوں کو لے دمشق چلا جائے اور ایک ان کے ساتھ فلسطین چلا جائے؛ چنانچہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ وہیں رہے، ابودرداء دمشق چلے گئے، معاذ رضی اللہ عنہ فلسطین روانہ ہو گئے۔(۱)

لہٰذا یہ دعویٰ کہ دورِ رسالت میں مسلمانوں کے درمیان اس طرز تبلیغ کی مثال نہیں ملتی یہ دراصل کتب سیر اور کتبِ حدیث پر قلت نظر کا اثر ہے۔ حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے اس حوالے سے یوں گفتگو کی ہے:

''یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے جماعتیں بھیجنے کا معمول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا، اس لئے یہ بدعت ہے، اس اشکال میں بھی مجھے اہل علم کی طرف سے اس قسم کی کوئی بات پہنچتی ہے تو زیادہ حیرت ہوتی ہے، جب کہ امر بالمعروف والنہی عن المنکر مامور بہ ہے اور دین کی اشاعت کے لئے جو کوشش بھی ہو وہ جہاد میں داخل ہے، پھر یہ کہنا کہ یہ طریقہ خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھا، تو یہ غلط ہے، لیکن بطریق تسلیم مامور بہ کے حاصل کرنے کا جو مباح طریقہ ہو اس کے مامور بہ ہونے میں کیا تامل ہے، کیا مدارس کا موجود طریقہ تدریس، مدرسین کے اسباق کی تقسیم، گھنٹوں کی پابندی، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات وغیرہ وغیرہ جو اس زمانے میں نہایت اہم اور ضروری ہونے کے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی طریقے تھے، ایسے کیا کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں توپ اور بندوق سے لڑائی نہیں تھی، لہٰذا وہ تو بدعت ہے، تیروں سے جہاد ہونا چاہئے، ان امور میں سے کسی کو بھی کوئی بدعت نہیں کہتا اور اس سب کے بعد یہ بھی غلط ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں

(۱) الطبقات الكبرى لابن سعد : ذكر من جمع القرآن علي عهد الرسول :۲/۳۵۷،دار صادر ، بيروت ، التاريخ الصغير : من مات في خلافة أبي بكر ،حديث:۴۳،مكتبة دار التراث ، القاهرة

مسلمانوں کے پاس جماعتوں کے بھیجنے کا طریقہ نہیں تھا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا الحاج محمد یوسفؒ کی کتاب حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم جو اصل کتاب تو عربی میں ہے، اہل علم کو خاص طور سے اس کو ملاحظہ کرنا چاہئے، اس میں ایک مستقل باب ہے ''باب إرسال الصحابة رضی اللہ عنہم إلی البلدان للتعلیم''...... ظاہر ہے کہ کفار کی طرف بھی جماعتوں اور سرایا کو بھیجنا ان کی ہدایت کے لئے ہی تھا اور جب مسلمان دین سے بے خبر اور بے توجہی میں ان کے قریب پہنچ گئے ہوں یا ان سے بھی آگے کفر وارتداد کی طرف بڑھ گئے ہوں تو کیا ان کی ہدایت کی ضرورت نہیں''(۱)

فتاوی زکریا میں تبلیغی جماعت کے مسلمانوں میں دین کی دعوت دینے کے طرزِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اول تو یہ کہ تبلیغی حضرات نے اس تبلیغ کے عظیم کام کو صرف مسلمانوں کے لئے خاص نہیں کیا؛ بلکہ ان کی چلت پھرت اور اس کام کی برکت سے بے شمار غیر مسلموں کو اللہ تعالی نے ایمان جیسی عظیم دولت سے سرفراز فرمایا، بالفرض اگر ہم مان لیں کہ کفار کے پاس نہیں جاتے تو بھی ان کا مسلمانوں کے پاس جانا اور کفار کے پاس نہ جانا یہ آیتِ کریمہ کے خلاف نہیں ہے، بلکہ اس عمل کے ثبوت میں بہت ساری احادیث موجود ہیں، مثلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا، نیز صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کوفہ کی طرف گئی، مسلمانوں کی جماعت کی دعوت کے لئے، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ساتھ اپنی خلافت کے زمانے میں کوفہ کی طرف روانہ فرمایا اور معقل بن یسار رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بصرہ کی طرف تشریف لے گئے اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہ شام کی طرف گئے، اہل اسلام اور مسلمانوں کی دعوت کے لئے تھا، نیز مسلمانوں میں دعوت کا فائدہ بنسبت غیر مسلموں کے جلدی ظاہر ہوتا ہے ''عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰي'' میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ ابن اُمِّ مکتوم کا لحاظ رکھنا قریش کے متکبر سردارں کے

(۱) جماعت تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات: ۹-۱۰، از حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ

مقابلے میں بہتر اور مفید ہے، باوجود اگر کسی کو اشکال ہو تو ان حضرات نے کسی کو روکا تو نہیں ہر ایک اپنے طور پر جا سکتا ہے کفار کے پاس اور تبلیغ کر سکتا ہے راستہ کھلا ہے کوئی روک ٹوک نہیں ہے؛ لہذا ان حضرات کو متہم کرنا صحیح نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (فتاوی محمودیہ: ۱/۴۵۲، فتاوی رحیمیہ: ۶/۳۸۱، جماعت تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات: ۱۲، دینی دعوت اور تبلیغ کے اصول واحکام، منتخب احادیث)''(۱)

یہاں تک تو یہ بات تھی کہ دورِ نبوی ﷺ میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعتیں مسلمانوں کے پاس اصلاحِ اعمال اور دعوتِ دین کی تبلیغ کیلئے روانہ کی جاتی تھیں۔ خود مسلمان بھی جماعت اور وفود کی شکل میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دین سیکھنے کیلئے آتے تھے :

''چنانچہ اس بارے میں وفد عبدالقیس کا قصہ کافی مشہور ہے جسے امام بخاریؒ سمیت تمام محدثین نے ذکر کیا ہے، جب یہ وفد حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا تھا تو اس نے آپ ﷺ سے یہ عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ ﷺ! قبیلہ مضر ہمارے اور آپ کے بیچ حائل ہیں، ہم صرف اشہر حرم میں آسکتے ہیں۔ ہمیں ایمان کے امور بتا دیجئے! تا کہ ہم اس پر عمل کریں اور جنت میں داخل ہو جائیں اور جا کر اپنی قوم کو بتائیں، اس پر حضور ﷺ نے چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے منع فرمایا۔(۲)

اِسی قبیل کا ایک دوسرا واقعہ ہے جسے حاکم نے علقمہ بن الحارث سے نقل کیا ہے کہتے ہیں:

''میں اپنی قوم کے سات آدمیوں کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ: تم کون ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ مومن ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہر قول کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے، تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ پندرہ چیزیں ہیں: جن میں سے پانچ کا تو آپ نے حکم فرمایا تھا اور پانچ چیزیں آپ کے قاصدوں نے بتائیں لمبی حدیث ہے یہاں اس جملہ کی طرف اصل متوجہ کرانا مقصود ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے قاصد قوموں کے پاس جا کر حضور ﷺ کے ارشادات پہنچانے تھے۔(۳)

---

(۱) فتاوی دارالعلوم زکریا: ۱/۴۴۴، زم زم پلشرز، کراچی

(۲) بخاری : باب قول الرجل مرحبا ،حدیث:۵۸۲۲،تحقیق ، مصطفی دیب البغا

(۳) کنزالعمال : الفصل الأول فی حقیقة الایمان ،حدیث:۱۳۶۳،موسسة الرسالة ، بیروت

تبلیغ صرف علماء کی ذمہ داری نہیں!

عموماً یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تبلیغ صرف علماء کا کام ہے،عوام اور جاہلوں کا نہیں، مطلقاً یہ نظریہ بالکل صحیح نہیں، چنانچہ مولانا زکریا صاحبؒ لوگوں کے اس باطل نظریہ کی تردید کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

’’یہ اعتراض دراصل تبلیغ اور وعظ میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، وعظ درحقیقت صرف عالموں کا کام ہے،عوام اور جہلاء کا وعظ کہنا جائز نہیں، اس کیلئے عالم ہونا ضروری ہے؛ تاکہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ شریعت کے موافق ہو، کوئی چیز اس میں قرآن وحدیث کے خلاف نہ کہی جاسکے اور تبلیغ جس کے معنی صرف پیام پہنچانے کے ہیں کوئی پیام کسی کے ہاتھ بھیج دینے کے واسطے اس کا عالم ہونا بالکل ضروری نہیں۔جن اکابر کے کلام میں تبلیغ علماء کے ساتھ مخصوص ذکر کی گئی ہے وہ حقیقت میں تبلیغ کے لفظ کو عام سمجھ کر اس کا اطلاق کردیا ہے، ورنہ نظام الدین کی تبلیغی جماعت پر یہ اشکال بالکل درست نہیں ہوتا، اس لئے کہ ان کی تبلیغ میں صرف چھ نمبر متعینہ بتائے جاتے ہیں، اُن ہی کی مشق کرائی جاتی ہے اور اِن ہی کے پیام کو لے جاکر شہر درشہر ملک درملک بھیجا جاتا ہے‘‘۔(۱)

حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں :

’’جو مسائل منصوص صاف صاف شریعت کے ہیں ان کی تبلیغ صرف علماء کے ساتھ خاص نہیں ہر شخص بآواز بلند کہہ سکتا ہے، امورِ اجتہادیہ (نئے اور جدید مسائل) سے خطاب کرنا البتہ یہ علماء کے ساتھ خاص ہے،عوام اس میں غلطی کریں گے‘‘۔(۲)

حضرت مولانا عبدالباری ندوی صاحبؒ علماء اور عوام کے فریضۂ تبلیغ کے درمیان فرق بتاتے ہوئے یوں فرماتے ہیں :

’’اور یہ تبلیغ یا امر بالمعروف یا نہی عن المنکر صرف علماء ہی کا کام نہیں، البتہ اُس کی دوقسمیں ہیں: ایک خطابِ عام، دوسرے خطابِ خاص: دوسری تقسیم یہ ہے کہ ایک خطاب منصوصات وقطعیات (شریعت کے واضح اور دوٹوک احکام) میں ہوتا ہے

(۱) تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات: ۲۸ (۲) تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات: ۲۸

اور ایک اجتہادیات میں، پس عام بصورت وعظ اور اسی طرح اُمورِ اجتہادیہ میں خطاب ' یہ تو علماء ہی کا کام ہے' مگر انفرادی طور پر ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو نصیحت کر سکتا ہے کہ اس طرح جو مسائل منصوص اور قطعی ہیں ان میں سے ہر شخص بآواز بلند کہہ سکتا ہے مثلاً ایمان لانا فرض ہے، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج فرض ہے، لیکن عالم و عامی سب ہی کو اس معاملہ میں اپنے اپنے فرائض سے اتنی بے پرواہی ہے کہ اولاً تو ان کی طرف توجہ ہی نہیں اور کوئی توجہ دلائے تو طرح طرح کے عذر اور بہانے تلاش کئے جاتے ہیں۔''

اکابر کی ان عبارات کی روشنی میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جو چیزیں شریعت کے قطعی اور منصوص اُمور سے تعلق رکھتی ہیں اس کی تبلیغ علماء کے ساتھ خاص نہیں، ہاں البتہ وعظ کہنا اور امور مجتہد فیہا میں بحث ومباحثہ کرنا یہ صرف علماء کے شایانِ شان ہے۔

دورِ رسالت ﷺ میں عوام اصحاب کو تبلیغ کی اجازت

تبلیغ ہر فردِ اُمت کی ذمہ داری ہے

یہ بات کہ تبلیغ کیلئے صرف عالم کا ہونا ضروری نہیں ہے اس پر بے شمار احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم دلالت کرتے ہیں :

- نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے متعدد اعلانات فرمائے تھے اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ جو حاضر ہیں وہ غائبین کو یہ پیام پہنچادیں؛ حالانکہ حجۃ الوداع میں سوا لاکھ کا مجمع تھا، کیا سارے ہی عالم تھے۔ ان میں سے وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے اس سے پہلے حضور ﷺ کی زیارت بھی نہیں کی تھی۔ چونکہ صرف ایک خاص پیام پہنچانا تھا، اس لئے اس کے واسطے علم ہونے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے آپ نے اس حج کے موقع سے متعدد بار یہ اعلان فرمایا کہ حاضرین غائبین کو یہ پیام پہنچادیں، اِمام بخاریؒ نے '' بَابُ رُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ'' نام سے باب باندھا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جو کم پڑھے ہوں، ایسوں کو پیام پہنچاتے ہیں جو زیادہ پڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اِمام بخاریؒ نے اس میں حضورِ اکرم ﷺ کا یہ پیام نقل کیا ہے کہ تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں تم پر ہمیشہ کیلئے ایسے حرام ہیں جیسا کہ اس شہر میں اس دن میں اور اس مہینے میں،

پھر یہ اعلان فرمایا: جو موجود ہیں وہ غائبین کو میرا یہ پیام پہنچا دیں۔ بہت ممکن ہے کہ جو موجود ہیں وہ ایسے لوگوں تک میرا پیام پہنچا ئیں جو سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں۔(۱) حجۃ الوداع کے موقع سے سوالاکھ کا مجمع تھا، کیا سارے ہی عالم تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اس سے پہلے حضور اقدس ﷺ کی زیارت بھی نہیں کی تھی ،مگر چونکہ صرف ایک خاص پیغام پہنچانا تھا، اس لئے عالم ہونے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی (لہٰذا یہ اعتراض دفع ہوگیا کہ جاہلوں کو علماء کے پاس تبلیغ کیلئے بھیجا جاتا ہے' چونکہ بسااوقات یہ عامی لوگ ہی علماء کو کام پر کھڑے کرنے کے محرک بنتے ہیں)۔

- اِسی طرح اِمام بخاریؒ نے ایک مستقل باب باندھا ہے: " باب تحريض النبی صلى الله عليه وسلم وفد عبد القيس على أن يحفظوا الإيمان و العلم ويخبروا من ورائهم "(حضورِ اکرم ﷺ کا وفد عبدالقیس کو ایمان اور علم کی حفاظت اور اپنے پیچھے لوگوں کو اس کی تبلیغ پر ابھارنا) حضورِ اکرم ﷺ نے اس وفد کو چند باتیں بتائیں اور یہ فرمایا کہ ان باتوں کو محفوظ رکھو اور اپنی قوم میں جا کر ان کو پہنچا دو، (آنحضرت ﷺ کا انہیں اِسلام کے بنیادی اُمور ایمان نماز اس طرح کی دیگر چیزوں کی تلقین کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ عالم نہیں تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے انہیں تبلیغ پر مامور فرمایا۔

- اِمام بخاریؒ نے " باب القراة على المحدث " کے تحت میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے جو گاؤں کے رہنے والے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میرے قاصد نے سچ کہا ہے، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ کے قاصد نے یہ بتایا کہ ہمارے اوپر پانچ نمازیں فرض ہیں، حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سچ کہا، انہوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قاصد نے کہا کہ ہمارے اوپر ایک ماہ کے روزے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ سچ کہا۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے میں ان چیزوں میں سے کسی میں کمی یا زیادتی نہیں کروں گا، یہ کہہ کر وہ آدمی جانے لگا تو حضورِ اقدس ﷺ نے

(۱) بخاری: باب قول النبی ﷺ رب مبلغ اوعی من سامع، حدیث:۸۷،

فرمایا کہ اگر اس نے سچ کہا تو جنت میں داخل ہوگا'' (۱)

اس حدیث میں کمی زیادتی نہ کرنے میں مختلف اقوال ہیں، جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ اپنی قوم کے پاس پہنچانے میں کمی زیادتی نہ کروں گا۔

اب کام پہلے کی طرح نہ رہا !

بہت سے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کام کرنے والوں میں پہلے کی طرح خلوص وللّٰہیت، قربانی اور مر مٹنے کا جذبہ نہیں رہا، پہلے کے مقابل اس وقت کام کے اِن اوصاف سے کارکنانِ تبلیغ خالی نظر آتے ہیں۔ اِس اعتراض کا جواب سمجھنے کیلئے حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی یہ تحریر نہایت ہی چشم کشا اور دلی اطمینان کا باعث ہوگی:

''پانچویں چیز یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ تغیر زمانہ کا عام اثر دنیا کی ہر چیز پر ہے، تو اہل علم اس سے باہر کہاں جا سکتے ہیں زمانہ جتنا بھی زمانہ نبوت سے دور ہوتا جائے گا، اتنے ہی فتنے وشرور اس میں بڑھتے جائیں گے لیکن ہم لوگ اپنے اندر ہر قسم کے ضعف وانحطاط کو تسلیم کرتے ہیں مگر اہل علم کیلئے وہی پہلا منظر چاہتے ہیں اور اسی معیار کو جانچنا چاہتے ہیں؛ حالانکہ دینی انحطاط کی پیشین گوئی خود نبی کریم ﷺ سے منقول ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لا یأتی علیکم عام ولا یوم، إلّا والّذی بعده شرٌّ منه، حتی تلقَوا ربّکم (۲) تم پر کوئی سال اور کوئی دن ایسا نہیں آئے گا جس سے بعد والا سال اور دن اس سے زیادہ برا نہ ہو یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو۔

حضرت علقمہ حضرتِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہ آئے گا جو علم کے اعتبار سے گذشتہ دن سے کم نہ ہو اور جب علماء نہ رہیں اور نیک باتوں کا حکم کرنے والا اور بری باتوں سے روکنے والا نہ رہے گا تو اس وقت سب ہی ہلاک ہوجائیں گے۔(۳)

ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ صلحاء ایک ایک ہو کر اٹھ جائیں گے اور لوگ

---

(۱) بخاری: باب وجوب الزکاۃ، حدیث:۱۳۳۳

(۲) بخاری، باب الفتن، لا یاتی زمان الا الذی بعده شر منه: حدیث:۷۰۶۸،

(۳) فتح الباری، الفتن، باب لا یاتی زمان:۲۱/۱۳، دار المعرفة، بیروت

ایسے رہ جائیں گے جیسے کہ خراب جو (بچے ہوئے) اور خراب کھجور (کیڑا لگی ہوئی) کہ حق تعالیٰ شانہ ان کی ذرا بھی پرواہ نہ کریں گے۔(۱)

اس لئے دین اور دینی امور میں انحطاط، کمی، ضعف تو سب ہی کچھ ہو کر رہے گا، ایسی حالت میں صلاح وفلاح کی سعی کرتے ہوئے جو کچھ موجود ہے، اس کو غنیمت سمجھنا ضروری ہے کہ اس کے بعد اس سے کمی ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔اس زمانہ میں جن آنکھوں نے اکابر کو دیکھا ہے، ان کے فیض وعلوم سے استفادہ کیا ہے وہ ان کے بعد والی نسلوں کو ان جیسا نہ پا کر اعراض اور روگردانی کرتے ہیں۔ (۲)

اِس تحریر کی روشنی میں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ رفتار زمانہ اور دورِ رسالت سے جس قدر بُعد ہوتا جائیگا اتنا ہی دینی امور میں انحطاط اور کمزوری آتی جائے گی، اگر صرف اس کمزوری پر نگارہ رہے گی تو باقی خیر سے بھی محرومی ہو جائے گی۔اس لئے تبلیغی کام کی گذشتہ نوعیت نہ ہونے کی وجہ سے اس سے اعراض خود اپنے لئے نقصاندہ ہوگا۔ دیگر دین کے شعبوں میں تنزُّل ہو رہا ہے۔ایک دوسری جگہ تبلیغ کے بارے میں لوگوں کے اسی اعتراض پر تنبیہ کرتے ہوئے حضرت مولانا زکریا صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں :

”تبلیغ اپنی افادیت، ہدایت اور اصلاح کے درمیان یقیناً ایسی تھی جیسا کہ لوگ بتاتے ہیں لیکن اب موجودہ تبلیغ اس طرز پر نہیں رہی، اس لئے یہ ضلالت وگمراہی ہے، میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا موجودہ دارالعلوم دیوبند اُسی طرز پر ہے جو حضرت نانوتوی قدس سرہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے دور میں تھا؟۔ کیا مظاہر العلوم سہارنپور اب اُسی طریقہ اور اُصول پر ہے جو حضرت مولانا احمد علی صاحب نوراللہ مرقدہ اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نوراللہ مرقدہ کے دور میں تھا؟ کیا موجودہ جمعیۃ علماء ہند وہی جمعیۃ ہے جو حضرت شیخ الہند اور مولانا کفایت اللہ صاحب کے دور میں تھی۔ کیا موجودہ خانقاہیں وہی ہیں جو حضرت حاجی صاحب اور حضرتِ گنگوہیؒ کے زمانے میں تھے اور اگر وہ نہیں ہیں تو کیا ساری ضلالت وگمراہی ہیں؟ تو

---

(۱) بخاری المغازی، غزوۃ الدویبع، حدیث::۴۱۵۶

(۲) الاعتدال فی مراتب الرجال:۱۹۲

کیا سارے ہی ادارے اب ضلالت وگمراہی بن گئے۔ حضور ﷺ کا مشہور ارشاد ہے: میرا زمانہ سب سے بہتر زمانہ ہے، پھر اس کے بعد، پھر اس کے بعد کا زمانہ، پھر اس کے بعد کا زمانہ، اس کے خیر القرون سے جتنا بعد ہوتا جائے گا ظاہر ہے وہ صلاح وفلاح خیر وبرکات ہرگز نہیں رہ سکتی جو سید الکونین ﷺ کے دور میں تھی۔ کیا اب اسلام کو ضلالت وگمراہی کہا جائے گا؟ (۱)

حضرت زہریؒ کہتے ہیں کہ: میں حضرتِ انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دمشق میں حاضر ہوا تو وہ رو رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے کی کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو تم لوگوں نے بدل نہ دی ہو۔ ایک نماز رہ گئی تھی اسے بھی ضائع کر دی۔

بخاری میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: تم لوگ ایسے زمانہ میں ہو، اگر مامور بہ کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دو تو ہلاک ہو جاؤ گے، لیکن عنقریب ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اگر وہ لوگ مامور بہ کے دسویں حصہ پر بھی عمل کر لیں گے تو نجات پالیں گے۔ (مشکوۃ)

مشکوۃ میں بہ روایت ترمذی حضرتِ انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس دن نبی کریم ﷺ کی مدینہ پاک تشریف آوری ہوئی مدینہ پاک کی ہر چیز روشن ہوگئی اور جس دن نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا ہر چیز بے نور ہوگئی اور حضور ﷺ کے دفن کے بعد ہم ہاتھ مٹی سے جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے اپنے دلوں میں تغیّر پایا؛ اس لئے اکابر کے دور کی برکات اور ان کے انوارات کی تلاش اور بعد والوں کو ان کے معیار پر جانچنا نادانی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ (۲)

چِلّہ کی اصلیت قرآن وحدیث سے

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ تبلیغ والے چلہ پر زور دیتے ہیں، حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے محض وہ چلّے پر ہی زور نہیں دیتے بلکہ دین سیکھنے کیلئے وہ وقت لگانے پر زور دیتے ہیں، جس کے پاس جتنا وقت ہو لگائے، اسی لئے ایک دن، دو دن، تین دن، دس دن، بیس دن، چالیس دن، تین ماہ، چار ماہ، سال اور پوری زندگی لگانے کی گذارش کرتے ہیں۔

(۱) جماعت تبلیغی پر اعتراضات کے جوابات: ۱۱۶-۱۱۷

(۲) ترمذی: باب فی فضل النبی ﷺ، حدیث: ۲۶۱۸، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث غریب اور صحیح ہے۔

اگر تبلیغ والے چلے پر زور دیتے بھی ہیں تو کوئی بے اصل چیز نہیں ہے؛ بلکہ حالات کے تغیر اور تبدیلی میں اس کو خاص دخل ہے، نہ صرف اس پر قرآنی آیات، احادیث، بلکہ سلف کا تجربہ اور مشاہدہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے یعنی چالیس دن لگاتار عمل کی بہت برکت اور تاثیر ہے۔ چالیس دن عمل کرنے سے روح اور باطن پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔(۱)

چلّہ کی اصل قرآن سے

قرآن پاک کا ارشاد ہے:وَوَاعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّاَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً (۲)''ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ہم نے اس کی تکمیل دس دن سے کی؛ چنانچہ انہوں نے اپنے رب کی طرف سے متعین چالیس دن کی مدت پوری کر لی'' حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تفسیر بیان القرآن میں اس آیتِ شریفہ کو مشائخ کے چلوں کی اصل قرار دیا ہے چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں :

وفیہ أصل الأربعین المعتاد عندالمشائخ الذی یشاھدون البرکات فیھا یہ آیت شریفہ صوفیوں کے چلوں کی اصل ہے،جس میں وہ حضرات بہت سے برکات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ کے فوائد میں لکھا ہے :

''جب بنی اسرائیل کو طرح طرح کی پریشانیوں سے اطمینان نصیب ہوا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمارے لئے کوئی آسمانی شریعت لائے جس پر ہم دلجمعی کے ساتھ عمل کر کے دکھلائیں۔حضرت موسی علیہ السلام نے ان کی درخواست کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کردیا۔خدا تعالیٰ نے ان سے کم از کم تیس دن اور زائد چالیس دن کا وعدہ فرمایا جب اتنی مدت تم پے بہ پے روزے رکھو گے اور کوہِ طور پر معتکف رہو گے تو تم کو تورات شریف عنایت کی جائے گی۔چالیس دن کی میعاد پوری ہوجانے پر حق تعالیٰ شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو کسی مخصوص وممتاز رنگ میں شرفِ مکالمہ بخشا۔''

---

(۱) تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات: ۱۶-۱۷

(۲) الاعراف :۱۴۲

چِلّہ کی اصل حدیث سے

❁ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے جس کو صاحب مشکوٰۃ نے بخاری اور مسلم دونوں سے نقل کیا ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کی ابتدائی خلقت ماں کے رحم میں چالیس دن تو نطفہ رہتی ہے اور چالیس دن تک خون کا لتھڑا رہتا ہے' پھر چالیس دن تک وہ بوٹی بنا رہتا ہے۔ (اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ تغییر حالت میں چالیس دن کو خاص دخل ہے)۔(۱)

❁ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص چالیس دن اخلاص کے ساتھ ایسی طرح نماز پڑھے کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو تو اس کو دو پروانے ملتے ہیں ایک پروانہ جہنم سے چھٹکارے کا' دوسرے نفاق سے بری ہونے کا۔(۲)

❁ جو شخص چالیس دن کسی مسجد میں نماز ایسی طرح پڑھے کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو تو اس کو جہنم سے آزادی مل جاتی ہے۔

❁ ایک حدیث میں ہے جو شخص میری مسجد میں چالیس نمازیں ایسی طرح پڑھے کہ ایک نماز بھی اس کی مسجد سے فوت نہ ہو تو اس کیلئے آگ سے برات لکھی جاتی ہے اور عذاب سے بری ہونا لکھا جاتا ہے اور وہ شخص نفاق سے بری ہو جاتا ہے۔(۳)

❁ ایک حدیث میں ہے جو شخص میری امت پر چالیس دن تک غلہ روکے اور صدقہ کرے تو اس کا صدقہ مقبول نہ ہوگا۔ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ کہ وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اللہ اُس سے بری ہو گیا۔(۴)

❁ ایک حدیث میں ہے جو اللہ کیلئے چالیس دن تک اخلاص (یعنی اخلاص کے ساتھ اعمال کرے)

---

(۱) صحیح مسلم: باب کیفیة الخلق الادمی فی بطن امه، حدیث:۶۸۹۳

(۲) ترمذی: فضل التکبیرة الأولی، حدیث:۲۴۱، البانی نے اسے حسن کہا ہے، یہ حدیث کئی سندوں سے مروی ہے، جس کا ذکر امام ترمذی نے کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غیر محفوظ ہے اور حدیث مرسل ہے۔

(۳) مسند احمد، حدیث: ۱۲۵۸۳، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو احمد اور طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔

(۴) مسند احمد، حدیث:۶۸۹۳ مع تحقیق شعیب الارنؤط.

کرے اللہ جل شانہ اس کے دل میں حکمت کے چشمے اُبال کر اس کی زبان سے ادا کراتے ہیں۔(۱)

❁ ایک حدیث میں ہے جو شخص کسی نابینا کی چالیس قدم تک دستگیری کرے اس کی مغفرت کردی جائیگی۔

❁ ایک حدیث میں ہے کہ جنت اُس کیلئے واجب ہو جائے گی۔(۲)

❁ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ حالتِ اسلام میں چالیس سال کی عمر دے اس سے جنون، جذام اور برص کی بلاء کو دور کر دیتے ہیں۔(۳)

❁ حضرت حکیم بن حزم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ زمانۂ جاہلیت میں چالیس غلاموں کو آزاد کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے سابقہ اس خیر کی وجہ سے اسلام لائے۔(۴)

❁ جو شخص میری امت سے چالیس حدیثوں کو حفظ کرے تو وہ علماء میں سے ہے۔(۵)

❁ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ان کے صاحبزادے کا اِنتقال ہو گیا تو انہوں نے اپنے آزاد کردہ غلام کریب سے فرمایا کہ دیکھ باہر کتنے آدمی ہیں۔انہوں نے آ کر عرض کیا کہ بہت بڑا مجمع ہو گیا۔تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چالیس ہوں گے، فرمایا جی ہاں، تو حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جنازہ لے چلو۔ میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب مسلمان کا انتقال ہو جائے اور اس کے جنازہ کی نماز چالیس نفر پڑھیں جو اللہ کے ساتھ کسی کو نہ شریک کریں تو اس میت کے حق میں ان کی سفارش قبول ہوتی ہے۔(۶)

چالیس دن کی اثر انگیزی اور حالات کی تبدیلی میں اُس کے خاص اہتمام کا اندازہ اس

---

(۱) مسند الشهاب :من اخلص لله أربعين صباحا ظهرت ينابيع الحكمة من قلبه علي لسانه ،حدیث:۴۶۶،مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت

(۲) مسند ابی یعلی، حدیث: ۵۶۱۳،محقق حسين سليم اسعد

(۳) مسند احمد،حدیث: ۱۳۲۷۹،مسند ابی یعلی : جعفر بنعمر بن امية عن انس،حدیث:۲۹۴۹

(۴) مسلم : باب بيان حكم عمل الكافر ،حدیث:۳۳۸

(۵) مؤطا : باب العلم قبل العمل، حدیث:۲۸

(۶) مسلم : باب من صلى عليه أربعا ،حدیث:۹۴۸

واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پیش آیا تھا۔

حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص ایک عورت پر عاشق ہوگیا اور اس کی محبت میں دیوانہ ہوگیا، وہ عورت بڑی پاکدامن عفیفہ اور سمجھدار تھی، اس نے اس شخص کو کہلوایا کہ چالیس دن تک حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھو اس کے بعد فیصلہ ہوگا، اس نے چالیس دن تک اسی طرح نماز پڑھی تو اس کی کایا پلٹ گئی اور اس کا عشق مجازی عشق حقیقی سے بدل گیا ابھی تک وہ اس عورت کا عاشق تھا، اب اللہ کا عاشق ہوگیا اور عشق بھی ایسا کہ اللہ کی محبت اس کے رگ وپے میں سرایت کرگئی، حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا:"صدق اللہ ورسولہ وأنَّ الصلوة تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر" (بے شک اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا یقیناً نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے)۔(۱)

اِن تمام آیات واحادیث کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ چالیس کے عدد کی خاص اہمیت ہے اور چالیس دن کا روحانی اور باطنی تبدیلی میں خاص اثر ہوا کرتا ہے۔

(ان آیات وروایات اور اس کی تفصیلی بحث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی کتاب ''جماعت تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات: اشکال نمبر:۱۲،ص:۴۳۔۴۴۔۴۵ میں ملاحظہ کیجئے، اوپر ذکر کردہ تمام روایات کو تقریباً حضرت نے چلہ کے ثبوت میں پیش کیا ہے)۔

چار مہینے کی شرعی حیثیت

چار مہینے کو اگر وہ اُصولِ صحیحہ کے مطابق اکابر کی ہدایت کی روشنی میں لگتے ہیں تو اس سے انسانی زندگی میں خاصی تبدیلیاں آتی ہیں، اسلامی مزاج بنتا ہے، پہلے چلے سے تو زنگ دور ہوتا ہے، دوسرے چلے سے رنگ آتا ہے اور تیسرے چلے سے ڈھنگ آتا ہے تین چلے یعنی چار مہینے کی اثر انگیزی، انسانی طبیعت پر اس کے اثرات کا اندازہ اس آیتِ کریمہ سے بھی ہوتا ہے جس میں انسان کی ابتدائی خلقت کے بارے میں بتلایا گیا ہے۔

دیکھئے جب نطفہ رحمِ مادر میں قرار پکڑتا ہے تو پہلے چلہ میں وہ نطفہ علقہ (یعنی بندھا ہوا خون) بنتا ہے اور دوسرے چلہ میں مضغہ (گوشت کی بوٹی) اور تیسرے چلے میں اس مضغہ کے بعض اجزاء کو ہڈیاں بنادیا جاتا ہے اور ان ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے، پھر اس کے بعد (یعنی تین

(۱) فتاویٰ رحیمیہ: ۳۸۴/۶

چلوں کے بعد جس کے چار ماہ ہوتے ہیں) اس میں جان پڑتی ہے۔(۱) ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ اَنْشَأْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (۲)

تین چلے معلوم ہوا کہ چار ماہ میں جسمانی تکمیل کی طرح اگر اُصولِ صحیحہ کا لحاظ ہو تو روحانی تکمیل بھی ہوتی ہے یعنی چار مہینے کے حالات پر اثر انداز ہونے کو اس واقعہ کے ذریعے بھی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے جو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پیش آیا تھا۔عبدالرزاق نے ابن جریج سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک با اعتماد شخص نے یہ بتلایا ہے کہ :

''حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو دورانِ گشت کسی عورت کی آواز سنائی دی جو اس طرح کہہ رہی تھی: رات کافی لمبی ہوچکی ہے، اس کے دونوں اُفق بالکل سیاہ ہوگئے اور اس نے مجھے بیدار کردیا ہے۔ میرا کوئی محبوب نہیں ہے کہ جس سے میں کھلواڑ کروں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر نہ ہوتا، اس جیسی چیز پھر کوئی نہیں ہوتی پھر اس کی وجہ سے اس تخت کے چاروں سمت ہل جاتے''۔

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے اُس سے کہا: تمہیں کیا ہوگیا؟ اس نے کہا: میرا شوہر کئی مہینوں سے میرے پاس موجود نہیں ہے، مجھے اس کی چاہ ہورہی ہے، حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم نے بدکاری کا ارادہ کیا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی پناہ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اپنے اوپر قابو رکھو، ڈاک جانے ہی والی ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور اُن سے کہنے لگے: میں تم سے اپنے ایک اہم معاملے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، تم اُس کے بارے میں مجھے بتانا، کتنی مدت میں عورت کو شوہر کی خواہش ہوتی ہے؟ انہوں نے اپنا سر نیچے کرلیا اور شرما گئیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ عزّ وجل حق بات کہنے سے نہیں حیاء کرتا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے تین مہینے یا چار مہینے بتلایا، حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تحریر روانہ کی کہ فوجیوں کو چار مہینے سے زیادہ روکے نہ رکھا جائے''۔(۳)

---

(۱) بیان القرآن (۲) المؤمنون : ۱۳-۱۴

(۳) مصنف عبد الرزاق : باب حق المرأة علي زوجها ،حدیث:۱۲۵۹۳، تحقیق حبیب الرحمٰن اعظمی

دعوت دینا الگ فرض ہے اور عمل کرنا الگ فرض ہے

بعض لوگ ایسے شخص پر جو خود منکرات میں مبتلا ہے اور لوگوں کو بھلائی واچھائی اور معروفات کی دعوت دیتا ہے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پہلے تم خود عمل کرو پھر دوسروں کو کہو یہ کہاں درست ہے کہ خود عمل نہ کرو اور دوسروں کو نصیحت کرنے لگو، جو لوگ اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ دعوت یہ الگ فرض ہے اور بذات خود اعمال کو انجام دینا یہ ایک مستقل فرض ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خود تو متقی پرہیز گار نہیں ہے، لیکن دوسروں کو دعوت دینا چاہئے' ہاں، جاننے کے باوجود اس کا عمل نہ کرنا اس کی سزا اس کیلئے علیحدہ ہوگی اور عمل کے ساتھ جو دعوت ہوتی ہے وہ موثر زیادہ ہوتی ہے :

عن أنس رضي الله عنه قلنا يارسول الله ﷺ لا نأمر بالمعروف حتى نعمل بـه ولاننهى عن المنكر حتى نجتنبه كلّهٗ فقال! بل مرو بالمعروف وإن لم تعملوا به ونهوا عن المنكر وان لم تجتنبوه كلّه (۱)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم نیک کاموں کو نہ کہا کریں جب تک کہ خود عمل نہ کریں اور نہ برے کاموں سے روکا کریں جب تک کہ خود ان سے نہ بچیں (نہیں) بلکہ نیک کاموں کو کہا کرو اگر چہ نہ کر سکو اور برے کاموں سے روکا کرو اگر چہ خود ان سب سے نہ رُک سکو''۔

اِس حدیث سے یہ پتہ چلا کہ جو عمل نہ کرے اس کیلئے بھی حق نصیحت ہے، وہ لوگوں کو فہمائش کر سکتا ہے اور دعوت دے سکتا ہے، بعض لوگ ایسے شخص کے حوالے سے جو خود تو معروفات (بھلائیوں) کو انجام نہیں دیتا اور منکرات (برائیوں) سے نہیں روکتا دوسروں کو بھلائیوں کا حکم کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ یہ آیت پڑھتے ہیں: " اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ" (۲)

کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو؟

حالانکہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل دوسروں کو نصیحت نہیں کر سکتا' حضرت تھانویؒ تفسیر بیان القرآن میں آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں :

(۱) المعجم الأوسط، حديث: ۶۶۲۸، مطبوعة دار الحرمين القاهرة، المعجم الصغير، حديث: ۹۸۱، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو طبرانی نے اوسط اور صغیر میں روایت کیا ہے اور یہ سند ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد : مرو بالمعروف وان لم تعملوا، حدیث: ۱۲۱۸۴)
(۲) بقرة: ۴۴

''زجرِ عالمِ بے عمل'' کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کاموں کو (نیک کام سے مراد رسولِ مقبول ﷺ پر ایمان لانا) اور اپنی خبر نہیں لیتے، حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی اور اس میں جابجا ایسے عالم بے عمل کی توہین مذکور ہے جو تلاوت کے وقت تمہاری نظر سے گذرتی ہیں تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہم ان مذمتوں کے مصداق بنتے جاتے ہیں''۔

آیتِ مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ بے عمل کو واعظ بنانا جائز نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ واعظِ بے عمل بننا جائز نہیں اور ان دونوں باتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے، البتہ بے عمل عالم وواعظ کیلئے دردناک سزا ہے۔

دین کے شعبوں میں تقابل نہیں، تعاون ہے

اِس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبوں کو جو ایک دوسرے کے معاون ہیں غیر شعوری طور پر مقابل سمجھ گیا طریقۂ کار گرچہ مختلف ہو مگر مقصود سب کا ایک ہی ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی صحیح معرفت کے ساتھ ان کے بتلائے ہوئے احکام انہیں کے اقوال وارشادات کی کامل روشنی میں عمل پیرا ہو یا جائے، لیکن افسوس کہ مقصد اور منزل کے مکمل طریقے سے نگاہوں کے سامنے نہ ہونے نے دین کے ان مختلف شعبہ جات میں سرگرم لوگوں کو آپس میں دست وگریباں کر دیا ہے، ہر شخص اپنے ہی طریقۂ کار کو درست قرار دینے پر تُلا ہوا ہے' حالانکہ یہ تمام شعبہ جات بیک وقت شرعاً مطلوب ہیں۔ کسی شعبہ کو معطل اور بیکار نہیں کہا جاسکتا، مدرسہ کی لائن ہو کہ خانقاہی یا تبلیغی نظام یہ تمام شعبہ جات اور ان کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ہر شعبہ میں کام کرنے والے افراد کی اپنے شعبہ کے تئیں غلو واصرار اور دیگر دوسرے شعبہ جات کو حقیر اور کمتر سمجھنے نے ان کے درمیان ایک بڑی خلیج اور بُعد پیدا کر دیا ہے، لہٰذا ایک شعبہ میں سرگرم شخص دوسرے شعبہ کے کارکن کو وحشت ونفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، حالانکہ دورِ نبوت سے لے کر موجودہ زمانے تک کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے کہ صحیح دین کی خدمت صحیح افرادکاری اور رِجال سازی اور عہدگری کا کام انہیں لوگوں نے انجام دیا ہے جنہوں نے ان دین کے تینوں مختلف اہم شعبوں کو بیک وقت ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ دین کے ان مختلف شعبہ جات کے بیک وقت مطلوب ہونے اور دین کی سرسبزی وشادابی انہیں کے تینوں امور کے ساتھ مربوط ہونے کو بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُمت مسلمہ فرائض نبوت میں سے دعوت خیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں جانشین ہے، اس لئے رسولِ کریم ﷺ کو کارنبوت کے جو تین فرض عطا کئے گئے، تلاوت کے احکام، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ یہ تینوں فرض امتِ مسلمہ پر بطور کفایہ عائد ہیں، چنانچہ قرناً بعد قرنٍ اکابر ائمہ امت نے ان تینوں فریضوں کی ادائیگی میں پوری توجہ اور کوشش مبذول فرمائی ہے اور انہیں کے مجاہدات کا نور ہے جس سے کاشانہ اسلام میں روشنی ہے، نبوت کے یہ تینوں فرض اس آیت میں یکجا ہیں :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ إِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلاً مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحُکْمَۃَ (آل عمران:۱۶۴) ''اللہ عزوجل مؤمنین کے لئے انہی میں سے ایک رسول بھیج کر احسان کیا، جو اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک وصاف کرتا اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیا ہے، لوگوں کو احکام الٰہی اور آیاتِ ربانی پڑھ کر سناتے اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمت ربانی کی باتیں سکھاتے اور اِسی پر اکتفاء نہ کی، بلکہ اپنی صحبت، فیض تاثیر اور طریق تدبیر سے پاک وصاف بھی کیا، نفوس کا تزکیہ فرمایا۔ قلوب کے امراض کا علاج کیا اور برائیوں اور بدیوں کے زنگ اور میل کو دور کر کے اخلاقِ انسانی کو نکھارا اور سنوارا، یہ دونوں ظاہری وباطنی فرض یکساں اہمیت سے ادا ہوتے رہے، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کے تینوں قرنوں تک یہ دونوں ظاہری اور باطنی کام اسی طرح قائم رہے، جو استاذ تھے، وہ شیخ تھے اور جو شیخ تھے وہ اُستاذ تھے۔ وہ جو مسند درس کو جلوہ دیتے تھے وہ خلوت کے شب زندہ دار تھے اور اپنے ہمنشینوں کے تزکیہ وتصفیہ کے بھی ذمہ دار تھے، ان تینوں طبقات میں اُستاذ اور شیخ کی تفریق نظر نہیں آتی ہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جس میں مسند ظاہر کے درس گو، باطن کے کورے اور باطن کے روشن دل، ظاہر سے عاری ہونے لگے عہد بعہد یہ خلیج بڑھتی ہی گئی۔ تاہم اس دور کے بعد بھی ایسی مستثنیٰ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں ہیں جن میں نورِ نبوت کے یہ دونوں رنگ بھرے ہوتے تھے، چنانچہ امام غزالیؒ جن سے علوم معقول ومنقول نے جلوہ پایا، علم حقیقت نے بھی انہیں کے ذریعہ ظہور کیا، حضرت شیخ

ابوالنجیب سہروردیؒ، ایک طرف شیخ طریقت ہیں تو دوسرے طرف مدرسۂ نظامیہ کے مدرس حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ امام وقت اور شیخ طریقت دونوں ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ جن کو علماء ظاہر سمجھا جاتا ہے جیسے حضرات محدثین امام بخاریؒ، ابن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ وغیرہ بھی اسی جامعیت سے سرفراز تھے۔ متوسطین میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کو ناواقف باطن سے خالی سمجھتے ہیں۔ ابن قیم کی مدارج السالکین شرح منازل السائرین وغیرہ کتابیں پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ وہ آرائش ظاہر اور جمالِ باطن دونوں سے آراستہ تھے۔

ہندوستان میں جن بزرگوں کے دم قدم سے اسلام کی روشنی پھیلی وہ حقیقت میں وہی تھے جن کی ذات میں مدرسہ اور خانقاہ کے کمالات کی جامعیت تھی، آسمان دلی کے مہر و ماہ اور تارے شاہ عبدالرحیمؒ سے لیکر شاہ اسماعیل شہیدؒ تک کو آپ ایک ایک کر کے دیکھیں درس و تدریس، دین کی اشاعت و تبلیغ اور قلوب و نفوس کے تزکیہ و تصفیہ کا جو کام انجام پایا وہ بھی اسی ظاہر و جامعیت کے آئینہ دار تھے۔

بعض صاحبوں کو خانقاہ نشینوں کے موجودہ طرز سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خاصانِ حق کا بھی یہی طریقۂ کار رہا ہے (یعنی محض خانقاہی نظام کو تھامے رہنا) حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ ان بزرگوں کی سیرتوں اور تذکروں کو کھول کر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ کہاں کے رہنے والے تھے۔

فیض کہاں پہنچا جو پایا اسے کہاں بانٹا اور کہاں جا کر زیر زمین آرام کیا اور یہ اس وقت کیا جب دنیا ٹرینوں، ٹرکوں، موٹروں اور سفر کے دوسرے سامانِ راحت سے محروم تھی، حضرت معین الدین چشتیؒ سیستان میں پیدا ہوئے، چشت واقع افغانستان سے دولت پائی اور راجپوتانہ کے کفرستان میں آکر حق کی روشنی پھیلائی حضرت، فرید شکر گنجؒ سندھ کے کناروں سے دہلی تک اور دہلی سے پنجاب تک آئے اور ان کے مریدوں در مریدوں میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ اور پھر ان کے خلفاء کے احوال اور ان کے سفر کے مقامات اور ان کے مزارات کی جائے وقوع کو دیکھئے وہ کہاں کہاں ہیں؟ کوئی دکن میں، کوئی مالوہ میں کوئی بنگال میں ہے، کوئی صوبجات متحدہ میں۔ (۱)

(۱) مقدمہ دینی دعوت از سید سلیمان ندویؒ تلخیص، از صفحہ ۱۰ تا صفحہ ۲۴

دعوت وسیاست

ذیل کی تحریر میں بالتفصیل اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اہلِ دعوت کا ''مروجہ سیاست'' میں حصہ لینا کتنا نقصان دہ ہے، اسی طرح ''شرعی سیاست کا'' اسلام میں کیا مقام ہے؟ موجودزمانہ میں مسلم وغیرمسلم ممالک میں نفع بخش ترین حل (قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ وتجربہ کی روشنی میں) دعوت ہی ہے۔

❖ دعوت، سیاست پر مقدم ہے

سب سے پہلے اصول دین ارکان اسلام پر مضبوطی سے عمل آوری اور دین کے تمام اجزاء پر مکمل طریقے سے کاربند رہنے کی دعوت لوگوں پر پیش کی جائے، چونکہ تمام اجزائے دین کومضبوطی سے تھامے رہنے، شریعت کی مکمل پابندی، عبادات کی درستگی اور اس میں درجہ کمال کے حاصل ہونے کے نتیجے میں انسان کے معاملات اور معاشرات دُرست ہوتے ہیں کہ اس میں سیاست وحکومت کے منصب کوسنبھالنے کی صلاحیت ولیاقت پیدا ہوتی ہے، یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جس سیاست وحکومت کی بنیاد دعوتِ دین پر ہوتی ہے وہ نہایت مضبوط اور غیر متزلزل ہوتی ہے، اس کو زوال وانحطاط کے خطرات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا، جہاں سیاست دُنیوی مفادات اور اس کے حقیر اغراض ومقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے تو پھر اس حکومت کے بقاواستمرار کی کوئی گیارنٹی نہیں دی جاسکتی، جو شخص انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور اس حوالے سے ان کی محنت وجدوجہد کی گہرائی کا ساتھ مطالعہ کرے تو یہ حقیقت اس کیلئے واضح ہوجائے گی کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا سب سے امتیازی اور خصوصی پہلو یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس محنت سے دنیوی منافع اور مادّی اغراض کی تکمیل بالکل متمنی نہیں ہوتے تھے، وہ اپنی دعوت سے صرف اللہ کی رضا، اس کے احکامات کی تعمیل اور اس کے پیغام کی نشرواشاعت کے طالب ہوتے تھے، انہوں نے کبھی بھی دعوت کو جاہ وعزت اپنے

اور اپنے پیروؤں کیلئے قوت وطاقت اور مناصب وحکومت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، اگر کسی نبی کو حکومت ملی بھی تھی تو وہ ایک عطیۂ ربانی تھا جو دعوت کی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی جسے وہ دینی مقاصد کی تکمیل اور شرعی احکام کے نفاذ واجراء کیلئے استعمال کرتے تھے انہوں نے اسے معاشرہ اور سماج کی اصلاح اور زندگیوں کے صحیح رخ کے یقین کیلئے بطور وسیلہ کے اختیار کیا ہوا تھا، حکومت کبھی بھی انبیاء علیہم السلام کا مقصدِ اصلی اور مطمحِ نظر نہیں رہی۔

حضورِ اکرم ﷺ نے بھی پہلے دعوت کی محنت سے انسان کے اعمال واخلاق کی دُرستگی کا کام کیا، اس کے جذبات وخیالات کا صحیح رُخ متعین کیا، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تئیس سالہ عہدِ نبوت میں ابتدائی تیرہ سال اس طرح گذرے ہیں کہ نہ ان میں کوئی جہاد ہے نہ حکومت نہ ریاست، نہ کسی قسم کی کوئی جدوجہد، کوئی اگر مارتا اور اذیتیں دیتا ہے تو اس کے جواب میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، اس کے بجائے مسلسل صبر کی تعلیم وتلقین تھی یہ تیرہ سالہ تعلیم وتربیت کے دورانیہ سے جب صحابہ رضی اللہ عنہم گذرے اور ان کے اعمال واخلاق درست ہوئے تو اس کے بعد مدنی زندگی حکومت وسیاست اور جہاد وقتال کا سلسلہ شروع ہوا، ایسا نہیں کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور مدینہ میں آکر زیادہ ہوگئی اس لئے ان لوگوں کی مدینہ آمد کے بعد انہیں جہاد وقتال کا حکم ہوا، مسلمانوں کو ان کے اطراف میں بسنے والے قبیلوں اور ان کی تعداد کے مقابلے میں کیا نسبت؟ ان کی تعداد بعض غزوات میں تو اس قدر کم تھی کہ دوران جہاد ملائکہ کو ان کے ساتھ شامل کیا گیا جب آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اولاً دعوت کی محنت پھر اعمال واخلاق کی درستگی، پھر جہاد وقتال اس طرح تمام مجاہدات سے گذرے تو حکومت حاصل ہوئی۔ اس وقت ہماری یہ حالت ہے کہ خدمت اسلام کا زبانی تو دعوی کرتے ہیں، لیکن ہم سے اکثر اپنے نفس کے واسطے کام کرتے ہیں، چنانچہ اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کراتے ہیں، جو لوگ احکام الٰہی کی پرواہ نہیں کرتے، جائز ناجائز اور حلال وحرام کا جنھیں خیال نہیں ہوتا، ان کے ساتھ حمایتِ الٰہی کیوں کر ہوسکتی ہے، کیسے وہ حکومت کے بل بوتے پر بغیر نصرتِ خداوندی کے احکامِ شریعت کو نافذ کرسکتے ہیں؟

❖ سیاست سے ہماری مراد

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ''مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت'' میں اس

حوالہ سے یوں فرماتے ہیں :

''سیاست سے یہاں ہماری مراد کسی کام کو قوت اور اقتدار سے اور کسی ضابطہ اور نظام کے ذریعہ کرانا ہے اور دعوت سے مراد محض تشویق و ترغیب اور کسی چیز کے منافع اور فضائل بتا کر اس پر شوق سے آمادہ کرنا ہے۔

مولانا (الیاس صاحبؒ) کا ایک مستقل نظریہ، بلکہ اسلامی تاریخ کا مولانا کے ذہن میں ایک خلاصہ تھا کہ امت میں صدیوں سے سیاست کی قوت واہلیت سلب ہو چکی ہے، اب مدتوں پورے صبر وضبط کے ساتھ دعوت کے اُصول پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد مسلمانوں میں نظم واطاعت کی قابلیت اپنے نفس کی خواہشات اور اپنے مصالح ومنافع کے برخلاف کسی ضابطہ اور قانون کی پابندی میں کام کرنے کی قوت پیدا ہوگی، سیاست کی تھوڑی سی مقدار کیلئے دعوت کی بہت بڑی مقدار چاہیئے، دعوت میں جس قدر کمزوری ہوگی اور جس قدر اس مرحلہ میں عجلت اور تیز رفتاری سے کام لیا جائے گا، سیاست میں اسی قدر خامی اور جھول ہوگا، یا تو وہ سیاست وجود میں نہ آسکے گی یا وجود میں آنے کے بعد اس کی عمارت زمین پر آرہے گی۔

واقعہ بھی یہی ہے، خلافتِ راشدہ کی قوتِ امر ونظم اور مسلمانوں کا ضبط ونظام اور تعمیل حکم کی قوت نتیجہ تھی اس طویل دعوت کا جو نبوت کے پہلے سال سے شروع ہو کر خلافتِ راشدہ تک قائم رہی اور بعد کا ضعف اور جماعتی زوال نتیجہ تھا دعوت سے اس تغافل کا جو خلافت بنی امیہ اور بنو عباس میں پیدا ہو گیا تھا۔

مولانا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا فقرہ اکثر وبیشتر دُہراتے تھے جو آپ نے حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ سے بطریق وصیت فرمایا تھا کہ اب اس امت کا کام بطریقِ دعوت ہوگا۔

''مولانا نے کسی ایسی جماعت میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا مقصد محض ضابطہ وسیاست اور افسری وماتحتی کے اُصول سے ہو اور آپ کے نزدیک موجودہ اختلافات، انتشار اور خرابیوں کا سبب ہی یہ تھا کہ دعوت سے پہلے سیاست شروع کر دی گئی ہے اور دینی کام کو مغربی سیاست وتنظیم کے طریق سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے'' (۱)

---

(۱) مولانا الیاس صاحبؒ اور اُن کی دینی دعوت : ۳۰۳-۳۰۴

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ ہندوستان کی سیاسی تحریکات سے بالکل الگ رہے ہیں، اس دوران ایک صاحب نے یہ پیشکش کیا کہ ہم آپ کو امیر المومنین بناتے ہیں' آپ ہماری قیادت فرمائیے، حضرت نے اس پیشکش کا مناسب جواب دینے کے بعد فرمایا :

''سب سے پہلے جو امیر المومنین ہوکر حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ'' دس برس تک سب تحریکیں اور شور وغل بند کرو' ان دس سالوں میں مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی، جب یہ قابل اطمینان ہو جائیں گے تب مناسب حکم دوں گا''۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس اقتباس میں ہماری دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے، اگر آج ہم اپنی سیاست میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم مکی زندگی کے تیرہ سال کی چھلانگ لگا کر پہلے ہی دن سے مدنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔(۱)

اس کے علاوہ دینی تحریکوں اور تنظیموں کے طویل تجربے کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو کوئی دینی تحریک اپنے ابتدائی مراحل ہی میں سیاست کے خارزار میں اپنا قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہے یا کسی جماعت یا پارٹی کا ساتھ دیتی ہے تو اس کا دیگر اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہو جاتا ہے، اسی رسہ کشی میں دعوت کا میدان ہاتھ سے نکل جاتا ہے، مکمل تربیت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ارکان حکومت کے حاصل ہونے پر بسا اوقات نام ونمود اور جاہ ومال کے چکر میں اپنے اصلاحی مقصد سے ہٹ کر اپنی دنیا کے سنوارنے میں لگ جاتے ہیں، اگر حکومت حاصل نہ ہو تو مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہوکر دعوت کی اس جدوجہد سے بیٹھ جاتے ہیں، مصر کی "تحريك اخوان المسلمين" کی مثال ہمارے لئے عبرت وموعظت کا ذریعہ ہے۔اس تحریک کے کارکنان نے جب اس کے ابتدائی مراحل میں سیاست میں عملی قدم نہیں رکھا تھا تو اس تحریک کے انقلابی اثرات دیکھنے میں آئے تھے، عرب ممالک اور وہاں کے باشندوں میں اس نے زندگی کی ایک لہر دوڑا دی تھی، اس کا اصلاحی دائرہ آئے دن مزید وسیع تر ہوتا جارہا تھا، لیکن جہاں اس تحریک نے سیاست میں قدم رکھا، یہ تحریک مختلف قسم کی پابندیوں اور رکاوٹوں کا شکار ہوگئی۔

حضرت مولانا ابوالحسن ندویؒ کو باوثوق ذرائع سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ :

---

(۱) حضرت تھانویؒ کے سیاسی افکار

''امام حسن البنّاء'' اپنی عمر کے آخری دور میں اس پر شدید بے چینی اور قلق کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے وقت سے پہلے سیاست میں کیوں قدم رکھا؟ پھر وہ اپنے ابتدائی نہج پر خالص دعوت واصلاح کے کام کو دوبارہ شروع کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی ایسی اصلاح اور تربیت کریں اور ان کی ایک ایسی جماعت تیار کریں جو کہ متعلقہ ہر ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دے اور اس راہ میں آنے والی ہر مصیبت کو ہنسی خوشی برداشت کرلے۔(۱)

جس کسی بھی اصلاحی اور دینی تحریک میں حکومت اور منصب کی لالچ اور طمع پیدا ہوئی ہے اس کا یہی انجام ہوا ہے۔

حضرت شیخ مولانا الیاس صاحبؒ نے دعوت واصلاح کی اپنی اس تحریک میں مجددِ الف ثانی (المتوفی ۱۰۳۴ء) کا طریقۂ کار اپنایا ہوا تھا کہ اولاً اصلاح کا یہ کام نچلی سطح کے لوگوں سے ہو، جب یہ صلاح وفلاح سے ہمکنار ہوجائیں تو اب اصلاح کا ایک کم درجہ یہ رہ جائے کہ معاشرے میں بڑے لوگوں کی شرارت باقی رہ جائے، پھر یہ نچلی سطح کے لوگ منصب وحکومت کے حامل لوگوں پر اپنے دباؤ اور زور کا استعمال کر کے ان کے شر اور فتنہ کا خاتمہ کردیں اور ان کو خیر وصلاح پر آمادہ کردیں، اس طرح آہستہ آہستہ حکومت کی سطح پر بھی شر اور فساد کا زوال ہوجائے...... چنانچہ مجدد الفِ ثانیؒ کے اصلاحی جدوجہد کے نتیجے میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مغلیہ خاندان جو کہ دین کا کٹر حریف اور اس کے مٹانے کے درپے تھا اس تخت وتاج کا مالک اکبر بادشاہ کی تیسری نسل میں ایک ایسا شخص بنا، جو نہ صرف خود عالم ومتبع سنت تھا، بلکہ اس نے دین کے سب سے بڑے خادم اور حامی کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا تھا یعنی اورنگ زیب عالمگیر جو کہ اکبر، شاہجہاں کی اولاد واحفاد (پوتوں) میں سے تھا۔ یہ وہ حضرت شیخ احمد سرہندی کا لگایا ہوا پودا تھا جب اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر اللہ کے حکم سے پھل دے رہا تھا (تُؤْتِیْ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا) انہوں نے اپنے اس خاموش اِصلاحی جدوجہد کے ذریعہ دین اسلام کی ترقی وکامرانی، احکام شرعیہ کے نفاذ اور مسلم معاشرہ کی اصلاح ودُرستگی کا ایک عظیم دوررس اور انقلابی کارنامہ انجام دیا تھا کہ جس کے اثرات کئی پشتوں اور نسلوں تک دیکھنے میں آئے، صرف حکومت کے حاصل ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے،

---

(۱) فی مسیرۃ الحیاۃ

حکومت پھولوں کا سیج نہیں، بلکہ کانٹوں بھرا گلدستہ ہے، یہ خاموش اصلاح کا عمل اس کے مقابل زیادہ زوداَثر اور دورس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ یہی باریک اور دقیق حکمت ومصلحت کی جانب مشائخ دعوت وتبلیغ لوگوں کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ ہم سیاست سے بالکل کنارہ کش ہوکر، حکومتِ وقت سے بغیر کسی چھیڑخوانی کے اپنے اصلاحی کام کوانجام دیتے رہیں، مبادا ہماری حکومت میں دخل اندازی کا شاخسانہ دعوت وتحریک کیلئے رکاوٹ اور پابندیوں کی شکل میں ظاہر نہ ہو؛ چنانچہ شیخ عمر پالن پوریؒ فرماتے ہیں :

''اگر سیاست وحکومت کی وجہ سے امت کے مسائل حل ہوتے یا دعوت کی محنت کامیابی سے ہمکنار ہوتی تو حضورِ اکرم ﷺ سب سے پہلے قریش کی پیشکش جوآپ سے حکومت قبول کرنے سے متعلق تھی سب سے پہلے قبول فرماتے! بلکہ آپ نے بجائے حکومت کی پیشکش کوقبول کرنے کے یوں فرمایا تھا چچاجان! اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ میں اور چاند کو بائیں ہاتھ میں رکھ دیں' تب بھی دعوت کی اس محنت کو میں نہیں چھوڑ سکتا یا تو اللہ عزّ وجل اس دین کوغلبہ دے دے یا میں اس کی راہ میں ہلاک ہوجاؤں''۔

❖ اِسلام میں سیاست کا مقام

دین وشریعت میں سیاست کا کیا مقام ہے؟ اور دین میں ایک صحیح سیاسی نظام کے قیام کی اہمیت کس درجے میں ہے' عیسائیت نے تو سیاست کو دین سے بالکل علحدہ کردیا' عیسائیت کا یہ باطل نظریہ بہت مشہور تھا:

''قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو''

دین وسیاست کی تفریق اور علیحدگی کا یہی نظریہ عہدِ حاضر میں ترقی کرکے ''سیکولرازم'' کی شکل اختیار کرگیا ہے، ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریئے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلامی تعلیمات ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہیں جن میں سیاست بھی داخل ہے، اس لئے اسلام میں سیاست کو دین سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز نہیں، لیکن بعض لوگوں نے سیکولرزم کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کوسیاسی بنادیا کہنا یوں تھا:

''سیاست کو دین سے الگ نہیں ہونا چاہئے''

لیکن کہا یوں:

''دین کوسیاست سے الگ نہیں ہونا چاہئے''

مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست وحکومت سے بھی متعلق ہیں ایک مسلمان کے ایمان کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح بقدرِ استطاعت سیاست وحکومت سے متعلق ان احکامات پر بھی عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے حاکم کا فرض یہ ہے کہ وہ اسلامی احکام کونافذ کرے اورانہیں احکام کے مطابق حکومت کرے اورعوام کا فرض یہ ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق اس حکومت کے قیام کی کوشش کریں اوراگر وہ قائم ہوجائے تو اس کی اطاعت کریں۔لیکن عہدِ حاضر کے بعض مفکرین اور مصنفین سیکولرزم کی تردید میں اس قدر جوش اور جذبہ کا مظاہرہ کیا کہ انہوں نے سیاست اور حکومت کومقصودِ اصلی اوراس کا حقیقی نصب العین اورتمام انبیاء علیہم السلام کا مطمحِ نظر، بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قراردیا۔اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ دوسرے درجہ کی حیثیت بلکہ انہیں مقصودِ اصلی یعنی ''سیاست'' کے حصول کا ایک ذریعہ اوراس کی تربیت کاایک طریقہ قراردیا۔

اِس اِنتہاپسندی کا ایک تو نقصان یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصویراوراس کی ترجیحات کی ترتیب الٹ کررہ گئی' جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن گئی اور جومقصد تھا وہ غیراہم وسیلہ بن گیا، اس طرزِفکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصدزندگی سیاست اورحکومت کی اصلاح ہوگیا۔اب مثالی انسان وہی قرار پائے گا جواسی کام کواپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر رات ودن اسی کیلئے وقف کردے اور دین کے دوسرے شعبہ مثل طاعات وعبادات زہدوتقویٰ، اصلاح نفس اورخشیت وانابت وغیرہ کی نہ صرف کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی بلکہ جوشخص ان کاموں میں مشغول ہواس کے بارے میں یہ تصور قائم کردیا گیا کہ وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے وہ دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کا مقصدِ اصلی سیاست وحکومت قرار پایا اورعبادات وغیرہ کے احکام کی حیثیت محض وسیلے کی ہوگئی تو ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کومقصد پر قربان کرنا پڑتا ہے اورمقصد کے حصول کیلئے اگر کبھی وسیلے میں اونچ نیچ یا کمی بیشی ہوجائے تو وہ گوارا کرلی جاتی ہے، لہٰذا اس نظریہ کے تحت ارادی یاغیرارادی طور پراس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہوگئی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتاہی ہوبھی جائے تو

قابل برداشت ہوگی، کیونکہ وہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ہوئی ہے۔اس نظریہ کوعوام کے سامنے سیاسی استقلال ''خلافت فی الأرض اور حکومت الٰہیہ'' وغیرہ جیسے خوبصورت عناوین کے ساتھ پیش کیا گیا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ فکر ونظر کا زاویہ بدل چکا ہے اوران خوبصورت اور حسین عناوین کے تحت بہت سی غلطیاں اور نقصانات درآئے ہیں؛ حالانکہ سیاست کو دین کا ایک شعبہ نہیں بلکہ مقصودِ اصلی قرار دینے کی مثال ایسی ہے جیسے تجارت ومعیشت جو کہ دین کا ایک شعبہ ہے، جس کی وجہ سے بہت سے احکام تجارت ومعیشت سے متعلق ہیں، بلکہ کسب حلال کے بے شمار فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اگر ان فضائل کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہے کہ دین کا اصل مقصد ہی تجارت ومعیشت اور کسب حلال ہے تو یہ اتنی بڑی غلطی ہوگی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی کچھ غلطی سیاست وحکومت کے متعلق سرزد ہوئی کہ یہاں پر بھی سیاست وحکومت کو دین کا ایک شعبہ قرار دینے کے بجائے، اس کے فضائل کی بنیاد پر اسے مقصودِ اصلی قرار دیا گیا۔ دین مقصود ہے نہ کہ مروّجہ حکومت وسیاست' ہم یہاں دین میں سیاست کا صحیح مقام کیا ہے اس تعلق سے بحث کریں گے۔حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے :

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِي الْأَرْضِ اَقَامُواالصَّلَاةَ وَاٰتَوُ الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰـهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ (۱)

''وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطاء کریں گے تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوۃ ادا کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دیانات اطاعات مقصودِ اصلی ہیں اور سیاست وجہاد مقصودِ اصلی نہیں ہیں بلکہ یہ اقامت دیانات کا وسیلہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاست وجہاد سب کو نہیں دیئے گئے، بلکہ جہاں ضرورت ومصلحت سمجھی گئی حکومت دی گئی ورنہ نہیں، وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کیلئے دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیت میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانت

---

(۱) الحج : ۴۱

کا وسیلہ ہونا اور خلافت فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آرہا ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ"(۱)

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کیلئے پسند کیا ہے اس کو ان کیلئے قوت دے گا"۔

یہاں پر ایمان اور عمل صالح کو تمکین فی الارض (زمین کی خلافت) کی شرط قرار دیا جا رہا ہے جس سے سیاست کا مقصود اصلی ہونا سمجھ میں آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین اور شوکت وحکومت کا وعدہ کیا گیا ہے، حکومت کا حاصل ہونا دین پر عمل آوری کے نتیجے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا دین پر سیاست وقوت موعود (وعدہ کیا گیا) ہوئی، لیکن موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں ورنہ یہ آیتِ کریمہ:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۲)

اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے نیچے (مراد زمین وآسمان) سے خوب فراغت سے کھاتے۔

اس آیت میں توریت، انجیل اور قرآن پر عمل آوری پر وسعتِ رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے، بلکہ وسعتِ رزق یہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا اور ننگا نہیں رہ سکتا، لہٰذا موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں بھی شوکت وحکومت ایمان وعمل صالح پر موعود ہیں، یعنی ایمان اور اعمال کے نتیجے میں یہ چیزیں حاصل ہوں گی نہ یہ کہ یہ چیزیں مقصود ہیں۔

بہرحال! اس بحث کی روشنی میں یہ پتہ چلا کہ سیاست ودیانت (دینداری) میں سیاست

---

(۱) النور : ۵۵ (۲) المائدة :٦٦

وسیلہ ہے اور دیانت (دینداری) مقصودِ اصلی ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ دین میں سیاست کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصودِ اصلی نہیں اور دینداری خود مقصودِ اصلی ہے۔

الغرض نہ وہ سیکولر نظریہ درست ہے کہ سیاست وحکومت میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ دین کا اصلی مقصد سیاست وحکومت ہے؛ واقعہ یہ ہے کہ دین کا اصلی مقصد بندے کا اپنے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے؛ جس کا مظاہرہ عبادات وطاعات کے ذریعہ ہوتا ہے؛ سیاست وحکومت بھی اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔

ایک جگہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

یادرکھو! سلطنت مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود رضائے رب ہے، اگر ہم سے خدا راضی نہ ہوتو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں، اگر مقصود بالذات ہوتی تو فرعون، ہامان، نمرود، شدّاد بڑے مقرب ہونے چاہئیں؛ حالانکہ وہ مردود ہیں، معلوم ہوا سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق ہو۔

آخر حضرتِ ابراہیم بن ادھمؒ کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے؟ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑی؟ محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا، معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں، بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن اَدھمؒ ہر فن کے امام ہیں، حدیث میں ثقہ اور محدث اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیہ میں تو امام ہیں، جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔

حضرتِ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کیلئے سلطنت مقصود کیلئے مضر اور نقصان دہ نہیں تھی تو ان کو اجازت دی گئی کہ وہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کیلئے مقصد میں مخل تھی اس لئے انھیں سلطنت کا اہل نہیں قرار دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سلطنت مقصود نہیں، اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہوتو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔(۱)

---

(۱) تقلیل الاختلاط مع الانام :۱۶، ۶۲،اشرف الجواب: ۴۵۵-۴۵۴

❖ مسلم ممالک کو اسلامی بنانے کے لئے دعوت ضروری

جس ملک میں مسلمان حکمراں ہوں اور وہ اپنی مملکت کو صد فیصدی اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہوں تو اس کیلئے کیا طرزِ عمل اپنانا ہوگا؟ کس طرز وروش کو اپنانے میں انہیں اپنے اس مقصد میں کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نظر آتے ہیں؟ تو ہم حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ کی اس تحریر کی روشنی میں یہ بتلانا چاہیں گے کہ اس کام کی تکمیل دعوت اور مسلمانوں میں اصلاحی جدوجہد کے ذریعہ ممکن ہوسکتی ہے؛ چنانچہ وہ یوں لکھتے ہیں :

''اس جگہ یہ عرض کردینا بھی اپنی ذمہ داری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کے مزاج' مسلمانوں کی پچھلی تاریخ اور اپنے زمانے کے احوال پر غور کرنے کے بعد ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان خدا کے فضل سے اکثریت میں ہیں اور اس وجہ سے وہاں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے' وہاں بھی حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت بنانے کی سچی خواہش رکھنے والوں کیلئے سب سے پہلا بنیادی کام کرنے کا یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی کو ایمانی اور اسلامی زندگی بنانے کی کوشش کی جائے' اور زندگی کے ایمانی و اسلامی بننے کا مطلب اور اس کا معیار یہ ہے کہ دنیا کی فکر اور محبت پر آخرت کی فکر اور دین کی محبت غالب ہوجائے اور رضائے الٰہی کی طلب اور ثوابِ آخرت کی طمع میں نفس کی خواہشوں کو قربان کرنا ان کیلئے آسان ہوجائے۔ مسلمانوں میں جب تک وسیع پیمانے پر اصلاحی جدوجہد کے ذریعے تبدیلی نہ ہوگی، کم از کم ہمارے اس زمانے میں وہاں کی حکومتوں کا صحیح معنی میں اسلامی حکومت بن جانا ایک خواب ہی رہے گا۔ یہ راستہ گرچہ بے مزہ اور دیرطلب ہے، لیکن راستہ صرف یہی ہے اور اس کے سوا جن راستوں کو لوگ مختصر سمجھ کر آج کل چلنے لگتے ہیں وہ دراصل اس منزل پر پہنچانے والے راستے نہیں ہیں۔ '' یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ'' (۱)

❖ غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے مسائل کا حل بھی دعوت ہے

جولوگ غیر اسلامی اقتدار کے ماتحت رہتے ہیں ان کے اسلامی مسائل کے حل کیلئے رہنمائی

---

(۱) دین وشریعت : ۲۲۵

کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''جن ملکوں میں اقتدار اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے اور وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے ان ملکوں اوران کی حکومتوں کواسلام سے اور مذہب سے بیر بھی نہیں ہے، لیکن ان حکومتوں کا نظام چونکہ غیر اسلامی اور خالص مادہ پرستانہ ہے،اس لئے ان کے بعض قوانین ایسے ہیں جو اسلامی احکام سے ٹکراتے ہیں،ایک خاص پالیسی اپنے حالات کے مطابق ایسی وضع کریں کے انہیں اول وآخر مسلمان اورتاحد استطاعت وامکان اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کے پابند بن کر رہیں گے''۔

آگے فرماتے ہیں :

''ایک چیز جو دینی اور شرعی حیثیت سے ہر مسلمان کیلئے یکساں درجہ میں ضروری ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی علاقہ کا رہنے والا ہو اور اس کی اصل جزا آخرت میں جنت اوراللہ تعالیٰ کی رضا ہے،لیکن غیر اسلامی ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل ومشکلات کوحل کرنے اوران کوعزت واحترام کا مقام دلانے میں اس کوخاص دخل ہے، وہ ایمان ویقین اوراعتماد علی اللہ کی دولت،تقوی یعنی سیرت کی طہارت و پاکیزگی،اللہ تعالیٰ سے خاص رابطہ اورخلق اللہ کی نفع رسانی والی زندگی ہے،ان ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی یہ خاص الخاص ضرورت ہے کہ اپنے اندر یہ ایمانی اوصاف پیدا کرنے اوران اوصاف کواپنے معاشرہ میں عام کرنے کیلئے ہر دوسری چیز سے زیادہ جدوجہد کریں،اگرانہوں نے ایسا کیا توان کیلئے وہ راہیں کھلیں گی جن کا خود ان کوگمان بھی نہ ہوگا،اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید میں،جا بجا اس کی ضمانت دی گئی ہے،اس سلسلہ میں ایک آیت بھی پڑھ لیجئے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْ وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ، لَهُمُ الْبُشْرٰى فِيْ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ، لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱)

جو بندے صاحب ایمان ویقین ہوں اورتقوی ان کا شعار ہو،ان کیلئے فلاح وکامیابی کی بشارت ہے،دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کے سب فرمان پورے ہونے والے اوراٹل ہیں(دنیا اور آخرت کی یہ کامیابی)بڑی فیروزمندی ہے۔

---

(۱) یونس: ۶۴

اِقدامی جہاد کے شرائط مفقود

جہاں تک جہاد کی بات ہے تو یہ ایک قانونی عمل ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہاء نے اس کیلئے کچھ شرطیں ذکر کی ہیں، جب تک یہ شرطیں نہیں پائی جائیں، جہاد کرنا درست نہیں۔

۱- اس سلسلہ میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ جہاد اُن ہی قوموں سے جائز ہے، جن تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو، یہاں اس سلسلہ میں چند روایات کا نقل کرنا مناسب ہوگا:

❁ عن ابن عباس رضي الله عنه قال: ما قاتل رسول الله ﷺ قومًا حتى دعاهم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کسی قوم سے اس وقت تک جہاد نہیں کیا جب تک کہ اُن کو دعوت نہ دے دی۔(۱)

❁ عن علی رضي الله عنه أن النبی ﷺ: حين بعثه لاتقاتل قومًا حتى تدعوهم حضرتِ علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فوج کو بھیجتے ہوئے ہدایت فرماتے تھے، جب تک کسی قوم کو دعوت نہ دے دو اُس وقت تک اُن سے جنگ نہ کرو۔(۲)

اس لئے محدثینؒ نے اپنی کتاب میں "باب الدعوة قبل الجهاد" کا باب قائم کیا ہے، اسی طرح فقہاءؒ نے جہاد سے پہلے تبلیغ دین کو واجب قرار دیا ہے، چنانچہ فقہاءِ حنفیہ میں علامہ برہان الدین بخاریؒ (م:۶۶۱ھ) فرماتے ہیں:

یجب أن یعلم بأن شرط جواز القتال مع الکفرة علی الخصوص أشیاء ثلاثة، أحدها: امتناعهم عن قبول الإسلام ...... حتی أنه إذا لم تبلغهم الدعوة إلیٰ ذلك لامن حیث الحقیقیة ولا من حیث الاعتبار، لا یباح قتالهم إلا بعد تقدیم الدعوة (۳)

---

(۱) مسند احمد، حدیث:۲۰۵۳، ۲۱۰۵، سنن دارمی، حدیث:۲۴۴۴، علامہ زیلعی فرماتے ہیں کہ: اس کو حاکم نے مستدرک میں کتاب الایمان کے تحت ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ: اس کی سند صحیح ہے اور شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، اور اس کو احمد نے مسند میں اور طبرانی نے معجم میں ذکر کیا ہے۔(نصب الرایة: باب کیفیة القتال:۱۲/۶۲)

(۲) مصنف عبد الرزاق، کتاب الجهاد، باب دعاء العدو، حدیث: ۹۴۲۴

(۳) المحیط البرهانی: ۹۴/۴

یہ جاننا ضروری ہے کہ خاص طور پر غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کے جائز ہونے کیلئے تین شرطیں ہیں: ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کردیں،...... یہاں تک کہ جب تک ان کو اسلام کی دعوت نہ پہنچ جائے، نہ حقیقتاً اور نہ تقدیراً، ان کو دعوت پیش کیے بغیر ان سے جہاد جائز نہیں۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: اگر دعوت پہنچانے سے پہلے جنگ کی جائے تو یہ باعثِ گناہ ہے: ”فلو قاتلهم قبل الدعوة أثم للنهي“ (١)

اگر انھیں دعوت دینے سے پہلے اُن سے جنگ کرے گا تو ممانعت کی وجہ سے گنہگار رہوگا۔

غرض کہ جس گروہ سے جہاد کیا جائے، ضروری ہے کہ پہلے اُسے اسلام کی دعوت پہنچائی جائے، خواہ پہلے سے دعوت پہنچائی گئی ہو یا عین میدانِ جنگ میں اُن کو دعوت پیش کی جائے؛ بلکہ جن لوگوں پر پہلے دعوت پیش کی جا چکی ہو، اُن پر بھی اس وقت دوبارہ دعوتِ اسلام پیش کرنا مستحب ہے، جس وقت فوجوں کا سامنا ہو؛ تاکہ پوری طرح حجت تمام ہو جائے۔

٢- جہاد کی شرطوں میں سے دوسری ضروری شرط امیر کا ہونا ہے؛ کیونکہ جہاد ایک اجتماعی عمل ہے نہ کہ انفرادی، چنانچہ حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله ﷺ: الجهاد واجب عليكم مع كل أمير براكان أوفاجرا، والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم براكان أوفاجرا وإن عمل الكبائر (٢)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم پر امیر کی اطاعت واجب ہے، چاہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار اور ہر مسلمان کے پیچھے نماز واجب ہے، چاہے نیک ہو یا برا، اگرچہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو؟

اِس سلسلہ میں علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ فرماتے ہیں:

وأمر الجهاد موكول إلى الامام واجتهاده، ويلزم الرعية طاعته فيما يراه من ذالك (٣)

---

(١) رد المحتار على الدر: كتاب الجهاد ٢٠٨/٦، دار الفکر، بیروت

(٢) ابو داؤد: كتاب الجهاد، باب فى الغزو مع ائمة الجور، حدیث: ٢٥٣٣،

(٣) المغنى: وأمر الجهاد موكول إلى الإمام: ٢٠٢/١

’’جہاد کا معاملہ امام اور اس کی رائے پر موقوف ہے اور وہ جو مناسب سمجھے رعایا کیلئے اس کی اطاعت لازم ہے‘‘۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفي الحديث دلالة على اشتراط الامير للجهاد وأنه لا يصح بدونه لقوله صلی اللہ علیہ وسلم : الجهاد واجب عليكم مع كل امير الخ“ فاذا لم يكن للمسلمين امام فلا جهاد ، نعم ، يجب على المسلمين أن يلتمسوا لهم اميرا، ويدل على أن الجهاد لا يصح إلا بامير (١)

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد کیلئے امیر کا ہونا شرط ہے اور بغیر امیر کے جہاد درست نہیں؛ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”الجهاد واجب ... الخ“ لہٰذا جب مسلمانوں کا امام موجود نہ ہو تو لوگوں کیلئے جہاد نہیں ہے، ہاں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے لئے امیر تلاش کریں اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بغیر امام کے جہاد درست نہیں۔

مولانا عثمانیؒ نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ امیر سے کس صلاحیت اور قوت کی شخصیت مراد ہے؟ یعنی یہ کافی نہیں ہے کہ چند افراد اپنے طور پر کسی کو امیر مقرر کرلیں؛ بلکہ باضابطہ ایسا امیر مراد ہے، جو احکام کی تنفیذ، مظلوم کی انصاف رسانی اور لشکر کی تیاری وغیرہ پر قادر ہو اور اُسے ولایتِ عامہ مطلقہ حاصل ہو۔(۲)

۳- جہاد بالسیف کی شرطوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اسباب ووسائل کے اعتبار سے بظاہر مسلمانوں کا کامیاب ہونا متوقع ہو؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو مکی زندگی میں جہاد کی اجازت نہیں دی گئی؛ بلکہ ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ میں شریک صحابہ رضی اللہ عنہم نے جہاد کرنا چاہا، تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جہاد کی اجازت نہیں دی، چنانچہ علامہ ابن کثیرؒ نے تفسیر ابن کثیر میں یہی بات کہی ہے۔(۳)

---

(۱) اعلاء السنن : ۴/۱۲ (۲) اعلاء السنن :۵/۱۲ (۳) تفسیر ابن کثیر:۳۳۵/۳

اِسی لئے فقہاء نے جہاد کے واجب ہونے کیلئے قدرت واستطاعت کی بھی شرط لگائی ہے،
علامہ علاء الدین کاسانیؒ (م:۵۸۷)فرماتے ہیں :

" لا يفترض إلا على قادر عليه ، فمن لا قدرة له لا جهاد عليه ؛ لأن الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطاقة بالقتال او المبالغة في عمل القتال، ومن لا وسع له كيف يبذل الوسع والعمل؟ فلا يفرض على المعمى والاعرج والزمن والمقعد والشيخ الهرم والمريض والضعيف والذى لا يجد ما ينفق". (۱)

''جو شخص جہاد کرنے پر قادر ہو،اسی پر جہاد فرض ہے،جس کو جہاد کی قدرت نہ ہو،اس پر جہاد فرض نہیں؛اس لئے کہ جہاد جہد (کوشش) صرف کرنے کا نام ہے اور جہد سے مراد جہاد کی طاقت اوراس عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی صلاحیت ہے اور جس کو اس کی طاقت ہی نہ ہو وہ کیسے محنت وعمل کرسکتا ہے؟ لہٰذا نابینا،لنگڑا،اپاہج،معذور،بہت بوڑھا،بیمار،کمزور اور اخراجاتِ جہاد کی گنجائش نہ رکھنے والے پر جہاد فرض نہیں ہے''۔

علامہ حصکفیؒ (م:۱۰۸۸ھ)اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"وفى السراج : وشرط لوجوبه : القدرة على السلاح "(۲)

''سراج نامی کتاب میں ہے:جہاد کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہتھیار پر قدرت ہو''

ہتھیار پر قدرت میں ہتھیار کا حاصل ہونا بھی شامل ہے اور ہتھیار چلانے کی تکنیک بھی شامل ہے اور یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کے ہتھیار دُشمنوں کے ہتھیار کے مقابلہ کے ہوں،مطلق ہتھیار مراد نہیں،توپ اور ٹینک کے مقابلہ میں اگر محض تلوار اور لاٹھی لے کر کوئی شخص چلا جائے تو یقیناً اس کا شمار ہتھیار پر قادر ہونے میں نہیں ہوگا۔اس لئے موجودہ دور میں قدرت واستطاعت میں جنگ کی ٹکنالوجی کے اعتبار سے دشمن کے مقابلہ کی صلاحیت کا حامل ہونا بھی داخل ہے،جس میں ہتھیار، دُشمن کے وسائل واہداف سے واقف ہونے کی صلاحیت، جاسوسی کا نظام وغیرہ سب شامل ہیں؛ کیونکہ موجودہ دور کی جنگ محض افرادی قوت اور چست طاقتور فوجیوں کے ذریعہ جیتی نہیں جاسکتی۔

---

(۱) بدائع الصنائع: فصل فى بيان من يفترض عليه الجهاد :۹۸/۷،دارالکتب العلمیۃ،بیروت

(۲) الدر المختار مع الرد : كتاب الجهاد :۱۲۷/۵،دار الفكر ، بيروت

فقہاء نے اس جنگ میں شرکت کو واجب قرار نہیں دیا ہے، جس میں ہزیمت کا غالب گمان ہو، چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ (م: ۶۲۰ھ) فرماتے ہیں :

”قال احمد : لا یعجبنی أن یخرج مع الامام أو القائد إذ عرف بالهزيمة وتضيع المسلمين وإنما يغزو مع من له شفقة وحيطة على المسلمين “ (۱)

”امام احمد نے کہا: مجھے امام یا سپہ سالار کے ساتھ نکلنا پسند نہیں ہے، جبکہ شکست کھانا اور مسلمانوں کا ضائع ہونا معلوم ہو، جہاد اُس شخص کے ساتھ کرے جس میں مسلمانوں کے ساتھ شفقت اور احتیاط ہو“۔

اسی طرح صاحب فتح الملہمؒ نے کہا:

”مسلم ممالک میں جہاد ہو تو درحقیقت جہاد ہے اور غیر مسلم ممالک میں چونکہ اس وقت عموماً یہ شرطیں نہیں پائی جاتیں اس لئے اِبتدائی جہاد کی اجازت نہیں ہے۔“ (۲)

ہجرت ناممکن العمل

غیر مسلم حکومت کے زیرِ اقتدار مسلمانوں کیلئے دوسرا امکانی راستہ ”ہجرت“ کا ہوسکتا ہے، ہجرت بنیادی طور پر اپنے دین کو بچانے کیلئے ترکِ وطن کرنے کا نام ہے، اسی صورتحال کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے درمیان مسلمانوں کے قیام کو ناپسند فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ” من جامع المشرك وسكن معه، فانه مثله “(۳)

خود قرآن مجید میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو فتح مکہ سے پہلے ہجرت پر قادر تھے؛ لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

(۱) ابو داؤد وسكت عليه : كتاب الجهاد ، باب فى الاقامة بارض الشرك ،حدیث: ۲۷۸۷، البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

(۲) المغنى: مسألة الغزو مع كل بر وفاجر :۲۰۱/۱۰

(۳) دفاعی جہاد کے احکام وشرائط کی تفصیل اس عنوان ” دفاعی اور ابتدائی جہاد کے احکام میں فرق“ ص/۹۴ کے تحت ملاحظہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ ظَالِمِيْ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُوْلَـٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا o إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا o فَأُوْلَـٰئِكَ عَسَى اللّهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّهُ عَفُوًّا غَفُورًا (۱)

''جولوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم زمین میں کمزور ومجبور تھے، فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی، کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، اور یہ بہت بڑا ٹھکانہ ہے، لیکن وہ کمزور مرد وعورت اور بچے جو نہ تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ کوئی راہ پا سکتے ہیں، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اُنھیں معاف کر دے، اللہ عز وجل معاف کرنے والے اور بخشنے والے ہیں''۔

اس آیت اور مذکورہ حدیث کی روشنی میں فقہاء نے ہجرت سے متعلق تین ضروری نکات اخذ کئے ہیں:

۱) پہلا یہ کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کیلئے احکام دین پر عمل کرنا ممکن نہ رہے، تو اب بھی ان کیلئے وہاں سے کسی مسلمان ملک کو ہجرت کر جانا واجب ہے، چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں:

''واما الهجرة عن المواضع التى لايتأتّىٰ فيها أمر الدين فهى واجبة اتفاقًا'' (۲) ''جہاں احکام دین پر عمل نہیں کر سکتے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے''۔

۲) دوسرا یہ کہ ہجرت اُن لوگوں پر واجب ہے جو اپنے وطن میں اپنے دین کے بارے میں خود کو مامون نہیں پاتے ہوں، چنانچہ حافظ ابن حجر (م:۸۵۲ھ) کا بیان ہے:

وهذا محمول على من لم يأمن على دينه (۳)

(۱) النساء: ۹۷-۹۹

(۲) عمدة القارى: فصل الجهاد والسير :۱۴/۸۰،دار احياء التراث العربى

(۳) فتح البارى :باب وجوب النفير، ۶/۳۰۹ دارالمعرفة، بيروت

یہ اس شخص سے متعلق ہے جو اپنے دین کے بارے میں مطمئن نہ ہو۔ابن حجرؒ نے ایک اور موقع پر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ماوردی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر غیر مسلم ملک میں اپنے دین پر عمل کرنا ممکن ہو تو وہاں اپنے قیام کو باقی رکھنا زیادہ بہتر ہے؛ تاکہ وہ وہاں داعیانہ کردار ادا کرسکے، ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ دوسروں کو ہدایت حاصل ہو۔

والحكم يدور مع علته ، فمقتضاه أن من قدر على عبادة الله في أي موضع اتفق لم تجب عليه الهجرة منه والا وجبت، ومن ثم قال الماوردی : اذا قدر على اظهار الدين في بلد من بلاد الكفر ، فقد صارت البلد به دارالاسلام ، فالاقامة فيها افضل من الرحلة لما يترجى من دخول غيره في الاسلام.(۱)

''حکم اپنی علت سے مربوط ہوتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو کسی بھی جگہ اللہ کی عبادت کرنے پر قادر ہو اس پر وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہ ہو، ورنہ ہجرت واجب ہو؛ اسی لئے ماوردی نے کہا ہے کہ اگر غیر مسلم ممالک میں سے کسی ملک میں دین کو ظاہر کرنے پر قادر ہو تو اس کی وجہ سے وہ ملک دارالاسلام بن جاتا ہے، وہاں اس کا قیام کرنا ہجرت کرنے سے افضل ہے؛ کیونکہ اس کی وجہ سے دوسروں کے اسلام میں آنے کی امید ہے''

۳) تیسری بات جو قرآن مجید کی مذکورہ آیات سے صراحتاً ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ ہجرت کرنے پر قادر بھی ہوں، جو لوگ ہجرت پر قادر ہی نہ ہوں، ظاہر ہے کہ ان پر ہجرت واجب نہیں ہوگی: لا يكلف الله نفسا الا وسعها (۲) اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی وسعت کے بقدر ہی مکلّف بناتا ہے۔

پہلے زمانہ میں لوگوں کیلئے دُشمنوں کے درمیان سے نکلنے کا مسئلہ دشوار تھا، اپنے ہم فکر لوگوں کے درمیان بسنے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں تھا؛ کیونکہ آج کی طرح ویزا اور پاسپورٹ کا لزوم نہیں تھا، لوگ اپنی مرضی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے، موجودہ دور میں ہجرت پر قادر ہونا اس وقت متحقق ہوگا، جبکہ وہ اپنے وطن سے نکلنے پر بھی قادر ہو اور کسی مسلمان ملک کی پناہ حاصل ہونے کا بھی اسے یقین ہو، اگر دوسرے ممالک اسے پناہ دینے اور اپنے یہاں اُسے اقامت کا حق دینے کو تیار نہ ہوں تو وہ بھی ہجرت سے عاجز سمجھے جائیں گے۔

---

(۱) فتح الباری : باب هجرة النبی ﷺ: ۲۲۹/۷ (۲) البقرة:۲۸۶

چنانچہ علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ (م:۶۲۰ھ) نے یہی بات اپنی کتاب (المغنی) میں کہی ہے۔(۱)

موجودہ دور میں جو مسلمان غیر مسلم ممالک کے زیر حکومت ہیں، ان کے سلسلہ میں دو نکات قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ آج کل زیادہ تر ملکوں میں جمہوری نظام قائم ہے، جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مذہب لوگوں کا نجی معاملہ ہے اور ہر گروہ کو اپنے عقیدہ اور اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے، دنیا کے اکثر ممالک وہ ہیں، جنہوں نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹ کو قبول کیا ہے اور اس بنیاد پر وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے پر پابند ہیں؛ بلکہ بہت سے غیر مسلم ممالک وہ ہیں جہاں دعوتِ دین کے وسیع مواقع ہیں اور مسلمان اقلیتوں کی کوششوں سے اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے اور عام طور پر مسلمانوں کو اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کے معاملہ میں قانونی تحفظ حاصل ہے؛ بلکہ بہت سے مسلمان، مسلم ممالک سے زیادہ اُن ملکوں میں اپنے لئے امن وعافیت محسوس کرتے ہیں، ظاہر کہ ان حالات میں مسلمانوں کیلئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں؛ بلکہ اگر وہ داعیانہ جذبہ کے ساتھ وہاں مقیم رہیں تو علامہ ماوردیؒ کے بقول ان کا اسی ملک میں مقیم رہنا مستحب ہے۔ ان حالات میں غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کیلئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ مسلم ممالک کی طرف ہجرت کرسکیں لہٰذا موجودہ دور میں علی العموم مسلمان اقلیتیں ہجرت کا راستہ اختیار نہیں کرسکتیں۔

دعوتِ دین......واحد راستہ

تیسرا راستہ جو مسلمان اقلیتوں کیلئے موجودہ حالات میں واحد راستہ ہے وہ ہے دعوتِ دین اور تبلیغ اسلام کا راستہ، ظاہر ہے کہ اس کیلئے زمان ومکان کی کوئی قید نہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ عہد نے دعوت کے وسیع مواقع پیدا کر دیئے ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں کیلئے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا نیا راستہ کھل گیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند نکات قابلِ توجہ ہیں:

- آج دُنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں تبلیغ مذہب کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔
- تعلیمی ترقی کی وجہ سے لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ پہلے لوگ مذہب کے بارے میں زیادہ غور وفکر سے کام نہیں لیتے تھے۔ اب ہر چیز کو عقل ودانش کی کسوٹی پر پرکھنے کا

---

(۱) المغنی: ۱۳/۱۵۱-۱۵۲

مزاج پیدا ہو گیا ہے۔

- رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں آپ ﷺ سے لوگوں کو دور رکھنے کیلئے زبردست پروپگنڈہ کیا گیا تھا، آپ ﷺ کی ملاقات سے روکا جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لوگوں کے اندر اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بارے میں معلومات کی کھوج اور جستجو بڑھ جاتی تھی، اس وقت بھی عالمی سطح پر اسلام کے تعلق سے یہی صورتحال ہے کہ اسلام کو بدنام کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جارہی ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔
- اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اس کی تعلیمات عقل ومشاہدہ اور فطرتِ انسانی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، اس میں ہر قسم کے مسائل کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، یہ وہ چیز ہے جو لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ سکتی ہے۔
- آج دُنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں وہ انسانی مساوات وبرابری کے سلسلہ میں انصاف کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتے، اونچ نیچ اور ذات پات کا نہایت گہرا اور غیر منصفانہ تصور اُن میں موجود ہے، اس کے بالمقابل اسلام ایسا دینِ عدل ہے، جس میں رنگ ونسل اور زبان وعلاقہ کی بناء پر کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ کرامت وشرافت کا معیار تقویٰ ہے۔ یہ چیز بھی لوگوں کے اسلام کی طرف مائل ہونے میں نہایت ہی موثر ہوگی۔
- اس کے علاوہ اسلام نہایت ہی عدل واعتدال والا مذہب ہے، افراط وتفریط سے بالکل پاک اس میں ہر ایک کے حقوق کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، ہر ایک کو اُس کی جنسی صلاحیت اور اُس کے فطری دائرۂ کار میں رکھ کر اُس کے حقوق اُسے عطا کئے گئے ہیں۔

اِن خصوصیات کی بناء پر غیر مسلم ممالک میں اقلیتوں کیلئے وہاں کی حکومتوں کے زیرِ سایہ زندگی گزارنے کے واسطے اصل توجہ دعوتِ دین پر دی جائے تو اس سے نہ صرف دوسری اقوام سے اُنہیں تحفظ حاصل ہوگا بلکہ اِسلام کی اشاعت کی راہیں بھی کھلیں گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بتدریج اِس ملک کی غالب طاقت بن جائیں جیسا کہ ملیشیاء، انڈونیشیا اور بعض دوسرے ممالک میں ہوا ہے۔(۱)

(۱) تلخیص از دعوتِ دین، مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہٗ: ۲۷-۵۷

القول البلیغ فی جماعۃ التبلیغ

یہ رسالہ اسی نام سے عالمِ عرب میں مشہور ہے، جس کے مصنف ابوبکر جابر الجزائری ہیں، اہلِ علم طبقہ ان کی "أیسر التفاسیر"، "عقیدة المومن"، "هذا الحبیب أیها المحبُّ"، "منهاج المسلم"، "رسائل الامام الجزائری" کی کتابوں سے عالمِ عرب میں مشہور ومعروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسجدِ نبوی ﷺ کا دیرینہ، شیریں گو اور مقبولِ عام واعظ بنایا ہے۔

اِس رسالہ میں آپ نے اپنی عقلِ سلیم، گہری بصیرت، وسیع تجربہ کی روشنی میں دعوت وتبلیغ کے بارے میں جو کچھ آپ نے دیکھا اور محسوس کیا اُس کو عام فہم انداز میں لکھا ہے، اگر چہ مراکزِ دعوت سے براہِ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے بعض اُصول کی تفہیم وتشریح میں ذاتی اجتہاد واستنتاج کا دخل ہے، جس سے اِتفاق نہیں کیا جاسکتا، تاہم مجموعی طور پر یہ رسالہ نہایت نفع بخش ہے، اس لئے اِس کو اِس کتاب کے ساتھ شاملِ اِشاعت کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں، بہترین انجام متقیوں کیلئے ہے۔ظالم لوگ زیادتی اور عذاب کے مستحق ہوں گے۔ دُرود وسلام ہو انبیاء علیہم السلام کے خاتم، رسولوں کے اِمام، بنی نوعِ اِنساں کے سردار محمد ﷺ پر اور آپ کے آل واصحاب رضی اللہ عنہم اور اُن کے مخلص پیروکاروں پر جو روزِ قیامت تک آنے والے ہیں۔

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

تبلیغی جماعت کے تعلق سے اِس دور میں تنقیحی اور تنقیدی ہر دو انداز کی گفتگو بکثرت ہونے لگی ہے اور یہ چیز لوگوں کیلئے ہجوم افکار کا باعث ہورہی ہے، اسی وجہ سے میں نے اس کتابچہ کو لکھنے کی زحمت کی ہے۔ اللہ کی ہی طرف تمام امور لوٹتے ہیں۔

تبلیغی جماعت کا آغاز

اِس کام کا آغاز ہندوستان کے دارالحکومت دہلی سے ہوا ہے اور اُس کی ابتداء تیرہویں صدی ہجری کے تیسرے دہے میں حضرت مولانا الیاس بن اسماعیل کاندھلویؒ کے دستِ مبارک سے ہوئی ہے۔

تبلیغی کاز کی اِبتداء کیوں کر ہوئی؟

ہر بامقصد کام خواہ وہ نفع بخش پہلو کا حامل ہو یا نقصاندہ پہلو کا۔ کچھ اسباب و احوال اِس کے وجود و آغاز کے باعث ہوتے ہیں۔ اس کے آغاز کا محرک اِس علاقہ کے وہ احوال جو جہالت و نادانی‘ فسق و فجور‘ اور فساد و بگاڑ کی شکل میں موجود تھے۔ جس سے ساری اُمتِ اِسلامیہ دوچار تھی۔
صورتحال بعثتِ نبوی ﷺ سے پہلے زمانۂ جہالت کی مکمل تصویر کشی کر رہی تھی۔ وہاں کے شہروں کی عمومی صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ عقائد کے بگاڑ، عبادت کے طور طریقوں سے عدم واقفیت، فکری بے راہ روی اور نفسیاتی امراض کے شکار تھے۔ عمومی طور پر تو تمام اِسلامی ممالک اِس قسم کے احوال سے دوچار تھے۔ خصوصاً ہندوستان‘ جہاں مسلمان اِسلام اور اُس کی تعلیمات سے ناواقفیت کی وجہ سے ہندووانہ بت پرستی کو گلے سے لگا رہے تھے۔
اُن بھیانک اور پر خطر احوال میں تبلیغی کاز کی اِبتداء ہوئی۔ اُمید کی جا رہی تھی کہ اس طریقۂ کار کے ذریعہ بحکمِ خداوندی لوگوں کو اِسلام سے ناواقفیت اور اس کی تعلیمات سے دوری کے فتنہ سے بچا کر اُن کو معلومات فراہم کی جائیں گی۔ جس پر عمل پیرا ہو کر وہ لوگ نجات اُخروی سے سرفراز ہوں گے اور تکمیلی مرحلہ سے گذر کر سعادت اور نیک بختی کو حاصل کر لیں گے۔ چونکہ اِنسان اُس وقت تک نہ نجات حاصل کر سکتا ہے اور نہ تکمیلی مرحلہ سے گذر سکتا ہے جب تک اُسے اِسلام کے متعلق صحیح معلومات نہ ہوں اور اُس کی ظاہری اور باطنی تعلیمات پر وہ مکمل طریقہ سے عمل پیرا نہ ہو۔

گمراہ لوگوں کو راہِ ہدایت پر لانے کیلئے تبلیغی جماعت کے اسباب و ذرائع

یہ بات طے شدہ ہے کہ جو شخص بھی کسی ڈوبتے ہوئے کو بچانا یا کسی شخص کو تباہی و بربادی سے دوچار ہونے سے نجات دلانا چاہتا ہو تو اُسے اُس ڈوبنے والے کو ڈوبنے سے بچانے یا تباہی

سے نجات دلانے کیلئے کچھ مفید اور کارآمد ذرائع اپنانے پڑتے ہیں۔اگر یہ بات مسلّم ہے تو تبلیغی جماعت کے پاس ان گناہوں کے سمندر میں غوطہ زن، ہلاکت و بربادی میں مبتلا اشخاص کو بچانے کیلئے کیا اسباب ووسائل موجود ہیں؟۔

ہم ان اسباب ووسائل کے ذکر کرنے سے پہلے بہتر سمجھتے ہیں کہ اُس علاقے کی صورتحال اورنوعیت پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے چلیں اور یہ مشرق ومغرب' شمال وجنوب ہرسمت کی یکساں صورتحال تھی۔قبر پرستی ہرطرف عام تھی۔مختلف ناموں اورعنوانوں سے مختلف عیداورتہوار منائے جاتے تھے۔سنت وفرائض کے چھوٹ جانے اور حرام کردہ چیزوں اور گناہوں میں لوگوں کے ڈوبتے ہوئے ہونے کی وجہ سے فسق وفجور کا ابتلاء عام تھا۔

رہے اسلامی آداب واخلاق تو وہ نماز کے ترک کرنے' نفسانی خواہشات کی اِتباع وپیروی اور فرائض و واجبات سے غفلت ولا پرواہی کے باوجود کیوں کر باقی رہ سکتے تھے؟ اگر وہاں کے شہروں کی مساجد میں تمہارا جانا ہوجائے تو آپ کو وہاں ایسے کھوسٹ بوڑھوں کے علاوہ کوئی نہیں دکھائی دے گا جن کا چراغِ حیات بالکل ٹمٹما رہا ہوگا۔

شہر کے بقیہ مسلمان کہاں چلے گئے؟ یہ لوگ چائے خانوں یا کھیل کود کے میدانوں ، بازاروں ،لغواور بیہودہ مجالس اور بری جگہوں میں خوش گپیوں اور دل لگی میں مصروف نظر آئیں گے، انہیں دیکھ کر محسوس ہی نہیں ہوگا کہ یہ مسلمان ہیں۔

جس معاشرہ میں غفلت ولاپرواہی کی فضا چھائی ہوئی تھی' جہاں جہالت ونادانی کی حکمرانی عام تھی' جہاں خواہشاتِ نفس کی اِتباع وپیروی کو قانونی چھوٹ حاصل تھی' جہاں لوگ شہوت پرستی کے سمندر میں غوطہ زن تھے' تبلیغی جماعت کے بانی حضرت محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو بذاتِ خود ان پُرخطر احوال کے مناسبِ حال وسائل وذرائع کو تلاش کرنا تھا تا کہ جہالت وتاریکی' ظلم وستم' فسق وفجور اورکفر وشرک کی کھائی میں پڑے ہوئے لوگوں کو بچایا جاسکے۔ چنانچہ اللہ عزّ وجل نے نہایت ہی کارآمد اور مفید طریقۂ کار کی جانب اِن کی رہبری فرمائی۔اس طریقۂ کار کے ذریعہ اللہ عزّ وجل نے بے حساب لوگوں کو اس غلط راستہ سے بچالیا۔ ایمان کی کمزوری سے نکال کر اس میں تر وتازگی اورتوانائی عطا فرمائی۔اسلام سے ناواقفیت اور جہالت کی تاریکی سے نکال کر اس کی معرفت کی روشنی سے نوازا، لاپرواہی کی تباہی وبربادی سے نکال کر خودشناسی اور خداشناسی کے قلعہ میں اُنہیں محفوظ

فرمایا۔فسق وفجوراورنافرمانی وسرکشی سے بچاکراللہ عزّ وجل کی اِطاعت شعاری پرانہیں لگادیا۔

اب ان وسائل کو بیان کیا جارہاہے جن کواختیار کرنے اوراُس کے مطابق عمل پیرا ہونے کیلئے اللہ عزوجل نے اپنے بندے محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی کی۔جس کے نتیجہ میں بہت سارا خیر وجود میں آیا۔ یہ ایسا حکیمانہ اوردانشمندانہ تربیتی نظام ہے کہ جس کی مثال کہیں دیکھنے کونہیں ملتی۔ چونکہ یہ نظام نہایت ہی مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ یہ ایسا عجیب وغریب نظام ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں محض چھ چیزیں شامل ہیں۔انہیں عناصر ودفعات کو چھ صفات سے تعبیر کیا جاتا ہے:

۱-سب سے پہلی چیز ایمان

اس بات کی مکمل گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں:(کلمہ توحید) اور یہ اس طرح ہوگا کہ صرف ایک اکیلے خدا کے حضور ﷺ کے بتائے ہوئے مختلف طریقوں کے مطابق عبادت واطاعت کی جائے۔

۲- کامل خشوع وخضوع والی نماز

یعنی پورے فرائض وواجبات کی مکمل رعایت کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔اس میں مکمل خشوع وخضوع کی تاکید اس وجہ سے ہے کہ چونکہ یہ نماز کی روح ہے۔نماز کی مشروعیت کا جوفائدہ ہے‘ وہ بے حیائیوں اور برائیوں سے روکنے والی بنے اور یہ اس کے اہتمام کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا ۔ہم یہ بھی جانتے ہیں بیشتر نمازی ایسے ہیں کہ ان کی نماز انہیں بے حیائی اور برائیوں سے نہیں روک پاتی، چونکہ اس میں اللہ عزّ وجل کی طرف رجوع اور جھکاؤ کی مطلوبہ کیفیت نہیں ہوتی۔

۳- علم وذکر

یعنی شریعت کے ضروری علم کا حصول اوراس پرعمل پیرا ہونا، ذکر کے لفظ کا یہی مطلب ہے؛ چونکہ معلومات کومعمولات بنالینے کا نام ہی ذکر ہے، بغیرعمل کے علم یہ توغفلت ولاپرواہی ہے، ہم تو ایسے علم سے جوغیرنفع بخش ہواور ایسی دعا سے جوشرفِ قبولیت سے سرفراز نہ کی جائے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

۴- اِکرامِ مسلم

مطلب یہ کہ مسلمان کی عزت اور مقام ومرتبہ کی دوبارہ بحالی ہو جو عرصہ دراز سے بالکل ناپید ہو چکی ہے۔ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا ایسا دشمن بنا ہوا ہے کہ وہ اسے جسمانی تکلیف پہنچانے اور اس کے جان' مال اور عزت پر تک دست درازی کرنے سے نہیں چوکتا۔ مسلمان کی ماں، بہن، پھوپھی اور خالہ سے بدکاری کا مرتکب ہوتا ہے، یہاں تک کہ صورت حال مسلم ممالک میں بھی ہے۔مسلمان کا احترام یہ ہے کہ اسے قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھا جائے بایں طور کہ اسے ایذا نہ پہنچائی جائے اور بقدرِ وسعت وطاقت اس کے ساتھ حسن سلوک والا معاملہ کیا جائے، اس قسم کے اخلاق وبرتاؤ کو مسلمانوں نے ایک عرصہ سے چھوڑ دیا ہے، بہت کم اس قسم کے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

۵- اخلاصِ نیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے ہر عمل کو محض اللہ عزوجل کی خوشنودی اور رضا کے حصول کیلئے انجام دے۔اس کے ہر قول وفعل اور عمل میں اللہ عزوجل کی رضامندی کا جذبہ کارفرما ہو۔قرآن وحدیث میں بھی اس قسم کے اخلاص کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

۶- دعوت اِلی اللہ

دعوتِ اِلی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ عزوجل پر ایمان لانے اور قرآن وحدیث کے بیان کردہ طریقے کے مطابق' اس کی اور رسولوں کی اطاعت شعاری اور وفاداری کی دعوت دی جائے۔

مبلغین کے استعمال کا طریقۂ کار اور ان کے دعوتی وسائل

ان لوگوں نے اسباب ووسائل کے طے کر لینے، اس کی اثر انگیزی کو جانچ اور پرکھ لینے اور ان کی نافعیت اور افادیت کا اندازہ کر لینے کے بعد، اس کے استعمال کی راہیں تلاش کرنے اور اس علم نظری کی عملی تطبیق ونفاذ کی کھوج شروع کر دی اور اللہ کے فضل سے انہوں نے مندرجہ ذیل طریقۂ کار ڈھونڈ لیا۔ جس کو نمبر وار ذکر کیا جاتا ہے :

مسجد، یہی دعوت کا مرکزی میدان ہے

ان لوگوں نے داعیوں کے سرداران کے اِمام ''محمد ﷺ'' کی اِتباع وپیروی میں اِسی طریقۂ کار کو اپنایا ہے، جس وقت آپ ﷺ نے مقامِ قباء میں بنی عبدالدار کے یہاں ٹھہرنے کے بعد اپنے دعوت کے کام کیلئے مسجدِ قباء کی بنیاد رکھی تھی ایسے ہی جس وقت آپ ﷺ کی اونٹنی آپ ﷺ کے نانیہالی رشتہ دار بنونجار کے محلّہ میں بیٹھ گئی تھی تو آپ ﷺ نے یہاں بھی سب سے پہلے مسجد کیلئے منصوبہ بندی کی تھی اور اپنے دعوت کے کاز کیلئے اس کی تعمیر شروع فرمادی تھی۔(۱)

تبلیغی جماعت نے مسجد کو اپنی دعوت کیلئے بطورِ مرکزی مقام کے استعمال کیا ہے۔اب تبلیغی جماعت کا سارا دورانیہ ایک مسجد سے دوسری مسجد تک ہوگا۔مسجد سے ہی جماعت جائے گی اور مسجد کو ہی واپس لوٹے گی۔انہوں نے اپنے دعوت کے کام کیلئے جس مسجد کو بنایا تھا۔بطورِ حسن ظن اور فال نیک کے اس کا نام ''مسجدِ نور'' (۲) رکھا تھا' حقیقت میں یہ مسجد روشنی کا منارہ ثابت ہوئی۔

اِسلام میں مساجد کو روشنی اور اس کے کرنوں کیلئے پاور ہاؤز کی حیثیت حاصل ہے۔چونکہ علم بھی یہیں سے حاصل کیا جاتا ہے اور مختلف عبادتیں نماز، ذکر واذکار، دُعاء، وتلاوۃ کتاب اللہ کے ذریعہ روحانی تزکیہ اور اِصلاحِ باطن کا کام بھی یہیں سے انجام پاتا ہے۔مساجد میں ہی آدابِ زندگی سیکھے جاتے ہیں اور حسن اخلاق کا درس بھی یہیں سے لیا جاتا ہے۔چونکہ مسجدیں خاموشی اور سکون ووقار کی غماز ہوتی ہیں اور یہاں روحانی پاکیزگی اور جسمانی طہارت بیک وقت حاصل ہوتی ہے۔ہفتہ واری چھٹی کی رات دعوت کے ساتھی مسجد میں اکٹھا ہوتے ہیں اور اپنے اہل وعیال' اور نرم گرم بستروں کو چھوڑ کر' اپنے رب کی طرف کامل توجہ وانہماک کے ساتھ مسجد میں (بہ نیتِ اعتکاف) شب گذاری کرتے ہیں' جبکہ اسی رات میں غافل اور لاپرواہ لوگ بیکاری اور فضولیات میں لگے رہتے ہیں، بالکل فجر کے قریب سوتے ہیں، پھر دن چڑھے اُٹھتے ہیں، انہیں نہ نماز سے کوئی مطلب ہوتا ہے نہ اللہ کی یاد سے کوئی سروکار۔

---

(۱) حیاۃ الصحابہ:۳

(۲) یہ نام کوئی خاص علامت یا تبلیغی مراکز کی شناخت کیلئے نہیں طئے کیا گیا بلکہ مدینہ پاک میں جس مسجد کے قریب مولانا سعید احمد خان صاحب مکیؒ کا قیام تھا اور وہی مسجد گویا مرکز بنی ہوئی تھی اس کا نام ''مسجدِ نور'' تھا، کچھ علاقوں میں بعض کارکنانِ دعوت نے ذاتی طور پر اپنے مراکز کو ''مسجدِ نور'' سے موسوم کرلیا۔

مسجد میں ان کے اس اعتکاف کی رات میں سونے سے پہلے ان میں سے ایک باصلاحیت وتجربہ کار شخص کھڑا ہوکر انہیں نصیحت کرتا ہے، انہیں ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے اور ان سے اپنے کچھ وقت اللہ کے راستے میں قربان کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور اللہ کی یاد اس کے اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے غافل اور لاپرواہ لوگوں کو دعوت دینے کیلئے ان لوگوں سے اللہ کے راستے میں نکلنے والوں کی فہرست میں نام اندراج کروانے کا بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ عزوجل انہیں کے ہاتھوں اُن لوگوں کی ہدایت کا سامان کردے، اس بارے میں ان کی نظر حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی پر ہوتی ہے: " فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ أَنْ يَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ " (۱) اللہ عزوجل تیرے ذریعہ کسی ایک کی ہدایت کا سامان کردے، یہ سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔

فجر کی نماز کے بعد انہیں میں سے ایک شخص جسے دعوت کے میدان میں بکثرت لگے رہنے کی وجہ سے کافی تجربہ اور مہارت ہوتی ہے، ان لوگوں سے جنہوں نے اپنے فارغ اوقات کو سامنے رکھ کر اپنے نام لکھائے ہیں، ان سے بات کرتا ہے، ان میں سے کچھ تو محض ایک دن کیلئے نام لکھائے ہوتے ہیں، کچھ زیادہ دنوں کیلئے۔

یہ باتیں جو اللہ کے راستہ میں نکلنے والوں سے کی جاتی ہیں انہیں ''ہدایات'' کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خلوص نیت اور دعوت' سفر' مساجد میں ٹھہرنے' ساتھیوں کے ساتھ حسن معاشرت' امیر جماعت کی کامل تابعداری' ان تمام امور کا جماعت کے نکلنے سے لے کر اس کی واپسی تک پاس ولحاظ کیا جائے۔

مربی کی بات ختم ہونے کے بعد ہر جماعت اپنے امیر کے ساتھ جڑ جاتی ہے، وہ انہیں صبر وطاعت اور فرمانبرداری واخلاص نیت کی تاکید کرتا ہے، پھر امیر اُن کی وصولی اکٹھا کرتا ہے، یہ

---

(۱) صحیح بخاری، باب مناقب علی بن ابی طالب اور بعض حدیث کی کتابوں میں یہ الفاظ ہیں: لان یهدی اللّٰه بك رجلا واحدا خیر لك من الدنیا وما فیها . (المغني عن حمل الاسفار، ابوالفضل عراقی، کتاب ذم الجاه والرحياء) اور محمد بن یوسف صالحی دمشقی نے "لأن یهدی اللّٰه بك رجلا واحدا خیر لك مما طلعت علیه الشمس او غربت (سبل الهدیٰ والرشاد فی سیرة خیر العباد، الباب الثانی والسبعون، فی سیرة علی ابن ابی طالب الی الیمن المرة الثانیة)" نقل کیا ہے۔

بابرکت زادِراہ ہوتا ہے، یہ کوئی زیادہ پونجی نہیں ہوتی؛ چونکہ یہ پونجی بالکل معمولی ہوتی ہے، پھران میں دو شخص سفر کیلئے سواری کے انتظام کیلئے متعین ہوتے ہیں، پھر جس وقت یہ لوگ اپنا سفر شروع کرتے ہیں تو سفر سے متعلق منقول دعائیں پڑھتے ہیں، پھر دوران سفر کچھ قرآن کریم اور آداب واخلاق سے متعلق کچھ حدیثوں کا مذاکرہ ہوتا ہے جب یہ لوگ جس بستی میں جانا ہوتا ہے پہنچ جاتے ہیں تو فوراً وہاں کی مسجد کا رُخ کر لیتے ہیں۔تحیۃ المسجد کی ادائیگی کے بعد دعوت کے کام کے نظام الاوقات' اگلے چوبیس گھنٹوں کی ترتیب یا موجودہ وقت سے کل اس وقت تک کے نظام العمل طے کرنے کیلئے بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں۔نظام العمل ان اُمور پر مشتمل ہوتا ہے:

○ پکوان

جو شخص پکوان کرتا ہے اس کے تعاون کیلئے دو یا تین شخص ہوتے ہیں۔

○ وقت کا تعین

مسجد کے امام صاحب' پولس اسٹیشن' شہر کے حاکم' محلے کے سربراہ اور گاؤں کے چودھری سے ملاقات کیلئے وقت طے کیا جاتا ہے اور مقررہ وقت میں یہ کام انجام دیئے جاتے ہیں۔اس ملاقات کا مقصد ان کی دل بستگی، شکوک وشبہات کا ازالہ اور ذمہ داروں کے احترام کی بجا آوری ہوتی ہے۔

○ تعارفی بات

ظہر کی نماز کے بعد مصلیوں میں جماعت کا تعارف ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کے دینی بھائی ہیں۔ان سے کچھ بھی دنیاوی غرض وابستہ نہیں ہے۔ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں سے ملاقات ہو جائے۔ان سے کچھ محبت و ہمدردی والی گفتگو ہو' پھر ان سے کچھ جان پہچان والی بات ہو جائے اور اللہ عزوجل کی یاددہانی اور اس کے اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری پر آمادہ کر کے ان کے تزکیۂ نفس اور تطہیرِ قلب کے واسطے ان کے ساتھ اللہ کے راستے میں نکلنے کا مطالبہ کیا جائے۔

○ گشت کی بات

عصر کی نماز کے بعد تھوڑی سی بات ہوتی ہے، پھر گشت کے آداب بیان کئے جاتے ہیں،

پھر مغرب سے ایک گھنٹہ پہلے یہ لوگ بازاروں، دُکانوں اور لوگوں کی بیٹھکوں میں جا کر ان کے سامنے اللہ کی ذات وصفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور انہیں نماز مغرب کے بعد بیان میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

دوسرا کام ''گشت کی ترتیب''

اس تبلیغی جماعت کے دعوت کے وسائل واسباب ہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ گشت کیلئے ایک امیر، ایک رہبر اور ایک متکلم طے کر لیتے ہیں، جس وقت یہ لوگ گشت میں نکلتے ہیں تو ایک شخص مسجد میں بیٹھ کر' ان کی دعوت کے صلاح وفلاح اور کامیابی' اس کے مفید اور کارگر ہونے کیلئے دعا کرتا ہے، ایک دوسرا شخص مسجد میں رہ کر گشت کے (دوران) بعد آنے والے لوگوں کا استقبال کرتا ہے، ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کو مانوس کرتا ہے اور دین کی باتوں کا تذکرہ کر کے انہیں اپنے قریب کرتا ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد ایک شخص بیان کا اعلان کرتا ہے کہ سنتوں کے بعد متصلاً بیان ہوگا، اعلان کیلئے وہ یہ جملہ استعمال کرتا ہے'' ہماری کامیابی وکامرانی اللہ عزوجل کے حکموں کو رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر پورا کرنے میں ہے'' اسی بات کو وہ لوگ دین وایمان کی بات سے تعبیر کرتے ہیں۔

عشاء کی نماز کے بعد یہ لوگ '' حیاۃ الصحابۃ رضی اللہ عنہم '' کے ایک دو قصے پڑھتے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قصے سنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے راستے میں نکلنے والے اس کے راستے میں اپنی محنت ومشقت اور وقت ومال کو زیادہ نہ سمجھ لیں اور ان میں خوش دلی کے ساتھ اللہ کے راستے میں جان ومال کی قربانی کا ذوق وشوق بڑھے۔ کھانے اور سونے سے پہلے ایک شخص ان کے آداب اور سنتوں کا مذاکرہ کرتا ہے، ایسے ہی مسجد کے آداب اور اس کی عظمت وحرمت کے لائق رہن سہن اور صفائی ستھرائی کے پاس ولحاظ کو بتلاتا ہے ایسے ہی انہیں شب بیداری کی ترغیب بھی دی جاتی ہے ہر شخص ان میں اپنی استعداد اور قدرت کے بقدر قیام لیل کرتا ہے۔ ہاں البتہ فجر سے آدھا گھنٹہ پہلے ان میں کا کوئی بھی سوتا ہوا نظر نہیں آتا، فجر کی نماز کے بعد بیان ہوتا ہے' تصحیح قرآن کے حلقے لگتے ہیں' سورہ فاتحہ سمیت سورہ فیل سے لے کر سورہ ناس تک' خصوصاً ان دس سورتوں یاد کرنا، ہر اللہ کی طرف دعوت دینے اور اس کے راستہ میں نکلنے والے کیلئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ جب سورج

طلوع ہوکر بقدرِ نیزہ بلند ہوجاتا ہے تو یہ لوگ چاشت کی نماز پڑھتے ہیں، پھر ناشتہ کرتے ہیں، اس کے بعد فوراً آرام کرتے ہیں، پھر بیدار ہوکر مشورہ اور آئندہ نظام العمل کی ترتیب بناتے ہیں، یہی آئندہ چوبیس گھنٹوں کا کام ہوتا ہے، یہ تبلیغی جماعت کا تفصیلی اور اجمالی نظام العمل ہوتا ہے۔

تیسری چیز ''لازمی اُمور''

تبلیغی جماعت والے دعوت کے ساتھی کیلئے وقت لگانے کے دوران چند چیزوں کا لازمی اہتمام کراتے ہیں تاکہ وہ خود بھی ان کے اہتمام کے ذریعہ کام کے مکمل نفع کو حاصل کرے اور خود اپنی ذات سے بھی دوسروں کیلئے نفع بخش ثابت ہو، وہ چیزیں (امور) مندرجہ ذیل ہوتے ہیں :

الف: چار چیزوں کی پابندی کرے :

(۱) امیر کی اطاعت (۲) اجتماعی امور میں شرکت

(۳) صبر ضبط، تحمل و برداشت (۴) مسجد کی صفائی ستھرائی

ب: چار چیزوں میں لگا رہے :

(۱) دعوت (۲) عبادت (۳) تعلیم

(۴) خدمت یعنی تمام امور میں جماعت کا بھرپور ساتھ دے۔

ج : مندرجہ ذیل چیزیں کم کرے :

(۱) کھانا (۲) سونا (۳) بات چیت (۴) ضروریات

د : چار چیزوں سے بالکل پرہیز کرے :

(۱) فضول خرچی سے (۲) دل کے سوال سے

(۳) زبان کے سوال سے (۴) بلا اجازت دوسروں کی چیز کے استعمال سے

ہ: چار چیزوں سے چھیڑ خانی نہ کرے :

(۱) فقہی مسائل سے؛ کہ اس سے مدعو حضرات انتشار کے شکار نہ ہوجائیں۔

(۲) سیاسی مسائل سے؛ کہ اس کی وجہ سے دعوت کے کام میں رکاوٹ نہ آجائے۔

(۳) دیگر جماعتوں کے ذکر سے گریز کرے؛ کہ اس کی وجہ سے مسلمان بھائیوں کو تکلیف ہوگی۔

(۴) لڑائی جھگڑا نہ کرے؛ اس کی وجہ سے غیر مفید اور لایعنی چیزوں میں وقت برباد ہوگا۔

عالمی سطح پر دعوت وتبلیغ کے نتائج واثرات

اس جماعت کی بنیاد، اس کے نشو ونما اور اس کے نظام عمل کی جانکاری کے بعد ہم اس کے مثبت ومنفی نتائج واثرات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، (یعنی اگر اس کے کچھ منفی پہلو ہوں تو) ہمارا یہ کہنا ہے کہ:

ہم نے اس جماعت کو شمالی افریقہ، مغرب، جزائر، تونس اور لیبیا میں دیکھا ہے۔ ایسے ہی فرانس، بلجیم، ہالینڈ، اٹلی اور برطانیہ میں اس کا مشاہدہ کیا ہے، امریکہ اور برصغیر میں بھی اس جماعت کے تعلق سے سنا ہے۔ میں نے اِس دعوت وتبلیغ کے مفید اثرات ونتائج کا مشرق وسطیٰ میں ملاحظہ کیا ہے:

میں نے اِس دعوت وتبلیغ کے درج ذیل اثرات محسوس کیئے ہیں :

- نہایت ہی خشوع وخضوع کے ساتھ نماز کی ادائیگی۔
- دینی خصوصیات وامتیازات کا اظہار واعلان؛ جیسے عورتوں کیلئے پردے کا التزام اور مرد۔ حضرات کا داڑھی کو بڑھانا اور سر پر پگڑی، عمامہ وغیرہ کا استعمال۔
- ایمان واعتقاد اور قول وعمل میں شرک اور اوہام وخرافات سے بالکل اجتناب۔
- وحدانیت کے پیغام کو قبول کرنا اور کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونا، جس وقت یہ لوگ شمالی افریقہ اور یوروپ میں ہوتے تھے تو جب تک میں اس ملک یا صوبہ میں ہوتا تو وہ لوگ ہر جگہ میرے بیانات اور تقاریر میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے۔ الحمدللہ سلفی عقیدہ کا التزام، شرک وبدعات اور اوہام وخرافات سے برسر پیکار رہنا، یہ اس جماعت کا طرّہ امتیاز اور شعار رہا ہے، شمالی آفریقہ میں یہ اِس جماعت کے احوال ہیں۔

رہا یوروپ تو وہاں بھی دعوت وتبلیغ کے اثرات نہایت ہی قابل تعریف ہیں، اس کی بدولت وہاں اسلام کو فروغ حاصل ہوا اور وہاں مسلمان ملازموں میں پہنچا، چنانچہ مسجدیں تعمیر ہوگئیں اور نمازیں ادا کی جانے لگیں، ڈاڑھی، عمامہ اور کرتے میں اسلامی تہذیب وشناخت کا اظہار ہونے لگا، لوگوں میں اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی، نصاریٰ کی ایک بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔

جو کام صرف اِسلامی فتوحات کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا تھا، جس کے بنیادی عناصر میں ہتھیار، جہاد اور اپنی جان کی بازی لگا دینا، اس جیسے امور شامل ہوتے ہیں، یہ بھی نہایت ہی واضح اور بین حقیقت ہے کہ جس کا انکار کوئی نادان لاپرواہ یا کوئی ایسا شخص ہی کرسکتا ہے جو اپنے انفرادی یا

اجتماعی مقاصد واغراض کے پیش نظر تجاہل عارفانہ برت رہا ہو، دسیوں سال ایسے گذرے ہیں کہ سوائے امریکہ کے سارے یوروپ کے علاقہ میں کسی مسلمان کی مجال نہیں تھی کہ اپنی اسلامی شناخت کا اظہار کرسکے۔ اکثر لوگ شراب نوشی کی لت کی وجہ سے نماز چھوڑے ہوئے تھے، زبان، تہذیب وشناخت، اخلاق وعادات اور اطوار وکردار میں بالکل انگریز نظر آتے تھے، پھر تبلیغی جماعت کی شکل میں عقیدے، عبادات اور طرز وادا میں اِسلامی ہدایات کو لے کر اسلام نمودار ہوا اور یہ سارا کام نہایت ہی خاموشی اور معمولی انداز میں ہوا، پھر امریکہ ویوروپ میں اسلام ایسی شکل وصورت میں وجود پذیر ہوا کہ اس کے موجود ہونے کو تو چھوڑو؛ بغیر جہاد بالسیف کے اس کا دیکھنا بھی ممکن نہ تھا۔

برِّصغیر میں دعوت وتبلیغ کے اثرات دیگر ممالک سے کچھ کم نہیں ہیں، وہاں مسلمان دائرہ اسلام سے باہر ہوجانے، اسلامی تعلیمات کو بالکلیہ ترک کردینے اور بدعات وخرافات اور انواع واقسام کے شرکیہ وکفریہ اعمال میں سرگرداں اور حیراں ہونے کے بعد پھر اسلام کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

تبلیغی جماعت کے نقوش واثرات کا اندازہ لگانے کیلئے وہاں کے جماعت کی جانب سے سالانہ منعقد ہونے والے اجتماعات کی جانب اِشارہ کردینا کافی ہے، جو لوگوں کی تعداد، ان کے وسیع انتظامات اور نظم وضبط کی باریکی کی وجہ سے عقلوں کو حیراں وششدر کردیتے ہیں، پھر یہ لوگ وہاں سے دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل کر اسلام کے فروغ اور ترقی کیلئے کام کرتے ہیں اور یہ لوگ اپنی زبان وحال ہر دو سے اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں تبلیغی جماعت کے نقوش وآثار

مصر، اردن، شام، لبنان، یمن کے شمالی حصہ، اِسی طرح خلیج کے تمام ممالک میں اس کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں، کتنے ہی کج رو اور لاپرواہ درست ہوگئے، کتنے ہی خود ناآشنا اور غافل لوگ ہوش میں آگئے، کتنے ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین سے منحرف' دوبارہ اللہ عزوجل کی ذاتِ عالی سے وابستہ ہوگئے، میں نہیں سمجھتا کہ یہ چیزیں اِن علاقوں میں اِصلاحِ معاشرہ کے کاز سے متعلق لوگوں سے ڈھکی چھپی ہوئی ہیں۔

یہ تبلیغی جماعت اور اُس کی دعوت کے کاز کے متعلق چند مثبت پہلو ہیں۔ اِنشاء اللہ ہم اس کے کچھ منفی پہلو کا اس کے مخالفین کی زبانی نقل کرکے، ان کی رضامندی یا ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر'

ان میں حق پہلو کی وضاحت کریں گے، ہمارا مقصد تو محض ربِّ ذوالجلال کی رضا جوئی ہے، اے اللہ ہم سے راضی ہوجا، ہم سے ناراض نہ ہو؛ چونکہ آپ ہی بردبار اور جاننے والے ہیں۔

مخالفین کے اعتراضات اور اُس کے جوابات

○ ایک اعتراض اِن کا یہ ہے کہ

تبلیغی جماعت نے مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کی روح کو ختم کر کے انہیں جیتے جی ہی مروادیا ہے؛ چونکہ یہ لوگ سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور جن ممالک میں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں شرعی احکام کے نفاذ کا مطالبہ نہیں کرتے اور یہ سعودی عرب کو چھوڑ کر تمام اسلامی حکومتوں کی حالت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ :

تبلیغ والے تو زندہ اور بیدار اور باشعور ہیں، ان پر مردگی طاری نہیں ہوتی؛ جیسا کہ ان لوگوں کا اعتراض ہے، جو شخص لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے اپنے جان ومال کی قربانی دے کر بیروں ملک واندرون پھرتا ہے یہ تو بالکل زندہ اور پائندہ ہے، اسے مردہ قرار نہیں دیا جاسکتا! یہ ایک بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ

اگر شرعی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ صرف ایک اکیلے اللہ کی کما حقہ عبادت کی جائے، تو تبلیغی جماعت نے اپنے اس دعوت کے کاز کے ذریعہ اللہ کی بندگی، اس کے اور اس کے رسولوں کی تمام ماموارت ومنہیات میں اطاعت شعاری کی ہے، جس مقصد کیلئے شرعی احکام کے نفاذ کا مطالبہ ہوتا ہے یہ تو بغیر قتل وخون کے حاصل ہورہا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ :

جو لوگ شرعی احکام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں اور بالذات سیاست میں لگے ہوئے ہیں، کیا انہوں نے اس کے ذریعہ مطلوبہ اغراض ومقاصد کو حاصل کرلیا ہے، تھوڑی سی ہی مقدار ہی میں صحیح؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا؛ تب تو تبلیغ والوں کے حوالہ سے زبانِ طعن دراز کرنے والوں کا پیغام منفی ہوگا، تبلیغی جماعت کا پیغام مثبت ہوگا، تمام ہی دانشمندوں کے یہاں مثبت پہلو منفی پہلو سے بہتر ہوا

کرتا ہے؛ اسی لئے ہم اپنے بھائیوں کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ یہ لوگ تبلیغی جماعت پر الزام تراشیوں سے باز آجائیں کہ مبادا ان کا شمار اللہ کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں میں نہ ہو جائے۔ یہ ان کے اعتراضات ہیں، ہر بات میں حق پہلو کے ذکر کرنے کے ساتھ ہم اِن تمام اعتراضات کو ترتیب وار ذکر کئے جا رہے ہیں :

- یہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغ کا طرز صوفیوں کی طرح ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تصوف کا مطلب یہ ہے کہ کسی صوفی سلسلہ نقشبندی، تیجانی، رفاعی وغیرہ کا التزام کیا جائے؛ جس کے بنیادی عناصر میں شیخ مربی کی اطاعت وفرمابرداری اور اوراد واذکار کی پابندی، اس سلسلہ کے لوگوں کے ساتھ اخوت و بھائی چارگی، اُس کے معارض ہر چیز کا دفاع اور اس کے معاندین اور معارضین سے معاندانہ رویہ رکھنا، اللہ کی قسم ہم نے تبلیغی جماعت میں اس طرح کا کوئی التزام نہیں دیکھا ہے، ہمیں ان کے اس طور وطریقے کا نہ شمالی آفریقہ میں پتہ چلا ہے، نہ یوروپ میں اور نہ ہی مشرق وسطیٰ میں اور نہ ہی امریکا میں ہم نے ان کے اس طرز کو سنا ہے؛ اس کے باوجود اگر تبلیغی جماعت کا کوئی فرد اس سلسلے کا کوئی صوفی ہوتا ہے تو یہ تبلیغی جماعت کیلئے کوئی معیوب شیٔ نہیں ہے؛ چونکہ تبلیغی جماعت یہ عالمی دعوت ہے جس میں ہر طرز وفکر کا حامل شخص شامل ہوسکتا ہے؛ چونکہ تبلیغی جماعت کا طریقۂ کار اور طرز وعمل، ایمان واعتقاد، قول وعمل ہر چیز میں تصوف کی موشگافیوں سے خالی ہے، یہ لوگ نہ اپنے افعال نہ اپنے اقوال اور نہ ہی کسی بھی اپنے اطوار وعادات سے تصوف کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بات ہر وہ شخص جو اس جماعت کے ساتھ نکلا ہے جانتا ہے، اس تحریک کا ایسے علاقے میں نشو ونما پانا تنقید کیلئے کافی نہیں ہے، جہاں اس قسم کے بے شمار سلسلے پائے جاتے ہیں؛ چونکہ ''مصر'' میں اس وقت اس قسم کے ستر (۷۰) سلسلے ہیں، ان کی نگراں کمیٹی بھی ہے، کیا اس قسم کے سلاسل کا مصر میں پایا جانا وہاں کی دیگر تحریکوں وتنظیموں کیلئے بہتان طرازی کا باعث ہوسکتا ہے؟

اگر ہم یہ بات مان بھی لیتے ہیں کہ تبلیغی جماعت کے بانی حضرت محمد الیاسؒ صوفی تھے، یا ان کے جانشین انعام الحسنؒ تھے؛ لیکن ان کی یہ تحریک تو اس قسم کے صوفیانہ طرز عمل سے خالی ہے، کیا محض یہ بات اس تحریک کے رکاوٹ کا سبب بن سکتی ہے؟ یا محض یہ بات اس کیلئے عار اور شرمندگی کا باعث ہوسکتی ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو اس کام سے متنفر کیا جاسکتا ہے؟ ایسا تو نہیں کیا جاسکتا۔

بھائیو! کچھ تو عقل سے کام لیں، اللہ تمہیں اور ہمیں ہدایت سے سرفراز کرے۔ آمین

❍ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

اکابر تبلیغ صوفی سلاسل میں بیعت ہوتے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ بیعت تو صرف امام المسلمین ہی سے ہوسکتی ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، ورنہ تو وہ احادیث کی روشنی میں واجب القتل ہوگا۔ رہا کسی مسلمان سے کسی کا یہ عہد کرنا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا تو اس کو کوئی ناواقف، عناد پرست یا دینی پراگندگی وانتشار سے دوچار شخص ہی (بیعت) کہہ سکتا ہے۔

تبلیغی جماعت کا جو نظام العمل ہم نے بتلایا ہے، اس میں سے کوئی لفظ یا حرف ایسا نہیں ملتا جس سے بیعت کی اصل بات کا پتہ چل سکتا ہو یا اس کا ثبوت ملتا ہو۔

اگر یہ بات مان بھی لیں کہ ہندوستان کے بعض داعی حضرات قادری، نقشبندی، اس جیسے صوفی سلسلوں سے وابستہ ہیں اور یہ لوگ بھی بعض لوگوں کو بھی خفیہ طریقوں سے اس سلسلے سے وابستہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں؛ اس کا وبال اور انجام وہ بھگتیں گے؛ جب تک دعوت کا طریقہ کار اور طرز عمل اس قسم کی چیزوں سے خالی ہوگا تو یہ اس تحریک اور اس سے منسلک لوگوں کیلئے نقصان دہ نہ ہوگا۔

داعی حضرات تو جو چیز دعوت کے اصولوں اور طرز عمل کے مخالف ہوا سے ہرگز قبول نہیں کریں گے، اگر اس تحریک کے طریقۂ کار میں یہ چیز شامل ہو یا کسی بھی طرح اس ثبوت ملتا ہو تو اس طرز دعوت سے برأت کا اظہار؛ بلکہ اس کی مخالفت ضروری ہے، جب یہ چیزیں اس تحریک کے نظام العمل میں داخل ہی نہیں ہیں تو پھر برأت کا اظہار کیوں کیا جائے؟ تبلیغ اور اس کے طریق پر نکتہ چینیاں اور افترا پردازیاں کیوں؟ یہ تو بہت بڑا ظلم ہے جس کا انجام نہایت ہی خراب ہوگا۔

❍ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

یہ داعی حضرات جو شخص بھی ان کے ساتھ کچھ دن کیلئے نکلتا ہے، اس کی زندگی سرے سے بدل کر رکھ دیتے ہیں، ہر چیز، یہاں تک کہ اصل عقیدے، طرز و ادا، سلوک و برتاؤ اور سوچ وفکر کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: ہاں ایسا ہی ہوتا ہے؛ چونکہ یہ دعوت ہی اس قدر حیرت انگیز اور پر تاثیر ہے کہ یہ اپنے قبول کرنے والے میں آپ کے کہنے کے مطابق مکمل تبدیلی لے آتی ہے۔

چنانچہ اگر جماعت میں نکلنے والا گمراہ ہوتو راہِ یاب ہوجاتا ہے، اگر ضعیف الایمان ہوتا ہے تو اس کی ایمان کی طاقت میں اضافہ ہوجاتا ہے، اگر بداخلاق ہوتو خوش اخلاق اور باوقار ہوجاتا ہے، اگر وہ غافل اور لاپرواہ ہوتو ہوش سے کام لینے لگتا ہے، اگر وہ مادہ پرست ہوتا ہے تو اس میں روحانیت آجاتی ہے۔

جو شخص بھی جماعت میں نکلتا ہے، اس کے اندر عموماً اس قسم کی تبدیلی رونما ہوتی ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے وہ توحید پرست تھا، اب کفر وشرک اور اوھام وخرافات میں مبتلا ہوگیا، پہلے متقی تھا اب سرے سے بگڑ گیا، یا پہلے امورِ آخرت ایمان وغیرہ سے واقف تھا، اب ان تمام چیزوں سے غافل ہوگیا، یا پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اطاعت گذار تھا اب نافرمان اور سرکش ہوگیا ،ایسا نہیں ہوتا! اللہ کی قسم ہم نے نہ اس طرح کی کوئی بات دیکھی ہے اور نہ اس طرح ان کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

بعض افراد میں اس قسم کے کسی واقعہ یا حادثہ کا پیش آجانا کوئی محال اور ناممکن بھی نہیں ہے، ایسا شاذ ونادر اور بہت ہی کم ہوتا ہے اور شاذ ونادر پر احکامات کا اجراء نہیں ہوتا۔

اے حق کے طلب گارو! حق کو تھامے رہو، حق بات سے اللہ کے بندوں کو متنفر کرنے میں تم اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ کے راستے سے روکنا کفریہ کام ہے، اس سے اللہ کی پناہ۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والوں نے اسلام کے پانچ بنیادی چیزوں اور ایمان کے چھ ارکان کو چھوڑ کر ان کے بجائے دیگر چھ صفات گھڑ لئے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی قسم اس قسم کا اعتراض تو بالکل پاگل پنے کی بات اور کھلی ہوئی بدظنی ہے، کیا کسی اصلاحی اور تربیتی نظام کو چلانے کیلئے کسی خاکے کا ترتیب دینا اور اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کی دعوت دینے کو اسلام کے بنیادی اور ضروری ارکان کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کا اختیار کرنا کہا جاسکتا ہے؟

جس تحریک کی بنیاد ہی اللہ کی ذات، اس کی ملاقات اور اس کے دین پر یقین، نمازوں کو قائم کرنا اور زکوۃ کی ادائیگی، اخلاق حمیدہ اور ہر قول وفعل میں خلوص نیت پر ہو، اے اللہ کے بندو! کیا اس تحریک کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اسلام کے بنیادی ارکان کو چھوڑ

کر دیگر چھ صفت گڑھ لئے ہیں۔

یا اللہ! یہ تو بہت بڑی الزام تراشی اور افترا پردازی ہے، جوامت کے اسلاف اور اس کے ابتدائی دور کے صلحاء اتقیاء سے اپنے تعلق ووابستگی کا مدعی ہے وہ یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے؟

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والے اہلِ عقیدہ اور ائمہ اسلاف کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو محض خالی دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے، کیا اس بارے میں کوئی دلیل موجود ہے؟ اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی محال اور بعید چیز نہیں کہ کوئی قرآن وحدیث سے ناواقف' بے حس' خودغرض اور مفاد پرست عالم ہو (جو اس طرح کی بات کہتا ہو) ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہے جو ائمہ سلف خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور محمد بن عبدالوہابؒ سے بغض وعناد رکھنے کے باوجود ان مبلغوں کے ساتھ جماعت میں نکلتے ہیں اور چونکہ دعوت کے بنیادی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ بحث ومناظرہ اور لایعنی سے گریز کیا جائے، ائمہ سلف کے بغض وعناد میں مبتلا کوئی ناسمجھ شخص، ہو جسے خود اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے' یہاں تک کہ دعوت ہی اس میں تہذیب وشائستگی پیدا کرتی ہے اور اس کی دل کی گندگیوں کا ازالہ کرتی ہے اور اس طرح ہو سکتا ہے۔

عموماً تبلیغی جماعت سے وابستہ لوگوں پر اس قسم کا الزام عائد کرنا کہ یہ لوگ سلفی عقیدہ اور ائمہ سلف کے دشمن ہیں یہ تو نہایت ہی لچر اور لغو بات ہے اور بہت بڑا ظلم اور ناروا الزام ہے اور مسلمان اس قسم کے اوصافِ رذیلہ کا حامل ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ کی قسم! ہم تبلیغی جماعت سے اچھی طرح واقف ہیں، یہ مشرق ومغرب میں ہمارے بیانات میں شرکت کرتے ہیں، ہم نے ان میں سے کسی سے کوئی ایسی بات نہیں سنی ہے، جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ لوگ توحید پرستوں اور ان کے ائمہ واسلاف کو بری نگاہ سے دیکھتے ہوں؛ بلکہ خود وہ لوگ ہم سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ خود ان کے ملک میں ان کے رشتہ دار انھیں ''وہابی'' کہتے ہیں۔

ہمارے ایمانی بھائیوں کو یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ جو شخص توحید پرست حضرات اور ان کے ائمہ واسلاف کے متعلق اپنی زبان طعن دراز کرتا ہو یا ان کو برا بھلا کہتا ہو، ہم اس کے متعلق خاموشی اختیار کر کے اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کر سکتے اور نہ خود ہم کسی پر اس قسم کی الزام تراشی کرتے ہیں یا ان کی جانب کسی ایسی بات کی نسبت کرتے ہیں جو انہوں نے نہ کہی ہو؛

چونکہ یہ توظلم اور زیادتی ہےاورظلم شرعاً حرام ہے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے مشرق ومغرب میں اسلاف سے بغض وعناد رکھنے والا کوئی نہیں پایا جاتا؛ بلکہ ان کے مخالفین کی تعداد بہ نسبت مؤیدین کے زیادہ ہے، مجموعی طور سے ہم اپنی اس بات سے تبلیغی جماعت کی ان چیزوں سے برأت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اللہ عزوجل دلوں کےاحوال سےخوب باخبر ہے۔

- یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

دعوت وتبلیغ والے جہاد کا انکار کرتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں حضورِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی سی ہے۔

کیا اس بات میں کوئی عیب، برائی یا کوئی گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے تبلیغی جماعت کو برا بھلا کہا جائے؛ بلکہ ہر باخبر صاحب عقل وخرد مسلمانوں کے احوال اور ان ممالک کو درپیش حالات وخطرات سے واقف کار شخص اس کا قائل ہے، جو لوگ جہاد کے بارے میں نعرہ بازی کرتے ہیں اور موجودہ حالت میں اس کی مخالفت کرنے والوں کو اپنی دشنام طرازی کا نشانہ بناتے ہیں، وہ یہ بتلائیں کہ انہوں نے اب تک کتنے معرکے سر کئے ہیں، کتنے ممالک کو غلامی کے شکنجے سے گلوخلاصی عطا کی ہے اور کس قدر وہاں احکامِ شرعیہ کا نفاذ کیا ہے؟ تا کہ اس بات کے پیش نظر یہ کہا جا سکے کہ تبلیغی جماعت والے جہاد کے عمل سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ دعوت وتبلیغ والوں نے ملک افغانستان میں جاری جہاد کے بارے میں کسی قسم کی ہمت افزاء بات نہیں کہی ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ دعوت کے کام میں مصروف تھے، اگر کچھ لوگ افغانستان کے جہاد میں برسرِ پیکار رہوں اور کچھ لوگ یہ سمجھ کر کہ اصلاح قلوب اور اخلاق واعمال کی درستگی کا کام اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس میں مصروف رہیں تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ جس سے مشرق ومغرب کے اس تحریک سے وابستہ حضرات کو متہم کیا جائے۔

- یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والے ''امر بالمعروف'' بھلائی کا حکم دینے اور ''نہی عن المنکر'' برائی سے روکنے کے فریضے کو بہترین طریقے سے انجام نہیں دے پا رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت کا اس بارے میں جو طریقۂ کار ہے وہ پیچھے گذر چکا ہے، اس کے بنیادی

اصولوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ برائی کرنے والے کواس کی برائی سے روکا نہ جائے، یہ دو وجہ سے :

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ

جس معاشرہ میں جہالت و نادانی کو سکہ رائج الوقت کا درجہ حاصل ہو، جہاں فسق و فجور میں ابتلاء کی فضا ہو تو وہاں کسی برائی پر نکیر فائدہ مند نہیں ہوتی، اس کا ہر صاحب بصیرت شخص کو اعتراف ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ

انہوں نے زبانی انکار کے بجائے یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے کہ اس برائی میں مبتلا شخص کو اس ماحول سے دور لے جا کر اسے ایسے مربی اور حکیم و دانا حضرات کے سامنے پیش کیا جائے جو خوش کلامی اور نرم گفتار کے ذریعہ اس کے مناسب حال ادویہ تجویز کریں، پھر چند دن گذرنے نہیں پاتے کہ وہ شخص خود اس برائی کو چھوڑ کر اس کی مذمت کرنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

اِصلاح و تربیت کا یہ طریقہ اس سے بہتر ہے کہ غافل اور لا پرواہ لوگوں کے بیچ منبر پر بیٹھ کر وعظ و نصیحت کی جائے، ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ: تبلیغی جماعت پر اعتراض کرنے والوں نے ''نہی عن المنکر'' کے فریضے کو کس قدر انجام دیا ہے، اس کا جواب ہر شخص کو معلوم ہے؛ بلکہ معاشرے کی صورتحال خود اس پر شاہد اور گواہ ہے، ہم اپنے واسطے اور ان کے واسطے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے فریضے پر اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں، جو شخص تبلیغی جماعت پر ''نہی عن المنکر'' کے فریضے کے ترک کا الزام لگاتا ہے اور خود اس فریضے کو انجام نہیں دیتا وہ اس شعر کا مصداق ہے :

لا تنه عن خلق تأتي مثلـه　　عار عليك إذا فعلت عظيم

''جس برائی اور عادت میں تو خود مبتلا ہے اس سے دوسرے کو مت روک، اگر اس بد خلقی میں تو خود مبتلا رہے گا تو یہ ندامت اور شرمندگی کا باعث اور بہت بڑی بات ہوگی''۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ تبلیغ والے مسلکِ حنفی کے سلسلہ میں تشدد برتتے ہیں :

اس کا جواب یہ ہے کہ کیا یہ بات صرف تبلیغی جماعت کے ساتھ مخصوص ہے؟ ایسا تو نہیں ہے، واقعی صورتحال یہ ہے کہ شافعی، شافعی مسلک کے تعلق سے تعصب برتتا ہے، مالکی اپنے مسلک

کے حوالہ سے تشدد آمیز رویہ اختیار کیا ہوتا ہے،اسی طرح حنبلی بھی اپنے مسلک میں شدت اختیار کرتے ہیں، اس سخت اور تشدد کی حد تک پہنچے ہوئے رویہ سے وہی لوگ بچے ہوتے ہیں جو حق بات کا اس کے تمام دلائل کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں اور اس قسم کے تشدد آمیز رویہ کو ترک کر دیتے ہیں اور ہر موقع پر حق کا ساتھ دیتے ہیں۔

پھر تو محض تبلیغی جماعت پر حنفی مسلک کے حوالہ سے تعصب آمیز رویہ اختیار کرنے کا الزام لگانا کیسے درست ہوگا؟ حالانکہ ہر مسلک کے ماننے والوں کا اپنے مسلک کے بارے میں ایسا ہی سخت رویہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تبلیغی جماعت میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ہر مسلک کے لوگ شامل ہیں؛ لہٰذا تبلیغی جماعت کے بارے میں اس قسم کا اعتراض کرنا بالکل درست نہ ہوگا۔اب بھی الزام تراشیاں کرنے والے سمجھتے کیوں نہیں؟!

اس بات کا بھی خیال رہے کہ مشرقی، مغربی آفریقہ، یوروپ، امریکہ، مشرق وسطیٰ کہیں سے بھی اب تک یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ تبلیغ والے کسی مسلک کے اختیار کرنے کو کہتے ہیں، ان کی دعوت کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ اعمال صالحہ کی انجام دہی اور اعمال بد کے ارتکاب سے گریز کر کے ایمان کی تقویت کا سامان کیا جائے، ہاں البتہ یہ لوگ حنفی امام کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں، یہ ان کا عمل ہے قول تو نہیں ہے۔ یہ بات بھی لوگوں میں مشہور و معروف ہے کہ جو لوگ تبلیغی جماعت کی دعوت پر راہ یاب ہوئے ہیں، ان میں دیگر مسلمان کے مقابل حق کو قبول کرنے اور کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت ولیاقت زیادہ ہوتی ہے۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والے اقسامِ توحید میں سے توحید عبودیت (صرف ایک اللہ کی پرستش) کا انکار کرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے کچھ تو حیدِ عبودیت (فن کی اصطلاحات مقصود نہیں ہوتی ہیں بلکہ معنی اور مصداق مقصود ہوا کرتے ہیں اور وہ الحمدللہ اچھی طرح پائے جا رہے ہیں، کتنے ہی وہ شہر اور گاؤں ہیں اور کتنے ہی وہ خاندان اور افراد ہیں جو اس کام میں لگنے کے بعد انہوں نے ان شرکیات وبدعات سے توبہ کی جس کی وجہ سے قبر پرست ان کے جانی دُشمن بن گئے اور بہت سے

اُن کے اکثریتی علاقوں میں جماعتوں کوشہید کر دیا گیا یا کم از کم مسجدوں سے نکال کودھویا گیا ہے) کو جانتے ہی نہیں ہیں؛ لیکن وہ لوگ (عملاً) اس کے خلاف بھی نہیں کرتے ہیں،اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ توحیدِعبودیت کا انکار کرتے ہیں،اس پر دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ ایک اللہ کے علاوہ کی عبادت کرنے کی دعوت نہیں دیتے ، نہ دعامیں ، نہ ذبح وقربانی ، نہ نذر ونیاز اور نہ ہی امید وبیم میں ؛جیسا کہ اس بارے میں اہلِ طریقت، جاہل اور گمراہ لوگوں کا طرزِعمل ہے۔

اس قسم کی کمی صرف تبلیغ والوں ہی میں نہیں ؛ بلکہ اکثر وبیشتر مسلمان،معدودے چندلوگوں کو چھوڑ کر توحیدِعبودیت سے بالکل واقف نہیں ہیں،اگر یہ لوگ توحیدعبودیت سے واقف ہوں،ذبح، نذرونیاز اور قسم کے وغیرہ کے ذریعے اہلِ قبور کی پرستش نہ کریں، ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ان کوتوحید عبودیت سمجھائیں نہ کہ ہم ان کے سلسلہ میں عیب جوئی کریں۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والوں کا دائرہ کار نہ صرف نافرمان سرکش لوگوں تک محدود ہے ؛ بلکہ یہ لوگ حق پرستوں پراثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں،انہیں ائمہ اور اسلاف کے طریقہ سے ہٹا کر تبلیغ کے نکما اور نا کارہ طریقہ کا پابند بناتے ہیں؛جس کی بنیاداوھام اور بدعات وخرافات پر ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اس بات کے معترف ہیں کہ تبلیغی جماعت کے اثر سے سرکش اورنافرماں راہ راست پر آجاتے ہیں،اللہ اوراس کے رسول ﷺ کے مطیع وفرمابردار ہوجاتے ہیں ،آپ نے جو یہ اعتراف کیا ہے، واقعی صورتحال بھی یہی ہے۔

’’مبارکبادی کے مستحق ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھوں اللہ عزوجل لوگوں کی ہدایت کا سامان کرے۔‘‘

رہاان لوگوں کا حق پرستوں پراثر انداز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خوداپنی ذات سے دین پر چلنے کو کافی نہیں سمجھتے ؛ بلکہ یہ لوگ دوسرے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، یہ بھی ایک طرح کی اثر انگیزی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان میں علماء کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اوراسی وجہ سے طلباء ان کے ساتھ نکلنے سے کتراتے ہیں اور چونکہ اس میں جان ومال اور ہرطرح کی قربانی دینی پڑتی ہے، بعض لوگ محض اسی لئے اس جماعت کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والے بدعتی ہیں؛ چونکہ یہ لوگ جماعتوں کی شکل میں نکلتے ہیں اور چونکہ ان لوگوں نے جماعت میں نکلنے کیلئے تین دن، چالیس دن اور چار مہینے مقرر کیے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: اپنی ذات کی اصلاح کیلئے سفر کرنا جیسے حصول علم و ہدایت کیلئے سفر کرنا اور لوگوں کو ان کے رب کی طرف بلانے اور ان کو دنیا و آخرت کی کامیابی کے گر بتلانے کیلئے سفر کرنا، ان چیزوں کیلئے سفر کرنا اللہ کے راستے میں سفر کرنا ہے؛ اگر نیت خالص ہو اور محض رب کی رضا کا جذبہ ہو اور مال، عزت شہرت اور تفریح طبع مقصود نہ ہو، ان داعی حضرات کا لوگوں کی ہدایت اور ان کے اصلاحِ نفس اور تزکیۂ باطن کے واسطے سفر کرنا، ان کے اللہ کے راستے میں نہ ہونے کا وہی شخص مدعی ہوسکتا ہے جو اس کام سے ناواقف ہو یا جان بوجھ کر جہالت کا مظاہرہ کر رہا ہو۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: غَدْوَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ روحة خيرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا (۱) ''اللہ کے راستے کی ایک صبح یا ایک شام دنیا و مافیہا سے بہتر ہے''۔

حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: جو شخص محض کسی خیر یا بھلائی کو سیکھنے کیلئے مسجد کو آئے، وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے مانند ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار صحیح اور حسن درجہ کی احادیث ایسی ہیں جس میں اللہ کے راستے میں نکلنے کی ترغیب دی گئی ہے؛ اس کے باوجود اے اللہ کے بندو! یہ کہتے ہو کہ تبلیغی جماعت میں جانا بدعت ہے؟ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز بات ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جماعتوں کی شکل میں نکلنا بدعت ہے؛ چونکہ حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا، آپ ﷺ نے جماعت روانہ نہیں کی تھی۔

وہ لوگ یا تو اس بات کو بھول گئے ہیں یا جان بوجھ کر بھلا دیا ہے کہ حضور ﷺ لوگوں کی تعلیم کیلئے ستر (۷۰) قراء کو روانہ فرمایا تھا۔

شاید وہ یہ بھی بھول گئے ہیں کہ حضور ﷺ نے تنہا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو روانہ نہیں فرمایا تھا بلکہ ان کے ساتھ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ان دونوں سے یوں فرمایا تھا کہ: لوگوں کو خوشخبریاں سنانا، انہیں متنفر نہ کرنا، ان کے ساتھ سہولت کا معاملہ کرنا، تنگی کا معاملہ نہ کرنا، لوگوں سے گھل مل جانا، اختلاف نہ کرنا۔

---

(۱) صحيح البخاری، باب صفة الجنة والنار، حديث:۶۱۹۹

ایسے ہی حضورِ اکرم ﷺ نے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ اور خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تھا اور ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ دعوت و تعلیم اور لوگوں میں برحق فیصلے کرنے کیلئے ایک بہت بڑی تعداد روانہ فرمائی تھی۔

جیسے ان لوگوں نے جماعتوں کی شکل میں نکلنے کی بدعت ایجاد کی ہے؛ ایسے ہی نکلنے کیلئے دِنوں کی تعداد کا بھی تعین کیا ہے، ان لوگوں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ ان کی دعوت کا نظام العمل بھی' مدارس اور یونیورسٹیز کے چھٹیوں کے دنوں کے نظام کی طرح ہے؛ جس کیلئے یہ لوگ ایک مدت متعین کرتے ہیں؛ تاکہ طلباء کی غیر حاضری کی مدت کا اندازہ ہو اور طلبہ بھی اس بہانے ایامِ تعلیم کیلئے اچھی طرح تیاری کرلیں۔

کیا اس کے باوجود بھی یہ لوگ داعی حضرات کے دنوں کے تعین کو بدعت قرار دیتے ہیں؛ حالانکہ یہ دنوں کی تعیین دعوت کے اغراض و مصالح ہی کیلئے ہے۔

سبحان اللہ! لوگوں کی حالت اِس شعر کے مصداق ہوگئی ہے :

وعين الرضاعن كل عيب كليلة

كما أن عين السخط تبدى مساويا

رضامندی اور قبولیت کی نگاہ ہر عیب سے کورچشم (اندھا) بنادیتی ہے' ایسے ہی ناراضگی کی نگاہ تمام عیوب ظاہر کرواتی ہے۔ اے اللہ کے بندو! اس ناراضگی کی وجہ کیا ہے؟

یک بندہ اپنے رب کی طرف بلاتا ہے، اپنے اور اپنے مدعو بھائیوں کے حق میں اللہ کی رضا وخوشنودی کا طلب گار ہوتا ہے، عمدہ و پاکیزہ اقوال واعمال کو اپنا کر اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کی اصلاح اور اخلاق کو درست کرلیتا ہے۔

اِن لوگوں نے اِس قسم کے اعتراضات کئے ہیں :

اللہ ہمیں اس سے محفوظ فرمائے، ہم تبلیغی جماعت کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہتے کہ جس سے ہمارا شمار اللہ کے راستے سے روکنے والوں میں ہونے لگے، تمام تعریفیں اللہ عزوجل کیلئے ہیں، معصوم و بے گناہ تو وہ ہے جسے اللہ محفوظ رکھے۔

حق کے متلاشی کو باطل اغراض ومصالح اور غلط تصورات وخیالات سے ماوراء ہو کر اس کتابچہ کو پڑھتے ہوئے یہ جان لینا چاہیے کہ میرا ایک دن کیلئے بھی تبلیغی جماعت کے ساتھ نکلنا نہیں

ہوا ہے اور نہ ہی میں کسی بھی طرح ان کے ساتھ جڑا ہوا ہوں؛ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تبلیغی جماعت میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں، محض ان سے غلطیوں کے سرزد ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ کام کرنے سے رکا نہیں جا سکتا اور نہ ہی ان غلطیوں کی اصلاح سے گریز کیا جا سکتا ہے؛ چونکہ غلطیاں ہیں بھی تو بہت ہی کم، غلطیوں سے محفوظ اور مامون تو صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی ہو سکتے ہیں۔

ان کے ساتھ میری عملی شرکت نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ میرے اندر خرچ کرنے اور مشقتوں کو سہنے اور برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے؛ اس لئے ہم صرف ان کے ساتھ خیر خواہانہ اور ناصحانہ برتاؤ کرتے ہیں، ان سے دعوت کے سلسلہ میں جو اغلاط پیش آتی ہیں، اس کی اصلاح اور دُرستگی کرتے ہیں، ہم ان کی عیب جوئی اور ان پر نقد و تبصرہ اس وجہ سے نہیں کرتے ہیں کہ اس وجہ سے ہمارا شمار راستے سے روکنے والوں میں نہ ہو جائے۔

لیکن بعض ہمارے بھائی :

اللہ انہیں ہدایت دے، جب ان لوگوں نے اپنے اندر دعوت کے کام کی سکت نہیں پائی تو یہ لوگ ان پر نقد و تبصرہ کرنے لگے، ان کو غلط انداز سے مشہور کرنے لگے، ان کے کام میں خلل انداز ہونے لگے؛ حالانکہ ان کا رویہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے، اللہ ہی مددگار رہے۔

''درود ہو ہمارے نبی ﷺ اور ان کے آل واصحاب رضی اللہ عنہم پر''

کتبِ فضائل
حقائق، غلط فہمیاں
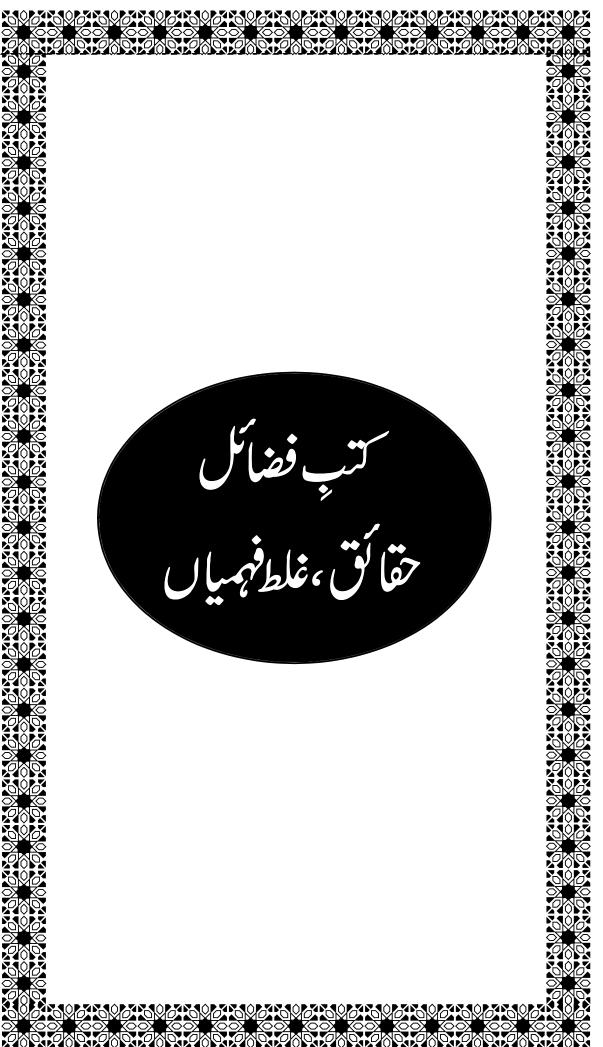
حضرت شیخ الحدیثؒ کا علمی مقام

ولادت و تعلیم

بیسویں صدی نے جن نادرۂ روزگار، یگانۂ وقت اور عباقر شخصیتوں کو جنم دیا ہے ان میں ایک نمایاں نام حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحبؒ کا بھی ہے۔ یہ ایک عالم راسخ، مربی و مصلح دردمند، محقق و مصنف، محدث اور ایک باکمال بزرگ تھے، ان کا علم حدیث کے ساتھ والہانہ شغف، وابستگی و تعلق اور اس حوالہ سے ان کی خدمات اس قدر ہمہ جہت اور ہمہ رنگ تھیں کہ بجا طور پر آپ کو شیخ الحدیث کے لقب سے نوازا گیا اور یہ لقب ان کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا کہ اسم ذاتی پر اس لقب سے وہ زیادہ جانے جانے لگے، یہ عالی مقام شخصیت اس خانوادہ کاندھلہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں توحید و ربوبیت، اخلاص وللّٰہیت اور عشق رسول ﷺ کی گویا روح پھونکی گئی تھی، جن کے عظیم اور لاثانی کارناموں سے دنیا ایک مدت تک فیض یاب ہوتی رہی، مستجاب الدعوات، گمنام بزرگ حضرت مولانا محمد اسماعیلؒ کے پوتے، بانیٔ تبلیغ، داعیٔ کبیر حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے بھتیجے، محدث وقت حضرت مولانا یحییٰ کاندھلویؒ کے فرزندِ ارجمند کی پیدائش ماہ رمضان کی گیارہویں شب ۱۳۱۵ھ میں کاندھلہ میں ہوئی۔ ڈھائی برس کی عمر تک کاندھلہ میں رہے، پھر گنگوہ حاضری ہوئی، جہاں آپ کے والد قطب عالم حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور یہیں سے آپ کی کشتِ جان میں سیرت و کردار اور اخلاق سازی کا وہ بیج بویا گیا جو آپ کی عظیم شخصیت کی شکل میں ایک تناور درخت بن کر ظاہر ہوا۔ سات سال کی عمر سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ والد محترم کے عجیب وانوکھے طرزِ تربیت و تعلیم کے زیر اثر تمام نصابی کتابوں کی تکمیل ہوئی، پھر اس کے بعد علوم حدیث کے ساتھ اشتغال کا وہ مبارک دور شروع ہوا جو آپ کی شخصیت کا امتیاز ثابت ہوا، والد محترم ہی نے دو رکعت نفل نماز پڑھ کر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کرائی، پھر اپنے اُستاذ محترم حضرت مولانا

خلیل احمد سہارنپوری صاحبؒ سے بھی دوبارہ حدیث کی تعلیم حاصل فرمائی اور اسی دوران اپنے مشفق و باکمال اُستاذ کے ساتھ بذل المجہود کی تالیف میں بھی شریکِ کار ہوگئے۔

تدریسی دور

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۳۵ھ میں جبکہ بیس سال کی عمر تھی مظاہر العلوم میں بحیثیت ِمدرس تقرری ہوئی۔ بہت جلد ہی ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ درجات کی کتابیں پڑھانے لگے، پھر اپنے محبوب فن، حدیث کی کتاب مشکوۃ پڑھانے لگے اور پھر ۱۳۴۴ھ میں اُستاذِ محترم حضرت شیخ خلیل احمد سہارنپوری صاحبؒ نے آپ کو شیخ الحدیث کے باوقار مسند پر بٹھایا اور ساتھ ہی چاروں سلسلوں میں بیعت وارشاد کی عام اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ چنانچہ شیخ الحدیث صاحبؒ اپنے فنِ حدیث کے ساتھ زندگی بھر کے اِشتغال کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں :

''۷ر محرم ۱۳۲۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد میری مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، والد صاحب نے خود ہی ظہر کی امامت بھی کی تھی کہ اس زمانے میں نماز وہی پڑھاتے تھے، نماز کے بعد غسل فرمایا اور دو رکعت نفل نماز پڑھی، پھر میری طرف متوجہ ہو کر مشکوۃ شریف کی بسم اللہ کی اور خطبہ مجھ سے پڑھوایا، پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر پندرہ یا بیس منٹ تک بہت دعائیں مانگیں، مجھے نہیں معلوم کہ کیا دعائیں مانگیں، لیکن میں ان کی معیت میں اس وقت صرف ایک ہی دعا کرتا رہا کہ یا اللہ حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا ہے اسے مرنے تک وابستہ رکھئے، اللہ جل شانہٗ نے میری ناپاکیوں، گندگیوں اور سیئات کے باوجود ایسی قبولیت عطا فرمائی کہ ۱۳۲۲ھ سے ۱۳۹۰ھ تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں حدیث پاک کا مشغلہ نہ رہا ہو''۔ (۱)

تصنیف وتالیف

ویسے تو آپ کی بے شمار مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصنیفات ہیں جن کا آغاز آپ نے اپنے زمانۂ طالبِ علمی ہی سے شروع کر دیا تھا، جن کا مفصل ذکر شیخ الحدیث صاحبؒ نے اپنی آپ بیتی میں فرمایا ہے، چند مشہورِ زمانہ تصنیفات کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

---

(۱) آپ بیتی: ص/۹۱-۹۲

عربی تصانیف

○ بذل المجهود کی تالیف میں شرکت

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا ۱۳۴۴ھ میں حضرت شیخ الحدیثؒ نے حضرت سہار نپوریؒ سے دوبارہ دورہ حدیث پڑھی، ابھی درس کے آغاز پر دو ہی مہینے گذرے تھے کہ ایک دن حضرت سہار نپوریؒ نے شیخ صاحبؒ سے ابوداؤد شریف پر ضروری تشریح ونوٹس لکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، جو تکمیلی مرحلہ سے گذر کر پانچ ضخیم جلدوں میں بذل المجہود کے نام سے منصۂ شہود پر آئی، حشو وزوائد سے پاک نہایت ہی سلیس ونفیس طرزِ نگارش کی وجہ سے بہت ہی جلد مقبولیت عام حاصل کرگئی۔ اس کتاب کا طرزِ تالیف یہ ہوتا تھا کہ حضرت سہار نپوریؒ شروح حدیث اور مآخذ کی نشاندہی فرماتے، حضرت شیخ ان کا مطالعہ کرکے اور متعلقہ مواد جمع کرکے لے آتے جسے حضرت سہار نپوریؒ مصنفانہ حیثیت سے لکھواتے، تسوید وتحریر کا کام بھی حضرت شیخ الحدیثؒ انجام دیتے۔ یہ تصنیف ہی دراصل آپ کے عروج واقبال کا وہ نقطۂ آغاز ثابت ہوئی جس نے آپ کے اندر مصنفانہ لیاقت پیدا کردی اور آپ تصنیف وتالیف کے ذوق سے واقف ہوگئے اور فنِ حدیث میں آپ کی نظر گہری اور وسیع ہوتی گئی۔

○ أوجز المسالك إلى موطامالك

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے اس کتاب کی تالیف اس وقت شروع فرمائی تھی جبکہ آپ کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ یکم ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو آپ نے اقدام عالیہ میں بیٹھ کر اس مبارک کام کا آغاز فرمایا، چنانچہ اللہ عزوجل نے ایسی بے بہا برکت عطا فرمائی کہ چند ماہ میں اتنا کام ہوگیا کہ جو ہندوستان کے قیام میں کئی سال میں نہ ہوسکتا تھا، چنانچہ ابواب الصلوۃ تک تحریری کام ہوا تھا کہ مدینہ سے واپسی عمل میں آئی، پھر ہندوستان میں طویل وقفوں کے درمیان یہ اہم علمی کام جاری رہا۔ تقریباً تیس سال کی محنتِ شاقہ اور کدوکاوش کے بعد ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ میں چھ ضخیم جلدوں میں منظرعام پر آئی۔ یہ کتاب موطا امام مالک کی سب سے جامع اور مفصل شرح ہے جو لوگوں کو دیگر شروحات وحواشی کی ورق گردانی سے بے نیاز کردیتی ہے، عرب علماء نے بھی شیخ الحدیث کی اس تالیف کو خوب سراہا ہے اور اب آپ کے عزیز شاگرد حضرت مولانا تقی الدین ندوی مدظلہٗ کی تحقیق وتدقیق کے ساتھ ۱۸/جلدوں میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر جدید علمی وتحقیقی معیار کے ساتھ منظرعام پر آئی ہے۔

لامع الدراری علی جامع البخاری

لامع الدراری دراصل یہ فقیہ النفس، محدثِ عصر، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (ف ۱۳۲۳ھ) کے درسی افادات کا مجموعہ ہے جو ان کے خادمِ خاص اور تلمیذ رشید حضرت مولانا یحییٰ کاندھلویؒ نے (ف ۱۳۳۴ھ) درس بخاری کے دوران قلمبند فرمائے تھے، جس میں جامع بخاری کے رموز واصطلاحات کی مکمل شرح اور اس کے مشکل مقامات کا حل پیش کیا گیا ہے؛ لیکن شیخ الحدیث صاحبؒ نے اپنے والد کے ان درسی نوٹس کو اپنے مفصل اور مفید حواشی وتعلیقات کے ذریعہ اور بھی چار چاند لگادیئے ہیں اور ایک علمی شاہکار اور جامع شرح کی حیثیت سے اربابِ علم کے سامنے پیش کیا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے ان تینوں حضرات کا نام لیناہی کافی ہے جو اپنے وقت کے پائے کے محدث تھے۔

الأبواب والتراجم

یہ کتاب دراصل صحیح بخاری کے ابواب وتراجم کی تفصیلی شرح ہے۔اس کتاب میں ان قواعد اور اصولوں پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے جن سے ابواب وتراجم اور ابواب بلاتراجم کی احادیث کو باب سے تطبیق دی جاتی ہے۔امام بخاریؒ کے تراجم ہر دور میں پیچیدہ اور مشکل سمجھے گئے ہیں۔ان ابواب وتراجم کے مختلف ادوار میں کسی نے چودہ اور کسی نے پندرہ اُصول بیان کئے ہیں۔حضرت شیخ الحدیثؒ نے حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دونوں رسائل کو سامنے رکھ کر نیز شراح بخاری کی آراء اور حضرت گنگوہیؒ کے تراجم کی تحقیقات سب کو شامل کر کے اپنی ذاتی تحقیق وتنقیح سے ان اصولوں کی تعداد سترہ بیان کی ہے۔پھر ان اُصولوں کی روشنی میں ابواب وتراجم کے درمیان تطبیق کا کام کیا ہے۔

الکوکب الدُرّی

یہ بھی دراصل قطب الاقطاب حضرت گنگوہیؒ کے ترمذی کے افادات ہیں، جسے حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ نے دورانِ درس عربی میں تحریر فرمایا تھا۔حضرت شیخ الحدیثؒ نے اس پر حواشی کا اضافہ فرما کر اس کے مشکل اور پیچیدہ مقامات کی وضاحت کے ذریعے اور ائمہ کے اختلافات اور وجوہ اختلاف کو لکھ کر اسے ایک مستقل تصنیف اور اخذ واستفادہ کے قابل بنایا ہے۔

○ جزء حجة الوداع والعمرات

یہ بھی حضرت کی عربی تالیف ہے، جسے انہوں نے مشکوۃ کی تدریس کے دوران محض ایک دن اور دیڑھ رات میں تحریر فرمایا، اس کتاب کو اس موضوع پر دیگر کتب کے مقابلہ میں اس وجہ سے امتیاز حاصل ہے کہ اس میں اس موضوع سے متعلق تمام ان مباحث کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق حجۃ الوداع کے مبارک اور نورانی سفر سے ہے۔ یہاں تک کہ منازل سفر کی تحدیدٗ ان کے نام اور اس سفر میں پیش آنے والے مبارک مقامات و واقعات کی بالتفصیل نشاندہی کی گئی ہے۔

اُردو تصانیف

○ مجموعۂ فضائلِ اعمال

یہ آپؒ کی سب سے زیادہ مقبول ترین کتاب ہے جو اس وقت قبولیت عام کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں رہی ہے۔ یہ نوقیمتی کتابوں (حکایات صحابہؓ، فضائل نماز، فضائل تبلیغ، فضائل ذکر، فضائل قرآن مجید، فضائل رمضان، فضائل درود شریف، فضائل صدقات، فضائل حج) اور ایک فکری مضمون (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) کا مجموعہ، علم و معرفت کا گنجینہ اور مرقعۂ درس عبرت؛ دنیا کے اکتیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ کتاب کا ایک ایک لفظ نہ جانے اخلاص وللّٰہیت کی کس چاشنی میں ڈوبا ہوا ہے، جس نے ایک بار چکھا وہ اس کا دلدادہ اور گرویدہ ہو کر رہ گیا۔ بقول علامہ ندویؒ ''ان کتابوں کے ذریعہ ہزاروں بندگانِ خدا ولایت کے درجہ پر پہنچ گئے''۔(۱)

○ الاعتدال فی مراتب الرجال ''اسلامی سیاست''

یہ بھی حضرت کی دعوتی و اصلاحی کتاب ہے جس سے آپ کی وسیع النظری، اعتدالِ فکر اور بزرگوں کے احترام و عقیدت کے پاس ولحاظ کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب اسلامی سیاست کے نام سے بھی جانی جاتی ہے، اس کتاب کا محرک دراصل یہ ہوا کہ ۱۳۵۶ھ اور اوائل ۱۳۹۷ھ میں کانگریس اور لیگ کے درمیان اختلافات اس قدر شدید رخ اختیار کر گئے کہ دونوں جانب کے اکابر کی شان میں گستاخیاں اور بے ادبیاں ہونے لگیں، بات اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک دوسرے

(۱) ایک عالمی اور بین الاقوامی کتاب فضائلِ اعمال

کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کیا جانے لگا، چنانچہ آپ نے ایک طالب علم کے خط کے جواب میں یہ مفصل تحریر اسلام میں سیاسی اختلافات کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

○ آپ بیتی

آپ بیتی کے سات اجزاء دو جلدوں میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہ آپ بیتی پون صدی کی ایک جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر ہے۔ کہنے کو تو یہ آپ بیتی خودنوشت سوانح حیات ہے، خودنوشت سوانح حیات، سرگذشت حیات کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے مگر یہ یہاں اظہار ذات اس قدر ہمہ پہلو اور ہمہ جہت ہے کہ یہ طالبانِ علوم نبویہ، مریدین باصفا، علماء واساتذہ، مشائخ و پیران طریقت اور اولیاء واتقیاءؒ کے تذکروں کا گنج گرانمایہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے قلب و وجدان کو جلا پہنچتی ہے اور سعید روحیں عبرت و موعظت حاصل کرتی ہیں۔

○ فضائل نبوی ﷺ شرح شمائل ترمذی

شمائل ترمذی حضورِ اکرم ﷺ کے اخلاق وشمائل پر سب سے جامع حدیث کی کتاب ہے۔ حضرت شیخؒ نے اس کا اردو میں ترجمہ اور تشریح فرمائی، جس سے ہر عام وخاص کیلئے اس سے استفادہ اور انتفاع آسان ہو گیا ہے۔

ہم نے حضرت کے علمی مقام کو واضح کرنے کیلئے ان کی چند ایک تصانیف کی مع تعارف نشاندہی کی ہے، ورنہ حضرت کی تصانیف بقول مولانا شاہد صاحب (نواسۂ شیخ الحدیثؒ) :

۱- راقم سطور کے جائزہ اور تحقیق کے مطابق حضرت کی جملہ تالیفات ۱۰۳ ہیں جن میں ۴۲ اب تک طبع ہو چکی ہیں اور بقیہ ۶۱ غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ تالیفات فن اور موضوع کے اعتبار سے اس طرح بھی شمار کی جاسکتی ہیں :

(۱)	علم تفسیر	۲/کتابیں	(۲)	علم حدیث	۶۰/کتابیں
(۳)	علم فقہ واصول فقہ	۴/کتابیں	(۴)	علم تاریخ وسیرت	۲۲/کتابیں
(۵)	علم تجوید وقرأت	۲/کتابیں	(۶)	علم نحو، منطق وسیرت	۳/کتابیں
(۷)	علم سلوک واحسان	۳/کتابیں	(۸)	دفاع اسلام	۴/کتابیں
(۹)	متفرق مضامین	۳/کتابیں			

کل میزان ۱۰۳/کتابیں

حضرت شیخؒ کا علمی مقام علمائے عرب وعجم کی نظر میں

حضرت شیخ الحدیث کے فضل وکمال اور ان کے علمی مقام کی ایک واضح دلیل اور سچی شہادت یہ بھی ہے کہ اس وقت کی بڑی بڑی ہستیوں نے آپ کے ان علمی کارناموں کو بنظرِ تحسین دیکھا ہے اور ان کاموں کو خوب سراہا ہے۔ ہم یہاں چیدہ اور اکابر علماء کے چند آراء واقوال کو نقل کئے دیتے ہیں جس سے آپؒ کے رتبے کی بلندی اور قد کی درازی کا خوب پتہ چلتا ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ متوفی ۱۳۴۶ھ

حضرت شیخ کا جب بھی ذکر آئے گا تو ساتھ ہی سب سے پہلے جس بزرگ شخصیت کا نام ذہن میں آئے گا، وہ حامیٔ سنت، قاطعِ بدعت، محدث وعلامہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحبؒ ''صاحبِ بذل المجہود'' کی ہوگی۔ آپ کے تلمیذ اقرب، فیضیاب اور تربیت یافتہ تھے۔ حضرت سہارنپوریؒ نے آپ کو خرقۂ خلافت سے بھی نوازا تھا۔ وہ آپ کے علم وقابلیت کے اس قدر قدرداں اور معترف تھے کہ آپ کو شیخ الحدیث کے منصب کی آپ کی نوعمری ہی میں پیشکش کی تھی اور بذاتِ خود انہیں ان کے علوم حدیث پر وسیع نظر کی وجہ سے شیخ الحدیث کے خطاب سے بھی نوازا۔

۱۳۴۱ھ میں جو کہ حضرت شیخ کی نوعمری کا زمانہ تھا اور ان کی عمر ۲۶ سال سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، حضرت مولانا سہارنپوریؒ نے ان کو بخاری شریف کے تین پارے پڑھانے کیلئے دیئے۔ شیخ کو اس پر تأمل ہوا اور خود کو نوعمر کہہ کر معذرت کرنی چاہی تو اس پر مولانا سہارنپوریؒ نے فرمایا:

نوعمر لڑکے کو میں ہی جانوں، دوسرے لوگ کیا جانیں؟ اگر کوئی الزام دے گا تو مجھے دے گا تمہیں تو نہیں دے گا۔(۱)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی ۱۳۶۲ھ

حضرت تھانویؒ حضرت شیخ کے علمی مرتبہ کے قدرداں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ خصوصی توجہ اور شفقت کا معاملہ فرماتے۔ حضرت تھانویؒ آپ کے ساتھ خصوصی رعایت اور آپ کی قدر وعظمت، آپ کی محنت، لگن اور علمی جستجو کے اس قدر معترف تھے کہ آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

میں نے (حضرت شیخ) نے ایک مرتبہ بہت قلق کے ساتھ حضرت حکیم الامت سے عرض کیا

(۱) حیاتِ خلیل: ص/۶۰۶

کہ لوگ تو بہت دور دور سے حاضر ہوتے ہیں لیکن یہ نا کارہ یہاں رہ کر (اس وقت یہ وہاں پروف ریڈنگ اور بذل کی طباعت کی غرض سے قیام فرماتھے) بھی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا، حضرت حکیم الامت نے ایسا جواب مرحمت فرمایا کہ میری مسرت کیلئے مرنے تک کافی ہے۔حضرت نے فرمایا: مولوی صاحب! اس کا آپ فکر نہ کریں، آپ اگرچہ میری مجلس میں نہیں ہوتے، مگر میں ظہر سے عصر تک آپ ہی کی مجلس رہتا ہوں، میں بار بار آپ کو دیکھتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ کام تو یوں ہوتا ہے، میں آپ کو ظہر سے عصر تک اپنے اوراق سے سر اٹھاتے نہیں دیکھتا۔(۱)

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ متوفی ۱۳۷۷ھ

حضرت شیخ کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کی محبت ومودت اور روابط وتعلقات کی بھی عجیب داستان ہے، حضرت شیخ اپنی آپ بیتی میں صفحہ ۳۹۳ سے صفحہ ۴۲۰ تک صفحات میں ان کا ذکر فرمایا ہے:

''یہ بھی ان کی علمی لیاقت کے نہایت معترف تھے، چنانچہ جب حضرت شیخؒ نے موطا کی شرح لکھی تو اس کتاب کی بہت تعریف وتوصیف فرمائی تھی۔حضرت شیخؒ نے اس حوالہ سے آپ بیتی میں ایک واقعہ لکھا ہے: ''ایک مرتبہ حضرت قدس سرہ نے میری دیوبند حاضری پر یہ ارشاد فرمایا کہ تم نے اوجز کے کتاب الحج میں ایک ایسی اچھی بات لکھی ہے، جس سے دل بہت خوش ہوا اور امام بخاریؒ کے بہت سے اعتراضات تمہاری تقریر سے اُٹھ گئے''۔(۲)

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب ''اوجز'' طبع بھی نہیں ہوئی تھی۔حضرت مدنیؒ کو اسے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا بہت شوق تھا، جیسا کہ حضرت شیخ لکھتے ہیں :

''ایک مرتبہ بہت ہی قلق سے فرمایا کہ میرے سامنے طبع ہو جاتی، تو میں بھی متمتع ہوتا، میرے بعد طبع کروگے تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟''۔(۳)

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ متوفی ۱۳۶۲ھ

آپ نہ صرف حضرت شیخؒ کے چچا تھے بلکہ ان کی پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت میں آپ کے والد حضرت یحییٰ صاحبؒ کے ساتھ برابر شریک رہے ہیں، ان کو حضرت شیخ الحدیثؒ کے

(۱) آپ بیتی : ۳۵۹/۱ (۲) آپ بیتی : ۴۰۴/۱ (۳) آپ بیتی : ۴۰۴/۱

علم واستعداد پر اس قدر اعتماد تھا کہ حضرت شیخ نے فضائل پر جو کتابیں اور رسائل تصنیف فرمائے ہیں ان میں سے اکثر کتابیں انہیں کے ایماء وحکم سے لکھی گئیں۔(۱)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ متوفی ۱۳۷۵ھ

حضرت شیخ کی عظیم الشان تصنیف ''اوجز المسالک'' کو ممتاز عالم دین، اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب اور انشاء پرداز مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا :

''جنابِ والا کی کتاب ''اوجز المسالک'' کا خاکسار یوں تو سرسری مطالعہ پہلے بھی کیا تھا، لیکن حال میں موطا پڑھاتے ہوئے اس کتاب کے تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا، بے اختیار بار بار جی چاہا کہ اس عظیم علمی خدمت پر آپ کو مبارکباد دوں، بعض چیزیں آپ کی کتاب میں ایسی ہیں جو شاید اس کتاب کے سوا کم از کم مجھے تو نہیں ملی تھیں۔ چند دن ہوئے قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں آپ کی بعض تعبیروں اور ائمۂ امصار کے بعض مذاہب کی نشاندہی میں آپ کی وسعتِ نظر سے دل بڑا خوش ہوا''۔(۲)

جامع ترمذی پر حضرت گنگوہیؒ کی تقریر ''الکوکب الدُرّی'' جب حضرت شیخ کے حواشی واہتمام کے ساتھ شائع ہوئی تو مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ایک ملاقات میں حضرت شیخ سے کہا:

''جسمانی ملاقات اگر چہ پہلی مرتبہ ہو رہی ہے مگر روحانی ملاقات روزانہ ایک گھنٹہ رہتی ہے، جب سے ''الکوکب الدری'' طبع ہوئی ہے۔ ترمذی پڑھانے کیلئے ایک گھنٹہ اس کا مطالعہ بہت اہتمام سے کرتا ہوں، گویا آپ کی مجلس میں رہتا ہوں۔'' (۳)

شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب متوفی ۱۳۷۴ھ

عربی زبان وادب کے نکتہ شناس اور رمز آشنا ''نفحۃ العرب'' جیسی کتاب کے مصنف اور دیوانِ متنبّی اور دیوانِ حماسہ جیسی اہم کتابوں کے محشی، شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے ''الکوکب الدُرّی'' کے مطالعہ کے بعد حضرت شیخ کو یہ مکتوب ارسال فرمایا تھا :

''الکوکب الدُرّی کی دونوں جلدوں کے مطالعہ سے ابھی فارغ ہوا ہوں اور سخت مشکل میں ہوں کہ اگر تعریف کروں تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے اور اگر سکوت

---

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا : ص/۲۵۲ (۲) فہرستِ تالیفات :۵۸/۱

(۳) فہرستِ تالیفات: ۲۷۲/۳

کروں تو کفرانِ نعمت کے مشابہ، اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ آپ نے ترمذی پڑھانا آسان کردیا''۔(۱)

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ متوفی ۱۴۰۵ھ

نہایت ہی محقق عالم، متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف،''رسالہ برہان'' کے مدیر تھے۔ یہ شیخ الحدیثؒ کے علمی رسوخ اور گہرائی و گیرائی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا ان تمام چیزوں پر غور و فکر کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ نبوغ علم اور تالیفات کی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے حضرت شیخ اپنے وقت کے ابن جوزی اور غزالی تھے اور علماء عصر حاضر میں بجز مولانا عبدالحئ فرنگی محلیؒ کے کسی کو ان کے مثیل وقرین نہیں قرار دیا جاسکتا۔''(۲)

حضرت مولانا یوسف بنوریؒ متوفی ۱۳۹۷ھ

اِمام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خاص تلامذہ میں سے اور ان کے علوم کے ترجمان تھے ''معارف السنن'' کی تصنیف ان کا بڑا کارنامہ ہے۔حضرت شیخ کی کتاب جزء حجۃ الوداع پر اُنہوں نے مقدمہ لکھا ہے۔اخیر میں تحریر فرماتے ہیں،عربی تحریر کا ترجمہ ہے:

''مگر یہ کہ اسلاف میں کچھ باقی ماندہ لوگ تھے، جو بعد کے دور میں نمودار ہوئے، جنہوں نے علم وفقہ کے میدان میں قابل قدر کوششیں انجام دیں۔ یہ لوگ اپنے علم وفضل اور بزرگی وخداترسی سے اسلاف کی تصویر پیش کرتے ہیں اور اس بابرکت اور روح پرور دور کی یاد دلاتے ہیں۔انہی افراد میں اپنی علمی اور عملی کمالات میں قابل رشک اور منفرد شخصیت، بہترین اور نفع بخش کتابوں کے مصنف، عمدہ وبیش قیمت حواشی کے محشی حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی سہارنپوری ہیں۔''

الشیخ السید علوی المالکیؒ

اِس دور کے مالکی علماء میں بڑا اہم مقام اور بلند درجہ رکھتے تھے، حضرت شیخ اور ان کی کتاب ''اوجز'' کی نسبت ان کے تاثر کو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے:

---

(۱) فہرستِ تالیفات :۲۷۹/۳ (۲) الفرقان : ص/۹۹

''مکہ معظّمہ میں سید علوی ایک مالکی مدرس ہیں، ابھی جوان ہیں، مگر ماشاء اللہ بہت فہیم وذی علم ہیں، سلسلۂ کلام میں آپ کی شرح موطا امام مالک کی بہت تعریف فرمائی''۔(۱)

اُن ہی کے بارے میں مولانا علی میاں ندوی صاحبؒ لکھتے ہیں:

''میں نے علامہ حجاز مفتی مالکیہ سید علوی مالکی سے جو نہ صرف حجاز بلکہ اپنے دور کے نہایت متبحر اور وسیع النظر عالم تھے اور وسعت علم اور استحضار میں ان کو علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، اوجز کی تعریف سنی، وہ اس پر تعجب کا اظہار کرتے تھے کہ خود مالکیہ کے اقوال ومسائل کا اتنا گہرا علم اور اتنی صحیح نقل موجب حیرت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر شیخ زکریا مقدمہ میں اپنے کو حنفی نہ لکھتے تو میں کسی کے کہنے سے بھی ان کو حنفی نہ مانتا، میں ان کو مالکی بتاتا؛ اس لئے کہ اوجز المسالک میں مالکیہ کی جزئیات اتنی کثرت سے ہیں کہ ہمیں اپنی کتابوں میں تلاش کرنے میں دیر لگتی ہے''۔(۲)

شیخ عبدالفتاح ابوغدۃؒ

عالمِ عرب کے اس زمانے کے مشہور عالم ومحدث تھے، انہوں نے ایک مکتوب میں ''اوجز'' کے تعلق سے اپنے تاثرات یوں قلمبند فرمائے ہیں جس کا ترجمہ پیش ہے :

''یعنی موطا کی اس شرح کے ذریعہ آپ نے دلوں اور سینوں کو کھول دیا اور عقلوں اور نگاہوں کو روشن کردیا اور مستفیدین کے فائدہ رسانی میں کوشش صرف کی ہے۔''(۳)

شیخ محمد عبداللہ التنبکیؒ

شیخ عبداللہ حرمِ نبوی ﷺ کے اِمام اور عالم وفاضل شخص تھے، انہوں نے حضرت شیخ کی تالیف ''اوجز المسالک'' کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں لکھا ہے جس کا ترجمہ پیش ہے :

''اس کا سوتا ایک ایسے عالم کے قلم سے پھوٹا ہے جو علم کا سمندر ہے، اس لئے اس کی ہر سطر ایک کتاب کے درجے میں بھی ہو تو اس پر کوئی تعجب نہیں، وہ ایک شیریں سمندر ہے۔ باریکیوں کے سمندر کا سنگم ہے، عاملین ومحدثین کا گنجینہ ہے۔ منتخب موتی ہے

---

(۱) فہرستِ تالیفات:۱/۴۵ (۲) فہرستِ تالیفات:۱/۴۲-۴۵

(۳) فہرستِ تالیفات:۱/۸۲

اور نیکو کاروں کا باغ ہے۔"(۱)

گذشتہ صفحات میں آپؒ کے حیات کے ضمن میں ان باتوں کا جو تذکرہ آیا ہے، مقصود اس سے آپ کے علمی مقام کا بتلانا تھا ورنہ تو آپ کی زندگی اس قدر ہمہ جہت ہے اور آپ نے اس قدر مختلف اور متنوع میدانوں میں اپنے علم وعمل کے جوہر دکھائے ہیں کہ اس کیلئے ایک ضخیم تالیف کی ضرورت ہوگی۔

وفات

وادئ علم وتحقیق کی آبلہ پائی اور دعوت واصلاح میں جگر کاوی کرتا ہوا یہ بندۂ خدا، اسی ذات کی عشق ومحبت میں جس کے اقوال واعمال اور حرکات وسکنات کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھا، اسی نبئ آخرالزماں کی سرزمین مدینۂ طیبہ میں اپنی جان جان آفرین کے حوالہ کردیا اور وہیں پیوندِ خاک ہوگیا۔

یکم شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴ر مئی ۱۹۸۲ء کو پیر کے دن شام کے پانچ بجکر چالیس منٹ پر مدینہ منورہ میں حضرت اقدس شیخ الحدیث کا وصال ہوا، کچھ کم ۸۷ سال کی عمر ہو پائی، قبل نمازِ عشاء جنازہ باب السلام سے حرم شریف لے جایا گیا، بعد نمازِ عشاء حرمِ شریف کے اِمام شیخ عبداللہ زاحم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنازہ کو باب جبرائیل سے جنت البقیع کی طرف لے چلے۔ ہجوم بے پناہ تھا، قبرِ شریف حضرت شیخ کی منشا کے مطابق اہل بیت کے احاطہ اور حضرت سہارنپوریؒ کی قبرِ شریف کے قریب تیار کی گئی۔ وہیں حضرت رحمۃ للعالمین ﷺ کے سایۂ عاطفت میں، صحابہ واہلِ بیت رضی اللہ عنہم اور اکابرِ اُمتؒ کے زیرسایہ قیامت تک کیلئے آسودۂ خاک ہوئے اور عمر بھر کی وہ تمنا پوری ہوئی جس کی خاطر شب وروز بے قرار وبے چین رہے اور بقول جگر مرادآبادی :

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

---

(۱) فہرستِ تالیفات: ۱/۴۷

ضعیف احادیث اور فضائلِ اعمال

عوام تو عوام خواصِ اُمت اور متوسط طبقۂ علماء بھی ''ضعیف حدیث'' کا عرفی اور لغوی معنی سمجھتا ہے، عموماً ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے اور مختلف مکاتبِ فکر کی طرف سے یہی باور کرایا جاتا ہے کہ ضعیف کا مطلب ''بوڑھی یا ناکارہ یا بے کار'' حدیث ہے، جس کی شریعت میں کوئی حیثیت ووقعت نہیں، حالانکہ ''ضعیف حدیث'' محدثین کی ایک خاص اِصطلاح ہے' اِس سے متعلق احکام اُصولِ حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں اور کوئی حدیث کی کتاب یہاں تک کہ بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ بھی ضعیف احادیث سے خالی نہیں ہیں، نیز اعمال کے فضائل پر مشتمل حدیث کی کتابیں تو خصوصاً ضعیف احادیث کی ایک خاصی مقدار کو لئے ہوئے ہیں؛ لہٰذا فضائلِ اعمال میں احادیثِ ضعیفہ کا ہونا اصولِ حدیث کے خلاف بھی نہیں اور نہ علماءِ حدیث کے طرزِ عمل سے علیحدہ کوئی روش ہے، ہم نے اس مقالہ میں ضعیف احادیث کی شرعی حیثیت' اُس پر عمل واستدلال کا مقام اور کتبِ احادیث اور مشہور کتابوں میں مذکور احادیثِ ضعیفہ کی مقدار ائمۂ حدیث کے اقوال کی روشنی میں اِن تمام اُمور کی وضاحت کی ہے، تاکہ قارئین کو اِس بارے میں کامل اطمینان ہوجائے۔

ضعیف احادیث اور فضائلِ اعمال

اسلام ایک کامل اور مکمل دین ہے، یہ ہر شعبہ زندگی میں انسانیت کی رہنمائی و رہبری کا عظیم فریضہ انجام دینے آیا ہے۔قرآنِ کریم کو اسلامی زندگی میں اساسی دستور اور قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ عزوجل نے اسے لوگوں کیلئے کتاب ہدایت بنا کر نازل فرمایا ہے۔اس کی توضیح وتشریح کی ذمہ داری اپنے رسولِ مقبول ﷺ کو سونپی ہے جس کو اللہ عزوجل نے یوں بیان کیا ہے: ''وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ '' (۱) اور آپ ﷺ پر یہ قرآن بھی اتارا ہے؛ تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان پر ظاہر کر دیں۔

اور یہ توضیح وتشریح کا کام بذات خود آپ اپنی مرضی سے نہیں کرتے ؛ بلکہ یہ بھی پیغامِ ربانی اوروحی الٰہی پر مشتمل ہوتا ہے؛ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى (۲) وہ (ہمارے رسول) اپنی مرضی سے نہیں بولتے وہ تو صرف وحی ہے جو آپ کی طرف کی جاتی ہے۔

گویا حدیثِ نبوی بھی وحی الٰہی پر مبنی ہے اور یہ بھی اُصول دین میں سے ایک عظیم اصل اوراس کی عمارت کا مضبوط و مستحکم ستون ہے اور اس کو قانون اسلامی اور شرعی آئین وضوابط کے بیان میں دوسرے درجہ کا مقام حاصل ہے؛لیکن چونکہ یہ ایک ایسا بحر ناپید کنار اور اس قدر بڑا ذخیرہ ہے کہ اس کی بآسانی گرفت وحفاظت اوراس میں کھرے کھوٹے اور اچھے برے کی تمیز ممکن نہیں تھی، شہرت کے طالب، غالی معتقدین اور بادشاہوں کے خوشامد اپنے مطلوب ومقصود کو حاصل کرنے اور ناپاک عزائم اور ارادوں کی تکمیل کیلئے خود ساختہ اور من گھڑت احادیث کو وضع کر کے احادیث کے اس عظیم الشان ذخیرہ میں ضم کرنے پر تلے ہوئے تھے،اس لئے علماءِ اُمت نے آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال اور آپ کی تقریرات (تائید کردہ) اُمور کو جو بواسطہ آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے نقل درنقل کے طریقے سے ہم تک پہنچتے رہے تھے،ان کو اس قسم کے خرد برد سے بچانے، ان کے صحت وسقم اور ثبوت وعدم ثبوت کو جاننے کیلئے ،احادیث کے ذوق ومزاج کو سامنے رکھ کر بہت سے اصول وقواعد وضع کئے اور اس کے کچھ شرائط وضوابط بنائے ،جس میں حدیث کے مقام ومرتبہ

(۱) النحل : ۴۴ (۲) النجم :۳

اوراحکام کے بیان اوراس پر عمل پیرا ہونے میں اس کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے، جو حدیث ثبوت کے جس اعلیٰ درجہ پر فائز ہوگی، عمل واستدلال میں بھی اسے وہی مقام حاصل ہوگا اور چونکہ حضور ﷺ سے حدیث کے ثبوت وعدم ثبوت کے جاننے کا ذریعہ اس حدیث کے سلسلہ رواۃ کا اسناد ہے، جس حدیث کے رواۃ' حدیث کے ثبوت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں گے۔ اس حدیث کا مقام ومرتبہ اسی قدر فائق ہوگا، جن احادیث میں شرائط ثبوت میں کمی اور کوتاہی ہوگی وہ اسی اعتبار سے کم درجہ کی شمار ہوں گی۔

الغرض محدثین نے احادیث کے ذوق ومزاج کو سامنے رکھ کر جو شرائط ثبوت وضع کئے ہیں اس اعتبار سے احادیث کے مختلف اور متفاوت درجات ہوتے ہیں: صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ۔

حدیثِ صحیح

وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو، جس کے راوی از اول تا انتہاء سب کے سب عادل اور ضابط ہوں اور اس میں کسی قسم کی علت اور شذوذ نہ پایا جاتا ہو۔

حدیثِ حسن

وہ ہے جس کے راوی کے قوت حافظہ میں کچھ خلل ہو، اس کی ایک دوسری قسم یہ بھی ہے کہ وہ حدیث تو فی نفسہٖ ضعیف ہو؛ لیکن اُس کے دوسرے طرق اور اسناد سے آنے کی وجہ سے وہ حسن کے درجہ پر ترقی کرگئی ہو۔

حدیثِ ضعیف: وہ ہے جس میں صحیح اور حسن کے شرائط اور اوصاف مفقود ہوں۔

ضعیف حدیث پر عمل اور اِستدلال سے متعلق علماء کے مذاہب

- جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ: فضائل، ترغیب وترہیب سے متعلق اُمور اور قصص وامثال وغیرہ میں حدیثِ ضعیف پر عمل کیا جاسکتا ہے؛ البتہ احکام میں ضعیف احادیث پر عمل نہیں کیا جاسکتا، یعنی ضعیف احادیث سے حلال وحرام کا ثبوت نہیں ہوسکتا :

ابن مہدی وغیرہ سے اِس بابت منقول ہے ''حلت وحرمت کے ثبوت میں ضعیف حدیث کے متعلق ہمارا سخت رویہ ہوتا ہے؛ البتہ فضائل وغیرہ کی روایت میں ہم نرمی اختیار کرتے ہیں'' (۱)

---

(۱) فتح المغیث فی معرفة من تقبل روایته ومن تردد :۲۸۸/۱،دار الکتب العلمیة

- بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ مطلقاً ضعیف احادیث قابل عمل ہوتی ہیں؛ خواہ احکام کے باب میں ہوں یا فضائل کے باب میں، علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں :

"یہ بات امام ابوداؤدؒ اور امام احمدؒ کی طرف منسوب ہے؛ چونکہ ان دونوں کا یہ خیال ہے کہ ضعیف حدیث دوسروں کی آراء کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتی ہے"۔

- امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور ان کے علاوہ دیگر محدثینؒ کا اِس بارے میں یہ مسلک رہا ہے کہ یہ لوگ ضعیف احادیث کو بالکل قابل عمل نہیں مانتے، نہ اُس کو احکام میں قابلِ عمل سمجھتے ہیں اور نہ فضائل کے باب میں، علامہ جمال الدین قاسمی نے اُصولِ حدیث میں یہ بات کہی ہے' اِس مسلک کی نسبت اُن دونوں اِماموں کی جانب صحیح روایت کے اعتبار سے دُرست نہیں ہے، ان دونوں کی جانب اس مسلک کے دُرست نہ ہونے کے متعلق مزید تردیدی بیان آگے آئے گا۔

علامہ عبدالحئیؒ لکھنوی نے اس مسئلہ کے متعلق ان دونوں کے آراء کے ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ:

"امام نوویؒ نے اپنی متعدد تصانیف میں محدثین وغیرہ کا فضائل اعمال کے باب میں ضعیف حدیث پر عمل کی بابت اجماع نقل کیا ہے۔" (۱)

لیکن سب سے زیادہ افسوس ان لوگوں پر ہے جو ضعیف احادیث کو بالکل مردود قرار دیتے ہیں اور اسے بالکل قابل اعتناء نہیں سمجھتے اور یہ کہتے ہیں: شیخین (بخاری ومسلم) کی روایت کردہ صحیح احادیث ہی قابلِ استدلال ہیں، بعض لوگوں نے اس بارے میں اس قدر سخت رویہ اختیار کیا ہوا ہے کہ یہ لوگ سنن، مسانید اور دیگر حدیث سے متعلق تصانیف اور دواوین کو ناقص اور نا تمام قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، یہ اپنے رویہ کے ذریعہ اُمتِ مسلمہ کو ان کی عظیم علمی روایات سے محروم کر رہے ہیں، مندرجہ ذیل تحریر میں ضعیف حدیث سے اِستدلال میں اُس کے مقام ومرتبہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

احکام میں ضعیف احادیث سے اِستدلال

ضعیف حدیث سے اگر اس کا ضعف انتہائی درجہ کا نہ ہو تو احکام شرعیہ میں استدلال درست ہے، مطلب یہ ہے کہ اسے جھوٹے راوی نے' اور ایسے راوی نے جس پر جھوٹ کہنے کا الزام ہو' تنہا روایت نہ کیا ہو، ضعیف احادیث سے استدلال پر فقہاء ومحدثین کا طرزِ عمل واضح طور پر دلالت کرتا ہے، ضعیف احادیث سے اِستدلال کی چند صورتیں ہیں :

(۱) الاجوبة الفاضلة لعبد الحی اللکناوی

- ایک تو صورت یہ ہے کہ اِس مسئلہ میں سوائے ضعیف حدیث کے کوئی مضبوط اور مستحکم دلیل نہ ہو، ہم اُس صورت کی وضاحت مندرجۂ ذیل طریقہ پر، مختلف مذاہب کے ائمہ کے ضعیف حدیث پر عمل کے متعلق اِہتمام پر دلالت کرنے والے نصوص کی روشنی میں کریں گے۔

حنفیہ

ابنِ حزم نے المحلیٰ میں اِمام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

"الخبر الضعیف عن رسول اللّٰہ ﷺ أولیٰ من القیاس ولا یحلّ القیاس مع وجودہ" (۱) حضور ﷺ سے مروی ضعیف حدیث قیاس سے اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے، اِس لئے ضعیف حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس دُرست نہیں۔

حافظ اِبن قیمؒ نے اِس کی مثال یوں بیان کی ہے، فرماتے ہیں :

۱- اِمام ابوحنیفہؒ نے نماز میں قہقہہ مار کر ہنسنے سے متعلق حدیث کو نرے قیاس پر مقدم مانا ہے؛ حالانکہ علماء نے اس روایت کو بالاتفاق ضعیف قرار دیا ہے۔

۲- اِسی طرح "اکثر الحیض عشرۃ ایّام" (حیض کی بیشتر مدت دس دن ہے) اِس حدیث کو جبکہ یہ بہ اتفاقِ علماء ضعیف ہے، محض قیاس پر مقدم کیا ہے۔

۳- ایسے ہی "لا مھر أقلّ من عشرۃ دراھم" (دس درہم سے کم مہر نہیں ہوتا) اِس حدیث کو محض قیاس پر مقدم مانا ہے؛ حالانکہ اِس روایت کے ضعیف ہونے پر تمام ائمۂ حدیث متفق ہیں؛ بلکہ بعض لوگوں نے اِس حدیث کو بالکل باطل قرار دیا ہے۔(۲)

- محقق کمال ابن ھمامؒ کہتے ہیں :

الاستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع (۳)

---

(۱) الاحکام لابن حزم :۳۶۸/۷،دار الحدیث ، القاھرۃ

(۲) اعلام الموقعین: ۸۵۱،مکتبۃ الکلیات الأزھر یۃ ، مصر

(۳) فتح القدیر، باب النوافل: ۱۳۹/۱

اگر ضعیف حدیث موضوع درجے کی نہ ہو تو اُس سے استحباب کا ثبوت ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر :

(الف) مغرب کے بعد کی چھ رکعت (جنہیں صلاۃ الاوّابین کہا جاتا ہے) مستحب ہیں؛ جیسا کہ طحطاوی کے حاشیہ میں مذکور ہے، اس کے استحباب پر دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول مرفوع روایت ہے: ”من صلی بعد المغرب ست ركعاتٍ لم يتكلم فيما بينهنّ بسوءٍ عدلن له بعبادة عشرة سنة“ (جو شخص بعد مغرب چھ رکعت نماز پڑھے اور ان کی ادائیگی کے دوران کوئی بری بات نہ کرے تو اسے دس سال کی نماز کا ثواب ملتا ہے)۔(۱)

(اس حدیث کو ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے) اور امام ترمذی نے اسے عمر بن خثعم کی سند سے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث غریب ہے اور یہ صرف عمر بن خثعم کی سند سے منقول ہے، ذہبی نے ”میزان“ میں عمر بن خثعم کے احوال میں کہا ہے کہ بخاری کہتے ہیں کہ: ”یہ شخص منکر الحدیث اور غیر معتبر ہے، پھر اس حدیث کو اس کے منکرات میں شمار کیا ہے، ابن طاہر المقدسی نے اپنی ”تذکرۃ الموضوعات“ میں اس روایت کا ذکر کیا ہے، مبارک کہتے ہیں: ”یہ حدیث باجماعِ محدثین ضعیف ہے“۔

(ب) اسی طرح جو شخص میت کے دفنانے میں شریک ہو، اس کیلئے مستحب یہ ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ بھر کر مٹی لے پھر تین مرتبہ مردہ کے سر کی جانب سے اُس کی قبر میں وہ مٹی ڈالے، پہلی مرتبہ یوں کہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ، دوسری بار میں یہ کہے: وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ، تیسری بار میں یہ کہے : وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى اس کو طحطاوی میں مستحب لکھا ہے(۲) اور اس کے مستحب ہونے پر ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بطورِ ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو قبر میں رکھا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں پڑھا ”مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ“ اس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پڑھنا بھی منقول ہے: ”وبسم الله، وفی سبيل الله وعلى ملة رسول الله“ احمد اور حاکم نے اس روایت کی تخریج کی ہے، اس کی سند بالکل ضعیف ہے، ذہبی نے ”تلخیص“ میں اس حدیث کے متعلق یوں کہا ہے: یہ بالکل لغو اور باطل ہے؛ چونکہ اس میں علی بن زید متروک الحدیث ہے۔

---

(۱) حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح ۳۹۰، دار الكتب العلمية ، بيروت

(۲) طحطاوی: ص/۶۱۱، دار الكتب العلمية ، بيروت

مالکیہ

اِمامِ مالکؒ مرسل کو اس کے عمومی معنی یعنی ہر منقطع کو (جس کے سند کے راوی مختلف جگہوں سے حذف ہوگئے ہوں) کو قابلِ اِستدلال سمجھتے ہیں اور یہ مرسل روایتیں جمہور محدثین کے یہاں ضعیف شمار ہوتی ہیں، مالکیہ کی نہایت ہی معتبر کتاب ''نشر البنود علی مراقی السعود'' میں ہے :

علم من احتجاج مالك ومن وافقه بالمرسل أنّ كلّا من المنقطع والمعضل حجة عندهم لصدق المرسل بالمعنى الأصولى على كل منهما. اِمامِ مالکؒ اور ان پیروؤں کے مرسل سے استدلال کے درست قرار دینے سے یہ معلوم ہوا کہ ان کے یہاں منقطع اور معضل (جس کی سند کے راوی ایک جگہ سے مسلسل دو حذف کر دیے گئے ہوں) دونوں بھی مرسل کے عمومی معنی (جس کے سند کا راوی کسی بھی جگہ سے حذف کر دیا گیا ہو) کے لحاظ قابلِ استدلال ہیں۔(۱)

شوافع

اِمامِ شافعیؒ کے یہاں بھی مرسل سے اگر متعلقہ باب میں اس کے علاوہ کوئی دوسری روایت نہ ہو تو باوجود مرسل روایت کے ان کے یہاں ضعیف ہونے کے اس سے استدلال درست ہے، سخاوی سے یہ بات منقول ہے، کہتے ہیں :

وزعم الماوردى أنّه فى الجديد يحتجّ بالمرسل إذا لم يوجد دليل (۲) ماوردی کا غالب گمان یہ ہے کہ امام شافعیؒ باعتبار اپنے نئے قول کے، اگر متعلقہ باب میں مرسل کے سوا کوئی دوسری دلیل نہ ہو تو اس سے اِستدلال کو دُرست قرار دیتے ہیں۔

أن الحديث الضعيف مقدّم على القياس، وقدّم فى احد قوليه حديث "من قاء، أورعف، فليتوضّأ، وليبن على صلوته" على القياس مع ضعف الخبر وإرساله.

---

(۱) نشر البنود على مراقى السعود : ۶۳/۲

(۲) الفتح المغيث : ۱۴۹/۱،دار الكتب العلمية ، بيروت

حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :
''ضعیف حدیث قیاس پر مقدم ہوتی ہے''اس لئے کہ
(الف)انہوں نے صیدوج کی حدیث کوضعف کے باوجود قیاس پر مقدم کیا۔
(ب) حرمِ مکی کے اندر اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنے کے جواز والی حدیث کوضعیف ہونے کے باوجود قیاس پر مقدم کیا ہے۔
(ج) اپنے ایک قول میں ''جو شخص قئے کرے یا جس کی نکسیر پھوٹے تو اُسے چاہئے کہ وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے''، اِس حدیث کو باوجود اِس کے ضعیف اور مرسل ہونے کے قیاس پر مقدم کیا ہے۔(۱)

حنابلہ

(الف)ابن النجار حنبلی نے ''الکوکب المنیر'' کی شرح میں امام احمدؒ کے اس قول کونقل کیا ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں :
''لستُ اخالف ماضعف من الحديث إذا لم يكن في الباب ما يدفعه'' (۲)''میں ضعیف کواس وقت تک رد نہیں کرتا جب تک اس کے معارض قول نہ ہو''۔
(ب) ہروی نے ذم الکلام میں عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ یوں فرماتے ہیں:
''میں نے اپنے والد محترم سے کہا:''رجل وقعت له مسئلة؛ وفي البلد رجل من أهل الحديث، فيه ضعف وفقيه من أهل الرأي، أيّهما يسأل؟ قال: لايسأل أهل الرأى، ضعيف الحديث خير من قوى الرأي '' (۳)اگر کسی شخص کوایک مسئلہ درپیش ہو،شہر میں ایک ضعیف الروایۃ اہلِ حدیث اور ایک اہل الرائے فقیہ بھی ہوتو وہ کس سے دریافت کرے؟ توانہوں نے فرمایا:اہلِ رائے سے ثبوت کیلئے دریافت نہ کرے؛اس لئے کہ ضعیف الروایۃ شخص قوی الرائے فقیہ سے بہتر ہے۔''

---

(۱) اعلام الموقعين : ۸۵/۱،مكتبة الكليات الأزهرية
(۲) شرح الكوكب المنير : ۵۷۳/۲،مكتبة العبيكان
(۳) ذم الكلام : ۱۷۹/۲،۱۸۰،مكتبة العلوم والحكم

(ج) امام فقیہ ابن القدامۃ المقدسی نے کہا ہے کہ :

نوافل اور فضائل کے ثبوت کیلئے حدیث کی صحت شرط نہیں ہوتی۔انہوں نے دورانِ خطبہ حبوہ (یعنی سرین کو ٹیک کر، گھٹنوں کو کھڑا کر کے، اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑ لینا) کے طرز پر بیٹھنے سے متعلق یوں فرمایا:

''امام کے خطبہ دینے کے دوران اس حالت میں بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے منقول ہے''۔

پھر آگے کہتے ہیں:

''بہتر یہ ہے کہ اس ہیئت پر نہ بیٹھا جائے؛ چونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کے دن خطبہ کے دوران اس ہیئت پر بیٹھنے کی ممانعت آئی ہے؛ اگرچہ یہ حدیث ضعیف درجہ کی ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے اس ہیئت کا نہ اپنانا بہتر ہے۔''(۱)

متقدمین ائمہ عظام کی ان تصریحات سے یہ پتہ چلا کہ وہ لوگ ضعیف احادیث کو قابل اعتنا سمجھتے ہیں اور اس پر احکام کی بنیاد رکھنے کو درست قرار دیتے ہیں۔

- اگر ضعیف حدیث پر عمل احکام میں بطور احتیاط ہو رہا ہو تو ضعیف حدیث پر عمل درست قرار دیتے ہیں۔ یہ بات امام نوویؒ نے ''اذکار'' میں جہاں انہوں نے احکام میں ضعیف حدیث پر عمل درآمد نہ کئے جانے کا ذکر کیا ہے، کہی ہے اور اس کی استثنائی صورتیں بیان کی ہیں فرمایا ہے کہ :

''ضعیف حدیث پر عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا، ہاں اگر وہ احکام سے متعلق روایت ورع واحتیاط کی قبیل سے ہو تو پھر اس پر عمل کیا جاسکتا ہے؛ جیسا کہ بعض قسم کے خرید وفروخت کے عدم جواز سے متعلق ضعیف احادیث، ایسے ہی بعض قسم کے نکاح کے جائز ہونے سے متعلق روایات تو یہاں مستحب یہ ہے کہ ان احادیث کی رو سے ان معاملات سے رکا جائے۔اس کی شرح میں ابن علان نے مثال دی کہ جیسے فقہاء کرام نے دھوپ میں گرم پانی کے استعمال کو مکروہ لکھا ہے حدیثِ عائشہؓ کی بناء پر جو کہ ضعیف ہے''(۲)

---

(۱) المغنی : ۱۶۵/۲،الانصات للخطبة ، دار الفکر ، بیروت

(۲) شرح الاذکار : ۷۷۸،۶۸/۱: فی التعریف بأوهام

- اگر کوئی آیت قرآنی یا حدیث صحیح دو یا دو سے زیادہ معانی کی محتمل ہو اور ضعیف حدیث ان مختلف معانی میں سے کسی ایک کی تائید کرتی ہو یا دو صحیح حدیثیں بظاہر آپس میں ایک دوسرے کے معارض ہوں، ضعیف حدیث سے ان میں سے کسی ایک کی تائید ہوتی ہو تو اس سے ترجیح کا کام لیا جائے گا؛ ایسے ہی اگر ضعیف حدیث اہلِ علم کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہو، یا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال سے اس کو تقویت حاصل ہو رہی ہو، یا اکثر اہلِ علم نے اس حدیث کے مطابق فتویٰ دیا ہو تو یہ حدیث بھی قابلِ عمل ہوگی اس کی بے شمار مثالیں ہیں، جیسے علامہ شیخ حسین بن محسن الیمانی انصاری (المتوفی ۱۳۲۷ھ) نے "الأجوبة الفاضلة" کے اخیر میں اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے......اگر تفصیل درکار ہو تو وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

مختصر یہ کہ ضعیف حدیث پر مختلف فقہاء و محدثین نے احکام کے باب میں عمل کیا ہے فضائل اعمال اور مکارمِ اخلاق کے باب میں اس پر عمل درآمد کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ بلکہ بدرجۂ اولیٰ عمل کیا جائے گا۔

غیر احکام و عقائد میں ضعیف احادیث سے اِستدلال

مذکورہ بالا تحریر میں احکام میں ضعیف احادیث سے اِستدلال کی تین صورتیں ذکر کی گئی تھیں اور بتلایا گیا تھا کہ ان مذکورہ بالا صورتوں میں احکام میں ضعیف احادیث سے اِستدلال کے بارے میں ائمہ شدت اختیار نہیں کرتے؛ البتہ فضائل اور اخلاق و عادات سے متعلق چیزوں میں ضعیف احادیث سے اِستدلال اور ان پر عمل درآمد کئے جانے کے متعلق تمام ہی ائمہ و محدثین نے نرم رویہ اختیار کیا ہوا ہے، اس باب میں مطلق احکام و عقائد کے مانند سخت رویہ اختیار نہیں کیا ہے؛ جیسا کہ اس سے پہلے امام نوویؒ نے احکام و عقائد کو چھوڑ کر فضائل اور مکارم اخلاق سے متعلق ابواب میں ضعیف احادیث پر عمل درآمد کیے جانے سے متعلق تمام ائمہ و محدثین کا اجماع نقل کیا ہے۔(۱)

---

(۱) الاجوبة الفاضلة : ٧٦

بعض اُن ائمہ کا ذکر جن سے فضائل میں ضعیف احادیث پر عمل کے متعلق عدمِ جواز کا قول منسوب کیا گیا ہے

محدّث جمال الدین قاسمی نے اپنی کتاب ”قواعد التحدیث“ میں امام بخاری، امام مسلم، یحییٰ بن معین، ابوبکر بن عربی کا احکام اور غیر احکام دونوں میں ضعیف احادیث پر عمل نہ کیے جانے کا موقف نقل کیا ہے، (۱) بعض لوگوں نے ابوطاہر ابن المقدسیؒ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شوکانی کو بھی انہیں میں شامل کیا ہے۔

ان لوگوں کے تعلق سے مطلقاً احکام اور غیر احکام میں ضعیف احادیث پر عمل کے عدم جواز کا یہ قول حقیقت پر مبنی نہیں ہے، یہ دعوی بلا دلیل کے ہے، ان لوگوں کی کتب احادیث کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ لوگ بھی فضائل اعمال، اخلاق وعادات، سیر مغازی اور تفسیر وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل درآمد کرنے کو دُرست قرار دیتے ہیں۔

ضعیف احادیث سے متعلق امام بخاری کا طرزِ عمل

اِمام بخاریؒ کا بھی اس بارے میں جمہور محدثین کا ہی طریقۂ کار رہا ہے، شیخ جمال الدین قاسمی اور علامہ الکوثری کی مذکورہ بالا بات دراصل یہ ان کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے امام بخاری کے اپنی صحیح میں جو طرز روش اختیار کیا ہے، اس کے ذریعہ یہ سمجھ لیا ہے کہ امام بخاری ضعیف احادیث کو بالکل قبول نہیں کرتے، امام بخاری کا اپنی کتاب ”الأدب المفرد“ میں جو طریقۂ کار رہا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ وہ فضائل اور اس کے متعلقات میں ضعیف احادیث پر عمل کرنے کو دُرست قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں بے شمار ضعیف احادیث کا ذکر کیا ہے؛ بلکہ اس کے بعض ابواب میں تو بس ضعیف احادیث ہی ذکر کئے ہیں؛ بلکہ ایسی ایسی احادیث ذکر کی ہیں کہ جس کے اسناد کے راوی مجہول، متروک اور ضعیف کی قسموں میں ہیں۔

چنانچہ عبدالفتاح ابوغدۃؒ نے ”الأدب المفرد“ کے ایسے رواۃ کا جو مستور، ضعیف، یا مجہول یا ان جیسے اوصاف سے متصف ہیں ”تقریب“ کی ورق گردانی کے بعد ان کے اعداد وشمار ذکر کئے ہیں؛ جن میں مستورین کی تعداد: ۲۰/ اور ضعیف رواۃ کی تعداد: ۲۲/ اور مجہول کی: ۲۸/ رہے۔

---

(۱) قواعد التحدیث: ۱۱۶، دار الکتب العلمیة، بیروت

اس کے علاوہ دیگر کتابوں میں بھی امام بخاری نے ضعیف احادیث نقل کی ہیں ؛ چنانچہ تحقیق المقال فی تخریج أحادیث فضائل الأعمال (۱) میں امام بخاری کی کتاب "خلق افعال العباد" کے تیرہ ضعیف راویوں کے نام مع تفصیلی احوال کے ذکر کئے ہیں؛اسی طرح انہوں نے امام بخاری کی "جزء رفع الیدین" کے ضعیف راویوں کی تعداد سات شمار کی ہے؛ایسے ہی امام بخاری کے "جزء القرأة "میں سات ضعیف راویوں کی نشاندہی کی ہے۔مزید آپ کی تاریخ کبیر کے تذکروں میں آنے والی احادیث کی نوعیت بقول: دکتور محمد بن عبدالکریم بن عبید حفظہ اللہ کے مرفوع ۱۲۷ ہیں ،جن میں صحیح احادیث ۲۱۰ حسن احادیث ۳۷۰ ضعیف اور بالکل نا قابلِ اعتبار احادیث ۳۹۹ اور موضوع حدیث ایک بتلائی ہے ۔تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔(۲)

بلکہ امام بخاری کی خود جامع صحیح میں بعض احادیث ایسی مشاہدے میں آئی ہیں ؛جن کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، ہاں البتہ اس کے متابعات اور شواہد موجود ہیں اور بخاری میں ذکر کردہ اس قسم کی ضعیف احادیث کا تعلق غیر احکام اور عقائد سے ہے، ان احادیث کو ضعیف قرار دے کر انہیں صحیح بخاری سے نہیں نکالا جاسکتا ہے، ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیر احکام وعقائد میں ضعیف احادیث پر عمل کیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ "مقدمه الفتح"(۲) میں حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ :

۱- ایک راوی محمد بن عبدالرحمٰن الطفاوی ہے جس کے بارے میں ابوزرعہ نے کہا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہے؛اس کی بخاری میں تین حدیثیں ہیں ...... اس کی تیسری روایت کتاب الرقاق میں ہے "وكن فى الدنيا كأنك غريب" اس کو طفاوی نے تنہا روایت

---

(۱) یہ مولانا لطیف الرحمٰن صاحب قاسمی بہرائچی کی تصنیف ہے،جس میں انہوں نے حضرت شیخ الحدیثؒ کی مقبول عام تصنیف فضائلِ اعمال میں عربی متون کے ساتھ مذکورہ احادیث کی تحقیق وتخریج کا کام کیا ہے اور الزامی طور پر ائمہ حنابلہ کی کتابوں سے اسی قسم کے کشف وکرامات کے واقعات نقل کئے ہیں ،جس طرح فضائلِ اعمال میں بیان کئے گئے ہیں نیز متعدد حدیث کی کتابوں میں ضعیف احادیث کی تعداد اور تعین کے ساتھ حدیث نمبروں کو بھی جانفشانی کے ساتھ لکھا ہے ،معارضین کے شکوک وشبہات کا جواب دیا ہے، تصحیح الخیال کے نام سے مولانا سید احمد ومیض صاحب ندوی زید مجدہٗ اور مفتی میر رضوان اللہ قاسمی نے اس کو مفیدِ عام بنانے کیلئے اس کے ترجمہ اور تلخیص کا کام کیا ہے۔

(۲) تصحيح الخيال ترجمه تحقيق المقال: ۱۶۸-۱۷۷

(۳) مقدمة الفتح : ۶۱۵، دار المعرفة ، بيروت

کیا ہے؛ اس لئے یہ بخاری کے غرائب میں سے ہے، امام بخاری نے اس روایت کے ذکر میں اس لئے سخت رویہ نہیں اختیار کیا ہے کیونکہ یہ روایت ترغیب سے تعلق رکھتی ہے۔

۲- دوسری غریب روایت عن ابن عباس رضی اللہ عنہ کے طریق سے منقول ہے: وکان للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حائطنا فرس یقال لہ : اللحیف (الجھاد ، باب الفرس والحمار) اس روایت میں ابی ابن عباس ہے، جسے احمد اور ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے...... یہ روایت بھی چونکہ احکام سے متعلق نہیں ہے؛ ہاں البتہ اس روایت کے متابعات موجود ہیں، اس لئے اسے بھی ذکر کیا ہے۔(۱)

۳- ایسے ہی ایک روایت ہے: "ھل تنصرون وترزقون إلا بضعفائکم" (الجھاد) اس روایت کے بارے میں ابن حجرؒ نے مقدمۃ الفتح (۲) میں کہا ہے کہ:

بخاری میں اس روایت کے راوی محمد بن طلحہ بن مصرف الکوفی کی تین روایتیں ہیں، اس کی تیسری روایت یہ ہے اور اس روایت کے بیان کرنے میں یہ تنہا ہیں؛ لیکن چونکہ یہ روایت فضائل اعمال سے تعلق رکھتی ہے اور فضائل میں ضعیف احادیث کی بابت چشم پوشی کی جاتی ہے......اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ فضائل وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل کو درست قرار دیتے ہیں۔

امام مسلم کا طرزِ عمل

اِسی طرح علامہ جمال الدین قاسمیؒ کا یہ کہنا کہ امام مسلم ضعیف احادیث کو بالکل قبول نہیں کرتے تھے؛ اس پر ان کا یہ دلیل پیش کرنا کہ انہوں نے خود ضعیف اور منکر روایتوں اور ان کے راویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا خود یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ ضعیف احادیث کو قابل عمل نہیں گر دانتے تھے۔قواعد التحدیث میں امام مسلمؒ کے بارے میں یہ بات دُرست نہیں۔ بہت سے ضعیف ومتروک راویوں کی روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں؛ گرچہ ان کے متابعات اور شواہد موجود ہیں، خود ان کا اپنے مقدمہ کتاب میں حدیث کی تین قسم کرنا کہ ''ایک وہ جسے متقنین نے روایت کیا ہو۔ دوسرے وہ جنہیں اہل ستر وصدق نے روایت کیا ہو، اور حفظ واتقان میں اوسط درجہ کے ہوں۔ تیسرے وہ جنہیں ضعیف اور متروک لوگوں نے روایت کیا ہو۔'' خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ

---

(۱) مقدمۃ الفتح : ۵۴۹ (۲) مقدمۃ الفتح : ۶۱۳

انہوں نے اپنی صحیح حدیث میں بعض ان ضعیف روایات کا بھی ذکر کیا ہے جن کے متابعات اور شواہد موجود ہیں؛ چنانچہ یہی بات علامہ نوویؒ نے مقدمہ شرح النووی (۱) اور یہی بات حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء (۲) میں کہی ہے۔

اوپر ذکر کردہ تحریر کی روشنی میں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم مسلم اور بخاری کی روایات کو چیلنج کر رہے ہیں؛ بلکہ یہ دونوں تو روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ اصح ہیں، ہمارا مقصد مذکورہ بالا تحریر کے ذریعہ ضعیف احادیث کے متعلق ان ائمہ کے مذہب اور مسلک کی تشریح وتوضیح ہے کہ یہ لوگ حلال وحرام کی بابت تو صحت کے اعلی درجہ کے متلاشی ہوتے ہیں اور اس کے بارے میں سخت موقف اختیار کرتے ہیں، غیر حلال وحرام مثلاً مغازی، اخلاق وسیر اور فضائل میں ان کے یہاں صحت کا وہ اعلیٰ درجہ مطلوب نہیں ہوتا ہے۔

مؤطا میں امام مالکؒ کا طریقۂ کار

علامہ سیوطیؒ، علامہ ابن حزم کی کتاب ''مراتب الدیانۃ'' کے حوالہ سے ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''میں نے مؤطا مالک کی روایات اور سفیان بن عیینہؒ کی احادیث کو شمار کیا تو ہر ایک کتاب کی مرفوع روایات میں سے پانچ سو سے زائد متصل اور تین سو سے زائد مرسل کو پایا، مؤطا مالک میں ستر سے زائد احادیث وہ ہیں جن پر خود امام مالک نے عمل نہیں کیا اور اس میں ضعیف حدیثیں بھی شامل ہیں، جن کے ضعف کو اکثر علماء نے واضح کیا ہے'' (۳)

مولانا عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں :

''اس کتاب میں کوئی موضوع حدیث نہیں ہے، ہاں وہ ضعیف احادیث ہیں کہ جن کا ضعف کثرت طرق سے ختم ہوتا ہے اور بعض روایتوں کا ضعف شدید ہے لیکن مضر نہیں کیونکہ سندوں سے اس طرح کی احادیث (دوسری جگھوں پر) موجود ہیں''۔ (۴)

---

(۱) مقدمہ شرح النووی : ۱۵

(۲) سیر اعلام النبلاء : ۵۶۵/۱۲،مؤسسة الرسالة ، بیروت

(۳) التدریب: ۱۰۹/۱

(۴) مقدمہ التعلیق المجد علی مؤطا محمد: ۱۴۶/۱

حافظ ابن حجرؒ کی ''بلوغ المرام'' اور ان کا طرز عمل

حافظ ابن حجرؒ کی ایک کتاب ہے "بلوغ المرام من ادلة الأحکام" ہے، جس میں انہوں نے احکام شرعیہ کے اصولی دلائل بیان کئے ہیں صاحبِ تحقیق المقال نے "بلوغ المرام" میں درج شدہ ضعیف احادیث کی تعداد شمار کی ہیں اور اُسے ایک سوسترہ ۱۱۷ بتلایا ہے۔(۱)

ابو عبداللہ حاکم کی مستدرک اور ضعیف روایات

حافظ سیوطیؒ کہتے ہیں :

''حافظ ذہبی نے ''مستدرک حاکم'' کی تلخیص کی اور اس کی بہت سی حدیثوں کو ضعیف اور منکر قرار دیا ہے، اس میں جو موضوع حدیثیں ہیں ان کو ایک رسالہ میں جمع فرمایا ہے جن کی تعداد تقریباً سو ۱۰۰ ہیں'' (۲)

ابو عبداللہ حاکم کی کتاب "المستدرك" میں ضعیف اور موضوع احادیث کی تعداد بقول ابن الملقن اور علامہ ذہبی کے نوسوسات ۹۰۷ ہے۔(۳)

یحییٰ بن معین کا طرزِ عمل

ضعیف احادیث پر عمل درآمد کئے جانے اور عدم جواز کے تعلق سے یحییٰ بن معین کے مختلف موقف نقل کئے گئے ہیں، ابن سید الناس نے ان کے بارے میں ''عیون الاثر'' میں نقل کیا ہے، کہتے ہیں:

''جن کے بارے میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ ضعیف احادیث کو احکام اور غیر احکام دونوں میں اس پر عمل کے دُرست نہ ہونے کے قائل ہیں ان میں یحییٰ بن معین بھی ہیں (۴) لیکن خطیب نے ''الکفایۃ'' میں ابن معین سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ضعیف احادیث سے استدلال اور عمل کے جواز کے قائل ہیں ؛اس لئے صحیح یہی ہے کہ یہ بھی فضائل کے متعلق ضعیف حدیث پر عمل کے قائل ہیں، رہا ان کا انکار تو وہ احکام کے باب میں ضعیف احادیث سے استدلال سے متعلق ہے''۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: تصحیح الخیال ترجمه تحقیق المقال: ۲۲۴ (۲) التقریب : ۵۲
(۳) ملاحظہ ہو: تصحیح الخیال ترجمه توضیح المقال: ۲۹۱ (۴) عیون الاثر : ۱/۶۵

ابن عربی کا طرزِ عمل

ابوبکر بن العربی المالکی کے متعلق ان سے کہیں بھی اس قسم کی کوئی تصریح ہمیں نہیں مل پائی ہے کہ جس کی رو سے یہ کہا جائے کہ وہ ضعیف احادیث پر فضائل کے باب میں عمل کے جواز کے قائل نہیں ہیں؛ بلکہ ان سے اس بارے میں اس کے برعکس طرزِ عمل کا ہی ثبوت ملتا ہے۔

- چونکہ وہ حدیث مرسل کو اس کے عمومی معنی میں.... جو کہ محدثین کے یہاں ضعیف ہے اس سے اخذ واستدلال کو اپنے مسلک کے اعتبار سے درست قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ وہ ''عارضہ'' میں کہتے ہیں:

''ہمارے یہاں مرسل روایت احکام دین، حلال وحرام، فضائل اور عبادات کے ثواب وغیرہ میں حجت ہے، ہم نے یہ بات اصول فقہ میں بیان کی ہے۔'' (۱)

- بلکہ خود ابن عربی نے ایک دوسری جگہ اپنی مذکورہ بالا کتاب "عارضة الأحوذی" میں ضعیف احادیث پر عمل کے جواز کی صراحت کی ہے، انہوں نے اس کی تصریح یوں کی ہے :

''ابوعیسیٰ نے مجہول حدیث روایت کی ہے، اگر تم اسے چاہو تو اسے لو اور چاہو تو نہ لو'، گرچہ وہ مجہول ہے؛ لیکن اس پر عمل کرنا مستحب ہے؛ اس لئے کہ وہ محض بھلائی کی دُعا، دوست کے ساتھ صلہ رحمی اور اس کے ساتھ محبت کے اظہار پر مشتمل ہے''۔(۲)

ابوشامہ المقدسی کا طرزِ عمل

ان سے بھی کہیں اس قسم کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ ضعیف حدیث پر فضائل کی بابت عمل کے عدم جواز کے قائل ہیں؛ چنانچہ یہ اپنی کتاب (الباعث علی إنکار البدع والحوادث) میں ابنِ عساکر سے ماہِ رجب کی فضیلت سے متعلق حدیث کے ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں :

''میں تو یہ چاہتا تھا کہ حافظ ابن عساکر نے اس روایت کو نقل ہی نہ کیا ہوتا؛ چونکہ اس سے منکر احادیث کی تائید اور توثیق ہوتی ہے، یہ ان کی شان سے بڑی چیز ہے کہ وہ آپ

---

(۱) الکفایة :۲۱۳، المکتبة العلمیة ، بیروت

(۲) عارضة الاحوذی : ۲/۲۳۷

ﷺ سے ایسی روایات نقل کریں جسے وہ جھوٹ گردانتے ہوں؛ لیکن انہوں نے محدثین کی عادت کے موافق فضائل اعمال سے متعلق باب میں نرم رویہ اختیار کیا ہے۔''(۱)

ان کے اس کلام میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ ضعیف احادیث پر عمل اور استدلال کو ناجائز قرار دے رہے ہیں؛ بلکہ وہ ابن عساکر پر نکیر فرمارہے ہیں کہ انہوں نے روایت کے ضعف کو ذکر کئے بغیر اس روایت کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔(۲)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا طرز عمل

ان کے طرزِ عمل کو معلوم کرنے کیلئے اُن کی کتاب ''الکلم الطیب'' کے متعلق علامہ ناصرالدین البانی سے دریافت کیا جائے؟ وہ آپ کو اپنی کتاب ''صحیح الکلم الطیب وضعیف الکلم الطیب'' میں یہ بتلائیں کہ انہوں نے اپنی کتاب ''الکلم الطیب'' میں کس قدر ضعیف احادیث ذکر کئے ہیں یہاں تک کہ ان کی کثرت وزیادتی کی وجہ سے البانی صحیح اور ضعیف کی تمیز نہیں کر پارہے ہیں، اگر ابنِ تیمیہؒ چاہتے تو صرف صحیح احادیث ہی ذکر کرسکتے تھے؛ لیکن ان کا ضعیف احادیث کو اپنی کتاب میں بکثرت لانا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جمہور کے موقف پر ہیں۔(۳)

علامہ شوکانی کا طرزِ عمل

ان کے طرز عمل کو معلوم کرنے کیلئے ''نیل الأوطار'' کی عبارت ملاحظہ کیا جائے:

''اس باب میں ذکر کردہ آیات واحادیث مغرب وعشاء کے درمیان بکثرت نماز کی ادائیگی کی مشروعیت پر دلالت کرتے ہیں؛ اگرچہ ان میں سے بیشتر احادیث ضعیف ہیں؛ لیکن مجموعہ احادیث سے انہیں تقویت حاصل ہوجاتی ہے اور خصوصاً فضائل اعمال میں ضعیف احادیث پر عمل کیا جاسکتا ہے۔''(۴)

ضعیف حدیث پر عمل کی شرطیں

ہاں یہ ضروری ہے کہ ضعیف حدیث کا ثبوت محتمل ہوتا ہے، اس لئے اس سے استدلال کے

---

(۱) الباعث علی انکار البدع والحوادث : ۸۵،دار الھدی،القاھرۃ

(۲) فتح الملھم : ۵۷/۱ (۳) التعریف باوھام : ۱۰۳/۱ (۴) نیل الأوطار :۶۷/۳

وقت کچھ اُمور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، حافظ شمس الدین سخاویؒ ''القول البدیع''(۱) میں ابن حجر سے نقل کیا ہے۔

حدیثِ ضعیف پر عمل کیلئے تین شرطیں ہیں

۱- یہ کہ ضعف غیر شدید ہو، چنانچہ وہ حدیث جس کی روایت تنہا کسی ایسے شخص کے طریق سے ہو جو کذاب یا متہم بالکذب، یا فاحش الغلط ہو تو وہ اس سے خارج ہوگی۔

۲- اس کا مضمون قواعد شرعیہ میں سے کسی قاعدہ کے تحت آتا ہو، وہ مضمون ناقابلِ عمل ہوگا جو محض اختراعی ہو۔ اصولِ شرعیہ میں سے کسی اصل سے میل نہ کھاتا ہو (ظاہر ہے اس کا فیصلہ دیدہ ورو بالغ نظر فقہاء ہی کر سکتے ہیں، ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں)۔

۳- اس پر عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا عقیدہ نہ رکھا جائے، بلکہ صرف اس کے ثواب کے حصول کی اُمید کے ساتھ کیا جائے، مبادا آنحضرت ﷺ کی جانب ایک بات جو واقع میں آپ ﷺ نے نہ فرمائی ہو، اس کا آپ ﷺ کی طرف منسوب کرنا لازم آجائے۔

۴- مولانا عبدالحئیؒ لکھنویؒ نے ایک چوتھی شرط یہ بھی ذکر کی ہے کہ اس سے قوی دلیل معارض موجود نہ ہو، پس اگر کوئی دلیل کسی عمل کی حرمت یا کراہت پر موجود ہو اور یہ ضعیف اس کے جواز یا استحباب کی متقاضی ہو تو قول کے مقتضی پر عمل کیا جائے گا۔

فضائلِ اعمال اور ترغیب و ترہیب کا فرق

واضح رہے کہ اہلِ علم ضعیف حدیث کے قابلِ قبول ہونے کے مواقع کو بیان کرتے ہوئے اپنی عبارتوں میں ''فضائلِ اعمال'' اور ''ترغیب و ترہیب'' دو لفظوں کا استعمال کرتے ہیں، فضائل اعمال کا اطلاق ایسے مواقع پر کرتے ہیں جہاں کوئی مخصوص عمل پہلے سے کسی نصِ صحیح یا حسن سے ثابت ہونے کے بجائے کسی ضعیف حدیث میں اس عمل کا ذکر اور اس کی فضیلت آئی ہو اور علماءِ امت اور فقہاء کرام اس ضعیف حدیث ہی کی بنیاد پر اس عمل کو مستحب قرار دیتے ہیں، مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ مثلاً مغرب کے بعد چھ رکعات کا پڑھنا، قبر میں مٹی ڈالتے وقت مخصوص دُعا کا پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے (جیسا کہ ماقبل میں گذرا) اور جیسے اذان میں ترسیل (ٹھہر ٹھہر کر کلماتِ

---

(۱) القول البدیع :۱۵۹

اذان ادا کرنا) اور اقامت میں حدر (روانی سے ادا کرنا) مستحب ہے۔ ترمذی شریف کی حدیث ضعیف کی وجہ سے جو عبدالمنعم بن نعیم کے طریق سے روایت کر کے کہتے ہیں :

"ھذا اسناد مجھولٌ" اور "ترغیب و ترھیب" کا اطلاق ایسے مواقع میں کرتے ہیں جہاں کہ وہ مخصوص عمل کسی نص قرآن، حدیثِ صحیح یا حسن سے ثابت ہو اور کسی حدیثِ ضعیف میں ان اعمال کے کرنے پر مخصوص ثواب کا وعدہ اور نہ کرنے یا کوتاہی کرنے پر مخصوص وعید وارد ہوئی ہو، چنانچہ اس مخصوص وعدہ اور وعید کو بیان کرنے کیلئے ضعیف سے ضعیف حدیث کو مذکورہ بالا شرطوں کے بغیر بیان کرنا جائز قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ اس میں اس حدیث سے کسی طرح کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور فضائل میں جو استحباب ثابت ہوتا ہے وہ بر بنائے احتیاط ہے۔

ترغیب وترہیب کیلئے مذکورہ بالا نرمی محدثین کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے جیسا کہ اگلے عنوان میں واضح ہوگا۔

یہ فرق مولانا عبدالحئیؒ لکھنویؒ کی اس عبارت سے بھی مترشح ہوتا ہے :

"فإن عبارة النووي ، وابن الهمام ، وغيرهما منادية بأعلى النداء بكون المراد بقبول الحديث الضعيف في فضائل الأعمال هو ثبوت الاستحباب ونحوِه به؛ لامجرد ثبوت فضيلة لعملٍ ثابتٍ بدليل آخر ، ويوافقه صنيع جمع من الفقهاء والمحدثين حيث يثبتون استحباب الأعمال التي لم تثبت بالأحاديث الضعيفة، وأيضاً لوكان المراد ماذكره ، (يعني الخفا جي من أن المراد بقبول الضعيف في الفضائل هو مجرد ثبوت فضيلة لعمل ثابت) لَما كان لقولهم: "يُقبَل الضعيف في فضائل الأعمال، وفى المناقب، وفى الترغيب والترهيب" فائدة يُعتدّ بها.

"اس لئے کہ امام نوویؒ اور ابن ہمامؒ وغیرہ کی عبارت اس حوالہ سے بالکل واضح ہے کہ ضعیف حدیث کے فضائلِ اعمال میں قبول کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے

مستحب یا اُس جیسی چیزوں کا ثبوت ہوتا ہے نہ کہ کسی ثابت عمل کا کسی دوسری دلیل کے ذریعہ ثبوت پیش کیا جاتا ہے، تمام فقہاء ومحدثین کا طریقۂ کار بھی اسی کے موافق ہے کہ وہ غیر ثابت شدہ اعمال کے استحباب کو احادیثِ ضعیفہ کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں اور اگر اس کا مطلب وہ ہے جسے خفاجی نے ذکر کیا ہے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث کے قبول کرنے کا مطلب محض کسی عمل کی فضیلت کو ثابت کرنا ہے تو اُن کی اِس بات کا کوئی معنی خیز مطلب نہیں نکلتا کہ فضائلِ اعمال، مناقب اور ترغیب وترہیب میں ضعیف احادیث کو قبول کیا جاتا ہے''۔

ضعیف یا موضوع احادیث، حضرت شیخ الحدیثؒ اور محدثین کا طریقۂ کار

جیسا کہ گذر چکا کہ بطورِ متن لائی گئی احادیث میں شیخ الحدیثؒ نے کوئی ایسی حدیث اپنی دانست کے مطابق ذکر نہیں کی جو موضوع ہو، چنانچہ جس کسی حدیث کے متعلق کسی نے وضع کی بات کی ہوتی ہے اور شیخ اس کے طرق اور مؤیدات وشواہد کی بناء پر مطمئن ہوتے ہیں تو ان طرق وشواہد کے ساتھ حدیث ذکر کرتے ہیں۔

البتہ شرح میں تائید وتوضیح کے طور پر امام غزالی کی احیاء العلوم، فقیہ ابواللیث کی تنبیہ الغافلین اور قرۃ العیون جیسی کتابوں سے بکثرت لیتے ہیں، اس حقیقت کے اعتراف میں ہمیں ذرا بھی تأمل نہیں کہ ان کتابوں میں انتہائی ضعیف، موضوع وبے اصل روایات کی تعداد خاصی ہے، چنانچہ ''مجموعۂ فضائلِ اعمال'' میں بھی اس طرح کی روایات کا درآنا بعید نہیں، اس کے باوجود ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے اس کتاب کی معتبریت اور حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، آخر کیوں؟

اس لئے کہ ہم نے بڑے بڑے ائمۂ جرح وتعدیل اور نقادِ حدیث کو دیکھا کہ جب وہ رجال کی جرح وتعدیل اور احادیث میں ثابت وغیر ثابت، صحیح وغیر صحیح کی تحقیق کرنے کے موڈ میں ہوتے ہیں تو ان کا اندازِ تحقیق اور لب ولہجہ اور ہوتا ہے اور جب اخلاق، آداب، فضائل یا ترغیب وترہیب کے موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں تو اتنا نرم پہلو اختیار کرتے ہیں کہ موضوع تک کو بطورِ استدلال پیش کر ڈالتے ہیں اور معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وہی ابن جوزی، منذری، نووی، ذہبی، ابن حجر، ابن تیمیہ اور ابنِ قیم ہیں جن پر فنِ نقد وروایت کو بجا طور پر ناز ہے اور مجموعی طور پر ان اساطینِ علم

حدیث کا طرزِ عمل صاف اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ترغیب وترہیب وغیرہ کے باب میں چشم پوشی زیادہ ہے جس کو آج کے مدعیانِ علم وتحقیق نہ جانے کس مصلحت سے نظر انداز کررہے ہیں؟

امام بخاری سمیت جمہورِ محدثین وفقہاء کا ضعیف حدیث کے ساتھ نرم پہلو اختیار کرنے کا معاملہ تو معلوم ہو ہی چکا، اس کے علاوہ کچھ نامور ناقدینِ حدیث اور مشہور مصنفین کا ان کی کتابوں میں طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں :

۱-حافظ ابنِ جوزیؒ

حافظ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزیؒ نے ایک طرف موضوعات کی تحقیق میں بے مثال کتاب تصنیف فرمائی تاکہ واعظین اور عام مسلمین ان موضوع احادیث کی آفت سے محفوظ رہیں، نیز وہ حدیث پر وضع کا حکم لگانے میں متشدد بھی مانے جاتے ہیں، دوسری طرف اپنی پندوموعظت اور اخلاق وآداب کے موضوع پر تصنیف کردہ کتابوں میں آپ نے بہت سی ایسی حدیثیں نقل کرڈالی ہیں جو ضعیف کے علاوہ موضوع بھی ہیں، مثلاً دیکھئے ان کی یہ کتابیں: "ذمُّ الھویٰ"، "تلبیس ابلیس"، "رؤوس القواریر" اور "التبصرة" جس کی تلخیص شیخ ابوبکر احسائی نے "قرة العیون المبصرة بتلخیص کتاب التبصرة" میں کی ہے۔

یہ بات حافظ ابن تیمیہؒ نے "الرد علی البکری" (۱) میں ابونعیم، خطیب، ابن جوزی، ابن عساکر اور ابن ناصر سب کے متعلق مشترکہ طور پر کہی ہے، حافظ سخاوی نے شرح الالفیہ میں لکھا ہے:

"وقد أكثر ابن الجوزی فی تصانیفه الوعظیة فما أشبهها من إیراد الموضوع وشبهه" ابنِ جوزی نے اپنے پندونصائح پر مشتمل یا اِس جیسی تصانیف میں بے شمار موضوع یا اس قسم کی روایت کا ذکر کیا ہے۔

۲- حافظ منذریؒ

حافظ منذریؒ کی الترغیب والترہیب کے نہج اور اُس کے متعلق حافظ سیوطی کی رائے گذر چکی اور ضمناً یہ بات بھی آئی کہ وہ ایسی حدیثیں بھی لاتے ہیں جس کی سند میں کوئی کذاب یا متہم راوی

(۱) الرد علی البکریٰ : ۱۹

ہوتا ہے اور اس کو صیغۂ تمریض لفظ ''رُوِیَ'' سے شروع کرتے ہیں (شیخ رحمۃ اللہ بھی ترغیب منذری کی ایسی کوئی روایت نقل کرتے ہیں تو صیغۂ تمریض ہی سے کرتے ہیں)، حافظ منذری اپنے مقدمہ میں کتاب کی شرطوں اور مصادر و مآخذ کے ذکر سے فارغ ہو کر لکھتے ہیں :

''واستوعبت جميع مافى كتاب أبي القاسم الأصفهانى ممالم يكن فى الكتب المذكورة، وهوقليل، وأضربت عن ذكر ما قيل فيه من الأحاديث المتحققة الوضع''

''یعنی مذکورہ اہم مصادر حدیث کے علاوہ میں نے ابوالقاسم اصفہانی کی ترغیب وترہیب (جس میں انہوں نے اپنی سند سے حدیثیں تخریج کی ہیں) کی وہ ساری حدیثیں لی ہیں جو مذکورہ کتب میں نہیں آسکیں اور ان کی تعداد تھوڑی ہے اور ان احادیث کو نظر انداز کر دیا ہے جن کا موضوع ہونا قطعی ہے''۔

معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی سند میں کذاب یا متہم راوی کا ہونا اس کے واقعی موضوع ہونے کو مستلزم نہیں ہے، جبھی تو منذری نے ایسی روایات کو منتخب کر لیا جو ان کے نزدیک قطعی طور پر موضوع نہیں ہیں اور ان کی سند میں ایسے رجال ہیں جو کذاب اور متہم کہے گئے ہیں۔

۳- حافظ نوویؒ

علامہ نوویؒ شارح صحیح مسلم کے متعلق بھی علامہ کتانی نے ''الرحمۃ المرسلۃ'' میں حافظ سیوطی کا یہ جملہ نقل کیا ہے ''إذا علمتم بالحديث أنه فى تصانيف الشيخ محى الدين النووى فارووه مطمئنين'' (۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ موضوع حدیث اپنی کتابوں میں ذکر نہیں کرتے، رہی ضعیف حدیثیں تو اس میں شک نہیں کہ ان کی کتاب ''الاذکار'' میں ان کی تعداد خاصی ہے جس سے معذرت کے طور پر مقدمہ میں انہیں یہ حقیقت واشگاف کرنی پڑی کہ ضعیف حدیث اگر موضوع نہ ہو تو فضائل اور ترغیب وترہیب میں معتبر ہوتی ہے جیسا کہ گذرا۔

بلکہ ''ریاض الصالحین'' جو باب فضائل میں صحیح احادیث کا مجموعہ ہے اور جس کے متعلق انہوں نے صراحت کی ہے کہ وہ صحیح حدیث ہی ذکر کریں گے اس میں چند ایک ضعیف حدیثیں موجود ہیں، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے بطورِ مثال تین حدیثیں پیش کی ہیں، مثلاً :

---

(۱) الرحمة المرسلة : ۱۵

۱- "الکیس من دان نفسه...... إلخ" اس کی سند میں ابوبکر بن عبداللہ بن ابی مریم ہیں جو بہت ہی ضعیف ہیں۔(۱)

۲- "ما أکرم شاب شیخاً إلا قیَّض الله له من یکرمه عند کِبر سنه" ان کے شیخ ضعیف ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں کیونکہ اس کی سند میں یزید بن بیان عقیلی اور اس کا شیخ ابوالرحّال خالد بن محمد الانصاری دونوں ضعیف ہیں۔(۲)

۳- "لاتشربوا واحداً کشرب البعیر" اس کی سند میں "یزید بن سنان ابوفروه الرهاوی" ضعیف ہیں، ترمذی کے نسخوں میں اس حدیث پر حکم مختلف ہے، بعض نسخوں میں "حسن" ہے اور بعض میں "غریب" واضح رہے کہ امامِ ترمذی تنہا لفظ "غریب" اس جگہ لاتے ہیں جہاں سند میں کوئی ضعیف راوی منفرد ہوتا ہے، حافظ نے فتح الباری میں فرمایا: "سنده ضعیف"۔(۳)

۴- حافظ ذہبیؒ

حافظ ذہبیؒ جن کی فن جرح وتعدیل میں شانِ امامت مسلم ہے، ہزاروں راویانِ حدیث میں سے ہر ایک کی ذمہ دارانہ شناخت کے سلسلہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، چنانچہ تلخیص المستدرک، میزان الاعتدال وغیرہ میں احادیث پر ان کی جانب سے صادر شدہ احکام مستند قرار دیئے گئے ہیں بلکہ بعض مواقع میں تو اُن پر تشدد کا بھی الزام ہے، انہوں نے بھی اپنی "کتاب الکبائر" میں ضعیف، واہی بلکہ موضوع تک کو بطورِ استشہاد پیش کیا ہے، شاید ان کا بھی مذہب اس سلسلہ میں ان کے پیشرو حافظ ابن الجوزی کا سا ہے، مثلاً ہم اُن کی کتاب سے بطورِ استشہاد کے ایک روایت پیش کرتے ہیں:

> "کبیرہ گناہ "ترکِ صلاۃ" کے تحت اُنہوں نے کئی ضعیف احادیث ذکر کی ہیں، اُن میں وہ طویل حدیث بھی ہے جو شیخ کی کتاب "فضائلِ نماز" ص ۲۸ تا ۳۱ میں درج ہے، جس کے بموجب نماز کا اِہتمام کرنے والے کا اللہ تعالیٰ پانچ طرح سے اِکرام کرتے ہیں اور اُس میں سستی کرنے والے کو پندرہ طریقہ سے عذاب دیتے ہیں، پانچ طرح دُنیا میں، تین طرح موت کے وقت، تین طرح قبر میں اور تین طرح قبر سے نکلنے کے

---

(۱) فیض القدیر :۸۶/۵،دار الکتب العلمیة، بیروت

(۲) فیض القدیر : ۴۲۵/۵،دار الکتب العلمیة، بیروت (۳) فتح الباری : ۸۱/۱

بعد، شیخؒ نے تو یہ حدیث ابن حجر مکی ہیتمی کی ''الزواجر'' کے حوالہ سے نقل کی ہے جس کی ابتداء ''قال بعضهم: ورد فی الحدیث'' سے کی ہے، مزید اس کے چند ایک حوالہ اور مؤیدات ذکر کرتے ہوئے حافظ سیوطیؒ کی کتاب ''ذیل اللآلی'' سے نقل کیا کہ ابن النجار نے ذیل تاریخ بغداد میں اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے اس کو روایت کیا ہے، میزان الاعتدال میں ہے :

''هذا حديث باطل، ركَّبه علي بن عباس علىٰ أبى بكر بن زياد النيسابوری...'' پھر امام غزالی اور صاحبِ منبّہات کے حوالہ سے بھی اس مضمون کو مؤید کیا، الغرض شیخ نے تو مذکورہ بالا تمام حضرات کے طرزِ عمل سے یہ نتیجہ نکالا کہ حدیث بے اصل نہیں ہے اور ترغیب وترہیب کیلئے پیش کی جاسکتی ہے۔

۵- حافظ سیوطیؒ

حافظ ابوبکر سیوطیؒ تو اس میدان کے مرد اور ضعاف وموضوعات کی پذیرائی میں ضرب المثل ہیں، انہوں نے اپنی کتاب الجامع الصغیر کے مقدمہ میں اپنی شرط کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا: ''وصنتُه عما تفرد به وضاع او كذاب'' اس کی شرح میں حافظ عبدالرؤف المناوی لکھتے ہیں :

> ''إن ماذكره من صونه عن ذلك أغلبی، أو ادعائی، وإلا فكثيراً ماوقع له أنه لم يصرف إلىٰ النقد الاهتمام، فسقط فيما التزم الصون عنه فی هذا المقام كما ستراه موضّحا فی مواضعه، لكن العصمة لغير الأنبياء متعذرة، والغفلة على البشر شاملة منتشرة، والكتاب مع ذلك من أشرف الكتب مرتبةً وأسماها منقبة'' (۱)

''یعنی حافظ سیوطیؒ کا یہ کہنا کہ میں نے ایسی حدیث سے اس کتاب کو محفوظ رکھا ہے جس کی روایت میں کوئی کذاب یا وضاع منفرد ہو، یہ دعویٰ یا تو اکثری ہے، یا دعویٰ محض ہے کیونکہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں آپ نے صحیح طور پر پرکھا نہیں، چنانچہ جس سے محفوظ رکھنے کا التزام کیا تھا وہ نادانستہ طور سے کتاب میں درآیا، جیسا کہ موقع پر

---

(۱) فيض القدير :۲۱/۱،دار الكتب العلمية ، بيروت

وضاحت سے آپ کو معلوم ہوگا، بہرحال معصوم نبی کے علاوہ کوئی نہیں، بھول چوک انسانی خاصہ ہے، اس کے باوجود کتاب مرتبہ وحیثیت کے اعتبار سے عظیم ترین ہے اور بلند پایہ خصوصیات کی حامل ہے‘‘۔

محدث احمد بن الصدیق الغماری اپنی کتاب ’’المغیر علیٰ الاحادیث الموضوعة فی الجامع الصغیر‘‘ میں لکھتے ہیں :

’’بلکہ اس میں جو حدیثیں سیوطیؒ نے ذکر کی ہیں ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جن کے موضوع ہونے کا حکم خود انہوں نے لگایا ہے یا تو اپنی لاٰلی میں ابنِ جوزی کی موافقت کرکے، یا خود ذیل اللآلی میں بطورِ استدراک ذکر کرکے‘‘۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدۃؒ نے الجامع الصغیر کی سات ایسی حدیثوں کی تعیین کی ہے جن کے وضع پر مؤلف نے ابن جوزی کی موافقت کی ہے اور پندرہ ایسی حدیثوں کی جن پر مؤلف نے اپنی طرف سے ذیل اللآلی میں وضع کا حکم لگایا ہے۔ حافظ سیوطیؒ کے تساہل پر بصیرت افروز کلام کیلئے (تعلیقات علی الاجوبة الفاضلة للشیخ ابوغدة: ۱۲۶تا۱۳۰) دیکھئے۔

جیسا کہ معلوم ہو چکا کہ جن احادیث کے متعلق موضوع ہونے کا شیخ کو شبہ بھی ہوتا ہے تو مؤیدات وشواہد جمع کرنے کا پورا اِہتمام فرماتے ہیں تو کیا اس بناء پر ’’مجموعۂ فضائلِ اعمال‘‘ حافظ سیوطیؒ کی کتاب سے اگر فائق نہیں تو اس کے برابر بھی نہیں قرار دیا جاسکتا؟ ہمارے نزدیک اس پر بھی وہ تبصرہ منطبق ہوتا ہے جو مناوی نے جامع صغیر پر کیا۔

٦- حافظ ابن قیم الجوزیہ

احادیث پر وضع کا حکم لگانے میں جو محدثین متشدد مانے جاتے ہیں اُن میں ایک نام حافظ ابن قیم کا ہے‘ اس دعویٰ کا ثبوت ان کی کتاب ’’المنار المنیف فی الصحیح والضعیف‘‘ جس میں انہوں نے چند ایک ابواب پر یہ کلی حکم لگایا ہے کہ اس باب میں جو کچھ مروی ہے وہ سب باطل ہے، تاہم اس میں شک نہیں کہ نقد حدیث میں ان کی حیثیت مرجع وسند ہے۔

لیکن ان کا بھی حال یہ ہے کہ اپنی بعض تصنیفات مثلاً مدارج السالکین، زادالمعاد وغیرہ میں کتنی ہی ضعیف اور منکر حدیثیں کوئی تبصرہ کے بغیر بطورِ استدلال پیش کرڈالتے ہیں، خاص طور سے

اگر وہ حدیث اُن کے نظریہ کی تائید میں ہوتی ہے تو اس کی تقویت میں بات مبالغہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، مثلاً :

زادالمعاد میں وفد بنی المنتفق پر کلام کے ذیل میں ایک بہت لمبی حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں :

"ثم...... تلبثون مالبثتم، ثم تُبعث الصائحه، فلعمرو إلٰهك ماتدع على ظهرها شيئاً إلامات، تلبثون مالبثتم، ثم يتوفى نبيكم، والملائكة الذين مع ربك، فأصبح ربك عزّوجلّ يطوف فى الأرض، وخلت عليه البلاد ......"

اس حدیث کو ثابت وصحیح قرار دینے میں ابن قیمؒ نے پورا زور صرف کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"هذا حديث جليل كبيرتنادى جلالته، وفخامته، وعظمته على أنه قد خرج من مشكاة النبوة، لايعرف إلا من حديث عبد الرحمن بن المغيرة المدني" (۱) ...... یہ بہت بڑی حدیث ہے، اِس کی بلندی، اِس کی جلالت وعظمت بذاتِ خود اِس کے حدیث ہونے پر دلالت کررہی ہیں اور یہ حدیث عبدالرحمٰن بن مغیرۃ المدنی ہی کی سند سے ہے۔

پھر عبدالرحمٰن بن مغیرۃ کی توثیق اوران کتابوں کے حوالوں کے ذریعہ جن میں یہ حدیث تخریج کی گئی ہے لمبا کلام کیا، حالانکہ خودان کے شاگرد حافظ ابن کثیر نے "البداية والنهاية" میں لکھا کہ :

"هذا حديث غريب جداً، وألفاظه فى بعضها نكارة" یعنی یہ حدیث انتہائی اوپری ہے، اس کے بعض الفاظ میں نکارت ہے، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں عاصم بن لقیط بن عامر بن المنتفق العقیلی کے ترجمہ میں لکھا کہ: "وهو حديث غريب جداً" جبکہ علامہ ابن قیم نے اس کی تائید میں کسی کہنے والے کے اس قول تک کو نقل کرڈالا ہے: "ولا ينكر هذا القول إلا جاحد، أو جاهل، أو مخالف للكتاب والسنة".

---

(۱) زاد المعاد : ۶۷۷/۳،فصل فى قدوم وفد بنى المنتفق،مكتبة المنار الإسلامية ، كويت

مذکورہ بالاتحریرات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فضائل، ترغیب وترہیب اور سیر ومغازی وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل کے جواز کے تعلق سے تمام ائمۂ سلف وخلف متفق ہیں؛ لہٰذا جولوگ ضعیف احادیث پر عمل کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کا یہ طرز تمام ائمہ ومحدثین اور فقہاء اور معتبر لوگوں کے اجماع کے خلاف ہے؛ بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ضعیف احادیث پر عمل کے عدم جواز کا قول دراصل دشمنانِ دین کی سازش کا نتیجہ ہے، ان کی اس سازش اورمکر وفریب کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے چراغ کو اپنے پھونکوں سے بجھادیں؛ چونکہ فضائل ومناقب، ترغیب وترہیب، سیر ومغازی پر مشتمل احادیث مسلم معاشرہ میں اسلامی بیداری پیدا کرنے کا نہایت ہی مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے ان کا اپنے خالق ومالک کے ساتھ ربط وتعلق مضبوط ہوتا ہے اور وہ لوگ اوہام وخرافات اور فضولیات سے اجتناب وپرہیز کرنے لگتے ہیں اور اپنے مقصد کے تئیں فکر ولگن آخرت کا جذبہ ان کے اندر جنون کی حد تک بڑھ جاتا ہے۔

”کاش کہ مسلمان دشمنانِ اسلام کی اس سازش کا اندازہ لگالیتے!“

حضرت شیخ زکریاؒ اور فضائلِ اعمال

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے ''فضائلِ اعمال'' کے نام سے جو کتاب تر تیب دی ہے یہ اس موضوع پر کوئی نئی چیز نہیں ہے؛ بلکہ لوگوں کو اعمال صالحہ پر آمادہ کرنے اور اعمال سیئہ سے انہیں اجتناب کا عادی بنانے کیلئے فضائل، ترغیب وترہیب، آداب واخلاق، دنیا کی بے بضاعتی اور فکر آخرت کا شوق وذوق پیدا کرنے والی ان کتابوں کی تالیف وتصنیف کا سلسلہ دوسری صدی ہجری ہی سے شروع ہو چکا تھا؛ چنانچہ اسی قسم کی کتابوں میں سے: عبد اللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) کی ''کتاب الزہد'' اِمام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کی ''فضائل القرآن'' احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) کی ''کتاب الزہد'' امام بخاری کی (متوفی ۲۵۶ھ) ''الادب المفرد'' اور حافظ عبد العظیم بن عبد القوی المنذری (۵۳۵ھ) کی ''الترغیب والترہیب'' امام نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) کی ''عمل الیوم واللیلۃ'' یہ تمام کتابیں اسی سنہرے سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان کتابوں میں بے شمار ضعیف احادیث شامل ہیں، ان کتابوں میں صحیح احادیث کا التزام اس وجہ سے نہیں کیا گیا ہے کہ فضائل وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل کے بارے میں ائمہ حدیث نرم رویہ اختیار کرتے ہیں؛ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا؛ لہٰذا ''فضائلِ اعمال''، ''مولانا محمد زکریا'' پر اعتراض دراصل یہ اسلاف اُمت کے اس طویل تاریخ پر مشتمل طرزِ عمل پر اعتراض ہے؛ چونکہ مولانا کی یہ تالیف بھی دراصل اسلاف امت کے صدیوں طرز پر مشتمل اسی طرز کی ایک کوشش ہے اور چونکہ شیخ صاحبؒ اپنی کتاب میں جو ضعیف احادیث کا تذکرہ کیا ہے، وہاں انہوں نے اس حدیث کے ماٰخذ اور مراجع کا بھی تذکرہ کیا ہے؛ بلکہ اس حدیث کے شواہد اور توابع کے تلاش کی بھی جستجو کی ہے، ان روایات پر اعتراض دراصل اِن مصنّفین پر اعتراض ہے جن کی کتابوں سے شیخ صاحبؒ نے استفادہ کیا ہے، شیخ صاحبؒ نے اپنی کتاب کی تالیف کے دوران جس کتاب سے زیادہ استفادہ کیا ہے وہ

''منذری'' کی ''ترغیب وترہیب'' ہے اور منذریؒ کے بارے میں حافظ ذہبیؒ اور دیگر لوگوں نے بہتر کلمات کہے ہیں، دیگر کتابیں جن سے شیخ الحدیث صاحبؒ نے دوران تالیف استفادہ کیا ہے ان میں "المستدرك للحاكم و مجمع الزوائد" حافظ سیوطی کی "جامع صغير"، "مشكاة المصابيح و جمع الفوائد اور القول البديع" شامل ہیں، ہاں البتہ انہوں نے احادیث کی تشریح وتوضیح کے دوران بہت سی ضعیف بلکہ موضوع احادیث کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ روایتیں دراصل امام غزالیؒ کی "احياء العلوم الدين"، "تنبيه الغافلين" اور فقیہ ابواللیث کی "قرة العيون" سے ماخوذ ہیں؛ لیکن اس قسم کی روایتوں سے کتاب کی اہمیت وافادیت میں کمی واقع نہیں ہوتی؛ اس لئے کہ فضائل کے باب میں ضعیف احادیث بلکہ موضوعات سے تک چشم پوشی کی جاتی ہے، یہ بات مذکورہ بالا کتب کے مطالعہ سے واضح ہوجائے گی، ایسے ہی اس موضوع پر حافظ ابن الجوزی کی ''تلبیس ابلیس'' اور ''تبصرہ'' حافظ نوویؒ کی ''الاذکار'' حافظ ذہبی کی ''الکبائر'' حافظ سیوطی کی "الجامع الصغير" حافظ ابن قیم کی ''مدارج السالکین'' اور ''زاد المعاذ'' وغیرہ ملاحظہ کیا جائے آپ کو بے شمار ضعیف احادیث بلکہ موضوعات تک مل جائیں گی؛ حالانکہ ان ائمۂ عظام کا مقام ومرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اس قسم کی روایات کو اپنی کتابوں میں لائیں؛ لیکن چونکہ ان کی یہ تصانیف وعظ وتذکیر سے تعلق رکھتی ہیں اور اس باب میں ضعیف بلکہ موضوع احادیث سے تک ائمۂ محدثین چشم پوشی کر لیتے ہیں، خود شیخ الحدیثؒ نے بھی اس باب میں قدیم محدثین کے فضائل اعمال کے متعلق اسی طرز کو اپنایا ہے؛ اگر فضائل کے باب میں ضعیف احادیث کا ذکر جرم ہے تو نعوذ باللہ یہ تمام ائمۂ محدثین جنہوں نے حدیث کی بقا وحفاظت کیلئے تن من دھن کی بازی لگائی ہے، یہ بھی مجرمین کی صفوں میں شامل ہوجائیں گے؟ اسی کو شیخ الحدیثؒ نے یوں فرمایا ہے: اگر یہ ائمہ عظام اور اسلاف امت کی کتابیں جھوٹ اور غلطی پر مبنی ہیں اور ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے تو مجھے میرے رسالہ ''فضائلِ حج'' کے غلط قرار دینے پر کوئی قلق نہیں ہوگا۔

فضائلِ اعمال کی ترتیب میں اِن کتابوں سے اِستفادہ کیا گیا

۱	تفسیر القرآن العظیم	ابن کثیرؒ	۷۷۴ھ
۲	الدر المنثور	ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین السیوطیؒ	۹۱۱ھ

۳	بیان القرآن	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ	۱۳۶۲ھ
۴	مفردات القرآن	ابوالقاسم الحسین بن محمد راغب اصفہانیؒ	۵۰۲ھ
۵	صحیح بخاری	ابومحمد عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ	۲۵۶ھ
۶	صحیح مسلم	ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیریؒ	۲۶۱ھ
۷	سنن ترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ	۳۰۳ھ
۸	سنن ابوداؤد	ابوداؤد سلیمان بن اشعثؒ	۲۷۵ھ
۹	سنن نسائی	ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائیؒ	۳۰۲ھ
۱۰	سنن ابن ماجہ	محمد بن یزید الربعی ابن ماجہؒ	۲۷۳ھ
۱۱	سنن بیہقی	ابوبکر احمد بن الحسین بیہقیؒ	۴۵۸ھ
۱۲	سنن دارمی	ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی دارمیؒ	۲۵۵ھ
۱۳	مستدرک حاکم	محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوریؒ	۴۰۵ھ
۱۴	مسندِ احمد بن حنبل	اِمامِ احمد بن حنبلؒ	۲۴۱ھ
۱۵	مشکوۃ	ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیبِ بغدادیؒ	۳۷ےھ
۱۶	الجامع الصغیر	ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین السیوطیؒ	۹۱۱ھ
۱۷	جمع الفوائد	محمد بن محمد سلیمان مغربیؒ	۱۰۹۴ھ
۱۸	المقاصد الحسنہ	شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاویؒ	۹۰۲ھ
۱۹	مجمع الزوائد	حافظ نورالدین الہیثمی	۸۰۷ھ
۲۰	تلخیص الحبیر	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانیؒ	۸۵۲ھ
۲۱	الترغیب والترہیب	ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذریؒ	۵۸۱ھ
۲۲	الموضوعات الکبریٰ	علامہ نورالدین علی بن سلطان محمد قاریؒ	۱۰۱۴ھ
۲۳	قرۃ العیون	شیخ ابواللیث سمرقندیؒ	۶۰۶ھ
۲۴	القول البدیع	علامہ شمس الدین محمد بن ابوبکر السخاوی شافعیؒ	۹۰۲ھ
۲۵	عمدۃ القاری	علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینیؒ	۸۵۵ھ

۲۶	فتح الباری	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانیؒ	۸۵۲ھ
۲۷	انجاح الحاجۃ علی ابن ماجۃ	علامہ عبدالغنی دہلویؒ	۱۲۹۵ھ
۲۸	الحرز الثمین	مسندِ ہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ	۱۱۷۶ھ
۲۹	مناسک نووی	یحیٰی بن شرف محی الدین نوویؒ	۶۷۷ھ
۳۰	تنبیہ الغافلین	شیخ ابواللیث سمرقندیؒ	۶۰۶ھ
۳۱	مرقاۃ المفاتیح	علامہ نورالدین علی بن سلطان محمد قاریؒ	۱۰۱۴ھ
۳۲	اللاٰلی المصنوعۃ	ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
۳۳	منبّہات	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانیؒ	۸۵۲ھ
۳۴	منتخب الکنز العمال	علی بن حسان الدین متقیؒ	۹۷۵ھ
۳۵	التعقبّات	ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین السیوطیؒ	۹۱۱ھ
۳۶	التدریب	ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین السیوطیؒ	۹۱۱ھ
۳۷	ذیل الآلی	ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین السیوطیؒ	۹۱۱ھ
۳۸	دقائق الأخبار	اِمام ابوحامد محمد بن محمد غزالیؒ	۵۰۵ھ
۳۹	شرح الصدور	ابوالفضل عبدالرحمٰن جلال الدین السیوطیؒ	۹۱۱ھ
۴۰	شرح اللباب	....	......
۴۱	الرحمۃ المھداۃ	ابوالخیر نورالحسن خان الحسینیؒ	......
۴۲	الزواجر	اِمام ابن حجر المکی الہیثمیؒ	۹۷۳ھ
۴۳	شمائل ترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ	۳۰۳ھ
۴۴	شفاء السقام	تقی الدین سبکیؒ	۷۵۶ھ
۴۵	اتحاف السادۃ المتقین	سید محمد بن محمد الحسینی الزبیدیؒ	۱۲۰۵ھ
۴۶	تقریب التہذیب	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانیؒ	۸۵۲ھ
۴۷	رجال المنذری	ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذریؒ	۶۵۶ھ
۴۸	مجالس الابرار	شیخ احمد رومیؒ	......

۴۹	التشرف	....	......
۵۰	قمرالأقمار	محمد عبدالحلیم بن محمد امین لکھنویؒ	۱۲۸۵ھ
۵۱	اسنی المطالب	شیخ محمد بن درویش الحوتؒ	۱۲۷۱ھ
۵۲	المغنی	احمد بن محمد بن قدامہ مقدسیؒ	۶۲۰ھ
۵۳	المنھل العذب	محمود محمد خطاب سبکیؒ	۱۳۵۲ھ
۵۴	نورالأنوار	حافظ شیخ احمد المعروف بملا جیون	۱۱۳۰ھ

فضائلِ اعمال کی احادیث کی تخریج

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے فضائلِ اعمال میں مختلف ابواب کے تحت عربی متن کے ساتھ جو احادیث ذکر کی ہیں، جن کتابوں سے وہ احادیث ماخوذ ہیں، اس کتاب کی وضاحت کے ساتھ اس سے لی گئی احادیث کی تعداد یہاں بیان کی جاتی ہے :

۱۔ بخاری و مسلم دونوں کی بیک وقت ذکر کردہ ان احادیث کی تعداد جو فضائلِ اعمال میں ہے باون (۵۲) ہے۔

۲۔ فضائلِ اعمال کی وہ احادیث جو صرف بخاری میں پائی جاتی ہیں ان کی تعداد ترسٹھ/۶۳ ہے۔

۳۔ فضائلِ اعمال کی وہ احادیث جو صرف مسلم میں ہیں ان کی تعداد بیانوے/۹۲ ہے۔

۴۔ فضائلِ اعمال کی وہ احادیثِ صحیحہ جو صحیحین کے علاوہ ہیں مذکور ہیں اور وہ حسن لذاتہ کے درجے کی ہیں ایک سو چونتیس (۱۳۴) ہے۔

۵۔ فضائلِ اعمال کی وہ احادیث جو صحیح لغیرہٖ ہیں ایک سو اُنسٹھ (۱۵۹) ہے۔

۶۔ فضائلِ اعمال کی وہ احادیث جو حسن لذاتہ ہیں ان کی تعداد ایک سو اُنسٹھ (۱۵۹) ہے۔

۷۔ فضائلِ اعمال کی وہ احادیث جو حسن لغیرہ ہیں ان کی تعداد، دوسو بیالیس (۲۴۲) ہے۔

۸۔ فضائلِ اعمال کی وہ احادیث جوضعیف ہیں تین سوستتر (۳۷۷) ہے۔

تفصیل کیلئے (تلخیص الخیال: تلخیص وترجمہ تحقیق المقال:۳۲۴ تا ۶۳۱) ملاحظہ ہو۔

اللہ کے راستے میں ایک نماز کا ثواب ۴۹ کروڑ

تبلیغی حضرات یہ جو بات کہتے ہیں یہ ان کی خصوصیت نہیں، بلکہ عام جو بھی اللہ کے راستے میں نکلے خواہ جہاد کے لئے، طلب علم کے لئے، حج وعمرہ کے لئے یا کسی اور نسبت سے وہ اس ثواب کا مستحق ہوگا، اس طرح یہ فضیلت ایک روایت سے نہیں لی گئی بلکہ دو حدیثوں کو ملا کر یہ بات کہی جاتی ہے:

"ومن غزا بنفسه فی سبیل الله وأنفق فی وجه ذلك فله بكل درهم سبع مائة ألف درهم ثم تلا هذه الآية"والله يضاعف لمن يشاء" جس شخص نے بنفس خود جہاد بھی کیا اور جہاد میں روپیہ پیسہ اور مال بھی خرچ کیا یعنی لڑائی میں خود شریک بھی ہوا اور مالی مدد بھی پہنچائی تو اس کو ہر درہم کے بدلے سات لاکھ درہم کا ثواب ملے گا کیونکہ اس نے اپنے نفس کو بھی مشقت ودکھ میں مبتلا کیا اور اپنا مال بھی خرچ کیا پھر آنحضرت ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (والله يضاعِف لِمن يشاء) یعنی اللہ تعالی جس کے چاہتا ہے اس کے ثواب میں اوراضافہ کرتا ہے(۱)

دوسری حدیث ہے: "إن الصلاة والصيام والذكر يضاعف علي النفقة في سبيل الله بسبعة مائة ضعف" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک دوران جہاد نماز روزہ اور ذکر الہی کرنے پر اس کا اجر سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے۔(۲)

---

(۱) ابن ماجة : باب فضل النفقة فی سبیل الله ،حدیث:۲۷۶۱، بوصیری کہتے ہیں کہ یہ سند ضعیف ہے، اس کی اصل صحیح مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں موجود حضرت ثوبان کی حدیث اور ترمذی میں خزیم بن فاتک کی حدیث ہے (مصباح الزجاجة: کتاب الجهاد:۲/۹۵، دار الجنان، بیروت۔

(۲) أبوداؤد : باب فی تضعیف الذکر فی سبیل الله ،حدیث:۲۴۹۸، حاکم کہتے ہیں کہ: یہ حدیث صحیح السند ہے اور شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، علامہ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

دین کے لئے تھوڑی دیر غور وفکر کرنا ساٹھ سال عبادت سے بہتر ہے:

یہ حدیث ”تفکر ساعة خير من عبادة ستين سنة “کہ تھوڑی دیر کا غور وفکر کرنا یہ ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے، ثابت ہے۔(۱)

حضرت شیخ یونس صاحب جونپوری شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور اس حدیث پر تفصیلی کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

”ان ساری عبارات سے حدیث کا مقام خود بخود متعین ہوجاتا ہے، بظاہر مرفوعا ہونا مشکل ہے، کوئی طریق علت قادحہ سے خالی نہیں ہے، اور اگر ثابت ہوتو پھر اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر تدبر وتفکر ہوگا، اسی قدر اپنی ذلت وبے مائیگی اور حق تعالی کی عظمت وکبریائی پیش نظر ہوگی“(۲)

---

(۱) الفوائد المجموعة ، كتاب الأدب والزهد والطب ،حدیث:۹۴،علامہ عراقی فرماتے ہیں اس کو ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابوہریرۃ سے مرفوعا روایت کیا ہے، اس کو ابن الجوزی نے موضوعات میں ذکر کیا ہے، علامہ سیوطی نے علامہ ابن الجوزی کا تعاقب کیا ہے، اور ”اللآلی المصنوعة “میں اس روایت کے شواہد ذکر کئے ہیں۔

(۲) نوادر الفقه :۱۳۷،ادارہ افادات اشرفیہ۔

اولیاء کیلئے کشف وکرامات کا ثبوت

اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں یعنی اولیاء سے خوارق عادت (خلافِ عادت واقعات وامور) کا صدور ممکن اور حق ہے یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کے نمونے اور اس کے پرتو ہوتے ہیں، مثلاً ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا، بلاموسم کے غیب سے ان کیلئے رزق کا انتظام ہونا، حیوانات اور تکلیف دہ جانوروں کا ان کے تابع ہوجانا، آگ میں داخل ہوجانا اور اس پر چلنا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جانا، انسان کے احاطۂ علم سے باہر امور مثلاً بارش ہونے کی اطلاع، یا کسی کے موت یا زندگی کے وقت کا تعین کرنا، دلوں کے احوال، مادرِرحم میں جنس کی خبر دینا، عجیب وغریب چیزوں کا انہیں سنائی دینا اور دکھائی دینا، تکلیف زدہ پریشان لوگوں کو راحت پہنچانا، بیماروں کو شفایاب کردینا، مردوں کو زندہ کردینا، اس قبیل کی تمام چیزیں حق ہیں، ایسی چیزوں کا صلحاء امت سے ظہور اور وقوع ممکن ہے، کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت سے ثابت ہے، اولیاء اللہ کے ان کرامات کا منکر علم سے عاری اور علم ضروری کا منکر ہے۔(۱)

ہاں البتہ کرامت کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ کسی نبی کے کسی کامل متبع اور پیرو سے ظاہر ہو اور خلافِ عادت ہو، اگر وہ امر خلاف عادت نہ ہو تب بھی کرامت نہیں، اگر اس چیز کا ظہور ایسے شخص سے ہو جو اپنے کو کسی نبی کا متبع نہیں کہتا تو وہ بھی کرامت نہیں۔ جیسے بعض جوگیوں، ساحروں وغیرہ سے یہ چیزیں سرزد ہوتی ہیں۔(۲) یعنی کرامت اس وقت کہیں گے جبکہ یہ خلاف عادت چیز کسی مومن، متبع سنت، متقی کامل سے ظاہر ہو، یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کو ہوا میں اڑتا یا پانی پر چلتا ہوا دیکھو، مگر وہ شریعت کا پابند نہ ہو تو یہ سب چیزیں بالکل حقیر ہیں۔

---

(۱) دارالعلوم دیوبند، عربی، مصنف عبیداللہ اسعدی: ۶۷۵ مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند

(۲) شریعت وطریقت: ۳۲۵

معجزہ اور کرامت اور دیگر خارق عادت اُمور میں فرق

معجزہ اور کرامت میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نبی سے جو معجزہ صادر ہوتا ہے اس میں اس کا دعویٰ نبوت بھی شامل ہوتا ہے، ولی سے جو کرامت صادر ہوتی ہے وہ نبی کی پیروی اور متابعت کے نتیجے میں ہوتی ہے، گویا یہ بھی دراصل نبی کا فیض اور اس کی کامل اطاعت کی برکت ہوتی ہے، معجزہ سے نبی کے دعویٰ نبوت کی تائید اور توثیق مقصود ہوتی ہے، ولی کی کرامت اس کے صلاح وتقوی میں ازیاد اور غیروں کے دین میں داخل ہونے کا ذریعہ بنتی ہے، لہٰذا معجزہ اور کرامت کے درمیان کوئی اشتباہ نہیں۔ (۱) اور جو شخص ایمان اور اعمال صالحہ سے خالی ہو اس سے اگر کوئی خلاف عادت امر ظاہر ہو جائے جیسے شیطان اور دجال سے بہت سے خوارق اور خلاف واقع امور کا ظاہر ہونا کتاب وسنت میں مذکور ہے یہ کرامت نہیں بلکہ اسے ''استدراج'' (ڈھیل) کہا جاتا ہے۔ نبی، ولی اور دیگر لوگوں سے خلافِ عادت امور کے ظاہر ہونے کے درمیان فرق کرتے ہوئے بعض محققین نے یوں کہا ہے :

> ''اگر یہ خلاف عادت چیز نبی سے اس کے خرقۂ نبوت کے نوازے جانے سے پہلے ظاہر ہوتی ہے تو اسے ''ارہاص'' کہتے ہیں اگر نبوت کے عطا کئے جانے کے بعد بغیر کسی چیلنج کے کہ اس چیز کا ظہور ہوتا ہے تو اسے ''کرامت'' اور یہ چیز کسی کی جانب سے چیلنج کے بعد ظاہر ہو تو اسے ''معجزہ'' کہتے ہیں۔ اگر یہی خلاف عادت چیز کسی متقی، پرہیزگار اور اہل اللہ سے ظاہر ہو تو ''کرامت'' اگر کسی عام مومن سے اس کا وقوع ہو تو ''معونت''، اگر اس کا ظہور کافر سے ہو اور اس سے اس کے اغراض ومقاصد کی تکمیل ہو رہی ہو تو اسے ''استدراج'' اس کے مطلوب کے خلاف ہو تو اسے ''اہانت'' کہتے ہیں۔'' (۲)

یہ بھی جاننا چاہئے کہ کرامت دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک حسّی اور ایک معنوی، عوام لوگ حسّی کرامت کو خوب جانتے ہیں اور اسی کو کمال شمار کرتے ہیں، جیسے دلوں کے احوال پر مطلع ہونا، پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، حالانکہ خواص کے یہاں کرامت معنوی کرامت حسّی سے کہیں بڑھی ہوئی ہوتی ہے، جیسے امورِ شرعیہ پر مواظبت اور پابندی کرنا، اچھے اخلاق وعادات کا خوگر ہونا، حسد، کینہ، بغض وغیرہ مذموم صفات سے دل کا پاک صاف ہونا اس میں استدراج یعنی اللہ کی جانب سے ڈھیل کا احتمال نہیں ہے۔

---

(۱) دارالعلوم دیوبند : ۶۷۴ (۲) ھامش شرح العقائد النسفیة : ۲۲۱

محققین کا کہنا یہ ہے کہ کرامات کی کوئی حد نہیں ہوتی، کرامات کے ذریعے بڑے بڑے امور جیسے بغیر والد کے لڑکے کا پیدا ہو جانا، یا کسی جماد کا حیوان بن جانا، ملائکہ سے گفتگو کرنا، اس قبیل کی چیزیں بھی بطور کرامت کے وقوع پذیر ہوسکتی ہیں۔ جب اللہ کی قدرت کی کوئی حد نہیں تو کرامات کیوں کر محدود ہوسکتی ہیں، کیونکہ دراصل یہ ظاہر ہونے والی چیز اللہ کا فعل ہوتا ہے، جو ولی کے ہاتھ پر اس کے اللہ کے یہاں مقبول ومحبوب ہونے کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

واضح رہنا چاہئے کہ کوئی نبی یا ولی کرامت کے ظاہر کرنے میں مختار کل (ہر طرح کا اختیار رکھنے والا) نہیں ہوتا بلکہ یہ سب کچھ اللہ کی مدد اور اس کی قدرت کا کرشمہ ہوتا ہے: ’’ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّأْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ‘‘ (۱) ’’اور کوئی رسول بھی اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی نہیں لا سکتا‘‘ بعض لوگ کرامتوں کا انکار کرتے ہیں انہیں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ کرامت ولی کا فعل ہے، ایک انسان ایسا غیر معمولی کارنامہ کیسے انجام دے سکتا ہے؟ جبکہ یہ صرف نصرتِ خداوندی ہوتی ہے جو ولی پر اس کے کامل اِتباع کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے اور بعض لوگ کرامت ومعجزات سے متاثر ہو کر شرک میں ملوث ہو جاتے ہیں، خارقِ عادت، معمول کے خلاف باتوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ شخص خدائی طاقت کا مالک ہے، چنانچہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات: جیسے مردوں کو زندہ کرنا، کوڑی کا مرض دور کرنا اس قبیل کی چیزیں دیکھ کر انہیں خدا یا خدا کا بیٹا تصور کر لیا، غیر مسلموں نے ایسے لوگوں کو خدا کا اوتار باور کر لیا، بے شعور مسلمانوں نے ایسے انسانوں کو خدا کے دربار کی خاص ہستی سمجھ کر ان کے قبروں پر ان سب ناجائز حرکتوں کو شروع کر دیا جو ایک غیر مسلم مورتی کے ساتھ کرتا ہے، حالانکہ کرامات کا انکار، یا کرامت کے ظہور میں ولی کو ہی موثر بالذات سمجھنا یہ دونوں غلط عقیدے ہیں جو افراط وتفریط کے حامل ہیں۔

بعض لوگوں کو ہر عجیب وغریب چیز پر کرامت ہونے کا وہم ہوا ہے اور یہ لوگ جن سے اس قسم کی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اس کی حقیقت کا پتہ لگائے بغیر ان کے معتقد اور مرید ہو جاتے ہیں چنانچہ اس قبیل کی چیزوں میں مسمریزم، فریمسن، حاضرات، ہمزاد کا عمل، عملیات ونقوش، طلسمات، شعبدات، تاثیراتِ عجیبہ، ادویاتِ سحر، چشم بندی، اس میں بعض چیزیں ان کے آثار تو

(۱) غافر : ۷۸

محض خیالی ہیں۔ اگر بعض چیزوں کے اثرات ظاہر بھی ہوتے ہیں تو اس کے پیچھے کچھ اسباب مخفی ہوتے ہیں جیسے ناپاک شیاطین، سفلی قوتیں وغیرہ۔ ان سب خرافات کا کرامات سے کوئی تعلق نہیں۔

معجزہ وکرامت خدا کا فضل ہوتا ہے:

نبی اور ولی کرامت اور معجزے کے مظہَر ہوتے ہیں نہ کہ مُظہِر ہوتے ہیں جیسا کہ بجلی بلب میں ظاہر ہوتی ہے، بلب میں پیدا نہیں ہوتی، بلکہ بعض مرتبہ نبی اور ولی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمارے ہاتھ پر کسی عجیب وغریب اور نرالی چیز کا صدور ہوگا؛ بلکہ اللہ تعالی ہی ان کی تصدیق وتکریم کے لئے خارقِ عادت چیز ان کے ہاتھ پر ظاہر کر دیتا ہے۔(۱)

کرامت کی قسمیں

کرامات کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم جہاں ولی کو اپنی اس کرامت کا علم بھی ہو اور اس نے اس کا قصد وارادہ بھی کیا ہو، جیسے حضرت عمرؓ کے فرمان سے دریائے نیل کا جاری ہونا اس کو تصرف اور ہمت بھی کہتے ہیں۔

دوسری قسم جہاں علم ہو لیکن اس کا ارادہ نہ کیا گیا ہو جیسے حضرتِ مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم پھل کا آنا۔

تیسری قسم جہاں نہ ولی کو اس کا علم ہو اور نہ اس کرامت کا ارادہ کیا ہو، جیسے حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کا دوچند ہو جانا، چنانچہ حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کو اس پر تعجب ہوا۔(۲)

کرامات کا مقام اور اُس کی شرعی حیثیت

شریعت میں کرامت کا مرتبہ ذکر لسانی سے بھی کمتر ہے، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ذکر سے اگرچہ توجہ کے ساتھ نہ بھی ہو تو کچھ تو قربِ خداوندی حاصل ہوتا ہے اور کرامت سے کچھ بھی قرب حاصل نہیں ہوتا، بلکہ کرامت ہی قربِ خداوندی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ الغرض واقعۃً ولی سے ظاہر ہونے والی یہ غیر عادی چیز کرامت ہو تو بس یہ قربِ خداوندی کی علامت ہے۔

عادت کے خلاف چیزوں کا ظاہر ہونا یہ ولایت کیلئے ضروری نہیں ہے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم

---

(۱) راہ ہدایت، از حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب:۹۱ (۲) شریعت وطریقت : ۳۲۵

سے تو عمر بھر خارقِ عادت کسی چیز کا ظہور نہیں ہوا؛ حالانکہ یہ سب اولیاء سے افضل ہیں،فضیلت کا دارومدار قربِ الٰہی اور اخلاص عبادت پر ہے' خلافِ عادت امور جوگیوں سے بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں، یہ ریاضت اور مجاہدہ کا ثمرہ ہوتا ہے،صاحبِ عوارف نے غیر اہل خوارق کو اہلِ خوارق سے افضل اور برتر بتلایا ہے، عارفین کی بڑی کرامت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ شریعت پر استقلال واستقامت کے ساتھ قائم رہیں اور سب سے بڑا کشف یہ ہوتا ہے کہ طالب کی استعداد کو سمجھ کر اس کے مطابق تربیت کریں۔بعض اولیاء نے مرنے کے وقت تمنا کی ہے کہ کاش ہم سے کرامتیں ظاہر نہ ہوتیں۔(۱)

کرامات کے ثبوت پر اسلافِ اُمت کے اقوال

اِمامِ طحاویؒ رقم طراز ہیں: اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی جو کرامتیں صحیح روایت سے ثابت ہیں،ہم ان پر یقین رکھتے ہیں:"ونومن بما جاء من کراماتهم وصح عن الثقات من روایاتهم" (۲)

''شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی کتاب ''مجموع الفتاویٰ'' میں مختلف مقامات پر معجزہ اور کرامات کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے،ایک جگہ لکھتے ہیں:''یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اللہ والوں کو کشف والہام اور پردۂ غیب سے تکلم وخطاب ہوتا ہے''(۳)

شیخ آگے لکھتے ہیں :

''کرامات ومعجزات کے متعلق صحیح اصول جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ ائمہ متقدمین کا عرف ہے کہ معجزہ خلافِ عادت شئی کو کہتے ہیں، نیز ان کو آیات بھی کہا جاتا ہے،لیکن اکثر متاخرین دونوں الفاظ میں یہ فرق کرتے ہیں کہ معجزہ نبی کیلئے ہوتا ہے اور کرامت ولی کیلئے،لیکن دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے،یعنی خلافِ عادت کام (۴)

آپ مزید لکھتے ہیں :

''اولیاء سے کرامتوں کا وقوع ہوتا ہے،جن کے ذریعہ اللہ عزوجل اپنے پرہیزگار

---

(۱) شریعت وطریقت : ۳۲۸

(۲) شرح الطحاوی: نبی واحد أفضل من جمیع :۴۹۴/۱،دارالسلام للطباعة والنشر

(۳) مجموع الفتاوی :۱۳۴/۱۸۵

(۴) مجموع الفتاویٰ: الفرق بین أولیاء الرحمن :۱۷۱/۱۸۵

بندوں کی عزت افزائی فرماتے ہیں اور ان اولیاء سے کرامتوں کا ظاہر ہونا دین کی حقانیت کوثابت کرنے یا مسلمانوں کی حاجت برآری کیلئے ہوتا ہے:"وخیار أولیاء الله کراماتهم لحجة فی الدین ، أو لحاجة من المسلمین" جیسا کہ حضور ﷺ کے معجزات کی بھی یہی شان ہے اور بزرگان دین کو یہ کرامات نبی کی اتباع کی برکت ہی سے حاصل ہوتے ہیں، میں نے تقریباً ایک ہزار معجزے جمع کئے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعینؒ اور بعد کے صلحاء امت کی کرامت کی تعداد تو بہت زیادہ ہے"۔(۱)

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب تحریر کرتے ہیں :

"میں اولیاء کی کرامتوں اور ان کے مکاشفات کا قائل ہوں۔"(۲)

اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے :"اولیاء کی کرامات حق ہیں"۔ (۳)

قرآن میں اولیاء کے کرامتوں کا ذکر

۱- حضرتِ مریم علیہا السلام جو کہ نبیہ نہ تھیں، بلکہ ولیہ اور صدیقہ تھیں بطور کرامت کے بے موسم رزق کا ان کے پاس آنا قرآن میں مذکور ہے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيُهَا زَكَرِيَّا الْمِحُرَابَ وَجَدَعِنُدَهَا رِزُقًا، قَالَ يَامَرُيَمُ أَنَّى لَكِ هٰذَا قَالَتُ هُوَمِنُ عِنُدِاللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرُزُقُ مَنُ يَّشَاءُ بِغَيُرِ حِسَابٍ(۴)

"حضرتِ زکریاؑ جب کبھی محراب میں مریم کے پاس جاتے تو ان کے پاس عجیب وغریب کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی دیکھتے تو پوچھتے : اے مریم یہ رزق تیرے پاس کہاں سے آیا، وہ کہتیں اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا، بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بغیر حساب رزق دیتے ہیں"۔

۲- حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر صاحب مشیر یعنی آصف بن برخیا کا جو کہ نبی نہ تھے، پلک جھپکنے سے پہلے بلقیس کے تخت کو لاکر سلیمان علیہ السلام کے سامنے رکھ دینا یہ قرآن کریم میں مذکور ہے، لہٰذا یہ ان کی کرامت ہوگئی :

---

(۱) مجموع الفتاوی: ۲۷۴/۱۱ (۲) مؤلفات محمد بن عبد الوهاب :۱۱/۱۰/۵

(۳) شرح فقه اکبر: ۱۴۴ (۴) آل عمران : ۳۷

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ، فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ (۱)

''کہا اس شخص نے جس کو اس کتاب کا علم تھا کہ میں اس تخت کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے آپ کے پاس لا کر رکھ دوں گا، چنانچہ وہ لے آیا۔ پس سلیمان علیہ السلام نے جب اس کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو یہ فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے، جس سے مقصود میری آزمائش ہے اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری''۔

۳- اصحابِ کہف کا قصہ بھی قرآن کریم میں مذکور ہے کہ تین سو سال کروٹیں بدلتے رہے ان پر موت طاری نہیں ہوئی۔ یہ اصحابِ کہف کی کرامت تھی۔

۴- ''اصحاب الاخدود'' کھائی والوں کا واقعہ، جس کا ذکر ''سورۃ المعارج'' میں ہے۔ احادیث میں اس واقعہ کی تفصیل میں ایک لڑکے اور اس کے کشف کرامات کا ذکر ہے، صحیح مسلم، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں یہ تفصیلی واقعہ درج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذونواس نامی کوئی بادشاہ کافر تھا، اس کے پاس ایک کاہن تھا اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھ کو ایک ہوشیار لڑکا دیا جائے تو میں اس کو اپنا علم سکھا دوں، چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا اس کے راستہ میں ایک راہب رہتا تھا کہ دین حق اس وقت عیسوی تھا، وہ لڑکا اس کے پاس آنے جانے لگا اور خفیہ مسلمان ہو گیا، ایک بار اس نے دیکھا کہ کسی شیر نے راستہ روک رکھا ہے اور خلق پریشان ہے اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دُعاء کی اے اللہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے پتھر سے مارا جاوے اور اگر کاہن سچا ہے تو نہ مارا جاوے اور یہ کہہ کر وہ پتھر مارا تو وہ ہلاک ہو گیا، لوگوں میں شور ہو گیا کہ اس لڑکے کو کوئی عجیب علم آتا ہے، کسی اندھے نے سنا آ کر درخواست کی کہ میری آنکھیں اچھی ہو جائیں، لڑکے نے کہا بشرطیکہ تو مسلمان ہو جائے چنانچہ اس نے قبول کیا، لڑکے نے دعا کی وہ اچھا ہو گیا اور مسلمان ہو گیا، بادشاہ کو یہ خبریں پہنچیں، تو اس راہب کو اور لڑکے کو اور اس اندھے کو گرفتار کر کے بلایا، اس نے راہب اور اندھے کو قتل کر دیا اور لڑکے کیلئے حکم دیا کہ پہاڑ پر سے گرا دیا جائے، مگر جو لوگ

---

(۱) سورۃ النمل : ۴۰

اس کو لے گئے تھے وہ خود گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح سالم چلا آیا، پھر بادشاہ نے سمندر میں غرق کرنے کا حکم دیا وہ اس سے بھی بچ گیا اور جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ سب ڈوب گئے، پھر خود لڑکے نے بادشاہ سے کہا مجھے بسم اللہ کہہ کر تیر مارو تو مر جاؤں گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور لڑکا مر گیا، پس اس واقعہ عجیبہ کو دیکھ کر یک لخت عام لوگوں کی زبان سے نعرہ بلند ہوا کہ ہم سب اللہ پر ایمان لاتے ہیں، بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور ارکانِ سلطنت کے مشورے سے بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر اسے آگ سے بھر دیا، پھر اعلان کروایا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا، اس کو آگ میں جلا دیں گے چنانچہ بہت سے آدمی جلا دیئے گئے اسی کو اللہ عز وجل نے فرمایا : " قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ " (۱)

۵- آسیہ زوجۂ فرعون کیلئے جنت کا کشف یہ ان کی کرامات میں داخل ہے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ، اِذْقَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٥(۲)

اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کیلئے فرعون کی بی بی کا حال بیان کرتا ہے جبکہ ان کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار میرے واسطے جنت میں اپنے قرب میں مکان بنائیے اور مجھ کو فرعون سے اور اس کے عمل سے محفوظ رکھئے اور مجھ کو تمام ظالم لوگوں سے محفوظ رکھئے۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون کو جب آسیہ کے مومن ہونے کا علم ہوا تو حکم دیا کہ ان کو چومیخا (یعنی ہاتھ پیر میں چاروں طرف کیل مار کر) دھوپ میں ڈال دیا جائے اوران کے سینے پر چکی کا پتھر رکھ دیا جاوے: "أن فرعون وتد لإمرأته أربعة أوتاد وأضجعها على صدرها وجعل على صدرها رحى " اس تکلیف میں انہوں نے یہ دعا کی تو ان کو بہشت میں اپنا مکان نظر آیا جس سے وہ تکلیف خفیف ہو گئی۔(۳)

---

(۱) بیان القرآن : ۸۸/۱۲

(۲) التحریم : ۱۱

(۳) الدر المنثور: التحریم : ۲۲۹/۸، دار الفکر، بیروت، بیان القرآن :۲۳/۱۲

احادیث میں کراماتِ اولیاء کا ذکر

غار والوں کا قصہ، جوان نیک طینت لوگوں کے کرامات میں شامل ہے۔ اس قصے کو امام بخاریؒ نے بالتفصیل ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ ہے کہ تین اشخاص سفر پر تھے، چلتے چلتے رات ہوگئی تو انہوں نے ایک غار میں پناہ لی، اس دوران ایک چٹان نے غار کے منہ کو بند کر دیا، انہوں نے یہ دیکھ کر آپس میں یہ کہا کہ اس چٹان سے نجات کی یہ صورت ہے کہ وہ اپنے اعمال کے ذریعے دعا کریں؛ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا:

اے اللہ! میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے، میں اہل وعیال اور غلاموں کو ان سے پہلے دودھ نہیں پلاتا تھا، میں ایک دن ایک چیز کی تلاش میں دور نکل گیا، واپس آنے تک والدین سو چکے تھے، میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوگیا انہیں جگانا پسند نہیں کیا، ان سے پہلے اہل وعیال کو پلانا بھی گوارا نہ کیا، میں دودھ کا پیالہ لے کر صبح تک کھڑا رہا، صبح جب ہوگئی تو میں نے ان کو دودھ پلایا، اگر میں نے یہ عمل تیری رضا کیلئے کیا ہے تو چٹان غار کے منہ سے ہٹا دے۔ اس کی دعا کے نتیجے میں چٹان تھوڑی سی سرک گئی۔

دوسرے نے دُعا کی کہ مجھے اپنی چچازاد بہن سے بے انتہا محبت تھی، میں نے اس سے اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کا اظہار کیا تو اس نے انکار کیا، ایک مرتبہ قحط سالی ہوئی، وہ قحط سے مجبور ہو کر میرے پاس آئی تو میں اسے اس شرط پر ایک سو بیس دینار دیئے کہ وہ تنہائی میں مجھ سے ملے، چنانچہ وہ اس کے لئے آمادہ ہوگئی، میں جب اس پر پورا قابو پا چکا تو اس نے کہا: میں تمہارے لئے اس بات کو حلال نہیں سمجھتی کہ تم اس مہر (پردہ بکارت) کو ناحق توڑو، اس کے اس بول سے میں اپنی اس بری حرکت سے باز آ گیا اور وہ دینار بھی اس سے واپس نہ لیا، اگر میں نے یہ عمل تیری خوشنودی کیلئے کیا تو اس چٹان کو غار کے منہ سے ہٹا دے، اس کی دعا سے چٹان کچھ اور ہٹ گئی۔

تیسرے نے دعا کی اے اللہ! بہت سے مزدوروں نے میرے پاس کام کیا، سب اپنی اپنی مزدوری لے کر چلے گئے، ایک شخص اپنی مزدوری لئے بغیر چلا گیا، میں اس کی رقم کو کاروبار میں لگایا، اس کے مال میں کافی اضافہ ہوگیا، کچھ مدت کے بعد وہ میرے پاس آ کر اپنی مزدوری کا مطالبہ کرنے لگا، میں نے کہا: یہ اونٹ، یہ گائے، بکریاں یہ سارے غلام جو تمہیں نظر آرہے ہیں یہ سب تمہاری مزدوری ہے اس نے کہا: مجھ سے مذاق نہ کرو، میں نے کہا کہ میں مذاق نہیں کررہا ہوں، پھر

میں نے اسے ساری حقیقتِ حال سے واقف کرایا،اس کے بعد وہ سارا مال لے کر چلا گیا،اے اللہ اگر میں نے یہ کام تیری رضا کیلئے کیا ہے تو میرے اس عمل کی برکت سے چٹان کو ہٹادے، چنانچہ چٹان ہٹ گئی اور وہ سب باہر نکل آئے۔(۱)

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامتیں

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی بے شمار کرامتیں ہیں۔ بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ معتبرہ میں ان واقعات وکرامات کا ذکر ملتا ہے۔ہم بطورِ نمونہ کے چند کرامات کا یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

- حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں حارث کی ایک دختر سے منقول ہے وہ کہتی ہیں میں نے ان (حضرت خباب رضی اللہ عنہ) کو انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا اور اس وقت مکہ میں،میوہ یا پھل کا کہیں نام ونشان نہ تھا اور خود وہ لوہے میں مقید تھے۔ (۲)
- حضرتِ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرتِ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک رات حاضر تھے' پھر دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے گئے، ان دونوں کے آگے دو نور نمودار ہوئے، جب دونوں جدا ہوئے تو ایک ایک نور ہر ایک کے ساتھ ہوگیا۔(۳)
- حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کا دوچند، سہ چند ہوجانا۔(۴)
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہاوند کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا،ساریہ نامی ایک شخص کو لشکر کا سردار مقرر کیا، مدینۂ نہاوند سے ایک مہینے کی مسافت پر تھا، ایک روز کفار کا لشکر پہاڑ کے پیچھے مسلمانوں کی گھات میں بیٹھ گیا اور لڑائی شروع ہوئی،قریب تھا کہ یہ لشکر ان پر حملہ آور ہوتا،

---

(۱) بخاری :باب من استاجر اجیرًا ، فترك اجره، حدیث: ۵۹

(۲) بخاری مطوّلا فی کتاب المغازی، باب بلا ترجمة تحت، باب فضل من شهد بدرًا : حدیث:۳۷۶۷

(۳) مسلم : باب إكرام الضیوف وفضل إیثاره ، حدیث:۲۰۵۷

(۴) متفق علیہ،مشکوۃ:۵۴۵

یہ حال اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ پر منکشف فرما دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے یکا یک باآواز بلند فرمایا: "یاساریة الجبل" اے ساریہ پہاڑ کے پیچھے دیکھو کہ دشمن تمہاری تاک میں بیٹھا ہوا ہے، حضرتِ ساریہ نے اسی وقت اس کا سراغ لگایا اور حملہ آور دشمن سے بچ گئے۔ یہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت تھی کہ نہاوند کے میدان کا حال ایک مہینے کی مسافت سے دکھلایا گیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز مدینہ منورہ سے نہاوند تک ایسے پہنچی کہ سارے لشکر نے آپ رضی اللہ عنہ کی آواز سنی۔(۱)

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرتِ سفینہ سرزمین روم میں یا تو لشکر سے پیچھے رہ گئے تھے یا دشمنوں نے انہیں گرفتار کرلیا تھا' جب یہ وہاں سے نکل کر لشکر کی تلاش میں چل پڑے تو دیکھا کہ شیر کھڑا ہے، انہوں نے اس سے مخاطب ہوکر کہا: میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور میری ایسی صورتحال ہے شیر دم ہلاتا ہوا ان کے بازو آ کر کھڑا ہوگیا۔ اگر کہیں سے کچھ آہٹ محسوس ہوتی تو شیر اس جانب متوجہ ہوتا، پھر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا، اس طرح سے وہ چل کر لشکر سے جاملے اور شیر واپس ہوگیا۔(۲)

- جب مصر فتح ہوا تو حضرتِ عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو دریائے نیل کے تعلق سے یہ اطلاع دی کہ یہاں کے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جب تک ہر سال ایک خوبصورت اور حسین لڑکی کو سجا سنوار کر دریا برد نہیں کرتے ہیں، دریائے نیل نہیں چلتا، حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا: یہ چیزیں اسلام میں نہیں ہوسکتیں، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ایک رقعہ اپنی جانب سے دریائے مصر کو لکھا اور اسے دریا میں ڈالنے کیلئے کہا، اس طرح دریائے نیل ہمیشہ کیلئے چلتا رہا۔(۳)

یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے کرامات سے متعلق چند واقعات ہیں جس میں ان کیلئے بے موسم پھل کا حاصل ہونا' روشنی کا نمودار ہونا' کھانے کا بڑھ جانا، کئی مہینہ کی مسافت کی دوری تک ان کی آواز کا پہنچ جانا، موذی جانوروں کا ان کے تابع ہونا، ان کے حکم سے دریا کا چلنا، اس طرح کے

---

(۱) کنزالعمال، حدیث: ۳۵۷۸۸، تتمة فضائل فاروق، مطبوعة بيروت

(۲) مشکوة مع شرح مرقاة المفاتيح، باب الكرامات، ۳۸۳۸، ۳۸/۹، دار الفكر، بيروت

(۳) كنز العمال: فضائل فاروق: حديث: ۳۵۷۵۹، مؤسسة الرسالة، بيروت

خارقِ عادت اور خلافِ معمول واقعات بکثرت پیش آئے جو درحقیقت ان کے کرامات سے متعلق ہیں۔(تفصیل کیلئے ''حیاۃ الصحابہ'' ج ۳/۷۴۳ تا ۹۶۰ ملاحظہ ہو)۔

معجزہ یا کرامت نبی یا ولی کیلئے اختیاری اور دائمی نہیں ہوتے

بعض لوگ کرامات، مکاشفات اور تصرفات وغیرہ اور بزرگوں کے ساتھ اس قسم کے پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کا انکار یہ کہہ کر کردیتے ہیں کہ اگر اس قبیل کی چیزیں درست ہوتیں، اور اولیاء کو کشف وغیرہ کے ذریعے بعض غیبی امور پر اطلاع حاصل ہوتی تو پھر حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی آنحضرت ﷺ اس کی حقیقت پر مطلع نہ ہوسکے، حدیبیہ کے موقع سے حضرتِ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے قتل کی افواہیں پھیل گئی تو آپ ﷺ نے حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا بدلہ لینے کیلئے بیعت لینا شروع کیا، حالانکہ حقیقتاً عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل نہ ہوا تھا، ایسے ہی غزوۂ اُحد کے موقع سے آنحضرت ﷺ کے شہید ہوجانے کی خبریں پھیل گئیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ کے دیکھنے کے بعد اطلاع ہوئی، اگر کرامات، مکاشفات، تصرفات درست ہوتے تو پھر آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کے اس قسم کے مواقع سے اس قدر سردردی اور پریشانی کی ضرورت کیوں ہوئی؟۔

اس بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ معجزہ یا کرامت نبی یا ولی کی اختیاری یا ان کے ساتھ دائمی چیز نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو انبیاء علیہم السلام اور اولیاءؒ کے ساتھ اللہ عزوجل کا فضل اور کرم ہوتا ہے، اللہ جس وقت چاہتے ہیں نبی کو وحی کے ذریعہ، ولی کو الہام وکشف کے ذریعے ان امور پر مطلع کردیتے ہیں، ارشادِ خداوندی ہے وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِىَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱) ''اور کوئی رسول بھی اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی نہیں لاسکتا''۔

اس حوالہ سے یہ بھی ارشادِ خداوندی ہے، آپ ﷺ سے جب مشرکین مکہ نے معجزوں کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ کے معجزات کے اختیاری نہ ہونے اور آپ کی اس بارے میں عاجزی وبے کسی کا ذکر کیا گیا: قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۲) ''آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ میں تو بس اللہ کا پیغام پہنچانے والا ایک انسان ہوں، ہاں میرے بھیجنے والے پروردگار کے قبضہ میں سب کچھ ہے اور وہ ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ میں نے کب یہ دعویٰ کیا کہ ایسے معجزے دکھانا بھی میرے قبضہ میں ہے

---

(۱) غافر: ۷۸/۱۲ (۲) بنی اسرائیل: ۹۳

جو تم مجھ سے ایسی لغو فرمائش کرتے ہو۔ ایسے ہی کفار ومشرکین نے جب آنحضرت ﷺ سے معجزات کا مطالبہ کیا تو آپ کو حکم دیا گیا: قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَاللّٰہِ (۱) ''یعنی ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ جو نشانیاں اور معجزے تم مجھ سے چاہتے ہو، وہ اللہ ہی کے پاس اور اسی کے قبضہ میں ہیں، وہ جب چاہے دکھائے یا نہ دکھائے''۔

مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں میرے اختیار سے باہر ہیں؛ اس لئے تمہارا مجھ سے یہ فرمائش کرنا غلط ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ غزوۂ بدر کے موقع سے کفار کے مقتل کی علیحدہ علیحدہ نشاندہی فرما رہے ہیں ایک عورت حاتم بن ابی بلتعہ کا رقعہ لے کر مکہ کو جارہی ہے آپ اس کی اطلاع دے رہے ہیں، دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ پر بہتان لگنے کے موقع سے ایک ماہ تک آپ ﷺ رنجیدہ رہے ہیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی حقیقت سے بھی آپ واقف نہیں ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کو مصر سے روانہ ہونے والے یوسف کے کرتے کی تو خوشبو آرہی ہے، مگر کنعان ہی میں ایک کنویں میں پڑے ہوئے یوسف کے بارے میں آپ کو کوئی اطلاع نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا کہ یہ واقعہ فلاں کے ساتھ پیش آیا فلاں کے ساتھ کیوں نہیں پیش آیا درست نہیں، معجزہ یا کشف یا کرامت یہ اختیاری یا دائمی چیزیں نہیں ہوتیں، عبادات ومجاہدات اور تقربِ خداوندی کے نتیجے میں ان اُمور کا ظہور ہوتا ہے۔ اس بارے میں بخاری کی یہ روایت بھی پیش نظر رہے، جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ کے واسطے ایک بکری، (تلی ہوئی) ہدیۃً پیش کی گئی جس میں زہر تھا۔ (۲)

آخر حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ نوش بھی فرمالیا، بعدہ آپ ﷺ کو معلوم ہوا، تو آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اٹھالیا لیکن آخر عمر میں اس زہر کا اثر ہوا، اس سے دو چیزیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ کشف دائم نہیں ہوتا، ورنہ آپ ﷺ پر اولاً یہ بات مخفی نہ رہتی، دوسرے یہ کہ خلاف عادت اور خوارق بھی ہمیشہ ظاہر نہیں ہوتے ورنہ آپ پر اثر نہ ہوتا، جب نبی کیلئے کشف اور خلاف عادت اُمور کا ظاہر ہونا دائمی نہیں تو دوسروں کا کیا ذکر؟؟

---

(۱) عنکبوت : ۵۰

(۲) بخاری : اذا غدر المشرکون بالمسلمین ھل یعفٰی عنھم ؟حدیث: ۳۱۲۹

چھوٹا بڑے سے جزوی فضیلت یا کرامت میں آگے بڑھ سکتا ہے

جو لوگ اولیاء کیلئے کرامات، تصرفات، مکاشفات اور خارقِ عادت اُمور کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ خصوصاً کرامات کے تعلق سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرح کی خارق عادت، خلافِ عادت چیزیں انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ظہور پذیر نہیں ہوئیں، خصوصاً ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے، حالانکہ کوئی بھی شخص خواہ عبادات ومجاہدات میں کس قدر کیوں نہ بڑھ جائے وہ نبی اور ولی کے مقام اور مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، پھر یہ خلافِ عادت چیزیں ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں اور انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں ظاہر نہ ہوں یہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔

دیکھئے! حضرتِ بی بی مریم ولیہ ہیں، ان کو بے موسم پھل مل رہے ہیں! مگر حضرت زکریا علیہ السلام جو نبی ہیں ان کو نہیں مل رہے ہیں، سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے خاوند کے ہوتے ہوئے بھی لڑکی بھی نہیں دی اور بی بی مریم کو بغیر خاوند کے لڑکا عطا کر دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنا دستِ مبارک روزانہ منہ پر پھیرتے ہیں مگر بینائی واپس نہیں آتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی صرف قمیص لگنے سے بینائی واپس آ گئی، جو ہوا سلیمان علیہ السلام کا تخت اٹھائے پھرتی تھی، اس ہوا کو یہ حکم نہیں ملا کہ سفرِ ہجرت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک لمحہ میں مدینہ پہنچادے، حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہیں، لیکن تختِ بلقیس کا آنا آپ کے صحابی ووزیر آصف بن برخیا کی کرامت ہے۔

اِسی طرح مختلف حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے تعلق سے خصوصی فضائل حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمائے ہیں؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”إِنَّ اللّٰه جعل الحقّ علی لسان عمرو قلبه“ کہ اللہ تعالیٰ نے عمر رضی اللہ عنہ کی زبان اور ان کے دل میں حق کو رکھ دیا ہے۔(۱)

مقامِ ابراہیم علیہ السلام، پردے کے مسئلہ اور غزوۂ بدر کے قیدیوں کے مسئلہ میں اللہ عزوجل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کی ہے۔ ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تعلق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فضیلت ذکر کرنا کیا میں ایسے بندے کا لحاظ نہ کروں جس کا فرشتے بھی لحاظ کرتے ہیں“ (۲) یا

---

(۱) ترمذی: باب فی مناقب عمر بن الخطاب، حدیث:۳۶۸۲، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔ (۲) مسلم: باب فضائل عثمان بن عفان، حدیث:۲۴۰۱

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے تعلق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ ان کو جنت کے سلسبیل سے سیراب فرما(۱) (جو جنت کی خصوصی نہر ہے) یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو ان کے دو ہاتھ کے بدلے جو جنگ میں کٹ گئے تھے جنت میں دو باز و خصوصی طور پر عطا ہونا(۲) یا حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے تعلق سے ان کی وفات کے بعد یہ فرمانا کہ ان کی آمد کی خوشی سے عرشِ الٰہی جھوم اُٹھا، یا ان کیلئے ستر ہزار خصوصی فرشتوں کا اترنا(۳)، یا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ فضیلت کہ ''میں نے جنت میں تمہارے جوتوں کی آواز اپنے آگے سنی ہے''۔اس طرح کے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بے شمار جزوی فضائل ہیں کیا ان جزوی فضائل کی وجہ سے یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کہ ''افضل الخلائق بعدالانبیاء'' ہیں(نبیوں کے بعد تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ فضیلت ان کو حاصل ہے) سے آگے بڑھ سکتے ہیں، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان فضائل کا انکار اس وجہ سے ہم کرتے ہیں، چونکہ یہ فضیلتیں حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا نہیں کی گئیں دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ فضیلتیں کیوں کر مرحمت کی گئیں؟ اس لئے علماء نے یہ کلیہ لکھا ہے کہ جزوی فضیلت یا کرامت کی وجہ سے کوئی چھوٹا بڑے سے افضل نہیں ہوجاتا:
''قدیؤتی المفضول مالایؤتی الأفضل''۔

والدِ شیخ الحدیث کا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے افضلیت کا مغالطہ

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے حکایاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دین کی خاطر سختیاں برداشت کرنے اور اللہ جل جلالہ سے ڈرنے، ان کا زہد وفقر، نماز کا شغف اور ذوق، باہمی ایثار وہمدردی، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے، موت کا شوق ان کے عورتوں اور بچوں کا دینی جذبہ اور ان حضرات کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ و بے مثال محبت کا ذکر کیا ہے، وہیں پر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا علمی مشغلہ ذکر کرتے ہوئے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ

---

(۱) ترمذی: باب مناقب عبد الرحمن بن عوف ، حدیث:۳۷۴۹،امام ترمذی نے اس روایت کو حسن، صحیح،غریب کہا ہے۔

(۲) مستدرك حاكم : ذكر مناقب جعفر بن أبی طالب ، حدیث:۴۹۳۵،حاکم نے اس روایت کو صحیح السند کہا ہے۔

(۳) بخاری : باب فضل الطهور باللیل ،حدیث:۱۰۹۸

نے لکھا سید السادات حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بھی ایک سال چھوٹے تھے؛ اس لئے ان کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت اور بھی کم تھی، یعنی چھ برس چھ مہینے کی تھی، چھ برس کا بچہ کیا دین کی باتوں کو محفوظ کرسکتا ہے، لیکن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں نقل کی جاتی ہیں اور محدثین نے اس جماعت میں ان کا شمار کیا ہے جن سے آٹھ حدیثیں منقول ہیں۔

اس کے بعد شیخ الحدیثؒ نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے دیگر فضائل کو نقل کرنے کے بعد قارئین کو ترغیب دی ہے کہ بچوں کو واہی تباہی جھوٹے جھوٹے بھوت پریت کے لغو قصے سنانے کے بجائے اللہ سے ڈرایا جائے اور قرآن پاک حفظ کرایا جائے اور لکھا ہے کہ بچپن کا یاد کیا ہوا کبھی بھی آدمی نہیں بھولتا، اسی کے ذیل میں آپ فرماتے ہیں :

> ''میں نے اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہ سے بھی بار بار سنا اور اپنے گھر کی بوڑھیوں سے بھی سنا کہ میرے والد صاحب کا جب دودھ چھڑایا گیا تو پاؤ پارہ حفظ ہو چکا تھا اور ساتویں برس کی عمر میں پورا قرآن شریف حفظ کرلیا تھا''۔(۱)

اس عبارت کا پڑھنے والا سلامتِ طبع اور سلامت فہم رکھتا ہو تو وہ بھی یہ نہیں سمجھتا کہ مصنفؒ نے اپنے والد کا مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھا دیا جبکہ حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کی شانِ صحابیت، نواسۂ رسول، فاطمہؓ کے لختِ جگر، حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کے نورِ نظر، مزید برآں جنت کے نوجوانوں کا سردار ہونا، ایک ایک فضیلت ان میں سے ایسی ہے جس کے سامنے حضرت شیخ الحدیث کے والد محترم کے دودھ چھڑاتے وقت پاؤ پارہ حفظ کرلینے کی بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جب کوئی عام مسلمان اس قسم کا تقابل نہیں کرسکتا تو بھلا شیخ الحدیث صاحبؒ کیسا کرسکتے ہیں؟ بلکہ یہاں بھی حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کی ہی فضیلت سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے اس کم عمری میں آٹھ حدیثوں کو سن کر محفوظ کرلیا اور والد شیخ الحدیثؒ کو تو بار بار سنا پڑھا کر حفظ کرایا گیا ہوگا۔

الغرض یہ کہ معجزہ یا کرامت یہ نبی یا ولی کے اختیار کی چیز نہیں ہے اور نہ اس میں افضل یا مفضول کی کوئی تفریق ہے جس کے ساتھ چاہیں اللہ عزوجل اس کا اظہار فرمادیں۔

اگر ولی سے کوئی خلافِ عادت کرامت کا اظہار ایسے ہوتا ہے جو کسی نبی یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے

---

(۱) فضائلِ اعمال: ۱۶، حکایاتِ صحابہ

نہیں ہوا تو یہ ان کی جزوی فضیلت ہے اور ان کے کلی فضائل کے سامنے اس کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہوتی۔

کیا کرامات کے ذکر سے شرک پھیل رہا ہے؟

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خلافِ عادت باتیں جو انبیاء علیہم السلام سے بطورِ معجزہ کے اور اولیاء سے بطورِ کرامت کے ظاہر ہوتے ہیں، اس میں اختیار اللہ عزوجل کا ہوتا ہے اور ظہور مخلوق اور بندہ کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حیرت انگیز معجزات مذکور ہیں کہ وہ کوڑھی کے بیمار کو درست کر دیتے۔ مادرزاد اندھے کو بینا کر دیتے ہیں۔ مردے کو زندہ کر دیتے ہیں، لیکن اس حوالے سے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہ معجزات عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے؛ مگر یہ دراصل قدرت خداوندی کا ظہور تھا جب مسلمان اسے قدرتِ الٰہی کی کرشمہ سازی مانتے ہیں تو ان کو ہر ہر معجزہ دلیلِ توحید نظر آتا ہے؛ لیکن عیسائی ان معجزات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عادت اور ان کے اختیار سے مانتے ہیں تو انہوں نے ایک ایک معجزہ کو دلیل شرک بنالیا، اب معجزات سے شرک کشید کر لینا اس میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا قصور تھا نہ عیسیٰ علیہ السلام کا، قصور تو عیسائی ذہنیت کا تھا جس نے توحید کو شرک بنا ڈالا، بالکل اسی طرح اہل سنت والجماعت مسلمان جب کرامات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو خدا تعالیٰ کے علم وقدرت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کرامات میں توحید ہی توحید نظر آتی ہے، لیکن جو لوگ ان کرامات کا مطالعہ عیسائی ذہن سے کرتے ہیں تو وہ کرامات ان کو شرک نظر آتے ہیں تو قصور نہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اس نے ان بزرگوں کی عزت افزائی کیلئے اپنی قدرت نمائی کیوں کی اور نہ ان بزرگوں کا۔ قصور تو سارا اس عیسائی ذہنیت کا ہے۔ عیسائی ذہنیت کو چھوڑ کر اسلامی ذہنیت کے ساتھ ان واقعات کا مطالعہ کریں تو اس میں یقیناً توحید ہی توحید نظر آئے گی، اگر کوئی ان کرامات وواقعات کو یہ کہہ کر انکار کرتا ہے کہ ایسی باتیں ہیں جو بالکل ناممکن اور محال ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ باتیں کس سے نہیں ہوسکتیں؟ خالق سے یا مخلوق سے؟ اگر مخلوق سے نہیں ہوسکتیں تو بالکل درست، چونکہ ان کرامات کو مخلوق کا فعل قرار دینا ہی عیسائی ذہنیت ہے اور اگر کہو کہ خالق سے بھی نہیں ہوسکتا تو یہ اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کا انکار ہے، اگر کوئی شخص خالق کی قوت بھی اتنی ہی مانے جتنی اس کی کہ جو اس سے نہیں ہوسکتا وہ خدا سے بھی نہیں ہوسکتا تو ایسے شخص کو اپنی توحید کی خیر منانی چاہئے کہ یہ اللہ والوں کی کرامات کا نہیں، قدرتِ خداوندی کا انکار ہے۔

قصے اور حکایات کی اثر انگیزی

یہ سبھی جانتے ہیں کہ وعظ ونصیحت کے دوران حکایات اور امثال کے ذکر سے انسانی طبیعت اثر لیتی ہے، وہیں امثال وقصص سے خالی موعظت ونصیحت مخاطب پر اس قدر اثر انداز نہیں ہو پاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ عزوجل نے بھی قرآن کریم میں پچھلی امتوں اور گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات دُہرا دُہرا کر ذکر کئے ہیں اور ان کے ذکر کا مقصد بھی واضح فرمایا ہے؛ چنانچہ سورہ یوسف میں ہے: "لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ"(۱)"یہ قصے اہلِ خرد حضرات کیلئے باعثِ عبرت ہوتے ہیں"۔ اور اللہ عزوجل نے آنحضرت ﷺ کو بھی یہ تلقین کی ہے کہ ان سے واقعات بیان کرتے رہیں؛ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: " فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ" (۲) "آپ ان سے واقعات بیان کرتے رہیں؛ تاکہ لوگ غور وفکر کرسکیں"۔

چنانچہ احادیث کے ذخیرے میں بے شمار ایسے واقعات اور حکایات ملتے ہیں جو حضورِ اکرم ﷺ نے لوگوں کیلئے بطور نصیحت وعبرت کے ذکر فرمائے ہیں؛ چنانچہ قدیم مصنّفین نے احادیث کے ذخیرے سے حکایات وقصص پر مشتمل احادیث کو علیحدہ کر کے "کتاب الامثال" اور "کتاب القصص" نامی کتابیں بھی لکھی ہیں۔

قصص وحکایات کی اسی اثر انگیزی اور طبیعت انسانی کے واقعات کی جانب اسی میلان ورجحان کو دیکھ کر حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو بنی اسرائیل کے ان واقعات کو ذکر کرنے کی اجازت دی ہے کہ جس سے دین میں بگاڑ نہ پیدا ہوتا ہو۔(۳) حالانکہ بنی اسرائیل کے تمام واقعات حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے، ایسے ہی شیخین اور دیگر لوگوں کی روایت کردہ "اُمِّ زرع" کی گفتگو؛ حالانکہ یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟ ان کے ناموں کا بھی ذکر نہیں ملتا؛ ایسے ہی اس واقعہ کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا کہ یہ آیا حضور ﷺ نے بیان کیا ہے یا حضرت عائشہؓ نے یا دیگر آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین نے؟ اور یہ اس قدر عجیب وغریب قصہ ہے کہ آدمی کی ہنسی بے ساختہ نکل جاتی ہے؛ چونکہ اس واقعہ میں ان عورتوں نے اپنے شوہروں

(۱) یوسف: ۷ (۲) اعراف: ۱۷۶

(۳) بخاری: الانبیاء، باب ماجاء ذکر عن بنی اسرائیل: ۳۴۶۱

کے عیوب اور نقائص کا مختلف پیرائے میں تذکرہ کیا ہے؛ لیکن چونکہ مقصود اس قصے کے ذکر سے پند وموعظت اور نصیحت ہے، اس قصے کے پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ امام بخاریؒ نے عجیب مغلظات پر مبنی قصے کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے؛ جس طرح امام بخاریؒ پر اس قسم کے واقعہ کے تذکرہ پر اعتراض بجا نہیں، ایسے ہی شیخ الحدیثؒ کا بطورِ عبرت ونصیحت کے مختلف واقعات کا ذکر بیجا نہیں۔

کراماتِ اولیاء

○ إمكان طيُّ الأرض (زمین کا سکڑ جانا)

عن مالكٍ في دعائه ﷺ "اللهم ازولنا الأرض" (۱)

اِمام مالکؒ سے دُعاءِ نبوی میں منقول ہے: ''اے اللہ ہمارے لئے زمین کو لپیٹ دے۔

حضور ﷺ کا یہ بھی اِرشاد ہے کہ: "إن الأرض تطوى بالليل" زمین رات میں لپیٹ دی جاتی ہے۔(۲)

بہت سے حکایات وواقعات میں اولیاء اللہ کی یہ کرامت منقول ہے کہ وہ تھوڑی مدت میں لمبی مسافت طئے کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو بعید سمجھ کر انکار کر دیتے ہیں، مگر صوفیہ اور علماء محققین اس کو ممکن اور واقع کہتے ہیں، اس حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ طي الأرض کے مختلف مراتب اور درجات ہیں اور اس میں کی کوئی خاص شکل ذکر نہیں کی گئی، اس سے معلوم ہوا طي الأرض یعنی مسافتِ بعیدہ کا مدتِ قصیرہ میں طئے ہونا ممکن ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضور ﷺ فلاں مقام پر جانے کیلئے اتنے دن کیوں لگے؟ چونکہ ہم نے آیات واحادیث کی روشنی میں یہ بتلا دیا ہے کہ معجزہ یا کرامت نبی یا ولی کیلئے اختیاری اور دائمی چیز نہیں ہوتی کہ جب چاہے اس سے اس طرح کے خارق عادت اُمور کا اظہار ہو جائے۔ لہٰذا فضائلِ اعمال میں اولیاء کیلئے زمین کا لپٹ جانا، لمبی مدت کو تھوڑے وقت میں طئے کر لینا اس طرح کے واقعات مستبعد اور محال نہیں۔

---

(۱) مؤطا مالك : ما يؤمر به من الكلام فى الدلجة ، حديث:۳۵۸۳،تحقيق مصطفي الاعظمی ۔

(۲) ابوداؤد : باب فى الدلجة ،حديث:۲۵۷۱،علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ:اس کو بزار نے روایت کیا ہے اس کے رجال ثقہ ہے۔(مجمع الزوائد : باب آداب السفر ، حديث:۹۳۱۵)

حضرت مولانا زکریا صاحب لکھتے ہیں :

''ایک شخص جس کا نام مالک بن قاسم حنبلی تھا، ستائیس سو میل سے مکہ میں صبح کی نماز پڑھنے آگئے۔ خود ہفتہ سے کچھ نہ کھایا تھا، والدہ کو کھلا کر آئے تھے ابھی ہاتھوں سے گوشت کی خوشبو آرہی تھی''۔ ''ایک بزرگ کو خضر نے بتلایا کہ میں صبح کی نماز مکہ میں پڑھتا ہوں، عصر کی نماز بیت المقدس میں اور عشاء کی سدِ سکندری پر۔''(۱)

مذکورہ اُصول کی روشنی میں اس طرح کے واقعات کو بعید گمان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' حضور ﷺ کیلئے یہ معجزہ کیا کم تھا کہ آپ نے معراج میں تھوڑی دیر میں آسمان وزمین کی سیر کرآئے۔

○ زمانے کا پھیلنا اور سکڑنا

جس طرح بطور خرقِ عادت کے اور خلاف معمول اولیاءؒ کے لئے زمین لپیٹ دی جاتی ہے، اسی طرح ان کیلئے بطور خرقِ عادت اور معمول کے خلاف زمانہ پھیل بھی جاتا ہے اور سکیڑ ابھی جاتا ہے۔

واقعۂ معراج جو کہ آنحضرت ﷺ کیلئے جسمانی طور پر پیش آیا تھا اور اس پر اجماعِ امت ہے اور تقریباً تیس صحابہ رضی اللہ عنہم واقعۂ معراج کے جسمانی ہونے پر احادیث روایت کرتے ہیں، اس میں آنحضرت ﷺ نے بطور معجزہ کے کئی ہزار سال کی مسافت کو تھوڑی ہی دیر میں طئے کیا تھا، اس واقعہ کے ذیل میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے، زمین کے لپٹ دیئے جانے اور زمانے کے پھیل جانے اور سکڑ جانے کے متعلق بحث کی ہے اور انہوں نے روح المعانی کے حوالہ سے یہ گفتگو کی ہے فرماتے ہیں:

''مسافت کا اتنے تھوڑے زمانے میں طئے کرنا اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ مکان اور زمان دونوں اپنی حالت پر رہیں اور سیر میں اس قدر سرعت ہو۔

۲۔ زمانہ اپنے حال پر باقی رہے اور زمین لپیٹ دی جائے اور یہ صورت اولیاء کیلئے ممکن ہے۔

۳۔ یہ کہ مکان اپنے حال پر باقی رہے اور زمانہ میں بسط ونشر ہو (پھیلاؤ) ہو، صوفیہ اور فقہاء نے اولیاء کیلئے اس کو بھی جائز کہا ہے (کام بھی ہوجائے وقت کا بھی پتہ نہ چلے)''۔(۲)

---

(۱) فضائلِ حج : ۷ (۲) بیان القرآن: ج:۶/۴۷

خلاصہ یہ ہے کہ اولیاء کیلئے خلاف معمول کبھی زمین ان کیلئے لپیٹ دی جاتی ہے، جس سے وہ اپنی منزل تک بجلد پہنچ جاتے ہیں، یا کبھی زمانہ کو پھیلا دیا جاتا ہے کہ کام ہوجاتا ہے اور وقت کے گذرنے کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح کی چیزیں محالات میں سے نہیں ہیں بلکہ احادیث سے ان کا ثبوت ملتا ہے۔

احادیث سے ثبوت

۱- عن النواس بن سمعان في ذكر الدجال' قلنا: يارسول الله ﷺ ومالبثه في الأرض؟ قال: اربعون يومًا، يومٌ كسنةٍ، ويوم كشهرٍ ويوم كجمعةٍ وسائر أيامه كأيا مكم (۱)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے ذکرِ دجال میں روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! اس کے رہنے کی زمین میں کتنی مدت ہے؟ فرمایا: چالیس دن' ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا اور ایک دن مہینہ کے برابر اور ایک دن ہفتہ کے برابر اور باقی ایام معمولی دنوں کے برابر ہوں گے۔

۲- عن أسماء بنت يزيد بن السكن رضى الله عنها قالت: قال النبى ﷺ يمكث الدجال في الأرض أربعين سنةً السنة كالشهر والشهر كاالجمعة، والجمعة كاليوم، واليوم كاضطرام السعفة في النار۔ (۲)

حضرت اسماء بنتِ یزید السکنؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دجال زمین میں چالیس برس رہے گا، برس تو مہینے کے برابر ہوگا اور مہینہ ہفتے کے برابر ہوگا اور ہفتہ دن کے برابر ہوگا اور دن ایسا ہوگا جیسے آگ سے لکڑیاں جل اُٹھتی ہیں۔

بظاہر ان دونوں احادیث کے مفہوم میں تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ کسی کو وہ زمانہ لمبا معلوم ہوگا اور کسی کو کم، واقع میں زمانے کی مقدار وہی ہوگی۔ اس حدیث سے یہ معلوم

---

(۱) رواه مسلم : الفتن ، ذكر الدجال وصفته ،حدیث:۲۹۳۷

(۲) مسند احمدے من حديث أسمار بنت يزيد ،حدیث:۲۷۶۱۱،علامہ بوصیری فرماتے ہیں کہ:اس کو عبدبن حمید اور احمد بن حنبل نے سندحسن کے ساتھ ذکر کیا ہے۔(اتحاف الخيرة المهرة ، باب فى التلاعن :۱۳۷/۸)

ہوا کہ زمانے کا پھیلنا اور سکڑنا ممکن ہے۔ زمانہ کا لپٹ دئے جانے پر یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے۔

۳- عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال : سئل رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم عن یومٍ کان مقدارہ الف سنة، ماطول هذا الیوم فقال: والذي نفسی بیده إنّه لیُخفّف علی المومنین حتی یکون اهون علیه من الصلوة المکتوبة یصلّیها في الدنیا۔(۱)

حضرتِ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن کی نسبت جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی (مراد قیامت کا دن ہے براہ تعجب) پوچھا گیا کہ اس دن کا کس قدر طول ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ وہ دن اہل ایمان پر ایسا ہوگا کہ فرض نماز جو دنیا میں پڑھتا ہے اس سے بھی ہلکا ہوگا۔

اس حدیث سے صاف اور واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ ان مومنین اور مخلصین کیلئے وہ لمبی مدت بالکل تھوڑی معلوم ہوگی۔ ہمارے اس مدعا پر یہ دلیل بھی واضح طور پر دلالت کرتی ہے :

۴- خُفّف علی داؤد القراٰن فکان یامر بدوابه فتسرج فیقرأ القرآن قبل أن تسرج دوابّه (۲) داؤد علیہ السلام کیلئے (زبور) کا پڑھنا آسان کردیا گیا تھا، وہ اپنے گھوڑوں کو زین لگانے کا حکم دیتے تھے اور زین لگائے جانے سے پہلے پڑھ لیتے تھے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ عزوجل اپنے جس بندے کیلئے چاہے زمانہ کو طویل کرسکتے ہیں اور جس کیلئے چاہے زمین کو لپٹ دے سکتے ہیں۔

۵- حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کفار ومشرکین نے معراج کے بعد آپ سے بیت المقدس کی کیفیت اور احوال دریافت کئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بیت المقدس تھوڑی دیر کیلئے سامنے لایا گیا تھا جیسا کہ اس پر روایت کے الفاظ "رفعه اللّٰه لی انظر الیه" کے

---

(۱) شعب الایمان ، فصل فی معنی قول اللّٰه عزوجل : تعرج الملئکةوالروح الیه ، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو احمد، ابویعلي نے روایت کیا ہے اور اس کی سند اس کے راوی کے ضعف کے باوجود حسن درجے کی ہے۔(مجمع الزوائد: حدیث:۱۸۳۴۸،باب خفة یوم القیامة علي المومنین)

(۲) صحیح البخاری، باب قول اللّٰه تعالٰی : اٰتینا داود زبورًا، حدیث: ۳۲۳۵مع تحقیق دکتور مصطفی دیب البغا۔

الفاظ دلالت کرتے ہیں اور یہ چیز کوئی محال بھی نہیں ہے جب حضرتِ سلیمان علیہ السلام کیلئے بلقیس کا عرش تھوڑی دیر میں لاکر حاضر کیا جا سکتا ہے تو کیا نبی کریم ﷺ کیلئے پلک جھپکنے کی مدت میں بیت المقدس کو حاضر کیا جائے اور پھر لوٹایا جائے کیا یہ ممکن نہیں ہے۔اس مفہوم کی تمام روایات کوامام بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے،اس کیلئے ملاحظہ ہو۔(۱)

○ بغیر کھائے پئے زندہ رہنا یاعادۃً کھانے پینے والی چیزوں کے بغیر زندہ رہنا

الف- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ان کے مسلمان ہونے کے قصہ میں ان کا یہ قول مروی ہے کہ (مکہ میں) تیس رات اور دن اس حالت میں رہا کہ بجز آبِ زمزم کے میری کوئی غذا نہ تھی (ولقد لبثت ثلثين مابين يومٍ وليلةٍ وما كان لی طعام الاماء زمزم) اور میں اس سے ایسا فربہ ہوا کہ شکم کی جلد میں بل اور شکن پڑ گئے اور کلیجہ پر ذرا بھوک کا اضمحلال نہ پایا۔(وما وجدتُّ على كبدي سخفة جوعٍ)۔(۲)

بعض اہل ریاضت ومجاہدہ سے منقول ہے کہ انہوں نے چالیس چالیس روز تک مطلق نہیں کھایا،یا اس قدر کم کھایا کہ عادۃ زندگی کی بقا کیلئے وہ کافی نہیں،اس پر بعض کوتاہ بین اور تنگ نظر فوراً انکار کر بیٹھتے ہیں،حضرتِ ابوذر رضی اللہ عنہ کے قصے سے یہ استبعاد(مشکل) بالکل رفع ہوجاتا ہے،اگر کہا جاوے کہ وہ زم زم کا پانی پیتے تھے،جواب یہ ہے کہ خود یہ چیز خلاف عادت ہے اور پانی کی تو یہ خاصیت نہیں،محض اس کی برکت ہے پھر اگر کسی کو ذکر میں یہی برکت حاصل ہوجاوے تو تعجب اور استبعاد کیا ہے؟

ب- حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے دجال کے قصہ میں (جس میں حضور ﷺ نے اس فتنہ کا اور اس کے زمانہ میں قحط پڑنے کا ذکر فرمایا تھا) مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ!اور کبھی ہم آٹا گوندھ کر رکھتے ہیں اور اس کو پکانے نہیں پاتے کہ بھوک لگ جاتی ہے (جس سے بیتاب ہوجاتے ہیں) سو اس روز مسلمانوں کا کیا حال ہوگا (جبکہ اس کے مخالفین پر شدید قحط ہوگا) آپ ﷺ نے فرمایا:''مسلمانوں کو(غذا کی جگہ) وہ چیز کافی

---

(۱) صحیح بخاری،باب حدیث الاسراء : قول اللّٰہ تعالیٰ : سبحان الذی اسری بعبدہ، حدیث:،مع تحقیق محمد زہیر بن ناصر،حدیث:۳۶۷۳ مع تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغا

(۲) مسلم : فضائل الصحابۃ، فضائل ابی ذرؓ، حدیث:۲۴۷۳

ہو جاوے گی جو اہل آسمان کو کافی ہوتی ہے، یعنی تسبیح و تقدیس'' قال : يُجزيهم ما يجزی اهل السماء من التسبيح والتقديس (۱)

اس روایت کی روشنی میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ انہوں نے خلوت میں مدتوں کھانا نہیں کھایا، بعض اہلِ جمود علی الظاہر (خشک لوگ) بے سمجھے ایسی چیزوں کا انکار کر دیتے ہیں، حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ بعض اوقات صرف ذکر و تسبیح بھی غذا کا کام دیتی ہے۔ اس لئے فضائلِ اعمال مولفہ حضرت شیخ الحدیث میں اس قسم کے جو واقعات مذکور ہیں وہ بعید از قیاس نہیں، اس قسم کے واقعات کا پیش آنا خود احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ فضائلِ اعمال میں مذکور ہے :

''ایک سید صاحب کا قصہ لکھا ہے کہ بارہ دن تک ایک ہی وضو سے ساری نمازیں پڑھیں اور پندرہ برس تک مسلسل لیٹنے کی نوبت نہیں آئی، کئی کئی دن ایسے گذر جاتے کہ کوئی چیز چکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔'' (۲)

ایک دوسری جگہ یہ واقعہ لکھا ہے :

''محمد بن سماکؒ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں میرا ایک پڑوسی تھا، اس کا ایک لڑکا تھا جو دن کو ہمیشہ روزہ رکھتا اور رات بھر نماز اور شوقیہ اشعار میں رہتا تھا، وہ سوکھ کر ایسا ہو گیا کہ صرف ہڈی اور چمڑا رہ گیا، اس واقعہ کی تفصیل ملاحظہ ہو۔'' (۳)

تکبیر و تہلیل اور اخلاصِ نیت کا اثر

حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگوں نے کوئی ایسا شہر سنا ہے جس کی ایک جانب خشکی میں ہے اور ایک جانب سمندر میں؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں سنا ہے، آپ نے فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ اس شہر پر ستر ہزار بنی اسحاق جہاد نہ کریں گے اور یہ لوگ جب وہاں آ کر اتریں گے تو نہ ہتھیار سے لڑیں گے اور نہ تیر پھینکیں گے، صرف زبان سے کہیں گے ''لا الـه الا اللّٰـه واللّٰـه اكبر'' پس (اس کے اثر سے)

---

(۱) مسند أحمد: من حديث: اسماء بنت يزيد ، حدیث:۲۷۵۷۹، محقق شعیب الارنوط اور مرشد عادل نے اسکو صحیح لغیرہ کہا ہے، اور اس کو عبد الرزاق ن مصنف اور طبرانی اور بغوی نے شرح السنۃ میں ذکر کیا ہے مع تحقیق شعیب الارنوط

(۲) فضائل نماز : ۶۸ (۳) فضائل نماز : ۲۴

اس شہر کی وہ جانب گر پڑے گی، جو سمندر میں ہے، پھر دوبارہ کہیں گے ''لا الہ الا اللہ واللہ اکبر'' سو اس کی دوسری جانب بھی گر پڑے گی۔(۱)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بزرگوں سے کرامات اور خلافِ عادت اُمور کا ظاہر ہونا حق بجانب اور درست ہے، حدیث میں مذکورہ واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے ریاضت ومجاہدے اور اوراد واذکار پر دوام واستقرار کے نتیجے میں ان کے زبان کے اندر اس قدر اثر انگیزی پیدا ہوجائیگی کہ وہ جہاں اللہ کی توحید وربوبیت پر مشتمل کلمات کو اپنی زبان سے ادا کریں گے اور محض اسی کے اثر سے ان کی بستیاں تباہ وبرباد ہوجائیں گی؛ لہٰذا فضائل اعمال میں مذکورہ یہ واقعہ بھی محل نظر نہ ہو۔

''ایک شخص پانی پت کا رہنے والا تھا' جس پر خون کا مقدمہ کرنال میں تھا اور جمنا میں طغیانی کا بہت زور تھا، وہ ایک ملاح کی خوشامد کرتا رہا، مگر ہر شخص کا ایک ہی جواب تھا کہ اُس میں تیرے ساتھ اپنے کو بھی ڈبوئیں گے، یہ بے چارہ غریب پریشان روتا پھرتا رہا، ایک شخص نے اس کی بدحالی دیکھ کر کہا کہ اگر میرا نام نہ لے تو ترکیب میں بتلاؤں، جمنا کے قریب فلاں جگہ پر ایک جھونپڑی پڑی ہوئی ہے، اس میں ایک صاحب مجذوب قسم کے رہتے ہیں ان کے جا کر سر ہوجا، خوشامد، منت، سماجت جو کچھ تجھ سے ہوسکے کسر نہ چھوڑنا اور جتنا بھی برا بھلا کہیں حتی کہ تجھے ماریں بھی تو تو منہ نہ موڑنا، چنانچہ یہ شخص ان کے پاس گیا اور ان سے خوشامد، درآمد کی اور انہوں نے اپنی عادت کے موافق خوب ملامت کی کہ میں کیا کرسکتا ہوں، میں کوئی خدا ہوں مگر جب یہ روتا ہی رہا تو ان بزرگ نے کہا جمنا سے جا کر کہہ دے کہ اس شخص نے بھیجا ہے جس نے عمر بھر کچھ کھایا ہے نہ بیوی کے پاس گیا ہے (یعنی حرام طریقے سے یہ امور انجام نہیں دیئے ہیں) چنانچہ یہ گیا اور جمنا نے راستہ دیا۔(۲)

اس واقعہ سے واضح مثال وہ حدیث الغار ہے جسے امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ تین اشخاص سفر پر تھے، ایک غار میں ان کا ٹھہرنا ہوا، چٹان نے غار کے منہ کو ڈھک دیا،

---

(۱) ترمذی: الفتن، باب ما جاء فی علامة حلول المسخ والخسف رقم: ۲۲۲۱امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

(۲) فضائل صدقات: ص/۵۲۸

پھرانہوں نے اپنے نہایت مخلصانہ اعمالِ صالحہ کے توسل سے اللہ سے دعا کی چنانچہ ان کی للّٰھی قوت سے وہ چٹان آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور وہ باہر نکل گئے۔

○ ہاتفِ غیبی (غیب سے آواز دینے والا)

ہاتفِ غیبی (غیب سے آواز دینے والے) کا کسی بزرگ سے کلام کرنا یہ بھی ایک محمود اور مطلوب حالت ہے، حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے :

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب (وفاتِ نبوی ﷺ کے بعد) حضور ﷺ کے غسل دینے کا ارادہ کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم باہم کہنے لگے واللہ ہم کو کچھ خبر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کپڑے بھی دوسرے مردوں کی طرح اتاریں یا کپڑوں کے ساتھ غسل دیں جب ان میں آپس میں اختلاف ہونے لگا تو اللہ عزوجل نے ان پر نیند طاری کردی۔ یہاں تک کہ ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی گردن اس کے سینے سے نہ لگ گئی ہو (یعنی نیند سے سب کی گردنیں جھک گئیں) پھر گھر کے ایک گوشہ سے کسی کلام کرنے والے نے (کہ وہ ہاتفِ غیبی تھا) ان سے کلام کیا یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھا؟ کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں کے ساتھ غسل دو، چنانچہ سب نے اُٹھ کر قمیص کے ساتھ آپ ﷺ کو غسل دیا، قمیص کے اوپر پانی ڈالتے تھے اور قمیص سمیت ملتے تھے، ہاتھ بدن پر نہیں پہنچایا :

(فكلمهم مُكلّم من ناحية البيت لايدرون من هو أن: اغسلو رسول الله ﷺ وعليه ثيابه)۔ (۱)

اِس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیبی اشارات پر اگر وہ شریعت کے مخالف نہ ہوں تو اس پر عمل درآمد کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کی ایک دوسری روایت سے غیبی آواز کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔

حضرتِ عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بعض اوقات مثل آوازِ جرس (گھنٹی کی آواز کے مانند) آتی ہے'': ''احياناً يأتيني مثل صلصلة الجرس''۔(۲)

---

(۱) ابوداؤد الجنائز، ستر الميت عند غسله، حديث: ۳۱۴۱، محمد بن احمد عبدالہادی نے اس کو امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے رواۃ ثقہ ہیں (المحرر فی الحديث: باب غسل الميت)

(۲) بخاری: باب كيف كان بدء الوحي إلى النبي ﷺ، حديث: ۲

لہٰذا بکثرت بزرگوں کے مکاشفات میں جو غیبی آواز کا ذکر ملتا ہے، اس حدیث سے اس کی صحت اور دُرستگی کا ثبوت ملتا ہے، ہاں البتہ مراقبہ اور اشغال کی ہرصورت کو غیبی آواز سمجھنا یہ غلطی ہے۔

○ مرحومین کو حالتِ بیداری میں دیکھنا

مرحومین کو حالت بیداری میں دیکھنا بطور کرامت کے ممکن اور جائز ہے، بے شمار روایات اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات وغیرہ اس پر شاہدِ عدل ہیں: نہ صرف انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ عام مومنین مرحومین کو بھی بیداری اور جاگنے کی حالت میں دیکھنا ممکن ہے۔

چنانچہ مناوی نے شرح شمائل میں مارزی، یافعی، حنبلی، شاذلی، مرسی، علی وفا، قطب قسطلانی وغیرہ کے حضورِ اکرم رضی اللہ عنہم کو بحالتِ بیداری دیکھنے کے واقعات کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا کہ اس طرح کا دیکھنا نہ شرعاً منع ہے اور نہ عقلاً منع ہے، چونکہ یہ ممکن ہے اللہ عزّ وجل ولی کیلئے مسافتِ بعیدہ کے باوجود ان حجابات اور پردوں کو ہٹادے جس سے ان مرحومین کو بحالتِ بیداری دیکھنا ممکن ہوسکے اور بات بھی خارقِ عادت اور خلافِ معمول اُمور کی ہورہی ہے۔(۱)

اس مسئلہ پر وہ روایات صراحتاً دلالت کرتی ہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شب معراج میں گذشتہ انبیاء علیہم السلام کو متعدد مقامات پر دیکھنے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ حدِتواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انبیاء علیہم السلام سے ملاقات بیت المقدس میں بھی ہوئی اور اس کے بعد فوراً آسمانوں پر بھی ہوئی ان واقعات کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔(۲)

مرحومین کو حالتِ بیداری میں دیکھنا اس طور پر ممکن ہوسکتا ہے کہ روح جسم کی مثال اور صورت اپنالے، اس کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو اس طور پر کہ پورا جسم جسم عنصری اور مادی کا مثال ہو، یا یہ کہ روح بعینہٖ جسم عنصری کے مانند دیگر عناصر سے تھوڑی سے دیر کیلئے مرکب ہوجائے اور وہ نظر آئے اور تحلیل (ختم) ہوجائے۔

یا اس طرح پر کہ اجسامِ اصلیہ تو اپنی جگہ قبر میں موجود ہوں، البتہ ارواح بغیر عناصر جسم

---

(۱) شرح المناوی للشمائل علی هامش جمع الوسائل : ۲۳۱/۲-۲۳۲

(۲) صحیح البخاری، مناقب الأنصار ، باب المعراج، ومسلم الایمان باب الاسراء برسول اللّٰه وفرض الصلوة .

مثالی میں ظاہر ہو جائیں اور یہی جسم مثالی ہوتا ہے اور جسم مثالی میں تعدد ممکن ہے اوران سب اجسام مثالی کے ساتھ بیک وقت روح کا تعلق اللہ کی قدرت اور مشیت سے قائم ہوسکتا ہے۔ اور معراج کے موقع سے انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کے متعدد واقعات جو مذکور ہیں بیت المقدس اور سماء دنیا دونوں میں وہ اجسام مثالی ہی کے ساتھ تھے خود علامہ ابن تیمیہ ''جسدِ مثالی'' وغیرہ قائل ہیں چنانچہ وہ واقعۂ معراج کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :

أما روية موسى وغيره من الأنبياء ليلة المعراج في السماء كما راى آدم في السماء الدنيا۔ فهذا رأى ارواحهم مصورة في صورةٍ ابدانهم، وقدقال بعض الناس لعله (أي نفس الأحبساد المدفونة في القبور وهذاليس بشئى (۱)

رہا موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو شبِ معراج میں آسمان پر دیکھنا، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا سماء دنیا میں دیکھنا، یہ ان کی جسم کی شکل میں روحیں تھیں، بعض لوگوں نے یہ کہا کہ ممکن ہے کہ وہ قبر میں مدفون اجسام ہوں۔ اس بات کی کوئی اصل نہیں ہے''۔

اس طرح کی مثالی چیزوں کے وجود اور اپنے موقع محل سے ہٹ کر ان کا دوسری جگہ نظر آنا اس پر نسائی کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں جنت اور دوزخ کا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صورتِ مثالیہ میں ظاہر ہونے کا ذکر ملتا ہے جس وقت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورج گرہن کی نماز پڑھ رہے تھے۔(۲)

اس طرح ابنِ سعدؒ کی ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ وہ حدیث جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کفارِ مکہ نے بیت المقدس کی عمارت اور وہاں کی چیزوں کے متعلق دریافت کیا تھا تو بیت المقدس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کے سامنے کر دیا گیا تھا:"فخيّل الي ّبيت المقدس "(۳)

چونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیت المقدس کی مثال اور شکل ظاہر کی گئی تھی اگر بعینہٖ بیت المقدس کی بنا اور عمارت کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ظاہر کیا جاتا تو اس مدت کے دوران بیت المقدس اپنی جگہ موجود نہ ہوتا اور یہ بات تاریخ میں موجود ہوتی۔

(۱) مجموع الفتاویٰ شیخ الاسلام:۳۲۸/۴،مجمع الملك فهدلطباعة المصحف الشريف
(۲) سنن نسائی، کتاب الصلاۃ، باب كيفية صلوة الكسوف، حديث:۱۴۷۲
(۳) الطبقات الکبریٰ : ۲۱۵/۱،باب ليلة اسرى برسول الله ا إلى بيت المقدس

○ مرحومین کو حالتِ بیداری میں دیکھنے سے متعلق صحیح واقعات

مرحومین کو حالت بیداری میں دیکھا جاسکتا ہے اس پر وہ روایت جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے صاف طور پر دلالت کرتی ہے:

''حضرت زید بن حارثہ یہ جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ان کا وصال ہوا حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب ان کا جنازہ تیار کر کے رکھ دیا گیا اور نماز کیلئے حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا انتظار ہونے لگا تو میں نے ارادہ کیا کہ انتظار کے اس وقفہ میں دو رکعت نماز ہی پڑھ لوں، چنانچہ میں ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا، دوسرے لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے اتنے میں جنازے سے آواز آئی السلام علیکم انصتوا انصتوا (یعنی خاموش ہو کر بات سنو) اس کے بعد مرحوم حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ نے ایک طویل کلام فرمایا جس میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں شہادت دی اور ان کے کچھ اوصاف بیان فرمائے اور اخیر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک پیشین گوئی فرمائی جو بعد میں بالکل حق ثابت ہوئی۔(۱)

اس طرح کے بے شمار واقعات اسلافِ امت اور بزرگانِ دین کے احوال میں ملتے ہیں، یہاں پر احکام القرآن میں بھی اس قسم کے بے شمار واقعات بہ سند ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ایک عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا واقعہ یہاں پر ذکر کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں:

و اخرج البخاري في تاريخه و ابن منده عن عبد اللّٰه بن عبيد اللّٰه الانصارى، قال كنتُ في من دفن ثابت بن قيس بن شماص و كان اصيب يوم اليمامة، فلمّا ادخلناه قبره سمعناه يقول: محمد رسول اللّٰه ﷺ، ابوبكر رضى اللّٰه عنه و عمر الشهيد عثمان امين رحيم، فنظر اليه فاذا هو ميت (۲)

---

(۱) المعجم الكبير: زيد بن حارثة الأنصارى، حديث:۵۱۵۲، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اوسط میں اس روایت کی سند کو اختصار سے ذکر کیا ہے اور ان دو سندوں سے کبیر کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔(مجمع الزوائد : باب الخلفاء الأربعة ، حديث:۸۹۲۶)

(۲) احکام القرآن: ۱۸۱/۳، مطبوعات ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی پاکستان

امام بخاریؒ نے تاریخ میں اور ابن مندہ نے حضرت عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ان لوگوں میں جنہوں نے ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کو دفن کیا شریک تھا اور آپ رضی اللہ عنہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے جب ہم نے ان کو قبر میں اتارا تو ہم نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ شہید ہیں، عثمان رضی اللہ عنہ امانت دار اور قابل رحم ہیں۔ ہم نے ان کو دیکھا تو وہ مردہ تھے''

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ تحریر فرماتے ہیں کہ :

''امام مسلمؒ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرے تو آپ علیہ السلام اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے، امام احمدؒ، عفان سے وہ حماد سے نقل کرتے ہیں کہ ثابت یہ دعا کرتے تھے اے اللہ! اگر کسی کو آپ اس کی قبر میں کھڑے ہوئے نماز ادا کرنے کی توفیق عطا کریں تو مجھے بھی اپنی قبر میں نماز ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، ابونعیمؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے ثابت کو اس کی لحد میں رکھا تھا، اس وقت میرے ساتھ حمید الطّویل بھی تھے، جب ہم نے لحد کی ساری اینٹیں جمادیں تو ایک اینٹ گر گئی اور میں نے دیکھا کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں''(۱)

علامہ ابن قیمؒ نے بھی اپنی کتاب الروح میں اس قسم کے متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔خود شیخ محمد عبدالوھابؒ کی مذکورہ بالا کتاب میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں، لہٰذا شیخ الحدیث صاحبؒ نے اپنی کتاب فضائل اعمال میں اس قسم کے جو واقعات لکھے ہیں، وہ بالکل مستبعد نہیں ہو سکتے۔

ہم کچھ واقعات مختصراً ذکر کرتے ہیں :

۱۔ چنانچہ شیخ صاحب روض الریاحین کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں کہ :

ایک کفن چور تھا، اس نے اپنے معمول کے مطابق ایک قبر کھودی تو دیکھا کہ ایک شخص

(۱) مؤلفات الشیخ: ۴۰۲

اونچے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں اوران کے تخت کے نیچے ایک نہر چل رہی ہے اور تلاوتِ قرآن میں مصروف ہیں، وہ یہ صورتحال دیکھ کر مارے بیہوشی کے گر پڑا۔(۱)

۲۔ شیخ ابو یعقوب سنوسی کہتے ہیں کہ

میرے پاس ایک مرید آیا اور کہنے لگا کہ میں کل ظہر کے وقت مرجاؤں گا، چنانچہ دوسرے دن ظہر کے وقت وہ مسجد حرام آیا، طواف کیا اور تھوڑی دور چل کر سو گیا اور مرگیا جب میں اس کے کفن دفن سے فارغ ہوکر اسے قبر میں رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں، میں نے کہا مرنے کے بعد زندگی ہے؟ کہنے لگا میں زندہ ہوں اور اللہ کا ہر عاشق زندہ ہی رہتا ہے۔ (۲)

۳۔ سید احمد رفاعی مشہور بزرگ اور اکابر صوفیاء میں سے ہیں، ان کا قصہ مشہور ہے کہ جب ۵۵۵ھ ہجری میں حج سے فارغ ہوکر زیارت کیلئے حاضر ہوئے اور قبلہ اطہر کے مقابل کھڑے ہوکر یہ دو شعر پڑھے ''دوری کی حالت میں اپنی روح کو خدمت اقدس میں بھیجا کرتا تھا، وہ میری نائب بن کر آستانہ مبارک کو چومتی تھی اب جسموں کی باری آئی ہے اپنا دست مبارک عطا فرمائے۔ تاکہ میرے ہونٹ اس کو چومیں'' اس پر قبلہ شریف سے دستِ مبارک نکلا اور انہوں نے اس کو چوما، کہا جاتا ہے کہ اس وقت نوے ہزار کا مجمع مسجد نبوی ﷺ میں تھا جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور حضور ﷺ کے دستِ مبارک کی زیارت کی جن میں حضرت محبوب سبحانی قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی نوراللہ مرقدہ کا نام نامی بھی ذکر کیا جاتا ہے۔(۳)

سید احمد رفاعی کے واقعہ کی سند

اس واقعہ کو علامہ سیوطیؒ نے اپنے رسالہ ''شرفِ مختم'' میں سلسلہ وار سند سے لکھا ہے کہ وہ روایت کرتے ہیں :

شیخ کمال الدین سے اور وہ شیخ شمس الدین جزری سے اور وہ شیخ زین الدین مراغی سے اور وہ شیخ عزالدین احمد فاروقی کے واسطے سے اور وہ اپنے والد شیخ ابواسحاق ابراہیم سے اور وہ اپنے باپ شیخ عزالدین عمر سے۔(۴)

---

(۱) فضائلِ صدقات حصہ دوم: ۴۷۵
(۲) فضائلِ صدقات حصہ دوم: ۴۷۸
(۳) فضائلِ حج: ۱۳۱
(۴) مجمع البحور : ۱۸۶

عموماً اس واقعہ پر نہایت ہی حیرت واستبعاد کے ساتھ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کا دستِ مبارک نظر آئے، اولاً تو ہم نے اس واقعہ کو بالسند کتبِ معتبرہ سے ذکر کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ واقعہ بطورِ کرامت اور خرقِ عادت کے ممکن ہے، اسے نہ شرعاً اور نہ عقلاً کسی بھی طرح ناممکن نہیں قرار دیا جاسکتا، چونکہ ایسا ممکن ہے (بطورِ کرامت کے) کہ اللہ عزوجل ولی کیلئے اس کے اور حضورِ اکرم ﷺ کے درمیان جو حجابات اور پردے ہیں وہ ہٹادیں، جس سے نہ صرف آنحضرت ﷺ کا دستِ مبارک کیا بلکہ پورا جسمِ اطہر بعینہٖ نظر آئے اور حضورِ اکرم ﷺ کی صورتِ اصلیہ میں زیارت ہو جیسا آئینہ ہوتا ہے کہ باوجود آڑ اور پردہ کے اس کے پیچھے کی تمام چیزیں نظر آتی ہیں۔

جیسے مرغی کا انڈا جو چاروں طرف سے قلعہ کی طرح بند ہوتا ہے، اس میں ذرا بھی سوراخ نہیں ہوتا مگر پھر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اسی بند قلعہ میں سے اچانک ایک بچہ نکل آتا ہے جو بہت کمزور ہوتا ہے۔ اگر قادر ذوالجلال کی یہی قدرت کارفرما ہو اور نبی کریم ﷺ کا دست ِمبارکہ (جن کی حیاتِ مسلمہ حقیقت ہے) قبر شریف سے باہر نکلے تو اس میں کیا خلافِ عقل بات ہے، البتہ خلافِ عادت ضرور ہے، اسی لئے تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔

یا دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی صورتِ اصلیہ میں نظر نہ آئے ہوں، بلکہ وہ آپ کا جسد مثالی ہو اور جسدِ مثالی سے وہ تمام امور انجام پائیں (بطورِ کرامت کے) جو جسدِ ظاہری وجسمانی انجام پاتے ہیں۔ عالمِ مثال کا ثبوت قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اس کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، ہمارا عنوان: عالمِ مثال کا ثبوت اور اس کے احکام۔

مذکورہ بالا احادیث وروایات اور اسلاف امت کے اقوال کی روشنی میں ان واقعات کو بعید از عقل کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

عقیدۂ حیاۃُ النبی ﷺ

یہ تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ عزّ وجل زندہ اور حیات ہے، اس کی زندگی اور حیات ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہے، موت تو رہنے دیجئے اس پر اونگھ اور نیند کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا "هو الحی القیوم لاتأ خذه سنة ولا نوم" وہ زندہ ہے ابدالآباد ذات ہے، اُس پر اونگھ اور نیند بالکل طاری نہیں ہوتی، ذاتِ خداوندی کے علاوہ جتنی بھی جاندار چیزیں اِس روئے زمیں پر آباد ہیں؛ یہاں تک کہ انبیاء علیہم السلام بھی جو اِس روئے زمین پر سب سے زیادہ برگزیدہ اور بزرگ نفوس ہوتے ہیں، سب کو موت کا مزہ چکھنا ہے، کوئی بھی "کل نفس ذائقة الموت" کے اس ازلی قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے، رہی یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام کو خصوصا ہمارے نبی ﷺ کو اِس دُنیوی موت کے طاری ہونے کے بعد جیسا کہ اللہ عزوجل کا قانون اور دستور ہے کہ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور مختلف قسم کی آیات اور احادیث اس پر دال ہیں: "إنك ميت وإنهم ميتون" اے نبی ﷺ! آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہونگے۔"أفإن مت فهم الخالدون" اگر آپ کو موت آگئی تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟ اِس طرح کی دیگر آیات اور احادیث جو آپ ﷺ کی دُنیوی موت پر دال ہیں، کیا آپ ﷺ پر اِس موت کے طاری ہونے کے بعد قبر میں جسمانی حیات حاصل ہے؟ تو اِس پر بے شمار آیات اور احادیث دال ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً ہمارے نبیٔ پاک ﷺ اپنی قبر میں زندہ اور باحیات ہیں اور یہ حیات ''حیاتِ حسی اور جسمانی'' ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ پر سلام پیش کیا جاتا ہے تو قریب سے بذاتِ خود سنتے ہیں دور سے فرشتے آپ ﷺ تک پہنچاتے ہیں، آپ ﷺ کیلئے وہاں کے مناسبِ حال رزق مہیا کیا جاتا ہے، آپ اپنی قبرِ اطہر میں اذان واقامت کے ساتھ نماز ادا فرماتے ہیں، آپ ﷺ پر اُمت کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو آپ ﷺ اُسے دیکھتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے اموال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، آپ ﷺ کے ازواج سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ تفصیل کیلئے یہ مضمون ملاحظہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں حیات ہیں

تمام اہلِ سنت والجماعت اور جمہورِ اُمت کا یہ اعتقاد ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام خصوصاً ہمارے نبی ﷺ اپنی قبر میں زندہ اور حیات ہیں اور آپ کی یہ حیات دُنیا کی سی ہے بلا مکلّف ہونے کے اور اس قسم کی یہ حیات آنحضرت ﷺ، انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ مخصوص ہے، محض برزخی نہیں ہے جو کہ سب مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو حاصل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو قبر مبارک میں اسی دنیا والے جسدِ اطہر کے ساتھ آپ کی روحِ اقدس کا ایسا تعلق ہے کہ جس کی وجہ سے اس بدنِ اطہر میں حیات اور زندگی حاصل ہے، یہ صرف روحِ مبارک کی زندگی نہیں؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عالمِ برزخ میں اس حیاتِ جسدی کیلئے دُنیوی حیات کے جملہ لوازمات ثابت ہیں اور یہ کہ آنحضرت ﷺ کو وہاں کھانے پینے وغیرہ کی جس طرح دُنیا میں حاجت ہوتی ہے اس طرح قبرِ اطہر میں بھی ہوتی ہے؛ لیکن چونکہ دُنیوی حیات کی طرح انبیاء علیہم السلام کو اس قبرِ شریف والی حیات میں بھی اِدراک اور علم وشعور حاصل ہے، اس لئے اِن اہم اُمور کے حاصل ہونے کی وجہ سے اِس حیات کو بھی دُنیوی حیات کہا جاتا ہے۔ ہاں البتہ وہاں کی زندگی تکلیفی اور احکامِ شرع پر مامور زندگی نہیں ہوتی، وہاں اُن لوگوں کو بطورِ اِکرام واعزاز کے دُنیوی زندگی سے مماثل برزخی زندگی کے مطابق اور مناسبِ حال کچھ اُمور کی انجام دہی کی منجانب اللہ صلاحیت ولیاقت عطا ہوتی ہے، چنانچہ اُنہیں وہاں کے مناسبِ حال رزق عطا ہوتا ہے اور وہ بغیر کسی تکلیفِ شرع کے محض بطورِ ذوق وشوق حظ اندوزی اور لذت کیلئے بعض اللہ کی رضا والے اعمال مثلاً نماز ادا کرتے ہیں، قرآن کی تلاوت اِس طرح کے دیگر خوشنودیٔ رب پر مشتمل افعال کی انجام دہی میں مصروف ہوتے ہیں، بلکہ بعض روایات میں تو اذان واقامت کے ساتھ نماز کی ادائیگی (دارمی) اور تلاوتِ قرآن (ترمذی) جیسا کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ذکر فرمایا ہے اور (بخاری) کے مطابق وہ حج بھی کرتے ہیں، اِس بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ مزید تشفی کیلئے علامہ سیوطیؒ کی ''شرح الصدور'' ملاحظہ ہو۔(۱)

ہم نے انبیاء علیہم السلام کی حیات پر دلالت کرنے والے اِن اُمور کی جانب جو اِشارہ کیا

---

(۱) فیض الباری : باب ظل الملائکۃ :۱۱۶۳/۵

ہے اُس پر وہ روایات بھی دلالت کرتی ہیں جسے ہم ''حیاتِ انبیاء علیہم السلام'' سے متعلق روایات کے تحت ذکر کریں گے۔

اِس حیاتِ برزخی کی مثال اوراس کا نمونہ اس دنیا میں نیند میں موجود ہے، خواب میں چونکہ روح کا تعلق عالمِ برزخ سے ہوجاتا ہے؛ اس لئے سویا ہوا شخص وہ حالات دیکھتا اور سنتا ہے جو اُس کے پاس بیٹھا ہوا نہیں دیکھتا اور خواب بعض سچے بھی ہوتے ہیں کہ جیسا خواب میں دیکھا یا سنا ویسا ہی بیداری میں دیکھ لیا اور اِس جہاں سے دریا پہاڑ اُس کے مشاہدے میں حائل نہیں ہوسکتے تو موت کے بعد تو اس سے بھی زیادہ تعلق روح کا عالمِ برزخ سے ہوجاتا ہے، پھر اس کی قبر کی دیواریں وغیرہ اس کے دیکھنے اور سننے میں کیوں کر حائل ہوسکتی ہیں؟

ایک مغالطہ اور اُس کا جواب

بعض لوگ حیاۃ انبیاء کا یہ کہہ کر انکار کردیتے ہیں کہ اُس کی وجہ سے کفر وشرک لازم آتا ہے، چونکہ ''حَــيٌّ'' اور ''قَيُّــوْمُ'' دائمی اور ابدالآباد زندگی تو ذاتِ خداوندی کیلئے زیب دیتی ہیں، جیسا کہ آیت ''هُــوَالْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، لَاتَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ'' (۱) اس پر دلالت کرتی ہے، اگر انبیاء کو حیات مانتے ہیں تو حیاتِ ابدی میں اُن کی ذاتِ خداوندی کے ساتھ شرکت لازم آتی ہے اور یہ عقیدۂ حیات مزید اِن آیات اور اُن کے مفہوم کے خلاف بھی ہے کہ: ''كُــلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتُ'' (۲) ''ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے''۔ ''اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ'' (۳) (آپ پر بھی موت طاری ہوگی اور وہ بھی مرجائیں گے) اور یہ عقیدہ ان روایات کے بھی مخالف ہے جس میں حضور ﷺ کی وفات اور آپ ﷺ کی تجہیز وتکفین اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس موقع سے ضبط وکنٹرول سے باہر جذبات کا ذکر ملتا ہے اور اس موقع سے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع سے حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی اس عقیدہ کے خلاف نظر آتا ہے ''فان محمدا قد مات'': ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ'' (۴) اور خود اِمامِ بخاریؒ نے بھی باب وفات النبی ﷺ: ۶۴۰/۲ قائم کرکے اِس مسئلہ کو بالکل الم نشرح کردیا ہے کہ حضور ﷺ وفات پاچکے۔

اِس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ:

---

(۱) البقرۃ: ۲۲۵ (۲) الانبیاء: ۳۵ (۳) الزمر: ۳۰ (۴) اٰل عمران: ۱۴۴

ہمیں یہ تمام آیات وروایات اور اُس کا مفہوم اور حضور ﷺ کی وفات بالکل تسلیم ہے، کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (۱) کے قانون وقاعدہ سے ہم کسی آدمی، جن ولی اور نبی کو مستثنیٰ نہیں مانتے اور نہ کسی کو اس موت میں اختلاف ہے؛ بلکہ موضوعِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ حضور ﷺ اور دیگر انبیاء اپنی اِس دُنیوی موت کے بعد جو کہ خدا کا قانون اور دستور جو بغیر کسی استثناء اور تفریق کے ہر ذی روح کو شامل ہے، اس موت کے طاری ہونے کے بعد قبر اور برزخ میں پھر انہیں دوبارہ زندگی حاصل ہے یا نہیں، ہمارا مدعا اور منشاء بھی یہی کہ اس دُنیوی موت کے طاری ہونے کے عالم قبر اور برزخ میں انہیں دوبارہ حیات حاصل ہے، اس حیات کی تفصیل پہلے گذر چکی، اس پر بے شمار روایات دلالت کرتی ہیں۔

یہاں چندایک آیات وروایات مع اس کی سند کی توثیق کے ذکر کرتے ہیں :

عقیدہ حیات النبی ﷺ اور قرآن

حق تعالیٰ کا اِرشاد ہے :

۱- وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲) جو اللہ کے راستہ میں قتل کئے گئے اُنہیں مردہ مت کہو؛ بلکہ وہ زندہ ہیں؛ لیکن تمہیں اس کا احساس نہیں۔

۲- وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا، بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ، فَرِحِيْنَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (۳) اور (اے مخاطب) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں اُن کو مردہ مت خیال کر؛ بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے تقرب میں اُن کو رزق ملتا ہے وہ خوش ہیں اس چیز سے جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی۔

اِن دونوں آیتوں کو ملاحظہ کیا جائے، پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے شہداء کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے اور دوسری آیت میں اُن کو مردہ سمجھنے سے بھی منع فرمایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو وہ قتل بھی ہوئے اور اُن پر موت بھی واقع ہوئی؛ لیکن اُس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو حیات عطا کر دی ہے؛ اس لئے اب ان کو مردہ کہنا اور سمجھنا خلافِ حقیقت اور خلافِ قرآن ہوگا۔

---

(۱) الرحمن : ۲۶ (۲) البقرۃ : ۱۵۴ (۳) ال عمران : ۱۶۹

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی یہ حیات محض ارواح کی حیات نہیں ہے؛ بلکہ اُن کی اس حیات کا تعلق اُن کے اجسامِ عنصریہ کے ساتھ بھی ہے اور آیت کے الفاظ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ مَنْ یُّقْتَلُ یعنی جس کو قتل کیا گیا ہے وہ جسم ہے نہ کہ روح اور قتل کئے گئے جسم ہی کو بَلْ اَحْیَآءٌ میں زندہ قرار دیا گیا،لیکن موت وقتل کے بعد عالمِ برزخ میں منتقل ہونے کی وجہ سے چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات پر پردہ ڈال دیا ہے اور وہ حیات ہم کو اس دُنیا کے حواسِ ظاہرہ سے محسوس نہیں ہوتی (جیسا کہ بعض شہیدوں کے اجسام کہیں نظر آتے ہیں تو ان میں کوئی زندگی محسوس نہیں ہوتی) اس لئے فرمایا: وَلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ کہ ان کے ابدان میں حیات تو ہے،لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے ،لیکن ہمیں اس کے شعور نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان کے ابدان میں کوئی حیات نہیں ہے۔

ارشادِ باری کی بناء پر ہمارا ایمان تو یہی ہونا چاہئے کہ مَنْ یُّقْتَلُ یعنی جو اجسام قتل کئے گئے ہیں،ان میں حیات ہے خواہ ہمیں اُس کا احساس ہو یا نہ ہو، عالمِ برزخ کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اور عالمِ غیب کی باتوں کو حسبِ ارشادِ خداوندی ”یؤمنون بالغیب“ بغیر دیکھے ہی مانا جاتا ہے، بہرحال قرآنی آیات سے بطورِ عبارۃ النص عالمِ برزخ وقبر میں شہداء کی جسمانی حیات ثابت ہوتی ہے اور چونکہ انبیاء شہدائے اُمت سے افضل ہیں اور ہمارے رسولِ کریم رحمۃ للعالمین ﷺ کی اُمت کے شہداء کو یہ نعمتِ شہادت خصوصی طور پر حضور ﷺ کی محبت واطاعت سے ہی نصیب ہوتی ہے،اس لئے اسی آیت سے بطریق اولیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کی عالمِ برزخ وقبر میں حیات جسمانی بطورِ دلالۃ النص کے ثابت ہوتی ہے اور اسی بناء پر علمائے حق کا اس عقیدہ پر اجماع ہو گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبورِ مبارکہ میں ارواحِ مطہرہ کے تعلق کے ساتھ زندہ ہیں اور بہ نسبتِ شہداء کے اُن کی حیات زیادہ قوی ہے حتیٰ کہ وہ اپنی قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں۔

عقیدہ حیاۃُ النبی ﷺ اور احادیث

پہلی دلیل

ابو یعلی فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالجہم الارزق بن علی نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یحییٰ بن بکیر نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مسلم بن سعید نے بیان کیا، وہ حجاج سے

اور وہ ثابت بنانی سے اور وہ حضرتِ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون (۱) حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔

علامہ سبکیؒ اس حدیث کی سند کو نقل کرکے اس کے رواۃ کی توثیق کرتے ہیں اور اُس کو صحیح قرار دیتے ہیں اور یہ روایت پہلے راوی کے علاوہ بقیہ رواۃ کے ساتھ (۲) میں بھی مذکور ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: وصححہ البیھقی (۳) کہ اس حدیث کی امامِ بیہقی نے تصحیح کی ہے، علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: رجال ابو یعلی ثقات (۴) ابو یعلی کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں۔

اِس حدیث کے مفہوم پر بطورِ شاہد کے یہ روایت بھی واضح ہے جسے اِمامِ مسلم نے روایت کیا ہے:

حمادبن سلمه عن ثابت البناني وسليمان التيمى عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ أنَّ رسول الله ﷺ قال وفي رواية مررت على موسى ليلة اسري بى عندالكثيب الأحمر وهوقائم يصلى (۵)

حماد بن سلمہ، ثابت بنانی اور سلیمان سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: میں معراج کی رات حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا جو سرخ رنگ کے ٹیلے کے پاس اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

اِس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں حیات ہیں اور وہ نماز ادا فرما رہے ہیں۔

جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا ثابت ہے تو پھر دوسرے انبیاء علیہم السلام کے اپنی قبروں میں نماز پڑھنے سے بھی کوئی عقلی یا نقلی دلیل مانع نہیں ہے۔

(۱) مسند ابویعلی، حدیث: ۳۴۲۵، مع تحقیق حسین سلیم اسعد، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو ابویعلی اور بزار نے روایت کیا ہے، ابویعلی کے رجال ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد : باب ذکر الأنبیاء، حدیث: ۱۳۸۱۲)

(۲) فتح الباری: ۳۵۲/۲ (۳) فتح الباری: باب حدیث الإسراء: ۱۹۸/۷

(۴) مجمع الزوائد: ۳۵۲/۲

(۵) صحیح مسلم، باب من فضائل موسیٰ، حدیث: ۱۶۴، مع تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی، مسند احمد، حدیث: ۱۲۵۰۴، مع تحقیق شعیب الارنؤط

دوسری دلیل

اِمامِ ابوداؤدفرماتے ہیں کہ: ہم سے محمد بن عوف نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مقری نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حَیوۃ نے بیان کیا وہ ابوصخر حمید بن زیاد سے اور وہ یزید بن عبداللہ بن قسیط سے اور وہ حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشادفرمایا کہ: مامن احدٍ یسلّم علیّ الّا ردّ اللّٰه علیّ روحی حتّی ارُدَّ علیه (۱) کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام کہتا ہو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ میں اُس کا جواب دیتا ہوں۔

اِمامِ سبکیؒ فرماتے ہیں کہ اِمام احمد اور اِمامِ ابوداؤد نے اس روایت پر اعتماد کیا ہے۔(۲)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: رواته ثقات (۳) کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں،

حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں: صححه النووی فی الأذکار (۴) کہ امامِ نوویؒ نے اس حدیث کی اپنی کتاب الاذکار میں تصحیح کی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

واتفق الأئمة علی انّه یسلم عند زیارته وعلی صاحبیه لما فی السنن عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ أنّه قال مامن رجلٍ یسلم عليّ الّا رد اللّٰه تعالیٰ علی روحی حتی ارُدَّ علیه السلام وهوحدیث جیّدٌ (۵)

حضرات ائمۂ کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی (قبور) کی زیارت کے وقت سلام کہنا چاہئے کیونکہ (سنن ابوداؤد) میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر کوئی شخص بھی سلام نہیں کہتا مگر اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح (توجہ) لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ میں اُس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

---

(۱) ابو داؤد ، باب زیارة القبور ، حدیث:۲۰۴۱،مع تحقیق محمد محی الدین
(۲) شفاء السقام : ۱۰۵ (۳) فتح الباری : ۲۷۹/۳
(۴) تفسیر ابنِ کثیر : ۵۱۴/۳ (۵) فتاویٰ الکبری: ۴۲۴/۲،دار المعرفة ، بیروت

اس حدیثِ صحیح کا مطلب یہ ہے کہ سلام کہنے والے کا جواب دینے کیلئے آنحضرت ﷺ کے جسدِ اطہر کی طرف روح مبارک لوٹائی جاتی ہے (ردِّ روح کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قبرِ مبارک میں آپ کی روح کی تمام تر توجہ دوسرے عالم کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی جمالی جلالی تجلیات کے مشاہدہ میں مصروف رہتی ہے پھر جب کوئی اُمتی سلام عرض کرتا ہے تو وہ فرشتہ کے ذریعہ یا براہِ راست قبرِ اطہر کے پاس آپ ﷺ تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے آپ ﷺ کی روح اس طرف بھی متوجہ ہوتی ہے اور آپ ﷺ سلام کا جواب دیتے ہیں، بس اِسی روحانی توجہ والتفات کو ''ردِّروح'' سے تعبیر کیا گیا۔(۱)

اور اس ''ردِّ روح'' میں آپ کی روحِ مبارک کا جسمِ اطہر سے اتصال اور تعلق ہوتا ہے اور آپ ﷺ سلام کا جواب دیتے ہیں، گویا آپ کو قبرِ اطہر میں جسمانی حیات حاصل ہے جو آپ ﷺ کے سلام کا جواب دینے کا باعث بنتی ہیں۔

تیسری دلیل

اِمام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارون بن عبداللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسین بن علی نے بیان کیا وہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے اور وہ ابوالاشعث الصنعانی سے اور وہ حضرت اوس رضی اللہ عنہ بن اوس سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

ان من افضل ايامكم يوم الجمعة فيه خلق آدم. وفيه قبض، وفيه النفخة وفيه الصعقة فاكثروا عليّ من الصلوة فيه فان صلوتكم معروضة عليّ قال قالوا : يارسول الله !وكيف تعرض صلواتنا عليك وقد ارمت قال يقولون بليت فقال ان الله عزوجلّ حرّم على الأرض اجساد الأنبياء (۲)

''بے شک تمہارے افضل ترین دنوں میں ایک جمعہ ہے، اِسی میں حضرتِ آدم علیہ السلام

(۱) فتح الباری: ۳۵۲/۲، طبع مصر

(۲) ابو داؤد، باب فضل يوم الجمعة ، حدیث:۱۰۴۷،مع تحقیق محمد محی الدین،سنن نسائی،باب اکثار الصلوۃ علی النبی یوم الجمعۃ،حدیث:۱۳۱۴،مع تحقیق عبدالفتاح غدۃ.حاکم نے اس روایت کو صحیحین کی شرط پر صحیح کہا ہے۔(کتاب الأهوال ، حدیث:۸۶۸۱)

السلام پیدا کئے گئے اور اسی میں اُن کی وفات ہوئی اور اس میں نفخۂ اولیٰ (پہلا صور) ہوگا اور اسی میں نفخۂ ثانیہ (دوسرا صور) ہوگا، سوتم جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت دُرود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا دُرود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کس طرح ہمارا دُرود آپ پر پیش کیا جائے گا جبکہ آپ ریزہ ریزہ ہوچکے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے اجسام حرام کردیئے ہیں (یعنی زمین اُن کو نہیں کھاتی)''۔

امام حاکم اور علامہ ذہبی دونوں اس حدیث کو بخاری کی شرط پر صحیح کہتے ہیں۔(۱)

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی اور نووی نے صحیح کہا ہے۔(۲) اس طرح حافظ ابن قیم، علامہ حجر وغیرہ نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔

اس حدیث کا درایتی پہلو جو بلا کسی ضم ضمیمہ (بلا جوڑ توڑ کے) حاصل ہوتا ہے وہ درجِ ذیل ہے:

۱- آنحضرت ﷺ پر زندگی میں دُرود شریف پیش ہوتا رہا؛ چنانچہ آپ ﷺ کے یہ الفاظ صراحت کے ساتھ اس پر دال ہیں کہ جمعہ کے دن. فأکثروا علیّ من الصلوٰۃ فان صلواتکم معروضة علیّ تم مجھ پر بکثرت دُرود پڑھو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

درود شریف کا یہ عرض جسمِ اطہر اور روحِ مبارک دونوں سے وابستہ ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سہارنپوری لکھتے ہیں کہ:

اور اس حدیثِ پاک میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دُرود روح مبارک اور بدنِ مبارک پر پیش ہوتا ہے۔(۳) اور اس عرض میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی اشکال پیش نہیں آیا، رہی اس عرض کی کیفیت تو اس کو جنابِ رسول اللہ ﷺ ہی بہتر جانتے تھے ہم اس کے مکلّف نہیں ہیں۔

۲- حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اشکال پیش آیا کہ زندگی میں تو روح اور جسد دونوں کا تعلق ہے اور اس دور میں درود کے پیش ہونے پر تو کوئی اشکال نہیں لیکن جب آپ ﷺ کی وفات ہوچکے گی تو اس کے بعد درود کیونکر پیش کیا جائے گا؟ آیا صرف روح مبارک پر پیش ہوگا؟ یا صرف جسدِ اطہر پر؟ یا دونوں پر؟ عقلی طور پر اس کی کئی صورتیں سامنے آسکتی ہیں مگر حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو محض روحِ مبارک پر درود شریف پیش ہونے کا کوئی شبہ نہ تھا

---

(۱) مستدرک: ۵۶۰/۴ (۲) تفسیر ابنِ کثیر: ۵۱۴/۳ (۳) فضائل درود شریف: ۳۷

اورنہ وہ تنہا روحِ مبارک پر درود شریف پیش ہونے کے حق میں تھے جبھی تو وہ یہ سوال کررہے ہیں کہ: ”قالوا یا رسول اللہ ﷺ وکیف تعرض صلٰوتنا علیك وقد ارمت قال یقولون بلیت “ یارسول اللہ ﷺ! ہمارا درود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا حالانکہ آپ تو (معاذ اللہ) بوسیدہ ہوچکے ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک آپ ﷺ پر صلوٰۃ وسلام پیش ہونے میں آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کو اولین درجہ حاصل ہے اور اس کے (العیاذ باللہ) بوسیدہ ہونے سے اس عرض کے سلسلہ میں ان کے اذہان وقلوب میں اشکال پیدا ہوا، اگر درود شریف کا تعلق آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کے ساتھ نہ ہوتا تو آپ ﷺ پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نظریہ کی تردید فرماتے کہ جسد کا کیا سوال ہے دُرود شریف تو روح پر پیش کیا جاتا ہے، مگر آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نظریہ کی پوری تائید فرمائی ہے کہ درود شریف کا تعلق آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کے ساتھ بھی باقاعدہ وابستہ ہے اور یہ تائید صرف دلالۃً ہی نہیں بلکہ صراحۃً ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:انّ اللّٰہ عزّوجلّ حرم علی الارض اجساد الانبیاء اللہ تعالیٰ نے زمین پر حضراتِ انبیاءکرام علیہم السلام کے اجسام حرام کردیئے ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ درود شریف کے پیش ہونے میں جسدِ اطہر کا پورا پورا دخل ہے کیونکہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سوال کے بعد وارد ہوا ہے کہ ہمارا درود آپ پر جبکہ آپ (معاذ اللہ) بوسیدہ ہوچکے ہوں گے کیونکر پیش کیا جائے گا؟ اور اس میں محض بے حس اور لاشعور جسم کا سوال نہیں بلکہ ایسے جسمِ اطہر کا سوال ہے جس پر درود شریف پیش ہوسکے اور روح کے بغیر یہ ہرگز ممکن نہیں ہے اس سے بڑھ کر حیاتِ جسمانی کی اور کونسی دلیل ہوسکتی ہے؟ لیکن چونکہ یہ حیات فی القبر برزخی بھی ہے؛ لہٰذا اس جہاں کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو اس کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا اور نہ ان کو حس وحرکت محسوس ہوسکتی ہے اور پہلے گذر چکا ہے کہ حیاتِ دُنیوی کا یہ مطلب ہے کہ روحِ مبارک کا تعلق دُنیوی بدن سے ہے اور اِسی تعلق کی وجہ سے حیات ہے؛ لہٰذا بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ برتقدیرِ تسلیم یہ احادیث صحیح بھی ہوں تو ان سے دُنیوی زندگی ثابت نہیں ہوتی الخ غفلت پر مبنی ہے۔

۳- اگر درود شریف کا یہ عرض جسدِ عنصری پر نہ ہوتا بلکہ جسدِ مثالی پر ہوتا تو حضرات صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کو کبھی اشکال پیش نہ آتا کیونکہ جسدِ مثالی کے خاک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خاک ہونے اور بوسیدہ ہونے کا احتمال بلکہ یقین تو جسدِ عنصری اور جسم خاکی ہی سے وابستہ ہوسکتا ہے' یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ قبر مبارک میں عرض صلوٰۃ وسلام کا آپ ﷺ کے جسدِ عنصری کے ساتھ براہ راست تعلق ہے اور پھر وہ حدیثیں جن میں آپ سلام کہنے والوں کو جواب دیتے ہیں اور عندالقبر صلوٰۃ وسلام کا بلاواسطہ سماع فرماتے ہیں، جس کی تحقیق انشاءاللہ اپنے مقام پر آئے گی۔اس پر مستزاد ہیں۔غرض یہ کہ اس صحیح حدیث کے اندرونی اور بیرونی قرائن واضح طور پر اس امر کو ثابت کررہے ہیں کہ آپ ﷺ کی روحِ مبارک کا جسدِ اطہر کے ساتھ تعلق ہے اور اس تعلق کی وجہ سے آپ ﷺ پر درود شریف پیش ہوتا ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے آپ ﷺ جواب دیتے ہیں۔حافظ ابن قیم نے (۱) میں اور حافظ تیمیہؒ نے (۲) میں اور دیگر حضرات نے اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے جس کو ہم نے مختلف نکات کی شکل میں اوپر ذکر کیا ہے۔

اسی قسم کی ایک دوسری روایت الفاظ اور سند کے اختلاف کے ساتھ سنن ابن ماجہ میں مذکور ہے۔(۳)

چوتھی دلیل

امام نسائی فرماتے ہیں ہم سے عبدالوہابؒ بن عبدالحکم الوراق نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاذ بن معاذ نے بیان کیا، اُن سے سفیان بن سعید ثوریؒ نے اور وہ عبداللہ بن سائب سے اور وہ زاذانؒ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: اِنَّ لِلّٰہِ ملئکۃً سیّاحین في الأرض یبلّغونی من امتی السّلام (۴) بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے فرشتے مقرر ہیں جو زمین میں گھومتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔

---

(۱) کتاب الروح: ۵۴ (۲) مناسك الحج : ۸۴،طبع دہلی (۳) ابنِ ماجه : ۱۱۹

(۴) نسائی، باب السلام علی النبی، حدیث: ۱۲۸۲، مسند احمد ،مسند عبد اللّٰه بن مسعود، حدیث:۳۶۶۶،مع تعلیق شعیب الارنؤط۔محقق شعیب الارنوط نے کہا ہے کہ:اس کی سند میں مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

علامہ ہیثمیؒ اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: رواه البزار ورجاله رجال الصحيح (۱) کہ محدث بزار نے اس کو روایت کیا ہے اور اس کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں: ''قال الحاكم والذهبي صحيح''، امام حاکم اور علامہ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔(۲)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے یہ تصریح فرمادی ہے کہ ''يبلغوني'' فرشتے مجھے صلوٰۃ وسلام پہنچاتے ہیں اور کلمہ ''نی'' جو واحد متکلم کی ضمیر ہے، ذات پر دلالت کرتا ہے (علم نحو کا قاعدہ ہے کہ ضمیر ذات پر دلالت کرتی ہے) اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی نہ تو صرف جسدِ اطہر کا نام ہے اور نہ محض روح مبارک کا؛ بلکہ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اگر صرف روحِ مبارک پر صلوٰۃ وسلام پیش کیا جاتا تو آپ ﷺ فرمادیتے کہ میری روح پر اس کا عرض ہوتا ہے اور اگر محض بدنِ اطہر پر یہ عرض ہوتا تب صرف بدنِ اطہر کا ذکر فرمادیتے مگر آپ ﷺ نے تو اپنی ذاتِ اقدس کا تذکرہ فرمایا ہے جو روح وجسم دونوں کے مرکب کا نام ہے' لہٰذا یہ روایت بھی آپ ﷺ کی حیات کی دلیل ہے' اس روایت سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ دور دراز سے جو لوگ درود وسلام پڑھتے ہیں وہ آپ ﷺ تک بتوسط ملائکہ پہنچایا جاتا ہے' آپ ﷺ خود اس کی سماعت نہیں فرماتے جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے۔

پانچویں دلیل

حافظ ابوالشیخ اصبہانی فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمٰن بن احمد الاعرج نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسن بن الصباح نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابومعاویہ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اعمش نے بیان کیا، وہ ابوصالح سے اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من صلّى عند قبري سمعته ومن صلّى عَلَيَّ من بعيدٍ اُعْلِمْتُهُ (۳) جس نے میری قبر کے پاس درود پڑھا تو میں اُسے خود سنتا ہوں اور جس نے مجھ پر دور سے درود پڑھا تو وہ مجھے (بواسطہ فرشتوں کے) بتلایا جاتا ہے۔

اس حدیث کے جملہ راوی ثقہ اور معروف ہیں اور محدثین کی خاصی جماعت اس حدیث کو صحیح مانتی اور کہتی ہے، حافظ ابن حجر ابوالشیخ کی مذکورہ سند کے بارے میں فرماتے ہیں: بسندٍ جيّدٍ (۴)

---

(۱) مجمع الزوائد :۲۴/۹ (۲) مستدرک :۴۲۱/۲

(۳) جلاء الافهام لحافظ ابن قيم : ۱۹، اور فرمایا کہ یہ حدیث بہت غریب ہے۔

(۴) فتح الباری : ۳۵۲/۶، طبع مصر

چھٹی دلیل

حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول والذی نفس ابی القاسم بیدہ لینزلن عیسیٰ بن مریم اماماً مُقسطا وحکمًا عدلًا فلیکسرن الصلیب ویقتلن الخنزیر ولیصلحن ذات البین ولیذھبن الشحناء ولیعرضن المال فلا یقبلہٗ احدثم لئن قام علیٰ قبری فقال یا محمد لاجبتہ (۱) میں نے جنابِ رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں ابوالقاسم ﷺ کی جان ہے، ضرور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے امام منصف اور حاکم عادل ہوکر سو، ضرور صلیب توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے اور ضرور لوگوں کے آپس کے معاملات دُرست کردیں گے اور ضرور مال پیش کریں گے تو کوئی اس کو نہ لے گا۔ پھر آ کر وہ میری قبر پر کھڑے ہوکر کہیں گے اے محمد! (ﷺ) تو میں ضرور اُن کو جواب دوں گا۔

یہ روایت صحیح مسلم کی ہے لیکن بطورِ شاہد کے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت بھی ملاحظہ کرلیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: لیھبطن عیسیٰ بن مریم حکماً واماما مقسطا ولیسلکن فجّاً حاجاً اومُعتمراً ولیأتینّ قبری حتّٰی یسلم عَلَیَّ ولاردنَّ علیہ؛ ضرور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام نازل ہوں گے، منصف اور امام عادل ہوکر اور وہ ضرور فج (جگہ کا نام ہے) کے راستے پر حج یا عمرہ کیلئے جائیں گے اور بلاشبہ وہ میری قبر پر آئیں گے حتّٰی کہ وہ مجھے سلام کہیں گے اور بلاشک میں ان کے سلام کا جواب دوں گا۔ (۲)

آنحضرت ﷺ کی حالت قبرِ مبارک میں جو اَب ہے وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت بھی ہوگی بالفاظِ دیگر اُس وقت آپ ﷺ کی قبرِ مبارک میں آپ ﷺ پر کوئی نئی حالت طاری نہیں ہوگی جو مثلاً اب نہیں ہے اور اس تفریق پر کوئی شرعی دلیل بھی قائم نہیں ہے سو اگر اُس وقت آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سلام سنیں گے اور اس کا جواب دیں گے تو اس وقت بھی یہ

---

(۱) صحیح مسلم، باب نزول عیسٰی بن مریم حاکمًا، حدی : ۲۴۳ مع تحقیق فؤاد الباقی.

(۲) مستدرك حاكم : ذكر نبی اللہ وروحہ عیسی ابن مریم ، حدیث: ۴۱۶۲، حاکم نے اس روایت کو صحیح السند کہا ہے۔

ممکن بلکہ واقع ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ عرض سلام اور اس کا جواب آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے جو جسم مع الروح کا نام ہے، نہ صرف جسم سے اور نہ تنہا روح سے، اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ عندالقبر آنحضرت ﷺ کا صلوٰۃ وسلام کا سماع متحقق ہے اور آپ ﷺ کا جواب دینا بھی ثابت ہے اور اس کا انکار صحیح حدیث کا انکار ہے۔

ساتویں دلیل

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا :

حیاتی خیر لکم تحدِّثُونَ و یحدَّثُ لکم و وفاتی خیر لکم تعرض علیّ اعمالکم فما رأیت من خیر حمدت اللّٰہ علیہ ومارأیت من شر استغفرتُ اللّٰہ لکم (۱)

کہ میری زندگی تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم (مشکل مسئلے) بیان کروگے اور (میری طرف سے) ان کی حقیقت بیان کردی جائے گی اور میری موت بھی تمہارے لئے بہتر ہوگی تمہارے اعمال مجھ پر پیش ہوں گے سو جو اچھے ہوں گے میں اُن پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کروں گا اور جو برے ہوں گے میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگوں گا۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت بہ سند صحیح ہے۔(۲)

اِسی مضمون کی روایت مشہور ثقہ اور مامون تابعی حضرت بکر بن عبداللہؒ سے بھی مروی ہے۔(۳)

اور حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ :

ابن المبارکؒ نے حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ سے روایت کی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ نبی ﷺ پر آپ ﷺ کی اُمت کے اعمال صبح وشام پیش نہ کئے جاتے ہوں۔ (۴-۵) اور تصریح فرمائی ہے کہ یہ عرض اجمالی ہے تفصیلی نہیں (محصلہ)۔

---

(۱) مجمع الزوائد، باب تخییرہ ﷺ بین الدنیا والآخرۃ ، حدیث:۱۴۲۵۰، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں ۔

(۲) خصائص الکبریٰ : ۲/۲۸۱ (۳) طبقات ابنِ سعد : ۲/۱۹۴

(۴) نشر الطیب: ۲۱۰ (۵) نشر الطیب: ۲۲۹

اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں کہ :

بلکہ یہ عقیدہ ہے کہ جب حق تعالیٰ چاہے جس شئے کو چاہے آپ ﷺ پر منکشف کردیوے اور ملائکہ درود وسلام پہنچاتے ہیں اور اعمال امت کے بھی آپ پر پیش ہوتے ہیں تو دُرست ہے......الخ۔(۱)

اِن تمام روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر میں حیات ہیں اور آپ ﷺ پر پیش کئے جانے والے سلام کو سنتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر اُمور جس کا احادیث کے اندر ذکر کیا گیا ہے اُس کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔

علماءِ اسلام اور مسئلہ حیات النبی ﷺ

اِس بارے میں جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ اپنی قبر میں حیات ہیں اور یہ حیاتِ دُنیوی کے علاوہ وہاں کے مناسبِ حال ہے، ہم یہاں چند چیدہ علماء ومحدثین اور محققین اسلام کے اقوال پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں :

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ :

ان حیاته ﷺ فی القبر لا یعقبها موت بل یستمر حیًّا والانبیاء أحیاء فی قبورھم (۲) آنحضرت ﷺ کی قبرِ مبارک میں زندگی ایسی ہے جس پر پھر موت وارد نہیں ہوگی بلکہ آپ ﷺ ہمیشہ زندہ رہیں گے؛ کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس عبارت میں آنحضرت ﷺ اور دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی قبروں میں زندگی صریح الفاظ میں بیان فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا ہے کہ قبر میں آپ ﷺ کی زندگی مستمر اور دائمی ہے جس پر پھر موت طاری اور وارد نہیں ہوتی جس طرح کہ بعض حضرات کے نزدیک نکیرین کے سوال کے وقت عام مردوں کو زندہ کیا جاتا ہے پھر اُن پر وفات طاری کردی جاتی ہے گو جمہور اس کے بھی خلاف ہیں۔

حضرت امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ :

---

(۱) البراھین القاطعه، : ۲۱۶-۲۱۷، طبع امدادیہ دیوبند (۲) فتح الباری : ۷/۲۲، طبع مصر

ان اللّٰہ جلّ ثناء ہٗ رد الٰی الأنبیاء أرواحھم فھم أحیاء عند ربھم کالشھداء ...... الخ (۱) بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ارواح اُن کی طرف لوٹا دیئے ہیں، سو وہ اپنے رب کے ہاں شہیدوں کی طرح زندہ ہیں۔

اِسی بارے میں حضرت ملا علی القاریؒ لکھتے ہیں کہ :

المعتقد المعتمدانہ حیّ فی قبرہٖ کسائر الانبیاء فی قبورھم وھم أحیاء عند ربھم و أنَّ أرواحھم لھا تعلقا بالعالم العلوی والسفلی کما کانوا فی الحال الدنیوی فھم بحسب القلب عرشیون وباعتبار القالب فرشیون (۲)

قابل اعتماد عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں جس طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں اور اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں اور اُن کے ارواح کا عالم علوی اور سفلی دونوں سے تعلق ہوتا ہے جیسا کہ دُنیا میں تھا سو وہ قلب کے لحاظ سے عرشی اور جسم کے اعتبار سے فرشی ہیں۔

اِس عبارت میں حیات انبیاء علیہم السلام کو قابلِ اعتماد عقیدہ قرار دیا ہے اور یہ بھی تصریح کردی ہے کہ اُن کے ارواح طیبہ کا تعلق جنت، ملاءِ اعلی، رفیقِ اعلیٰ اور علیّین سے بھی قائم رہتا ہے اور عالم سفلی یعنی قبور میں اُن کے اجسامِ مبارکہ سے بھی جس طرح کہ دُنیا میں تھا کہ وہ قلب کے اعتبار سے عرشی اور قالب کے لحاظ سے فرشی تھے۔

بلکہ بعض حضرات نے انبیاء علیہم السلام کی اپنی قبر میں حیات کو اجماعی مسئلہ بتایا ہے۔

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادیؒ لکھتے ہیں :

والحاصل ان حیاۃ الانبیاء ثابتۃ بالاجماع (۳)

''حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات بالاجماع ثابت ہے''

امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں :

---

(۱) حیاۃ الانبیاء: ۱/۱۱۱مکتبۃ العلوم والحکم ، وفا الوفاء بتعریف المصطفی: ۲/۴۰۶

(۲) شرح شفاء : ۲/۱۷۲،طبع مصر (۳) المنحۃ الوھبیۃ:۶/۳۵۲،طبع استنبول

حیاۃ النبی ﷺ فی قبرہ ھو وسائر الانبیاء معلومة عندنا علما قطعیا لماقام عندنا من الادلة فی ذٰلك وتواترت به الاخبار الدالة علیٰ ذٰلك (۱) آنحضرت ﷺ کی اپنی قبرِ مبارک میں اور اِسی طرح دیگر حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی حیات ہمارے نزدیک قطعی طور پر ثابت ہے کیونکہ اس پر ہمارے نزدیک دلائل قائم ہیں اور تواتر کے ساتھ اخبار موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

چونکہ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں رہا اور اس پر حدیث سے بھی صحیح ثبوت موجود ہے اور اُمت کے تمام طبقات میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے اس لئے امام سیوطیؒ نے تواتر کا دعویٰ کیا ہے اور ایک اور مقام میں تواتر کا دعویٰ کر کے یوں لکھتے ہیں کہ :

ان من جملة ما تواتر عن النبی ﷺ حیاۃ الانبیاء فی قبورھم (۲) یعنی جو چیزیں آنحضرت ﷺ سے تواتر کے ساتھ مروی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حیاۃ النبی ﷺ کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

ان النبی ﷺ حیّ کما تقرر وأنه یصلّی قبرہ باذان واقامة (۳) آنحضرت ﷺ زندہ ہیں جیسا کہ اپنی جگہ یہ بات ثابت ہے اور آپ ﷺ اپنی قبر میں اذان واقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ :

ان کثیراً من الاعمال قدثبتت فی القبر کالاذان والاقامة عند الدارمی وقرأة القرآن عندالترمذی......الخ (۴) قبروں میں بہت سے اعمال کا ثبوت ملتا ہے جیسے اذان واقامت کا ثبوت دارمی کی روایت میں اور قرأۃ قرآن کا ثبوت ترمذی کی روایت میں ہے۔

---

(۱) انباہ الاذکیاء: ۲، طبع حیدرآباد دکن وفتاویٰ امام سیوطیؒ: ۲/۱۴۷، طبع مصر

(۲) النظم المتناثر من الحدیث المتواتر، کذا فی شرح البوسنوی: ۴، طبع مصر

(۳) فتح الملهم: ۳/۴۱۹ (۴) فیض الباری: ۱/۱۸۳

ان جملہ آیات واحادیث اور آثار اور ائمۂ سلف کے اقوال کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح اور ثابت ہوجاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام، شہداء خصوصاً ہمارے نبی ﷺ اپنی قبر میں حیات ہیں اور آپ ﷺ کی حیات سب سے افضل واعلیٰ ہے اور وہاں بھی آپ ﷺ کے کچھ اعمال واشغال ہیں، آپ ﷺ امت کے اعمال کو دیکھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، اُس دُنیا کے مناسبِ حال رزق وہاں آپ ﷺ کو فراہم کیا جاتا ہے، آپ ﷺ اپنی امت کا سلام سنتے ہیں، اُس کا جواب دیتے ہیں، یہ اور اس قسم کی روایات آپ ﷺ کے حیات پر صریح دال ہیں۔(۱)

○ حضورِ اکرم ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنا اور ملنا خلافِ شرع نہیں ہے

حضورِ اکرم ﷺ کو آپ ﷺ کی وفات کے بعد نہ صرف خواب میں، بلکہ آپ ﷺ کو بحالتِ بیداری میں دیکھنا بھی کوئی امر محال یا مستبعد چیز نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس حوالہ سے یوں فرماتے ہیں :

> بہت سے روایات وواقعات میں بعض خواص امت کا حضورِ اکرم ﷺ سے بحالتِ بیداری کلام کرنا اور بعض اُمور میں ان کی رہنمائی ورہبری کرنا وارد ہوا ہے، خواب میں اور بطورِ کشف کے آپ ﷺ کے دیکھنے سے متعلق اس قدر واقعات ہیں کہ جس کا شمار دشوار ہے۔(۲)

علامہ سیوطیؒ نے بھی منکرین کے رد پر ایک مستقل رسالہ بنام "تنویر الحلك فی رؤیة النبی والملك" لکھا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

> فقد کثر السوال عن رؤیة ارباب الاحوال للنبی ﷺ وان طائفةً من اهل العصر ممّن لا قدم لهم فی العلم بالغوا فی انکار ذلك والتعجب منه وادّعوا انه مستحیل فالّفتُ هذه الکراسة في ذلك (۳) صاحبِ حال کے حضورِ اکرم ﷺ کو دیکھنے سے متعلق بکثرت سوالات ہونے لگے ہیں۔ موجودہ زمانے کی ایک جماعت نے جنہیں علم میں

(۱) تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی البرزخ والقبور حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر، مکتبہ دارالاشاعت دیوبند۔

(۲) نشر الطیب : ۲۱ (۳) الحاوی للفتاویٰ : ۲/۲۵۵، دارالجیل بیروت

کسی قسم کا رسوخ نہیں ہے، اس کے انکار میں شدت اپنایا ہوا ہے اور اسے محال اور دشوار قرار دیا ہے، میں نے اسی بارے میں یہ رسالہ لکھا ہے۔

حضور ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنے پر دلالت کرنے والی روایات

اس سلسلہ کی سب سے صحیح روایت وہ ہے جس کی امام بخاریؒ نے تخریج کی ہے :

۱- عن ابی هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ :"من رآنی في المنام فسيرانی فی اليقظة ولايتمثّل الشيطان بی" حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص مجھے خواب میں دیکھے اسے عنقریب بحالتِ بیداری میری زیارت نصیب ہوگی''۔

علماء نے "فسيرانی فی اليقظة" (۱) ''وہ عنقریب بحالتِ بیداری مجھے دیکھے گا'' اس کی تفسیر میں مختلف اقوال لکھے ہیں :

- بعض لوگوں نے یوں کہا کہ مطلب یہ ہے کہ وہ عنقریب مجھے قیامت کے دن دیکھے گا، اگر یہ مطلب لیتے ہیں تو پھر یہ تخصیص کس بات کی؟ حالانکہ قیامت کے دن بغیر کسی تخصیص کے جس نے خواب کی حالت میں دیکھا ہو ہر امتی کو آپ ﷺ کی زیارت نصیب ہوگی۔
- بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص آپ ﷺ کے حین حیات ایمان لایا ہو، آپ ﷺ کے وہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکا ہو وہ آپ ﷺ کی وفات سے پہلے آپ ﷺ کو دیکھ لے گا۔
- بعض لوگوں نے یہ کہا کہ یہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم پر ہے کہ جو شخص آپ ﷺ کو خواب میں دیکھے اسے بحالتِ بیداری آپ ﷺ کی زیارت نصیب ہوگی۔ (یعنی وہ اپنے سر کی آنکھوں سے آپ ﷺ کو دیکھے گا)۔
- ابوبکر بن عربی کہتے ہیں کہ وہ اپنے دل کی آنکھوں سے آپ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوگا۔

حدیث کے مفہوم میں قولِ فیصل

امام ابو محمد بن ابی حمزۃ نے بخاری کی منتخب احادیث پر حاشیہ کا کام کیا ہے اس حدیث کے

(۱) بخاری: باب من رأى النبی ﷺ، حدیث:۶۵۹۲

ذیل میں فرماتے ہیں :

''یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھے وہ آپ ﷺ کو بحالتِ بیداری بھی دیکھے گا''، کیا یہ الفاظ آپ ﷺ کی زندگی اور موت کے بعد دونوں کیلئے عام ہیں یا صرف آپ ﷺ کی حیات کے ساتھ خاص ہیں؟ کیا یہ بات ہر شخص کیلئے ہے یا اس میں اہلیت اور اتباعِ سنتِ نبوی کی تخصیص ہے؟ لفظ تو اس کے عام ہونے پر دلالت کرتا ہے جو شخص بغیر کسی وجہ تخصیص کے اس کے مفہوم کو خاص کرنے لگے تو ایسا شخص بیجا تشدد کا حامل ہوگا۔ بعض لوگ اس حدیث کی عمومیت کا انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہر صاحبِ عقل وخرد یہ سمجھ سکتا ہے کہ مردہ شخص زندہ شخص کو اس عالم دنیا میں کیوں کر دیکھ سکتا ہے؟ یہ بات دو وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں حضور اکرم ﷺ کے ارشادِ گرامی جو کہ بالکل صادق المصدوق ہیں جن کے حوالہ سے ارشادِ خداوندی ہے ''ما ینطق عن الھوی'' (النجم:۲) ''اپنی خواہش سے نہیں بولتے'' کو جھٹلانا لازم آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس سے قدرتِ خداوندی سے جہالت کا پتہ چلتا ہے اور (نعوذ باللہ) اللہ عزوجل کیلئے عجز و بے کسی کا ثبوت ہوتا ہے، شاید کہ اس کے منکر نے سورۃ البقرۃ میں گائے کا قصہ نہیں سن رکھا ہے؟ اللہ عزوجل کیسے ارشاد فرماتے ہیں: ''إضربوہ ببعضھا کذلك یحي اللّٰہ الموتی'' (البقرۃ: ۷۳) ''اس کا ایک حصہ لیکر مردے پر مارو (تو وہ زندہ ہوجائے گا) ایسے ہی اللہ عزّ وجل مردوں کو زندہ کرتے ہیں''، ایسے ہی چار پرندوں کے متعلق حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا قصہ، حضرتِ عزیر علیہ السلام کا قصہ، جو ذات کہ گائے کے ایک ٹکڑے سے میت کو مارنے پر اسے زندہ کرسکتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار پر پرندوں کو حیات دے سکتی ہے اور موت وزندگی کے فلسفہ پر حضرت عزیر علیہ السلام کے تعجب کی وجہ سے انہیں اور ان کے گدھے کو موت دے کر پھر سو سال بعد انہیں دوبارہ حیات دے سکتی ہے، وہ ذات کیوں کر اس بات پر قدرت نہیں رکھتی کہ حضورِ اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھنے پر انہیں بحالتِ بیداری میں بھی دکھادے؟

بعض اصحابِ نبی ﷺ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے :

میرے گمان کے مطابق یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا انہیں یہ حدیث یاد آگئی، وہ اس کے بارے میں غور وخوض کرنے لگے، پھر ازواجِ نبی ﷺ میں سے کسی کے یہاں تشریف لائے، گمان غالب یہ ہے کہ وہ میمونہ تھیں، ان سے یہ قصہ بیان کیا، چنانچہ وہ وہاں سے اٹھیں اور ایک آئینہ لے کر آئیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ " فنظر فی المراۃ فرأیت صورۃ النبي ﷺ ، ولم ارلنفسی صورۃً" میں نے آئینہ دیکھا تو اس میں مجھے اپنی صورت کے بجائے آنحضرت ﷺ کی صورت نظر آنے لگی۔

پھر آگے یوں فرماتے ہیں :

سلف اور خلف کی ایک جماعت سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا اور انہیں اس حدیث پر یقین بھی تھا انہوں نے اس کے بعد حضور ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھا اور آپ ﷺ سے بعض پیچیدہ' پریشان کن اور مشکل اُمور کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے اس کا حل بتلایا اور ان پریشان کن امور سے چھٹکارا پانے کی راہوں کی اطلاع دی اور ان کے ساتھ یہ چیزیں بلاکم وکاست پیش بھی آگئیں، پھر فرماتے ہیں: اس حدیث کا انکار کرنے والا یا تو اولیاء کی کرامات کا قائل ہوگا یا نہیں، اگر وہ شخص اولیاء کرامؒ کی کرامات کا منکر ہے تو پھر اس سے بحث کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے وہ سنتِ صحیح اور دلائل واضحہ سے ثابت شدہ چیز کا منکر ہے، اگر وہ شخص کرامات اولیاء کے حق ہونے کا قائل ہے تو حضور ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنا یہ بھی کرامات کی قبیل سے ہے، چونکہ اولیاء کیلئے بطورِ خرقِ عادت (عادت کے خلاف) عالمِ علوی (اوپر کی دنیا) اور عالمِ سفلی (نچلی دنیا) کی بعض چیزیں منکشف ہوجاتی ہیں۔(۱)

خلاصۂ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث اپنے عام مفہوم پر ہے' اس میں اہلیت اور سنتِ نبوی ﷺ کی اتباع وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں مطلب یہ ہے کہ خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت سے بیداری میں آپ ﷺ کی زیارت کا نصیب ہونا گرچہ ایک ہی مرتبہ کیوں نہ ہو آپ ﷺ کے

(۱) الحاوی للفتاویٰ : ۲/۲۵۵-۲۵۶، تنویر الحلک في رویۃ النبی والملک

وعدہ کے مطابق ضرور ہوگا، عامی حضرات کو حضور ﷺ کی یہ زیارت جان کنی کی حالت میں ہوتی ہے، یعنی بغیر آپ ﷺ کی بحالتِ بیداری زیارت کے اس کی روح نہیں نکلتی، البتہ خاص لوگوں کو اپنی طویل زندگی میں تھوڑی بہت بقدران کی کوشش وجدوجہد اور اتباع سنت کے یہ زیارت ہوتی رہتی ہے۔حضور ﷺ کی اس قسم کی زیارت کیلئے سنت کی خلاف ورزی سب سے زیادہ مانع ہوتی ہے۔(۱)

حضورِ اکرم ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنا ممکن ہے اس کی صحت پر وہ تمام روایات وآثار بھی دلالت کرتے ہیں جس میں اسرا اور معراج کے موقع سے آنحضرت ﷺ کا گذشتہ انبیاء علیہم السلام کو کئی مرتبہ مختلف مقامات پر دیکھنا نقل کیا گیا ہے۔ یہ احادیث اس قدر ہیں کہ نہ صرف یہ شہرت کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں بلکہ ان روایات کے درجۂ تواتر کو پہنچے ہونے کا بھی دعویٰ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے ہوئے، ایسے ہی بیت المقدس پہنچنے کے بعد وہاں انبیاء علیہم السلام سے ملاقات پھر آسمانوں میں پہنچنے کے بعد انبیاء علیہم السلام سے شرفِ ملاقات اور کلام۔ یہ سب روایات بحالتِ بیداری حضور ﷺ کی زیارت ممکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ان روایات کیلئے صحیح بخاری (۲) ملاحظہ ہو۔

اور یہاں پر یہ اُصول بھی ملحوظ رہے کہ وقد تقررّ أنّ ما جاز للأنبياء معجزةً جاز للأولياء كرامة بشرط عدم التحدّي۔ یہ اُصول ہے کہ جو چیز بطور معجزہ کے انبیاء علیہم السلام سے ممکن ہو وہ اولیاء کیلئے بطورِ کرامت کے پیش آسکتی ہے ہاں البتہ معجزہ بطور چیلنج کے ہوتا ہے۔

اِس بارے میں بزرگوں کے چند واقعات

مناوی کہتے ہیں :

حكى من المارزي واليافعي والجيلي والشاذلي المرسي، وعلى وفا، والقطب القسطلاني وغيرهم انّهم راوه يقظةً

مارزی، یافعی، جبلی، شاذلی، مرسی، علی وفا اور قطب قسطلانی وغیرہ سے یہ نقل کیا گیا ہے

(۱) الحاوی للفتاویٰ : ۲۵۵/۲-۲۵۶، تنوير الحلك في روية النبى والملك

(۲) صحيح البخاری: مناقب الانصار، باب المعراج اور مسلم الايمان باب الاسراء برسول اللّه وفرض الصلوة ۔

کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں :

وهـم...... يعني ارباب القلوب في يقظتهم يشهدون الملائكة، وارواح الأنبياء، ويسمعون اصواتًا، ويقتبسون منهم فوائد یعنی صاحبِ دل حضرات اپنی بیداری میں ملائکہ، انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو دیکھتے ہیں، اُن کی آواز سنتے ہیں اور اُن سے استفادہ کرتے ہیں۔

قونویؒ کہتے ہیں :

من ثبتت له المناسبة بينه وبين أرواح الكمل من الأنبياء والأولياء اجتمع بهم (۱) جس شخص کو انبیاء کاملین اور اولیاء کاملین کے ساتھ مناسبت حاصل ہوتی ہے تو اس کی ملاقات ان سے ہو جاتی ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے اپنے رسالہ " تنوير الحلك في رؤية النبي والملك "میں حضورِ اکرم ﷺ کی بحالتِ بیداری زیارت وملاقات سے متعلق بے شمار واقعات ذکر کئے ہیں۔ ہم اسی رسالہ کے حوالہ سے چند ایک واقعات نقل کئے دیتے ہیں :

- شیخ صفی الدین بن ابی منصور اپنے رسالہ اور عفیف الدین یافعی روض الریاحین میں لکھتے ہیں کہ شیخ کبیر برکۃ العصر ابوعبداللہ قرشی فرماتے ہیں کہ جب ملک مصر میں قحط کی وجہ سے مہنگائی زیادہ ہوگئی تو میں محوِ دُعا ہوگیا، تو مجھ سے یہ کہا گیا کہ دُعا نہ کرو، کیونکہ اس بارے میں تم میں سے کسی کی دُعا قبول نہ ہوگی، چنانچہ میں نے ملک شام کا سفر کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری وہاں ملاقات ہوگئی۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ اہلِ مصر کے واسطے میری ضیافت میں ان کیلئے دُعا کیجئے، چنانچہ انھوں نے ان کیلئے دُعا کی تو اللہ نے اہلِ مصر کیلئے کشادگی عنایت فرمائی۔
- شیخ سراج الدین ملقن طبقات الاولیاء میں لکھتے ہیں، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا: میں نے ظہر سے پہلے حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت کی، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: بیٹے بات کیوں نہیں کرتے؟ میں نے منہ کھولا تو آپ ﷺ نے اس میں سات مرتبہ اپنا لعاب

---

(۱) شرح المناوي للشمائل على هامش جمع الوسائل :۲۳۱/۲-۲۳۲

ڈالا اور فرمایا: لوگوں سے بات کرو اور انھیں حکمت اور اچھی نصیحت سے اللہ کے راستہ پر بلاؤ، میں نے ظہر کی نماز ادا کی اور بیٹھ گیا، میرے پاس بے پناہ مخلوق آئی، مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی، میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجلس میں میرے مقابل بیٹھے ہوئے دیکھا، کہنے لگے: بیٹے کیوں بات نہیں کرتے، میں نے کہا: ابا جان مجھ پر کپکپی طاری ہورہی ہے' انہوں نے فرمایا: منہ کھولو' میں منہ کھولا تو آپ ﷺ نے اس میں چھ مرتبہ اپنا لعاب ڈالا میں نے کہا: آپ رضی اللہ عنہ نے سات مرتبہ اپنا لعاب کیوں نہیں ڈالا۔ انہوں نے فرمایا: حضور ﷺ کے ادب میں۔

- خلیفہ بن موسیٰ الہند الملکی کے سوانح میں لکھا ہے کہ وہ بکثرت آنحضرت ﷺ کو بیداری اور خواب میں دیکھا کرتے تھے، یہ کہا جاتا تھا کہ ان کا ہر کام بیداری یا خواب میں حضور اکرم ﷺ کے حکم سے ہوتا ہے' انہوں نے حضور ﷺ کو ایک رات میں سترہ دفعہ دیکھا ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: میرے اس بکثرت دیدار سے کبیدہ خاطر نہ ہونا، بہت سے ولی میری زیارت کی حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے۔(۱)
- کسی ولی کا یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ کسی فقیہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے' اس فقیہ نے کوئی حدیث بیان کی تو ان سے ان ولی نے کہا: یہ حدیث باطل ہے' فقیہ نے کہا! تمھیں کہاں سے پتہ چل گیا؟ انہوں نے کہا: یہ دیکھو حضور ﷺ تمہارے سرہانے تشریف رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث نہیں کہی' اس فقیہ کو بھی کشف ہوگیا، اس نے بھی آپ ﷺ کو دیکھا۔(۲)
- سید احمد رفاعی کا واقعہ (اس کا ذکر ہم فضائل اعمال کے واقعات میں کریں گے)۔(۳)
- شمس الدین محمد بن موسیٰ بن النعمان کی کتاب "مصباح الظلام في المستغثين بخير الأنام" میں ہے فرماتے ہیں:

میں نے یوسف بن علی الزنانی سے سنا وہ ایک ہاشمی عورت کا جو مدینہ منورہ کے پڑوس

---

(۱) الحاوی للفتاویٰ: ۲۵۹/۲،تنویر الحلك في روية النبی والملك
(۲) الحاوی للفتاوی: ۲۵۹/۲،تنویر الحلك في روية النبی والملك
(۳) الحاوی للفتاویٰ: ۲۶۱/۲، نویر الحلك ......

میں رہتی تھی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ روضہ کے خدام اس عورت کو تکلیف دیتے تھے، وہ عورت کہتی ہے کہ میں نے اس بارے میں حضور ﷺ سے مدد طلب کی تو میں نے روضہ سے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ :

تمہارے لئے میں نمونہ ہوں تم میری طرح صبر کرو۔ وہ عورت کہتی ہے کہ مجھ سے یہ تکلیف جاتی رہی وہ تینوں جو مجھے تکلیف دیا کرتے تھے مر گئے۔(۱)

- ابن سمعانی دلائل میں کہتے ہیں ہم سے ابوبکر ہبۃ اللہ بن فرج نے، ان سے ابوالقاسم یوسف بن محمد نے، ان سے یوسف بن محمد عبدالرحمٰن بن عمر ابن غنیم المؤدب نے، ان سے سلمہ بن کُھَیل نے، ان سے ان کے والد صادق نے، ان سے علی بن ابوطالب نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ :

حضورِ اکرم ﷺ کی تدفین کے بعد ایک دیہاتی ہمارے پاس آیا، حضورِ اکرم ﷺ کی قبر پر گر کر اپنے اوپر مٹی ڈالنے لگا اور کہنے لگا: آپ ﷺ نے کہا تو ہم نے آپ ﷺ کی بات سنی۔ آپ ﷺ نے اللہ عزوجل کی جانب سے باتوں کو محفوظ کیا تو ہم نے آپ ﷺ سے ان باتوں کو محفوظ کیا۔ اللہ عزوجل نے آپ پر یہ بھی نازل فرمایا:

"وَلَوْاَنَّهُمْ اِذْظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُ وْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا"(۲)

میں نے چونکہ اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور آپ ﷺ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ ﷺ میرے لئے بخشش طلب کریں؛ چنانچہ قبر سے آواز آئی تمہاری مغفرت ہو چکی۔(۳)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ :

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کہ آپ کو سلام کروں، یہ اس زمانے میں نظر بند تھے۔ انہوں نے کہا: مبارک ہو میرے بھائی میں نے حضورِ اکرم ﷺ کو اس کھڑکی سے دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عثمان! کیا ان لوگوں نے تم کو مقید

---

(۱) الحاوی للفتاویٰ : ۲/۲۶۱، نویر الحلك ...... (۲) النساء : ۶۴

(۳) الحاوی للفتاویٰ : ۲/۲۵۹،تنویر الحلك في روية النبی والملك

اور محصور کررکھا ہے؟ میں نے کہا: ہاں،تم کو پیاسا کرر کھا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔حضور ﷺ نے میری طرف ایک ڈول ڈالا جس میں پانی تھا، میں پی کر اس قدر آسودہ ہوگیا کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے سینے اور اپنے کندھوں کے درمیان محسوس کی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں ان کے خلاف تمہاری مدد کروں اور اگر چاہو تو ہمارے ہی پاس افطار کرلینا، میں نے آپ ﷺ کے پاس افطار کرنے کو پسند کیا؛ چنانچہ اسی دن آپ رضی اللہ عنہ قتل کردیئے گئے۔اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں :

وهذه القصة مشهورة عن عثمان، مخرجة في كتب الحديث بـالاسـناد۔ اخرجهاالحارث بن ابى أسامة في مسنده وغيره، وقدفهم المصنف منها أنّها روية يقظةً وان لم يصلح لكرامات لأنّ رؤية الـمـنـام يستوى فيه كل احد ولاينكرها الّامن ينكر كرامات الأولياء

حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قصہ نہایت مشہور ہے' کتب احادیث میں بہ سند نقل کیا گیا ہے، حارث بن ابی اسامہ اور دیگر لوگوں نے اسے اپنے مسانید میں نقل کیا ہے، اس سے مصنف نے یہ سمجھا ہے کہ یہ بیداری کی حالت میں دیکھنا ہے اگر یہ دیکھنا کرامات میں شمار کے لائق نہیں تو خواب میں دیکھنے میں ہر شخص برابر ہوتا ہے۔اس طرح کے واقعات کا منکر دراصل اولیاءؒ کی کرامات کا منکر ہی ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالاتحریر کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنا ان سے کلام کرنا اور آپ ﷺ کا مشکل اُمور میں رہنمائی فرمانا یہ سب کچھ ممکن ہے، بقولِ علامہ سیوطیؒ اس کا منکر وہی شخص ہوسکتا ہے جو رسوخ فی العلم سے عاری ہو۔ یہ اثار واحادیث اور بزرگوں کے واقعات حدِّ تواتر تک پہنچے ہوئے یہ واقعات اس مسئلہ کو خوب واضح کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضور اکرم ﷺ اپنے جسمِ مبارک اور روح کے ساتھ قبرِ اطہر میں تشریف رکھتے ہیں، آپ ﷺ جہاں چاہے جاتے ہیں اور جو چاہے تصرف فرماتے ہیں، قبل از وفات آپ ﷺ کی جو ہیئت اور حالت تھی، اس وقت اسی حالت میں ہیں، ہماری آنکھوں سے ایسے اوجھل ہیں جیسے فرشتے اپنے اجسام سمیت زندہ ہونے کے باوجود ہمیں نظر نہیں آتے' جب اللہ چاہتے ہیں تو جس کا اکرام مقصود ہوتا ہے اس کے درمیان سے پردہ ہٹا کر آپ ﷺ کی زیارت نصیب کرتے ہیں۔

چند شبہات کا ازالہ

بعض لوگوں نے حضورِ اکرم ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنا اس لئے ناممکن قرار دیا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کیلئے آپ ﷺ کا قبر اطہر سے نکلنا، لوگوں میں چلنا اور آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں روضہ اقدس کا جسمِ مبارک سے خالی ہونا اور دو مختلف جگہوں میں دو شخصوں کو آپ ﷺ کا نظر آنا یہ محالات لازم آتے ہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں بطورِ کرامت اور خلافِ عادت پیش آتی ہیں، لہٰذا اُسے خلافِ عقل، خلاف شریعت، یا عادت کہہ کر اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کے روضہ سے بہت دور رہنے والے ولی کو اللہ عزوجل اس طرح آپ ﷺ کی زیارت کرواسکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اور اس ولی کے درمیان کوئی حجاب یا پردہ نہ رہے، تمام حجابات رفع ہو جائیں جیسے شیشہ سے اُس کے پیچھے کی چیزیں نظر آتی ہیں اور حضور ﷺ اپنی قبر میں باحیات ہیں، لہٰذا کسی ولی کا آپ سے بات چیت کرنا، اپنی آنکھ سے آپ ﷺ کو دیکھنا، اس کیلئے دور یا نزدیک کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔

اور کوئی یہ بھی اعتراض نہیں کرسکتا کہ اگر اس طرح اولیاء اللہ کو حضور ﷺ کی بحالتِ بیداری زیارت ہوتی رہے تو یہ لوگ بھی صحابہؓ ہو جائیں گے اور صحبت قیامت تک رہے گی۔

اس کا جواب یہ ہے: یہ دیکھنا بطور خارق اور کرامت کے ہوتا ہے اور ہر قاعدہ کلیہ کے کچھ شذوذ بھی ہوتے ہیں، چونکہ یہ دیکھنا زندگی میں نہیں ہے؛ اس لئے اس دیکھنے کی وجہ سے صحابیت بھی ثابت ہونا ضروری نہیں، چونکہ یہ خلاف عادت اور قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ چیز ہے۔

اور کوئی یہ نہ کہے کہ حضرتِ فاطمہؓ حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ سے جدائیگی پر چھ مہینے تک نہایت غمزدہ رہ کر انتقال فرما گئیں، آپؓ کا گھر آنحضرت ﷺ کے روضہ کے پڑوس میں تھا، پھر حضور ﷺ آپ کو کبھی دکھائی نہیں دیئے۔

اس کا جواب یہ ہے: اس دوران حضور ﷺ کی زیارت آپ ﷺ سے منقول نہیں اس وجہ سے زیارت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ہوسکتا ہے ہوئی ہو، انہوں نے بیان نہ کیا ہو، کبھی اللہ عزوجل چھوٹے کو وہ چیز دیتے ہیں جو بڑے کو نہیں دیتے۔(وقد یکرم اللّٰہ المفضول بما لایکرم به الفاضل)۔(۱)

---

(۱) شرح المناوی للشمائل علی ھامش جمع الوسائل: ۲۳۱/۲

حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنات، ہوا، درند پرند، غرض ہر چیز پر حکومت دی گئی تھی وہ ہوا میں تخت پر اڑتے تھے۔کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیزیں حضور ﷺ کو کیوں نہیں دی گئیں، یہ تو ایسے ہی ہوا کہ کوئی معمولی آدمی کے گھر اس کا لڑکا اپنی محنت وجد وجہد اور عطاء خداوندی کے بدولت ڈاکٹر بن جائے تو اس لئے لڑکے ڈاکٹر ہونے کا انکار کردیں کہ بھائی اس معمولی آدمی کے گھر ڈاکٹر کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ خود ڈاکٹر نہیں لڑکا ڈاکٹر کیسے بن گیا؟ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کبھی چھوٹے کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو بڑے کو نہیں حاصل ہوتی۔

حیاتِ مؤمنین وحیاتِ شہداء اور حیاتِ انبیاءؑ کا فرق:

حیاتِ انبیاء علیہم السلام بہ نسبت حیاتِ شہداء کے قوی ہے جیسا کہ محققین نے تصریح کی ہے مثلا دو آدمی ہیں حیات کا تعلق دونوں سے ہے، مگر ایک قوی ہے، دوسرا ضعیف ہے، اسی طرح آنکھیں وغیرہ ہر شخص کو ہیں، مگر ایک کی نظر تیز ہے، دوسرے کی کمزور ہے۔

یہیں سے ایک دوسرے شبہ کا بھی ازالہ ہوگیا کہ جس طرح نصوص شرعیہ سے حیاتِ انبیاء علیہم السلام وشہداء ثابت ہے، اسی طرح عام موتی کی حیات بھی ثابت ہوتی ہے، چنانچہ ان کا منعّم ومعذَّب ہونا، سلام کا سننا، جواب دینا وغیرہ احادیث میں وارد ہے اور یہ لوازمات حیات میں ہیں اور جواب یہ ہے کہ انواعِ حیات متفاوت ہیں، ایک حیات اشقیاء معذبین کی ہے، دوسری حیات حیات مؤمنین منعمین کی ہے اور تیسری حیات شہداء کی ہے اور چوتھی حیات حضراتِ انبیاء صلوات اللہ علیہم والسلام کی ہے اور ظاہر ہے کہ حیاتِ شہداء اکمل واعلی ہے اور حیاتِ انبیاء علیہم السلام ان سے اکمل واعلی ہے، نیز حیاتِ انبیاء عنصری ہے اور حیاتِ مومنین وغیرہ برزخی ہے۔(۱)

○ کیا بزرگوں کی ارواح اور ان کے مردہ اجسام سے استعانت کی جاسکتی ہے؟

بزرگوں کے ارواح اور ان کے مردہ اجسام سے مطلق استعانت اور حاجت طلبی کا ہمارا بالکل عقیدہ نہیں ہے، اس بارے میں تفصیل ہے جو بالکل دقیق اور باریک ہے جس پر مطلقاً غیر اللہ سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے معنی میں لینا درست نہیں چنانچہ اس بارے میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ رقم طراز ہیں:

(۱) نوادر الفقہ، از افادات حضرت شیخ یونس صاحب مدظلہ: ۳۲۷

اِستمداد تین قسم کا ہے :

۱- ایک یہ کہ صاحبِ قبر سے یوں کہے کہ تو میرا فلاں کام کردے، یہ بالکلیہ شرک ہے خواہ یہ قبر کے پاس کہے یا قبر سے دور رہ کر کہے۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ یوں کہے! اے فلاں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ فلاں کام میرا پورا ہوجائے (اس میں صاحب قبر سے براہِ راست امداد طلب کرنا نہیں ہوتا) جو سماعِ موتیٰ (مردوں کے سننے) کے قائل ہیں، ان کے نزدیک ان کا یہ کہنا درست ہے اور دوسروں کے نزدیک ناجائز۔

۳- تیسری صورت یہ ہے کہ یوں اللہ سے دُعا مانگے کہ فلاں کی عزت وحرمت کے واسطے سے میرا کام پورا کردے یہ صورت باتفاقِ اسلاف کے جائز ہے۔ (یہ صورت توسل کی ہے جس کی صحت کیلئے ملاحظہ ہو''مسئلۂ توسل کی حقیقت)''(۱)

غیراللہ سے استعانت کے مختلف طریقے ہیں، ان میں بعض تو مطلقاً کفر اور شرک ہیں اور بعض صورتیں ان میں کتاب وسنت کی روشنی میں جائز اور درست ہیں اس کی تفصیل یوں ہے :

- غیراللہ (اللہ کے علاوہ) سے اس طور پر مدد طلب کرنا کہ اس کو مستقل بالذات (اسی کو سب کچھ سمجھ لے) اور علی الاطلاق اسی کو قادر مانے تو اس کی یہ صورت شرک محض ہے۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ غیراللہ کو موثر حقیقی اور اس کی قدرت وطاقت کو اس کی ذاتی تو نہ تصور کرے لیکن یوں کہے کہ اللہ نے اسے تمام امور میں تصرف کی صلاحیت اس کے حسب منشاوارادہ دے رکھی ہے، یہ بھی حرام اور شرک ہے۔
- تیسری صورت یہ ہے کہ غیراللہ کو مستقل بالذات قادر علی الاطلاق یا بواسطہ ذات خداوندی اس کو تمام اُمور میں اس کے اختیار سے تصرف کرنے کا عقیدہ تو نہ رکھے، لیکن اس کے نام کی نذر ونیاز کرے یہ سب بھی بلا کسی شک کے شرک وکفر ہے۔
- چوتھی صورت یہ ہے کہ چیزوں سے ایسے مدد حاصل کی جائے کہ جس سے ان کا مستقل بالذات ہونا سمجھ میں آتا ہو جیسے آسمان وزمین کی ارواح سے مدد طلب کرنا، یہ بھی کفر اور شرک ہے۔

---

(۱) فتاویٰ رشیدیہ، مطبوعہ مکتبہ تھانوی دیوبند: ۲۳۱/۲

ہاں البتہ جس شخص کا کامل بھروسہ ذات خداوندی پر ہو اور غیر اللہ کو محض اللہ عزّ وجل کی مدد ونصرت کے نزول کا محل اور موقع سمجھتا ہو اور غیر اللہ سے ایسے مدد چاہتا ہو جیسے اُمور عادیہ (عام چیزوں) میں مدد طلب کی جاتی ہے جیسے مرض کے دفعیہ اور ازالہ کیلئے ڈاکٹر سے استعانت کی جاتی ہے یا شرعی اُمور یعنی دینی یا دُنیوی ضروریات میں کسی اللہ کے نیک اور مقبول بندے سے استعانت چاہی جائے تو یہ صورت جائز اور دُرست ہے، چونکہ یہ دراصل، اللہ عزوجل سے حاجت روائی کے درجے اور مرتبے میں ہے، یہاں اللہ کا غیر محض سبب اور ذریعہ کے درجہ میں ہوتا ہے اور اس طرح کا یہ مفہوم (سورۃ فاتحہ کی اِس آیت اِيَّـاكَ نَسْتَعِيْنُ جوکہ صرف استعانت باللہ (صرف اللہ سے مدد طلب کرنے) کے جائز ہونے پر دلالت کررہی ہے اور دیگر آیات واحادیث جوکہ پانچویں صورت میں ذکر کردہ استمداد (مدد طلب کرنے) کے جائز اور درست ہونے پر دلالت کرتی ہیں) کو سامنے رکھ کر حاصل کیا گیا ہے۔اس پر یہ روایت دلالت کرتی ہے جو توسل سے تعلق رکھتی ہے:

''ایک شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس ضروری کام کے سلسلے میں آیا جایا کرتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غالباً مصروفیت کی وجہ سے نہ تو اس کی طرف توجہ فرماتے اور نہ اس کی حاجت براری کرتے، وہ شخص حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے ملا اور اس کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا: وضو کی جگہ جا اور وضو کر، پھر مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ، پھر کہہ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور بوسیلہ حضرت محمد ﷺ تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں جو نبی الرحمہ ہیں''۔

اِسی روایت کے آخر میں اس کی تصریح ہے کہ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور اس دعا کی برکت کی وجہ سے حضرتِ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کی تعظیم وتکریم بھی کی اور اس کا کام بھی پورا کردیا۔

امام طبرانیؒ فرماتے ہیں : "والحدیث صحیح "(۱)

اِمام منذریؒ بھی اس روایت کو نقل کرکے امام طبرانیؒ کے اس قول "والحدیث صحیح" کی تائید کرتے ہیں۔(۲)

---

(۱) معجم الصغیر : ۱۰۴ (۲) الترغیب والترھیب: ۲۴۲/۱

۱- جیسے اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: "وَاسْتَعِيْنُوْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاة"(۱) "نماز اور صبر سے مدد حاصل کیا کرو"۔

اس آیت میں نماز اور صبر سے مدد چاہی گئی ہے جو کہ دراصل ذاتِ خداوندی سے مدد کے حصول کے ذرائع اور اسباب ہیں۔

۲- ایک شخص خدمتِ اقدس ﷺ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: فلاں شخص میرے مال کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے، تو آپ نے فرمایا "ذکّره باللّٰه" اسے اللہ کا خوف دلاؤ، اگر پھر بھی باز نہ آئے تو "فاستعن بمن حولك من المسلمين" تمہارے قریبی مسلمانوں سے اس کے خلاف مدد لو، اس نے عرض کیا کہ اطراف میں مسلمان موجود نہ ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: "فاستعن عليه بالسلطان" اس بارے میں حاکم وقت سے مدد طلب کرو، اس نے کہا کہ اگر بادشاہ وقت بھی مجھ سے دور ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو تم اپنے مال کی خاطر اس کا مقابلہ کرو، لڑتے لڑتے تم شہادت کے مرتبہ پر پہنچ جاؤ یا وہ تمہارے مال (پر ناحق تصرف) سے رک جائے۔(۲)

۳- کعب بن ربیع سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں حضورِ اکرم ﷺ کی صحبت میں شب گذاری کرتا تھا آپ ﷺ کے وضو کا پانی اور دیگر ضروریات کی دیکھ بھال کرتا، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا "سل" مانگ میں نے کہا: میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طالب ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اس کے علاوہ تمہاری کوئی اور ضرورت بھی ہے؟ میں نے کہا: میری تو بس یہی ضرورت ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "فاعنی علی نفسك بكثرة السجود" لہٰذا تم بکثرت سجدوں (نمازوں کے ذریعہ میری مدد کرتے رہو)۔(۳)

۴- مصعب بن سعد روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ سعد نے دیکھا کہ انہیں دوسروں کے مقابلے کچھ برتری حاصل ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "هل تنصرون وترزقون الا بضعفائكم" تمہارے کمزوروں ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں

---

(۱) بقرة : ۴۵ (۲) نسائی : ما يفعل من تعرض لماله ،حديث:۴۰۸۱

(۳) مسلم: باب فضل السجود والحث عليه، حديث:۱۱۲۲-۲۲۶،مع تحقيق محمد فؤاد عبدا لباقی:۲۹۴/۵،سنن ابی داؤد ، باب وقت قيام النبی من الليل، حديث:۱۳۲۲،مطبوعة بيروت

رزق دیا جاتا ہے۔(۱)

ان مذکورہ بالا روایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ کے غیر سے اس طرح اُمورِ عادیہ (عام چیزوں) اور اُمورِ شرعیہ (شریعت سے متعلق چیزیں) میں مدد لی جاسکتی ہے۔

○ بزرگوں کی روحانیت اور ان کے سینوں اور قبروں سے فیض کا حصول

اس بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بزرگوں کی روحانیت سے استفادہ اور ان کے سینوں اور قبروں سے فیوض کا حاصل کرنا بالکل درست ہے لیکن اس طریق پر نہیں جو عوام میں رائج ہے بلکہ خواص اور صاحب کشف حضرات اس طرز کو جانتے ہیں (کشف کی بحث آگے آئے گی)۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں :

مزارات اولیاء سے کاملین کو فیض حاصل ہوتا ہے، مگر عوام کو اس کی اجازت دینی ہرگز جائز نہیں اور تحصیل فیض کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہے، جب جانے والا اہل ہوتا ہے تو اس طرف سے حسبِ استعداد فیضان ہوتا ہے مگر عوام میں ان امور کا بیان کرنا کفر وشرک کا دروازہ کھولنا ہے۔(۲)

کاملین کیلئے قبروں سے فیض کے حصول پر یہ روایت دلالت کرتی ہے :

عن ابن عباس ﷺ قال: ضرب بعض اصحاب النبی ﷺ بائة علی قبرٍ وھو لا یحتسب أنه قبر فاذا فیه الانسان یقرأ (تبارك الذی بیده الملك) حتی ختمها فاتی النبی ﷺ اخبره، فقال النبی ﷺ ھی المانعة، ھی المنجیة تنجیه من عذاب الله (۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی صحابی نے اپنا خیمہ ایک قبر پر لگایا اور ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ قبر ہے سو اس میں ایک آدمی معلوم ہوا جو سورۂ ملک پڑھ رہا ہے، یہاں تک کہ اس کو

(۱) صحیح البخاری: باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب: ۲۷۳۹

(۲) فتاویٰ رشیدیہ، مطبوعہ مکتبہ تھانوی دیوبند: ۱۰۴

(۳) ترمذی: فضائل القرآن، فضل سورة الملك حدیث: ۲۸۹۰، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔

ختم کیا، وہ صحابی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اس واقعہ کی خبر آپ کو دی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''یہ سورت حفاظت کرنے والی ہے، یہ سورۃ نجات دینے والی ہے، یہی مردہ کو عذابِ الٰہی سے (جو کہ قبر میں ہوتا ہے) نجات دیتی ہے''۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مجید کا سننا انسان کے باطن کیلئے نفع بخش ہوتا ہے اور یہ نفع اُن صحابی رضی اللہ عنہ کو صاحب قبر کے واسطے سے ہوا، اس سے اہلِ قبور کے فیضان کا ثبوت ہوتا ہے۔

اسلاف کے واقعات

اور اسلافِ اُمت نے اس قسم کے بے شمار واقعات بیان کئے ہیں: چنانچہ خطیب بغدادیؒ نقل کرتے ہیں کہ علی بن میمون نے بیان کیا کہ میں نے امام شافعیؒ کو یہ کہتے سنا کہ :

''میں (امام شافعیؒ) امام ابوحنیفہؒ کی قبر سے برکت حاصل کرتا ہوں اور ہر دن اُن کی قبر کی زیارت کو جاتا ہوں جب بھی مجھے کوئی حاجت پیش آتی ہے، میں دو رکعت پڑھ کر ان کی قبر کے پاس جاتا ہوں اور اللہ سے اپنی ضرورت کا سوال کرتا ہوں چنانچہ تھوڑی دور بھی نہیں جاتا ہوں کہ میری ضرورت پوری ہوتی ہے''۔(۱)

خطیبِ بغدادی نے اپنی کتاب تاریخ بغداد(۲) میں احمد بن حنبلؒ کی قبر سے فیض کے حصول کا تذکرہ کیا ہے۔اِس طرح کے بے شمار واقعات متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔

امام جزریؒ کی بحث

امامِ جزریؒ نے حصن حصین میں قبولیتِ دعا کے مقامات کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا :

''کعبۃ اللہ پر نظر پڑنے کے وقت دُعا قبول ہوتی ہے۔مسجدِ حرام، مسجد نبوی ﷺ اور مسجدِ اقصیٰ کے بہت سے مقامات میں، سورہ الانعام میں دو لفظ اللہ کے درمیان، طواف اور ملتزم کے پاس، اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کی قبورِ مبارکہ کے پاس دعا کی قبولیت کو مجرب بتایا ہے، آپ نے صالحین کی قبروں کے پاس بھی کچھ مشہور شرطوں کے ساتھ دعا کے مقبول ہونے کو تجربہ شدہ فرمایا ہے پھر وہ آگے علامہ شوکانیؒ اور امام جزریؒ کی ایک عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (ان مقامات پر دعاؤں کی قبولیت) کی وجہ ان کے مقام و مرتبہ کا بلند ہونا اور برکت کا نازل ہونا ہے اور ہم پہلے یہ بات ذکر

(۱) تاریخ بغداد: ۱/۱۲۳ (۲) تاریخ بغداد: ۲۱-۲۲

کر چکے ہیں کہ جگہ کی برکت دعا کرنے والے پر اثر انداز ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ کے ذکر میں مشغول صالحین کی مجلس میں اگر کوئی دوسرا شخص آجائے تو وہ بھی ان پر اثر نے اُترنی والی برکت ورحمت سے فیض یاب ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ایسی جماعت ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا محروم نہیں ہوتا‘‘(۱)

علامہ جزریؒ کی یہ عبارت بھی خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ وہ بھی بزرگوں کے قبور سے فیض کے حصول کو ثابت کررہے ہیں مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کے فضائل اعمال میں مذکورہ واقعات پر تنقید کی گنجائش نہیں اس لئے ایک تو حدیث سے اس کا ثبوت ہوتا ہے، دوسرے اسلافِ امت کی معتمد کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں اور علامہ جزری کی بحث بھی بزرگوں کی روحانیت سے فیض کے حصول پر دلالت کرتی ہے اور یہ فیض کا حصول براہِ راست اور مستقل طور سے ان سے نہیں ہوتا، بلکہ ان کے اللہ کے مقبول بندے ہونے کی وجہ سے ان کی روحانیت کے توسط سے فیضان کے حصول کی کوشش ہوتی ہے؛ چنانچہ حضرت مولانا زکریا صاحب لکھتے ہیں:

۱۔ حضرتِ حاتم اصم بلخی جو مشہور صوفیہ میں سے ہیں کہتے ہیں کہ تیس برس تک ایک قبر میں انہوں نے یہ چلہ کیا تھا کہ بے ضرورت کسی سے بات نہ کی، جب حضورِ اقدس ﷺ کی قبر پر حاضر ہوئے تو اتنا ہی عرض کیا تھا کہ اے اللہ ہم لوگ تیرے نبی ﷺ کی قبر کی زیارت کو حاضر ہوئے ہیں تو ہمیں نامراد واپس نہ کیجیو، غیب سے آواز آئی ہم نے تمہیں اپنے نبی کی قبر کی زیارت نصیب ہی اس لئے کی ہے کہ اس کو قبول فرمائیں، جاؤ ہم نے تمہارے اور تمہارے ساتھ جتنے حاضر ہیں سب کی مغفرت کر دی۔(۲)

۲۔ مصر کے ایک صاحب خیر ایک ضرورت مند کیلئے ایک سخی کی قبر پر درخواست گذار ہوئے رات کو وہ بزرگ انہیں خواب میں ملے اور کہا کہ تم میرے گھر والوں کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ مکان کے فلاں حصے میں جو چولھا بن رہا ہے اس کے نیچے ایک چینی کا مرتبان گڑا ہے اس میں پانچ سو اشرفیاں ہیں وہ اس فقیر کو دے دیں، یہ خواب حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور اس پر عمل کیا گیا۔(۳)

اس طرح کے مزید واقعات (فضائل صدقات ص۹۴۴) (فضائل حج ص۱۳۳) میں ملاحظہ ہوں۔

---

(۱) تحفة الذاکرین:۶۳ (۲) فضائل حج،فصل زائرین کے واقعات:۴ (۳) فضائل صدقات:۱۲:۷

مکاشفات کے مسائل

بزرگوں کیلئے عالم غیب (غیب کی دنیا) کی چیزوں کا ظاہر اور منکشف ہونا بالکل حق اور درست ہے، اگر شریعت پر کامل پیروی اور اِتباع کے ساتھ ان اُمورِغیبیہ کا ظہور ہو تو یہ ایک نہایت ہی بلند و بالا حالت ہے، مزید کشف کے ذریعہ قبر اور قبر والوں کے احوال بلکہ لوگوں کے دلوں کے احوال بھی بسااوقات ظاہر ہوجاتے ہیں' کشف کے درست ہونے پر صحیح احادیث اور بزرگوں کے بے شمار وان گنت واقعات دال ہیں۔

خود علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی مجموع فتاوی شیخ الاسلام میں کشف کی حقیقت کو بیان کرنے کیلئے مستقل باب باندھا ہے جس کیلئے ملاحظہ ہو (ج:۱۱/۳۱۳،۳۱۴) انہوں نے ایک جگہ یوں فرمایا ہے:

المکاشافات التی تکون لأھل الصفا جزء من جزء علم الأمور الکونیہ (۱) اہلِ اخلاص کیلئے جو مکاشفات ہوتے ہیں وہ تکوینی علوم کا ایک نہایت ادنیٰ درجہ ہوتا ہے۔

پھر آگے مزید ارشاد فرماتے ہیں :

وأما خواص الناس فقد یعلمون عواقب اقوام بما کشف اللّٰہ لھم (۲) رہے خاص لوگ وہ اللہ عزوجل کی عطا کردہ کشف کی دولت سے لوگوں کے انجام پر واقف ہوتے ہیں۔

کشف کی قسمیں

کشف دو طرح کا ہوتا ہے: کشفِ کونی، کشفِ الٰہی۔

---

(۱) مجموع الفتاویٰ :بیان أنواع العلم : ۳۹۸/۱۱

(۲) مجموع الفتاویٰ : فی أن الأولیاء ھم :۶۵/۱۱،مجمع الملك فھد

کشفِ کونی یہ ہے کہ کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے ،جگہ کی دوری وزمانہ کا بعد کوئی چیز اس کے درمیان حائل نہ ہو۔

کشفِ الٰہی یہ ہے کہ بندے کے دل پر علوم واسرار، دقیق وباریک معارف وحقائق ظاہر ہوں، خدا کی ذات وصفات کی حقیقت اس پر منکشف ہو جائے اور یہ تمام چیزیں صورتِ مثالیہ میں اسے نظر آئیں۔(۱)

کشف بندے کے اختیار میں نہیں

پہلے ہم آیت کے ذیل میں اس مسئلہ سے متعلق کچھ باتیں ذکر چکے ہیں :

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّأْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲)

''اور کوئی رسول بھی اللہ کی مدد اور اس کی قدرت کے بغیر کوئی نشانی نہیں لاسکتا''

اس لئے اس آیت کی روشنی میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بزرگوں کو جو کشف ہوتا ہے وہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ ان کے اختیار سے باہر ہوتا ہے، یہاں تک کہ نبیوں کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا، چنانچہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کو ایک مدت تک حضرتِ یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوئی، حالانکہ اس غیبوبت (گمشدگی) کی حالت میں ان کو اس قدر رنج وغم ہوا کہ روتے روتے ان کے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، جب اللہ عزوجل نے انہیں یوسف علیہ السلام کے احوال کی اطلاع دینا چاہا تو میلوں سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو آئی۔

اِسی حقیقت کو بیان کرنے کیلئے یوں کہا گیا ہے کہ کشف دوطرح سے ہوتا ہے، ایک تو صاحبِ کشف کے اختیار سے اور دوسرے اس کے اختیار کے بغیر، لیکن بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ صاحبِ کشف کے ارادے اور اختیار کو اس میں دخل ہوتا ہے، لیکن اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل نہیں ہو پاتا اور اس کی یہ محنت رائیگاں جاتی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ کشف کا بالکلیہ اختیار بندے میں نہیں ہے، کبھی بندے کے ارادہ سے کشف تو ہو جاتا ہے پر اس کے اثرات حاصل نہیں ہوتے)۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے دریافت کیا گیا کہ بعض بزرگوں کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ وہ صاحبِ کشف ہیں اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کیا وہ شخص خود اپنے ارادے اور اختیار سے مخفی چیزوں پر واقف ہو جاتا ہے، یا اللہ کا فضل اور اس کا ارادہ اس کیلئے شامل حال ہوتا

---

(۱) شریعت و طریقت : ۳۳ (۲) غافر :۷۸

ہے تو انہوں نے فرمایا: کشف کبھی تو بندے کے ارادہ سے حاصل ہوتا ہے، کبھی بغیر ارادے کے اور کبھی اس کے ارادہ اور کوشش کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا، مختصر یہ کہ کشف وکرامات بندے کے اختیار میں نہیں ہوتے، ہاں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی بندے نے کشف کیلئے ارادہ کیا اور اسی وقت اللہ کی مدد شامل حال ہوگئی۔

اس بحث کو سامنے رکھنے سے بہت سے اشکالات واعتراضات دفع ہوجاتے ہیں کہ کسی بزرگ کے ساتھ کوئی انتہائی عجیب کرامت یا کشف کا ظہور ہوجائے تو یہ نہیں کیا جاسکتا کہ نبی کے ساتھ اس کشف وکرامت کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ نبی کے بعض دیگر معجزات کے سامنے ولی کی جزئی کرامت بالکل ہیچ ہوتی ہیں۔ الغرض یہ کہ بندے کیلئے ہمیشہ اور دائمی طور پر اپنے ارادے اور اختیار سے اس کیلئے کشف یا کرامت کا ظہور ہو یہ آیات واحادیث کی روشنی میں منع اور محال ہے۔

کشف کی شرعی حیثیت ومقام

کشف کا ہونا یہ کوئی بڑا کمال نہیں، بلکہ اصل اتباعِ شریعت ہے، چونکہ کشف (جو معتبر ہے) وہ اتباعِ شریعت اور احکام الٰہیہ کی کامل تابعداری کے نتیجے میں ہوتا ہے۔

کشف والہام سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، اگر یہ شریعت کے اصول وقواعد کے موافق ہو تو قابل عمل ہوگا ورنہ واجب الترک (بالکل چھوڑ دینا) اگر یہ شریعت کے اصول وقواعد کے خلاف تو نہ ہو، لیکن کشف باہم مختلف ہوں اگر وہ دونوں کشف ایک کے ہوں تو اخیر کا کشف معتبر ہوگا یا جن میں قبولیت کے آثار زیادہ ہوں اس کا کشف معتبر مانا جائے گا۔

کشف احادیث کی روشنی میں

○ کشفِ ملائکہ : یعنی فرشتوں کا نظر آنا

عن سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ قال: رأیت علی یمین رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی شماله یوم أحدٍ رجلین، علیهما ثیاب بیض، یقاتلان کأشد القتال ما رأیتهما قبل ولا بعد(۱)

(۱) بخاری: المغازی، باب اذ همت طائفتان منکم ان تفشلا، رقم: ۴۰۵۴، مسلم: فضائل اکرامه صلی اللہ علیہ وسلم بقتال الملائکة معه، حدیث:۲۳۰۶

حضرتِ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں غزوۂ اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داہنے بائیں جانب دو شخص دیکھے جن پر سفید کپڑے تھے اور وہ بہت سخت لڑ رہے تھے میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا اور نہ بعد میں یعنی وہ دونوں جبرائیل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرشتوں کا نظر آنا، فرشتوں سے ان کا بات چیت اور مصافحہ کرنا، ان کا فرشتوں کی باتوں کو سننا، ان کے تلاوتِ قرآن کے وقت فرشتوں کا آموجود ہونا اس قسم کے بے شمار واقعات حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم سے متعلق کتب میں صحیح اسانید کے ساتھ موجود ہیں اگر اس کی تفصیل چاہئے تو ''حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم :۵۶۷/۳ تا ۶۳۷، مطبوعہ پریش علی گڑھ الہند'' ملاحظہ کیا جائے۔

○ غیر نبی (ولی) کو بھی فرشتے نظر آتے ہیں

عن اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ قال: بینما هو یقرأ من اللیل سورة البقرة وفرسه مربوط عنده، اذجالت الفرس فسکت، فسکنت الفرس، ثم قرأ فجالت وکان ابنه یحیی قریباً منها فانصرف، فاخرجه، ثم رفع رأسه الی السماء فاذا مثّل اللّٰه فیها امثال المصابیع فلما اصبح حدث به النبی فقال " أوتدری ماذاك؟ " قال: لا فقال: تلك الملائکة دنت بصوتك ولو قرأت لأصبحت ینظر إلیها الناس لا تتواریٰ منهم (۱)

حضرتِ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک شب کو سورۃ البقرہ پڑھ رہے تھے اور ان کا گھوڑا ان کے پاس بندھا ہوا تھا' دفعۃً گھوڑا اُچھلا یہ پڑھتے پڑھتے خاموش ہوگئے، وہ گھوڑا بھی ٹھہر گیا، یہ پھر پڑھنے لگے وہ پھر اچھلنے لگا، یہ پھر خاموش ہوگئے، وہ ٹھہر گیا، انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا وہ پھر اُچھلنے لگا اور ان کا لڑکا یحییٰ اس سے قریب تھا یہ وہاں سے چلے اور اس لڑکے کو ہٹالیا، پھر سر اٹھا کر جو آسمان کی طرف دیکھا تو اس میں ایک سائبان نظر پڑا، جس میں چراغ سے معلوم ہوئے جب صبح ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ فرشتے تھے

(۱) بخاری : فضائل القرآن، نزول الملئکة عند قرأة القرآن رقم: ۵۰۱۸

کہ تمہاری آواز سے نزدیک آ گئے تھے اور اگر تم پڑھتے رہتے تو صبح کے وقت تک وہ یہاں رہتے کہ سب لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے''۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اولیاء کرامؒ کو فرشتے دکھائی دیتے ہیں' بلکہ سلام اور کلام بھی ممکن بلکہ واقع ہے، اس حدیث میں صراحتاً اس کشف کا واقع ہونا مذکور ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حسین رضی اللہ عنہ کو بحالتِ بیماری فرشتوں کا سلام کرنا مذکور ہے، انبیاءؑ اور اولیاءؒ کیلئے فرشتوں کے نظر آنے اور ان سے بات چیت کرنے میں فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ان باتوں کو لوگوں تک پہنچانے کے مکلّف ہوئے ہیں اور غیر نبی کیلئے اس کی تبلیغ ضروری نہیں ہوتی۔

بعض اوقات اہلِ کشف کو اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہلِ کشف کیلئے اپنے کشف کی حقیقت معلوم ہونا ضروری نہیں، چنانچہ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو ملائکہ کا کشف ہوا، مگر انہیں یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ فرشتے ہی ہیں، لہٰذا بعض لوگوں کا یہ اعتراض کہ حضرت لوط اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے پاس فرشتے آئے لیکن انہیں ان کے فرشتے ہونے کی اطلاع نہ ہوسکی حتی کہ انہوں نے ان کیلئے مہمان نوازی کا انتظام کیا اور اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے قوم کی غیر فطری حرکت سے ان کو بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو دیگر لوگوں کو ان کے فرشتے ہونے کی اطلاع کیسے ہوگئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات ولی کیلئے اپنے کشف کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور کبھی نہیں معلوم ہوتی' جیسا کہ اس روایت میں ان صحابی کو فرشتوں کا علم نہ ہوسکا اور اس سے پہلے ذکر کردہ روایت میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ان فرشتوں کے بارے میں علم ہوگیا تھا کہ وہ جبرائیل علیہ السلام اور میکائل علیہ السلام تھے۔

لہٰذا فضائل اعمال مولفہ حضرت زکریاؒ میں اس طرح کے اولیاء اللہ کے فرشتوں کے نظر آنے اور ان کی ضروریات پورا کرنے سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں، وہ اوپر ذکر کردہ احادیث کی روشنی میں صد فیصد صحیح ہیں:

حضرت مولانا زکریا صاحبؒ لکھتے ہیں:

''حسن بن حی کہتے ہیں کہ میرے بھائی علی کا جس رات انتقال ہوا انہوں نے مجھے آواز دے کر پانی مانگا، میری نماز کی نیت بندھ رہی تھی، میں سلام پھیر کر پانی لے کر گیا تو وہ

فرمانے لگے، میں تو پی چکا میں نے کہا آپ نے کہاں سے پی لیا، گھر میں تو میرے اور آپ کے سوا کوئی نہیں۔ کہنے لگے، حضرت جبرائیل علیہ السلام ابھی پانی لائے تھے، وہ مجھے پلا گئے اور یہ فرما گئے کہ تو اور تیرا بھائی ان لوگوں میں سے ہیں جن پر حق تعالیٰ نے انعام فرما رکھا ہے۔'' (۱)

حضرتِ حنظلہ رضی اللہ عنہ جو کاتبِ وحی رسول تھے ان کی یہ مشہور روایت ہے جس سے فرشتوں کا ظاہر ہونا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ انہیں اپنے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں موجودگی اور عدم موجودگی میں فکرِ آخرت کے تعلق سے فرق محسوس ہوا تو انہیں اپنے منافق ہونے کا یقین ہو گیا اور انہوں نے اپنی اس کیفیت کا اظہار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کیا تو وہ بھی ان کے ہم خیال ہو گئے، چنانچہ ان دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اس کیفیت کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا:

''والذی نفسی بیده لوتدومون علی ماتکونو، عندی أو في الذکر لصافحتکم الملائکة علی فرشکم وفي طرقکم ولکن یاحنظلة ساعة وساعة'' ثلث مراتٍ (۲) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم جس حالت پر میرے پاس ہوتے ہو اگر تم لوگوں کو اس پر یا فرمایا کہ ذکر پر دوام حاصل ہو جائے تو تم سے بستروں پر اور سڑکوں پر ملائکہ مصافحہ کرنے لگیں، لیکن اے حنظلہ ایک گھڑی کیسی ایک گھڑی کیسی، یہ مضمون آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اوراد واذکار کی زیادتی اشغال ومراقبات کی کثرت سے جب نفس میں یکسوئی اور استغراق کی کیفیت غالب ہوتی ہے تو اس حالت کے فرشتوں سے مناسبت کی وجہ سے کبھی ان کا انکشاف ہو جاتا ہے اس حدیث سے اس کا امکان بلکہ واقع ہونا معلوم ہوتا ہے، بلکہ انکشاف سے بڑھ کر ملاقات کا بھی اثبات ہے۔ چنانچہ فضائل اعمال میں مذکورہ اس قسم کے واقعات کچھ محال نہیں ہیں۔

شیخ اسماعیل فرغانی کہتے ہیں کہ مجھے ایک عرصہ سے اسمِ اعظم سیکھنے کی تمنا تھی مجاہدے بہت کرتا تھا، کئی کئی دن فاقے کرتا حتی کہ فاقوں کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر جاتا، ایک

---

(۱) فضائلِ صدقات : ۴۷۹

(۲) مسلم: التوبة، فضل دوام الذکر والفکر فی الاخرة حدیث: ۲۷۵، ترمذی: صفة القیامة، باب حدیث حنظلة رقم: ۲۵۱۴، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔

روز میں دمشق کی مسجد میں بیٹھا تھا کہ دو آدمی مسجد میں داخل ہوئے اور میرے قریب کھڑے ہوگئے، مجھے ان کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ یہ فرشتے معلوم ہوتے ہیں، ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا کیا تو اسم اعظم سیکھنا چاہتا ہے، اس نے کہا ہاں بتا دیجئے، میں یہ گفتگو سن کر غور کرنے لگا، اس نے کہا وہ لفظ اللہ ہے بشرطیکہ صدقِ دِل سے ہو۔(۱)

○ غیب کی چیزوں کا ظاہر ہونا

بسا اوقات بزرگوں کیلئے بطور کشف کے عالم غیب کے احوال نظر آتے ہیں بے شمار احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے :

۱- عن انسٍ رضی اللہ عنہ فی قصة احدٍ قولُ انس بن النضر قال: یاسعد بن معاذ! الجنة ورب النضر، إنی لأجد ریحها من دون احدٍ (۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قصۂ احد میں ان کے چچا حضرت انس بن نضر کا قول مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا، اے سعد بن معاذ! قسم ہے نضر کے پروردگار کی کہ جنت کی خوشبو پاتا ہوں جبلِ احد کے پیچھے سے۔

۲- عن جابر رضی اللہ عنہ قال لما حضر احدُ دعانی ابی من اللیل فقال ما ارأنی الا مقتولاً فی اوّل من یقتل من اصحاب النبی وإنی لا اترك بعدي اعزّ علیّ منك غیر نفس رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم إنّ علیّ دیناً فاقض واستوص باخواتك خیراً فاصبحنا فکان اول قتیلٍ ودفنته مع اٰخر في قبرٍ (۳) حضرتِ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب معرکۂ اُحد پیش آنے والا تھا تو رات میں مجھے میرے والد نے بلایا، کہنے لگے: مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے سب سے پہلے شہید کیا جاؤں گا، اگر تمہارے علاوہ مجھے سب سے زیادہ عزیز چیز جسے چھوڑ کر جا رہا ہوں کوئی ہے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک، میرا کچھ قرض ہے اُسے پورا کرو، اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو؛ چنانچہ صبح سب

---

(۱) فضائلِ اعمال، ذکر: ص ۹۸، بعد از حدیث ۲۹، فصل سوم

(۲) بخاری: الجهاد، باب قول اللّٰه من المؤمنین رجال صدقوا، حدیث:۲۶۵۱، مسلم:الأمارة، ثبوت الجنة للشهید :۱۴۸، ترمذی:۳۲۰ وقال حسن صحیح

(۳) بخاری: هل یخرج المیت من القبر واللحد، حدیث: ۱۲۸۶

سے پہلے وہی شہید کردیئے گئے تو میں نے انہیں ایک دوسرے شہید کے ساتھ دفن کردیا۔

۳- حرام بن ملحان کو بئر معونہ کے موقع سے جب نیزہ لگا تھا تو انہوں نے یوں فرمایا تھا "فزت ورب الکعبة" رب کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہوگیا۔(۱)

ایسے دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بے شمار واقعات ہیں، جس سے بطور کشف وکرامت کے اللہ والوں کیلئے امورِ آخرت کے منکشف ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا فضائل اعمال مولفہ حضرت زکریاؒ میں جو بزرگوں کے بطور کشف امورِ آخرت سے واقفیت کا تذکرہ ملتا ہے وہ محال اور بعید از قیاس نہیں ہیں۔

- ایک بزرگ کا جو واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اللہ سے دُعا کی کہ ان پر شیطان کے وسوسہ ڈالنے کی کیفیت منکشف ہوجائے تو انہیں یہ نظر آئی کہ بائیں طرف مونڈھے کے پیچھے مچھر کی شکل سے بیٹھا ہے، ایک لمبی سونڈ منہ پر ہے، جس کو سوئی کی طرح دل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کو ذاکر پاتا ہے تو اس سونڈ کو کھینچ لیتا ہے غافل پاتا ہے تو اس سونڈ کے ذریعے وساوس اور گناہوں کا زہر انجکشن کے طریقہ سے دل میں بھرتا ہے۔(۲)
- شیخ ابو یزید قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ سنا کہ جو شخص ستر ہزار مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات ملے، میں نے یہ خبر سن کر ایک نصاب یعنی، ستر ہزار کی تعداد اپنی بیوی کیلئے بھی پڑھا اور کئی نصاب اپنے لئے بھی ذخیرۂ آخرت بنایا، ہمارے پاس ایک نوجوان رہتا تھا، جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ یہ صاحبِ کشف ہے، جنت ودوزخ کا بھی اُسے کشف ہوتا ہے، مجھے اس کی صحت میں کچھ تردد تھا، ایک مرتبہ وہ نوجوان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھا کہ دفعۃً اس نے ایک چیخ ماری اور سانس پھولنے لگا اور کہا کہ میری ماں دوزخ میں جل رہی ہے، اس کی حالت مجھے نظر آئی، قرطبیؒ کہتے ہیں کہ میں اس کی گھبراہٹ کو دیکھ رہا تھا، مجھے خیال آیا کہ ایک نصاب اس کی ماں کو بخش دوں، جس سے اس کی سچائی کا بھی مجھے تجربہ ہوجائے چنانچہ میں نے چپکے سے وہ نصاب بخش دیا، مگر وہ نوجوان فوراً کہنے لگا کہ چچا میری ماں دوزخ کے عذاب سے ہٹادی گئی۔

---

(۱) بخاری: کتاب المغازی، باب غزوۃ الرجیع، حدیث:۳۸۶۵

(۲) فضائلِ ذکر:۳۷، بعداز حدیث ۱۴، فصل ثانی

- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا جب انتقال ہونے لگا تو فرمایا مجھے بٹھا دو لوگوں نے بٹھا دیا پھر فرمایا (یا اللہ تو نے مجھے بہت سے کاموں کا حکم فرمایا مجھ سے اس میں کوتاہی ہوئی، تو نے مجھے بہت سی باتوں سے منع کیا مجھ سے اس میں نافرمانی ہوئی، تین مرتبہ یہی کہتے رہے اس کے بعد فرمایا لیکن لا الہ الا اللہ فرما کر ایک جانب غور سے دیکھنے لگے، کسی نے پوچھا کیا دیکھتے ہو؟ فرمایا کچھ سبز چیزیں ہیں کہ نہ وہ آدمی ہیں نہ جن، اس کے بعد انتقال فرمایا۔(۱)
- بعینہٖ ایسا ہی واقعہ ابولعباس کا ہے جو فضائل اعمال میں مذکور ہے۔
- ایسے ہی امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ ہے کہ انہیں وضو کا پانی گرنے کے ساتھ لوگوں کے کس گناہ کا ازالہ ہوتا ہے معلوم ہوتا تھا۔(۲)

یہ تمام واقعات بالکل مستبعد نہیں بخاری کی روایات میں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا صحابہ رضی اللہ عنہم کیلئے امورِ آخرت جنت وغیرہ کا انکشاف کا ذکر ہے، ایسے ہی بزرگوں کیلئے بطور کشف و کرامت کے باذن اللہ یہ واقعات صادر و ظاہر ہو سکتے ہیں۔

عالمِ غیب کی آواز کا ظاہر ہونا

عن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل عليه الوحي يسمع عندوجهه كدوي النحل (۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ایک ایسی غیر مفہوم آواز سنائی دیتی جیسے شہد کی مکھی کی آواز ہوتی ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اوقات شغل (پورے طریقے سے متوجہ الی اللہ ہونے) سے، بعض اوقات کسی بزرگ کی قربت کی برکت سے بعض اوقات دوسرے اسباب سے عالم غیب کی آواز منکشف ہو جاتی ہے، حدیث میں ایسی ہی آواز کا ذکر ہے، لیکن متوجہ اِلی اللہ ہونے کے وقت آنے والی ہر اس آواز کو غیبی آواز نہیں کہا جا سکتا۔

اس حدیث کی روشنی میں اس طرح کے واقعات کچھ مستبعد نہیں :

(۱) فضائل ذکر:۱۰۳، بعد از حدیث ۳۲ فصل سوم (۲) فضائل ذکر:۱۵، بعد از حدیث

(۳) مسند احمد : مسند عمر بن الخطاب ،حدیث:۲۲۳، علامہ منذری کہتے ہیں کہ اسکو ابن ابی الدنیا اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔

جس میں غیبی آواز کا تذکرہ ہے۔ حضرتِ حاتم اصم بلخی جو مشہور صوفیہ میں سے ہیں کہتے ہیں کہ تیس برس تک ایک قبر میں انہوں نے یہ چلہ کیا تھا کہ بے ضرورت کسی سے بات نہیں کی، جب حضور ﷺ کی قبرِ اطہر پر حاضر ہوئے تو اتنا ہی عرض کیا تھا کہ اے اللہ ہم لوگ تیرے نبی کی قبر کی زیارت کو حاضر ہوئے ہیں تو ہمیں نامراد واپس نہ کیجیو، غیب سے آواز آئی کہ ہم نے تمہیں اپنے نبی ﷺ کی قبر کی زیارت نصیب ہی اس لئے کی ہے کہ اس کو قبول فرمائیں، جاؤ ہم نے تمہیں اور تمہارے ساتھ جتنے حاضر ہیں سب کی مغفرت کر دی۔(۱)

احوالِ قبور کا معلوم ہونا

- عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: ضرب بعض اصحاب النبی ﷺ خبائهٗ علی قبرٍ وهو لايحتسب أنه قبر فاذا فيه الانسان يقرأ "تبارك الذی بيده الملك" حتی ختمها فاتی النبی ﷺ فاخبره، فقال النبی ﷺ هی المانعة هی المنجية تنجيه من عذاب الله (۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی صحابی نے اپنا خیمہ ایک قبر پر لگایا اور ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ قبر ہے، سو اس میں ایک آدمی معلوم ہوا جو " تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ " پڑھ رہا ہے یہاں تک کہ اس کو ختم کیا وہ صحابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اس واقعہ کی خبر آپ ﷺ کو دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ سورۃ حفاظت کرنے والی ہے، یہ سورۃ نجات دینے والی ہے یہی مردہ کو عذابِ الٰہی سے (جو کہ قبر میں ہوتا ہے) نجات دیتی ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ قبروں کے احوال نیک لوگوں کیلئے ظاہر ہوتے ہیں جیسے ان صحابی کو ہوا، عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دیگر واقعات بھی ہیں۔

- ایسے ہی ایک واقعہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا ہے جسے حاکم نے یحییٰ بن ایوب الخزاعی سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک نوجوان نہایت ہی عابد وزاہد رہتا تھا، اکثر وبیشتر وہ مسجد میں اپنی وقت گذاری کیا کرتا، اس کا جب انتقال

---

(۱) فضائل حج : فصل زائرین کے واقعات، واقعہ : ۴.

(۲) ترمذی : فضائل القرآن، فضل سورة الملك، حدیث: ۲۸۹۰، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔

ہوا تو اور حضرتِ امیر المومنین کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کی قبر پر تشریف لے گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے فلاں: ’’وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ‘‘ (الاعراف/۲۰۱)
’’جو اپنے رب کا خوف کرتا ہے تو اسے جنت کے دوڈھکانے ملتے ہیں، نوجوان نے قبر میں سے کہا: اے عمر اللہ عزّ وجل نے مجھے جنت کے دوڈھکانے عطا کئے‘‘۔(۱)

- ابن ابی الدنیا اور ابن سمعانی نے محمد بن حمیر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گذر بقیعِ غرقد کے پاس سے ہوا' آپ نے کہا: السلام علیکم یا اھل القبور! ہمارے احوال تو یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں نے دوسری شادیاں رچالیں، تمہارے گھروں میں دوسرے بس گئے، تمہاری ثروت اور دولت تقسیم ہوگئی، تو کسی نے آواز دی، ہمارے احوال یہ ہیں کہ جو کچھ ہم نے اپنے لئے آگے بھیج رکھا تھا اسے ہم نے پالیا، جو کچھ ہم نے خرچ کیا تھا، اس کے حوالہ سے ہم نفع بخش رہے، جو کچھ ہم چھوڑ گئے تھے اس کے حوالہ سے گھاٹے میں ہیں۔(۲)

اس طرح کے بے شمار واقعات علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب الروح میں (ص ۸،۱۰) اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ مؤلفات الشیخ ۴۰/۲، ۴۱ میں ذکر کیا ہے۔

ان احادیث اور اسلافِ اُمت کے طرز پر ان مکاشفاتِ قبور کا تذکرہ حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے اپنی کتاب فضائل اعمال میں کیا ہے تو انہوں نے یہ چیزیں بے بنیاد نہیں لکھیں، بلکہ ان احادیث اور اسلافِ امت کے کتابوں کو اپنی تحریر میں پیشِ نظر رکھا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کشفِ قبور سے متعلق واقعات لکھتے ہیں:

’’حضرت ثابت بنانی حفاظ حدیث میں سے ہیں ابوسنان کہتے ہیں خدا کی قسم! میں ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے ثابت کو دفن کیا دفن کرتے ہوئے لحد کی ایک اینٹ گرگئی، تو میں نے دیکھا کہ وہ کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہے ہیں، میں نے اپنے ساتھی سے کہا، دیکھو یہ کیا ہورہا ہے اس نے کہا چپ ہوجاؤ، جب دفن کرچکے تو ان کے گھر جاکر ان کی بیٹی سے دریافت کیا کہ ثابت کا عمل کیا تھا، اس نے کہا پچاس برس شب بیداری کی اور صبح کو یہ دعا کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! اگر کسی کو یہ دولت عطا کرے کہ وہ قبر میں نماز پڑھے تو تو مجھے عطا کر‘‘۔(۳)

---

(۱) کنز العمال: سورۃ المومنون، ۳۱۷۳ (۲) کنز العمال: ۱۲۳/۸ (۳) فضائل نماز: ۶۵

علمِ غیب کی حقیقت' اُس کے اقسام واحکام

غیب کی تعریف

غیب اور مغیب دونوں غاب یغیب کے مصدر ہیں اور غاب الشیء من فلانٍ کے معنی ہیں، پوشیدہ ہونا، پس غیب کے لغوی معنی ہیں: ایسی چیز جو ہم سے پوشیدہ ہو، اس کی جمع غیوب آتی ہے اور مغیب کی جمع مغیبات ہے۔

قاموس میں ہے: "الغیب ماغاب عنك" غیب وہ چیز ہے جو آپ سے پوشیدہ ہو۔

اور مغرب میں ہے: "الغیب ماغاب عن العیون وان کان محصلا فی القلوب" غیب وہ ہے جو نگاہوں سے اوجھل ہو، چاہے وہ دلوں میں موجود ہو۔

اور عرف شرع میں غیب: ہر وہ چیز ہے جو بندوں سے پوشیدہ ہے' حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر، سدی مفسر کے حوالہ سے، ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ قول نقل کرتے ہیں :

اما الغیب: فماغاب عن العباد من امر الجنة وامر النار وماذکر في القرآن (۱) غیب وہ ہے جو بندوں سے پوشیدہ ہو جیسے جنت اور دوزخ کے حالات اور جو کچھ قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

غیب کی اس تعریف پر اگر یہ شبہ ہو کہ جنت اور دوزخ وغیرہ کے حالات تو ہمیں معلوم ہیں، ان کو غیب کہنا کیوں کر درست ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وحی والہام اور کشف کے ذریعہ جن اُمورِ غیبیہ پر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور برگزیدہ بندوں کو مطلع فرماتے ہیں، وہ سب چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں، حواسِ ظاہرہ (دیکھنا، سننا، سونگھنا، چھونا، چکھنا) سے ہم ان کا ادراک کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، اس لئے ان کو غیب کہنا درست ہے، قرآن پاک میں بھی ایسی چیزوں کو غیب کہا گیا ہے ارشادِ خداوندی ہے: "اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" (۲) جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا

---

(۱) تفسیر ابنِ کثیر: ۴۱/۱ (۲) البقرة : ۳

(یعنی جو چیزیں ان کے عقل وحواس سے مخفی ہیں جیسے دوزخ، جنت، فرشتے وغیرہ ان سب کو اللہ اور رسول ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے حق اور یقین سمجھتے ہیں۔(فوائد شیخ الہند)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن امورِ غیبیہ کے کچھ احوال ہم جانتے ہیں ان کو بھی غیب ہی کہا جائیگا، کیوں کہ وہ ہم سے پوشیدہ ہیں اور ان کے کچھ حالات کا ہمیں جو علم ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے ہے اور انبیاء کرام اور اولیاءؒ کو وحی والہام اور کشف کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، حواس کا اس میں کچھ دخل نہیں۔اس لئے یہ مغیبات ہی رہیں گے۔

غیب کی چار قسمیں اور اس کے احکام

مغیبات کے جاننے کی بنیادی قسمیں دو ہیں: ذاتی، عطائی، پھر عطائی کی دو قسمیں ہیں: محیط، غیر محیط، پھر محیط کی دو قسمیں ہیں عام اور خاص، پس مغیبات جاننے کی کل چار قسمیں ہوئیں:

۱-ذاتی ۲-عطائی محیطِ عام ۳-عطائی محیطِ خاص ۴-عطائی غیر محیط

نقشہ درجِ ذیل ہے :

تمام قسموں کی مختصر وضاحت
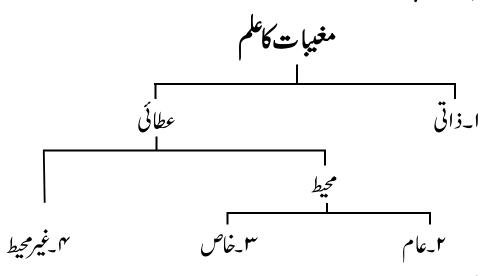
۱- ''علمِ ذاتی'' خانہ زاد علم کو کہتے ہیں، یعنی ایسا علم جو کسی کا عطا کیا ہوا نہ ہو۔

۲- ''علمِ عطائی'' وہ علم ہے جو کسی ہستی کا عطا کیا ہوا ہو۔

۳- ''علمِ محیط عام'' ازل سے ابد تک تمام چیزوں کے علم کلی کو کہتے ہیں۔

۴- ''علمِ محیط خاص'' ابتدائے آفرینش سے جنت وجہنم میں داخل ہونے تک کی تمام چیزوں کے علمِ کلی کو کہتے ہیں۔یعنی جب سے اللہ عزّ وجل نے کائنات کو پیدا کیا ہے، اس وقت

سے لے کر جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے تک کی تمام چیزوں کا ایسا تفصیلی علم کہ کائنات حاضرہ اور غائبہ کی کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہ رہے۔

۵- ''علم غیر محیط'' سے مراد صرف مغیبات کا علم ہے، یعنی غیب کی صرف ان باتوں کا علم جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کو وحی والہام کے ذریعہ مطلع فرمایا ہے' اس مختصر وضاحت کے بعد ان کی تفصیلی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

علم ذاتی

جو قومیں اللہ کو تمام مخلوقات کا خالق اور سارے عالم اور پوری کائنات کو اس کی مخلوق مانتی ہے' وہ سب یہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ کسی بھی مخلوق میں جو صفت ہے وہ خالق کی عطا کی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کیلئے الوہیت اور مستقل تصرف کی قدرت کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کو یہ صفات اور کمالات خدا ہی نے عطا کئے ہیں۔ کیوں کہ جن کا وجود ہی خانہ زاد نہیں ہے، بلکہ عطائے غیر ہے ان کے اوصاف وکمالات ذاتی اور خانہ زاد کیسے ہو سکتے ہیں؟

اِسی بناء پر یہ حقیقت بالکل مسلم ہے کہ کسی بھی بندے اور بزرگ ہستی کو ایک ذرہ کا بھی ''ذاتی علم'' حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ رسول اللہ ﷺ کو یا کسی نبی یا ولی کو کسی بھی ذرہ کا ذاتی علم تھا یا ہے تو وہ بالاتفاق مشرک ہے۔

علم عطائی محیطِ عام

اسی طرح تمام اسلامی فرقے اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تمام غیوب کا علم محیط اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام مغیبات کا علم محیط حاصل تھا اور عالم غیب کی کوئی چیز جس طرح اللہ سے مخفی نہیں ہے اِسی طرح رسول اللہ ﷺ سے بھی مخفی نہیں تھی اور اللہ تعالیٰ کے علم غیب اور رسول اللہ ﷺ کے علم غیب میں بس ''ذاتی'' اور ''عطائی'' کا فرق تھا تو ایسا عقیدہ رکھنے والا بھی بلاشبہ مشرک اور کافر ہے، ملا علی قاریؒ ''موضوعات کبیر'' میں ارقام فرماتے ہیں :

من اعتقد تسوية علم الله و رسوله يُكفّر اجماعا كما لا

یــخــفــی (۱) جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے علم میں برابری کا عقیدہ رکھے اس کو بالاتفاق کافر قرار دیا جائے گا جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

علم عطائی محیط خاص

اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس قسم کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی بھی نبی یا ولی کو اس قسم کا علم نہیں دیا گیا ہے مگر رضا خانی رسول اللہ ﷺ کیلئے اس قسم کا علم ثابت کرتے ہیں۔

علم عطائی غیر محیط

اِس قسم کا علم غیر اللہ کیلئے ثابت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام اور پیغمبران عظام کو وحی کے ذریعہ اور اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کو کشف کے ذریعے غیب کی چند باتوں سے آگاہ کر دیا ہے، مگر کائنات کے ذرہ کا علم کسی کو عطا نہیں فرمایا، اس لئے یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور پیغمبرانِ عظام کو اللہ تعالیٰ نے وحی والہام کے ذریعہ غیب کی جن باتوں سے آگاہ فرمایا ہے' صرف ان ہی باتوں کو وہ جانتے ہیں، کائنات کے ہر ذرہ ذرہ کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔مع انواع واقسام اور دلائل کے ساتھ تفصیل معلوم کرنے کیلئے ردّ ِ رضا خانیت محاضرہ ''پہلا'' ملاحظہ کیجئے۔

علم غیب اور کشف میں فرق

بعض لوگوں نے علم غیب اور کشف وکرامات کے درمیان خلط ملط کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کشف وکرامات کے ثبوت میں ''عقیدۂ علمِ غیب پر'' جو کہ ذاتِ الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے، رخنہ اندازی لازم آتی ہے، اس طور پر کہ بندہ کا بھی غیب دانی میں اللہ عزّ وجل کے ساتھ شریک وسہیم ہونا لازم آتا ہے؛ حالانکہ اس قسم کے اعتراضات کا سرے سے ان ابواب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، علم غیب اور کشف وکرامات دو بالکل الگ حقیقتیں ہیں، جس کا اقرار واعتراف عہد نبوی ﷺ ، صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعینؒ اور سلف امت سے چلا آرہا ہے کہ وہ بزرگوں سے خلاف عادت اُمور ظاہر ہونے اور بعض غیبی اُمور پر اطلاع کو بطورِ کشف وکرامات کے حق اور درست کہتے ہیں اس طرح سے ان کے بعض غیبی اُمور پر بفضلِ خداوندی مطلع ہونے پر علم غیب اطلاق نہیں کیا جاسکتا اور علم غیب تو نام ہے اپنی ذات سے غیبی امور سے واقف ہونے کا، یہ صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔

---

(۱) موضوعاتِ کبیر: ۱۱۹

بعض بزرگوں کے مکاشفات وکرامات کے انکار کیلئے اس قسم کی آیتیں بطور استدلال پیش کی جاتی ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ عِندَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ، وَيَعْلَمُ مَا فِى الْأَرْحَامِ، وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا، وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ، إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۱)

”بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم اور اتارتا ہے مینہ اور جانتا ہے جو کچھ ہے ماں کے پیٹ میں اور کسی جی کو معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کرے گا اور کسی جی کو علم نہیں کہ وہ کس زمین میں مرے گا، تحقیق اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے“۔

إِنَّ اللّٰهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، إِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے آسمان وزمین کی پوشیدہ چیزوں کو، بے شک وہی جانتا ہے جو کچھ دلوں میں ہے۔

آیاتِ بالا کی توضیح مفسرین اور علماءِ اسلاف کی تحریر کی روشنی میں

چنانچہ ملاعلی قاری تحریر فرماتے ہیں :

”إنّ للغيب مبادى ولواحق فمباديها لا يطلع عليه ملك مقرب ولا نبى مرسل واما اللواحق فهو ما أظهره الله تعالىٰ بعض أحبائه لوحة علمه وخرج بذلك عن الغيب المطلق وصار غيبا اضافيّا و ذلك إذا تنورت الروح القدسية و ازداد نو انيتها واشراقها بالإعراض عن ظلمة عالم الحادث و بتجلية القلب عن صداء الطبيعة والمواظبة على العلم والعمل و فيضان الأنوار الإلٰهية حتى يقوى النور وينبسط فى فضاء قلبه وتنعكس فيه النقوش المرتسمة اللوح المحفوظ ويطلع على المغيبات“(۳)

---

(۱) لقمٰن : ۳۸ (۲) مرقاة : ۱/۵۷ (۳) الفاطر : ۳۸

’’بلاشبہ غیب کیلئے کچھ مبادی ہیں اور کچھ لواحق ہیں، غیب کے مبادی پر نہ تو کسی مقرب فرشتہ کو اطلاع دی جاتی ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو اور جو لواحق ہیں تو ان میں اپنے علم کی جھلک اللہ تعالیٰ اپنے بعض محبوب بندوں پر ظاہر کرتا ہے اور یہ غیب مطلق کی مد سے خارج ہو کر غیب اضافی کی مد میں داخل ہو جاتا ہے اور جب یہ روح قدسی منور ہو جاتی ہے اور اس کی چمک اور نورانیت بڑھ جاتی ہے؛ اس لئے کہ وہ فانی دنیا کی ظلمت اور تاریکی سے اِعراض کرتی ہے اور طبیعت کے زنگ سے دل صاف ہو جاتا ہے اور علم وعمل پر یکساں پابندی اور انوارِ الٰہیہ کے فیضان کی وجہ سے نور قوی ہو کر دل کی فضا میں پھیل جاتا ہے اور دل میں ان نقوش کا عکس پڑتا ہے جو لوح میں لکھے ہوتے ہیں اور مغیبات پر اطلاع ہو جاتی ہے‘‘۔

ملا علی قاریؒ کی اس تحریر کی روشنی میں علم غیب اور کشف وکرامات کے مابین واضح اور بیّن فرق معلوم ہو جاتا ہے؛ چونکہ اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیب کے مبادی اور اصول ہیں، جیسے تقدیر، قیامت اور مذکورہ بالا آیت میں ذکر کردہ پانچ چیزیں یہ ایسی ہیں کہ اس پر کوئی مقرب فرشتہ اور نبی ورسول کو اطلاع نہیں دی جاتی، ہاں جو اس کے لواحق (اس کے ساتھ ملی ہوئی چیزیں) اللہ تعالیٰ ان پر بعض پاک نفوس کو اطلاع دے دیتا ہے، جن کی علم وعمل کی کیفیت اعلیٰ اور انوار الٰہیہ کے فیضان کی بناء پر روحانی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوتے ہیں؛ مگر یہ غیب مطلق نہیں ہوتا؛ بلکہ غیب اضافی جو صرف اجمالی طور پر بعض جزوی چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کا عکس ان کے دلوں پر پڑتا ہے اور وہ غیب پر مطلع ہو جاتے ہیں، ان پانچ چیزوں کے کلیات پر وہ جانکاری حاصل نہیں کر سکتے، مطلب یہ ہے کہ قیامت آ کر رہے گی؛ مگر کب آئے گی؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں، نہ معلوم کب یہ کارخانہ توڑ پھوڑ کر برباد کر دیا جائے، زمین کی ساری رونق اور مادی برکت (جس پر مخلوق کی خوشحالی کا دارومدار ہے) بارش پر موقوف ہے، سال دو سال مینہ نہ برسے تو خاک اڑنے لگے، مگر یہ بارش کب ہوگی؟ کہاں ہوگی؟ کتنی مقدار میں ہوگی؟ کن کن نتائج کی حامل ہوگی؟ اس کو بھی صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اس کا علم بھی صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ اَرْحَام میں کیا ہے؟ لڑکے ہیں یا لڑکیاں؟ اکیلے ہیں یا جڑواں؟ کالے ہیں یا گورے؟ صحیح الاعضاء ہیں یا ناقص الاعضاء؟ اور پیدا ہونے کے بعد ان کی عمر کیا ہوگی؟ روزی کتنی ملے گی؟

کیا کیا کام کریں گے؟ سعید (نیک) ہونگے یا شقی (بد بخت)؟ وغیرہ۔اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا؟ (خودساختہ پروگرام کا کوئی سوال نہیں) نفع کمائے گا یا نقصان؟ نیکی کرے گا یا بدی؟ اور کچھ کرنے کیلئے زندہ بھی رہے گا یا نہیں؟ اور موت آئے گی تو کہاں اور کس نوعیت کی؟ اس کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں، دفن ہوگا یا جانور کھا جائیں گے؟ تجہیز وتکفین کون کرے گا؟ کس خطہ میں دفن کیا جائے گا؟ ان پانچ چیزوں کو اس تفصیل کے ساتھ کوئی نہیں جانتا۔بعض احکام غیبیہ کا علم اللہ عزّ وجل انبیاء کرام علیہم السلام کو بطور معجزہ کے اور اولیاء کرام کو بطور کشف وکرامت کے عنایت کرتے ہیں، یہ جزوی علم ہوتا ہے، یہ اللہ کی عطا اور نوازش پر موقوف ہوتا ہے؛ اس لئے علم غیب، معجزہ اور کشف وکرامت کے درمیان بالکل اشتباہ نہیں ہونا چاہیے...... یہ بات کہ قرآن کریم کی اس آیت جس میں علم کی اللہ عزّ وجل کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ تخصیص کی گئی ہے وہ علم کلی ہے، یعنی ان چیزوں کے کلیات کا بطور کلی علم صرف ذات خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے، ان میں بعض جزئیات کا علم غیر اللہ کیلئے ثابت ہوگا تو وہ صرف علم جزئی ہے اور ایجاب جزئی اور رفع ایجاب کلی میں کوئی منافات نہیں؛ چنانچہ علامہ آلوسی الحنفیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وأنّه يجوز أن يطّلع الله تعالىٰ بعض أصفيائه على إحدى هذا الخمس ويرزقه عزّوجل العلم بذلك فى الجملة وعليها الخاص جلا علاما كان على وجه الاحاطة والشمول لأحوال كلّ منها وتفصيله على الوجه الأتم، وفى شرح المناوى للجامع الصغير فى الكلام على حديث بريدة السابق خمس لايعلمهنّ إلّا الله على وجه الإحاطة والشمول كليّا وجزئيّا، ينافيه اطلاع الله تعالىٰ بعض خواصه على بعض المغيبات حتى من هذه الخمس لأنها جزئيات معدودة (۱)

''یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض برگزیدہ بندوں کو ان پانچ امور میں سے کسی پر مطلع کردے اور اللہ تعالیٰ ان کو فی الجملہ ان کا علم عطا فرمائے اور ان اُمورِ خمسہ (پانچ) میں سے جو علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے وہ ایسا علم ہے جو علی وجہ الاحاطۃ (مکمل) اور علی

(۱) تفسیر روح المعانی: ۱۱۲/۲۱،دار احیاء التراث العربی

سبیل الشمول (پورا پورا) ہو کہ ان میں سے ہر ایک علی وجہ الأ تم (مکمل) تفصیلی علم پر مشتمل ہو۔ جامع صغیر میں علامہ مناویؒ لکھتے ہیں: کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی سابق حدیث میں یہ جو آیا ہے کہ ان پانچ چیزوں کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی تمام کلیات اور جزئیات کا علی سبیل الاحاطة والشمول (پورا پورا اور کامل ومکمل) علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو ان پانچ میں سے بعض مغیبات (غیب کی چیزیں) پر مطلع کردے؛ چنانچہ چند گنے چنے واقعات اور معدودے چند جزئیات ہیں''۔

علامہ عبدالرؤف مناویؒ اور علامہ آلوسیؒ کے حوالے سے یہ بات بالکل روشن ہوگئی کہ ان پانچ اُمور کا احاطہ اور کامل اور مکمل علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان میں بعض جزئیات کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بعض اولیاء کو بھی ہوجاتا ہے؛ مگر یہ صرف جزئیات کا علم ہے اور بس۔

ملاجیونؒ بھی اس آیت کی تفسیر میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

فعلم من كلامه أن الله تعالىٰ يطلع الاولياء على بعض مايشاء من الغيوب الخمسة۔(۱) قاضی صاحبؒ کے کلام سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ غیوب خمسہ میں سے بعض پر جس مقدار میں چاہے حضرات اولیاء کرامؒ کو مطلع کردیتا ہے۔

اوراس سے پہلے قاضی صاحب مفسر بیضاوی کے ''الغیب المخصوص'' کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولعله أراد بالغيب المخصوص هذه الخمسة أو على ما سواها يطلع الأكثر وقيد بعلم بعضه ليخرج مثل علم الساعة.(۲)

''غیب مخصوص (جس پر اللہ تعالیٰ کسی کو مطلع نہیں کرتا) یہ پانچ ہیں؛ کیونکہ اس کے علاوہ پر اکثر مطلع ہیں اور بعض کے علم کی قید اس لئے لگائی ہے تاکہ قیامت کا علم اس سے خالی ہوجائے (کہ اس کا علم بجز خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں)''۔

یعنی ان اُمورِ خمسہ (پانچ چیزوں) میں سے قیامت کے وقوع کا علم سوائے اللہ عزّ وجل کے کسی کو نہیں، بقیہ امور پر جزوی طریقے پر بعض انبیاء کرام علیہم السلام واولیاء کرامؒ وغیرہ مطلع ہوسکتے

(۱-۲) التفسيرات الاحمدية : ۳۹۸

ہیں، اسی اصول کو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ یوں بیان فرماتے ہیں :

فكل ما في القرآن وما ادراك فقدأعلمه الله إياه وما فيه ويدريك فلا يدره ولم يطلعه عليه كقوله عزّوجل وما يدريك لعل الساعة تكون قريبا وما تبين له وقتها۔(۱)

ہر وہ چیز جو قرآن میں "وما أدراك" کے لفظ سے مذکور ہے تو بے شک اس چیز کا علم تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دے دیا ہے اور جو چیز قرآن میں "وما يدريك" کے لفظ سے بیان کی گئی ہے اس چیز کا علم اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو نہیں دیا اور نہ اس پر مطلع کیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''کس چیز نے تجھے اطلاع دی ہے شاید کہ قیامت قریب ہے'' تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو قیامت کا وقت نہیں بتایا۔

سفیان بن عیینہؒ سے بخاری شریف میں اسی قسم کی بات نقل کی گئی ہے۔

کشف کی حقیقت اور اس کا شرعی حکم !

اس عنوان کے تحت دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ اولیاء کرام کو کشف کیوں ہوتا ہے؟ کیسے وہ بعض امورِ غیبیہ پر مطلع ہو جاتے ہیں؟ کشف سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے یا اس سے بھی جو علم غیب ذات خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے مانند قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے؟ تمام ہی ائمہ اور اسلاف اس بات پر متفق ہیں کہ کشف سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے، اسے علم غیب جو کہ ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے ساتھ کیا مناسبت؟ جو کہ علم یقینی کا فائدہ دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم غیب اور کشف کے درمیان واضح اور بین فرق ہے، کشف پر علم غیب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، کشف سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے اور علم غیب سے قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن خلدونؒ اپنی بے نظیر کتاب میں ''علم تصوّف'' کی فصل میں ریاضت، مجاہدہ، ذکر و خلوت وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ثمَّ إن هذه المجاهدة و الخلوة والذكر يتبعها غالبا كشف حجاب الحس والإطلاع على عوالمٍ من أمر الله ليس

(۱) غنية الطالبين :۱/۱۳

لصاحب الحسّ إدراك شيىء منها ، والروح من تلك العوالم وسبب هذا الكشف،إن الروح إذا رجع عن الحس الظاهر إلى الباطن ضعف احوال الحس وقويت احوال الروح وغلب سلطانه ، وتجدد نشؤه وأعان على ذلك الذكر ، فإنه كالغذاء لتنمية الروح إلى أن قال ، وهذا الكشف كثيرا ما يعرض لأهل المجاهدة فيدركون حقائق الوجود مالايدرك سواهم ، وكذلك يدركون كثيرا من الواقعات قبل وقوعها۔(۱)

پھراس مجاہدہ،خلوت اور ذکر کے بعد غالباً ایسا ہوتا ہے کہ حس ظاہری کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور ان عالم امر اللہ (اللہ کے احکام کی دنیا) پر اطلاع ہوجاتی ہے، صاحب حس کو (جس کے علم کے حدود سننے، سونگھنے، چھونے، دیکھنے اور چکھنے تک ہوں) ان پر اطلاع نہیں ہوتی ، روح چونکہ اسی عالم کی چیز ہوتی ہے ،اور ان مکاشفات کا سبب ہوتی ہے اور روح جب ظاہری سے حس باطن (روحانیت) کی طرف رجوع کرتی ہے اور حس کے احوال کمزور ہوجاتے ہیں تو روح کے احوال غالب ہوجاتے ہیں اور اس کا تسلط ہوجاتا ہے اور اس کے نشو ونما میں ترقی ہوتی ہے اور ذکر اس کا مدد اور معاون ہوتا ہے' چونکہ ذکر روح کی نشو ونما کیلئے غذا کے درجہ میں ہوتا ہے، (پھر فرمایا) اور یہ کشف بسا اوقات اہل مجاہدہ کو پیش آتا ہے اور وہ حقائق وجود کا ادراک کر لیتے ہیں اور دوسروں کو خبر تک نہیں ہوتی۔اس طرح وہ بہت سے واقعات کو وقوع سے پہلے بطورِ کشف کے دیکھ لیتے ہیں۔

اس عبارت سے صاف طور سے یہ معلوم ہوا کہ کشف اس لئے واقع ہوتا ہے کہ انسان کی ظاہری حس (ظاہری معلومات کے ذرائع) کمزور پڑ جاتے ہے اور روحانی حس بے انتہاء بڑھ جاتی ہے اور روح چونکہ عالمِ بالا کی چیز ہوتی ہے، جب روح کے احوال کا غلبہ ہوتا ہے تو اہل مجاہدہ عالمِ بالا کی بعض چیزوں پر مطلع ہوجاتے ہیں، کشف کے ذریعہ اولیاء کو علم حاصل ہوجاتا ہے، وہ ظنی ہوتا ہے اور آیت میں اُمور خمسہ پر اطلاع نہ ہونے کی بات آئی ہے وہ علم یقینی ہے؛ چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

(۱) بقدر الحاجة مقدمة : ۴۶۹-۴۷۰

والمراد بالعلم العلم القطعی والعلم الحاصل للأولياء بالإلهام وغيره ظنی ليس بقطعی (۱) اور علم سے قطعی علم مراد ہے اور جو علم حضرات اولیاء کرامؒ کو الہام وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے، وہ علم ظنی ہے قطعی نہیں۔

نیز آگے تحریر فرماتے ہیں :

واعلم أن ما ذكرت لك أن العلم الحاصل للأولياء ظنی، المراد به العلم الحاصل علمًا حصوليًا وذلك قد يكون بالإلهام بتوسّط الملك و بغير توسّطٍ وقد يكون بكشف الحجب كما ذكرنا حديث عمر رضی اللہ عنہ "يا سارية الجبل" ومن هذا القبيل ماقيل أنه قد ينكشف على بعض الأولياء فی بعض الأحيان اللوحا لمحفوظ فينظرون فيه القضاء المنبر والمعلق وقد يكون بمطالعة المثال فی المنام او المعاملة (۲)

تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے تیرے سامنے جو یہ چیز پیش کی ہے کہ حضرت اولیاء کرامؒ کا علمِ ظنی ہوتا ہے تو اس سے مراد علم حصولی ہوتا ہے اور یہ بھی الہام سے یا فرشتے کے ذریعہ یا بغیر واسطے کے حاصل ہوتا ہے اور کبھی درمیانی حجابات اور پردے اُٹھ جاتے ہیں ؛ جیسا کہ ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث پیش کی جس میں انہوں نے فرمایا تھا: اے ساریہ پیچھے پہاڑ کی طرف خیال کر اور اسی قبیل سے ہے وہ جو کہا گیا کہ کبھی بعض حضرات اولیاء کرامؒ پر بعض اوقات لوح محفوظ منکشف ہو جاتا ہے اور وہ قضاء مبرم (اٹل تقدیر) اور معلق (ردو بدل ہونے والی تقدیر) کو دیکھ لیتے ہیں اور کبھی خواب یا معاملہ بیداری میں عالمِ مثال کے مطالعہ سے ان کو یہ حاصل ہوتا ہے۔

خلاصۂ بحث

یہ ہے کہ علم غیب اور کشف وکرامات دو مختلف چیزیں ہیں، علم غیب کسی چیز کا کامل اور مکمل اور اس کے تمام اجزاء پر اطلاع کو کہتے ہیں اور کشف میں بعض امور غیبیہ پر اطلاع ہوتی ہے اور وہ

---

(۱) تفسیر مظهری : ۶۷۸۵/۱، مكتبة رشيدية ، باكستان

(۲) تفسير مظهری : ۶۷۸۳/۱، سورة الجن ، مكتبة رشيدية ، باكستان

کامل طریقہ پر نہیں ہوتی محض اس کے بعض اجزاء معلوم ہوتے ہیں، غیب کے محض بعض اجزاء پر اطلاع کو بطورِ کشف ومعجزہ کے اس پر علمِ غیب کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا اور کشف بھی اولیاء کیلئے اس وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ ان کی روحانیت ذکر، ریاضت ومجاہدہ، وغیرہ کی وجہ سے بے انتہاء بڑھ جاتی ہے اور روح عالم بالا کی چیز ہوتی ہے، جب وہ قوی اور کامل ومکمل ہوجاتی ہے، اس کے عالمِ بالا کی مجانست (یکسانیت) کی وجہ سے اسے عالمِ بالا کی چیز مشاہدہ کے درجہ میں ہوجاتی ہے، نہ کہ وہ غیب پر مطلع ہوتی ہے۔ علمِ غیب اور علمِ کشف میں ایک بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ علمِ غیب سے قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور کشف سے ظنی اور غیر یقینی علم حاصل ہوتا ہے؛ اس لئے بزرگوں کے واقعات کو جو کہ بطور کشف وکرامات کے پیش آتے ہیں، اسے علمِ غیب کے مرادف قرار دے کر رد نہیں کیا جاسکتا، بزرگوں کا بعض امورِ غیبیہ پر مطلع ہونا بالکل برحق ہے؛ اس لئے یہ واقعات جسے حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے اپنی کتاب فضائل اعمال میں بزرگوں کے کشف وکرامات کے قبیل سے ذکر کیا ہے اسے علمِ غیب پر اطلاع کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا؛ چونکہ علم غیب اور کشف وکرامات میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحبؒ کے ذکر فرمودہ چند واقعات

- حضرت جنیدؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ

ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں شیطان کو بالکل ننگا دیکھا انہوں نے فرمایا: تجھے شرم نہیں آتی کہ آدمیوں کے سامنے ننگا ہوتا ہے، وہ کہنے لگا یہ کوئی آدمی ہیں، آدمی تو وہ ہیں جو شونیزیہ کی مسجد میں بیٹھے ہیں جنہوں نے میرے بدن کو دبلا کردیا ہے اور میرے جگر کو کباب کردئے ہیں، حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: میں شونیزیہ کی مسجد میں گیا، میں نے دیکھا چند حضرات گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے مراقبہ میں مشغول ہیں، جب انہوں نے مجھے دیکھا تو کہنے لگے خبیث کی باتوں سے کہیں دھوکہ میں نہ پڑجانا۔(۱)

اس واقعہ کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا کہ مراقبہ والوں کو دوسروں کے دلوں کے احوال حتیٰ کہ دوسروں کے خواب کے بارے میں بھی کیونکر اطلاع ہوسکتی ہے؟

---

(۱) فضائلِ ذکر: ۵۱

○ شیخ ابو یعقوب سنوسیؒ کہتے ہیں:

میرے پاس ایک مرید آیا اور کہنے لگا کہ میں کل ظہر کے بعد مر جاؤنگا؛ چنانچہ دوسرے دن ظہر کے وقت وہ مسجد حرام میں آیا، طواف کیا اور تھوڑی دور جا کر مر گیا، میں اس کو غسل دیا اور دفن کیا، جب میں نے اس کو قبر میں رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں، میں نے کہا کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے؟ کہنے لگا: میں زندہ ہوں اور اللہ کا ہر عاشق زندہ ہی ہوتا ہے۔(۱)

یہاں پر بھی اس شخص کو اپنی موت کا علم جو حاصل ہوا وہ جزئی علم ہے جو خود اس کی ذات سے متعلق ہے۔تمام انسان، حیوان، درندوں چرندوں کا علم تو کجا؟ بلکہ خود اسے اپنے کفن دفن اور قبر کی جگہ اور بعد کے مراحل کی بھی اطلاع نہیں ہے،اس پر علم غیب کا اطلاق کیسے کیا جا سکتا ہے؟

○ ایک معتمد دوست نے راقم سے ایک خوش نویس لکھنؤ کی حکایت بیان کی:

ان کی عادت تھی کہ جب صبح کے وقت کتابت شروع کرتے تو اول ایک بار درود شریف ایک بیاض پر جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی لکھ لیتے ،اس کے بعد کام شروع کرتے ، جب ان کے انتقال کا وقت آیا تو غلبہ فکر آخرت سے خوف زدہ ہو کر کہنے لگے، دیکھئے وہاں جا کر کیا ہوتا ہے؟ ایک مجذوب آ نکلے، کہنے لگے: بابا کیوں گھبراتا ہے؟ وہ بیاض سرکار میں پیش ہے،اور اس پر ’’صاد‘‘ بن رہے ہیں۔(۲)

اس واقعہ میں بھی بطورِ کشف کے ایک جزوی چیز پر اطلاع حاصل ہوئی ہے۔

○ جنات کا انسانی شکل میں نظر آنا

عن أبی هریره رضی اللہ عنہ قال: وکلّنی رسول اللّه ﷺ بحفظ زکوة رمضان، فأتانی اتٍ فجعل یحثو من الطعام، فأخذته إلی ان قال: قال رسول اللّه ﷺ تعلم من تخاطب منذ ثلث لیالٍ یا اباهریرة، قلت: لا: قال: ذالك شیطان (۳)

---

(۱) فضائلِ صدقات: ۴۷۶ (۲) فضائلِ درود: ۹۰

(۳) بخاری الوکالة، اذا وکل رجلا فترك الوکیل شیئًا فاجازه الموکل فهو جائز ،حدیث:۲۳۱۱

حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ رمضان کی حفاظت کیلئے مقرر فرمایا (اور ایک روز) ایک آنے والا میرے پاس آیا اور غلہ میں سے لپیں بھرنے لگا میں نے اس کو پکڑ لیا، یہاں تک قصہ بیان کر کے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ: تم جانتے ہو کہ تین روز سے کس سے بات چیت کیا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ وہ شیطان تھا۔

اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسانی شکل میں متمثّل ہوسکتا ہے۔

- اِسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ امام ترمذیؒ نے ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے :

أنـه كـان له سهوة فيها تمر، و كانت تجئى الغول، فتأخذ منه، قـال: فشكـا ذلك إلى الـنبى فقال: فاذهب، فاذا رايتها فقل: بسـم الـلّه اجيبى رسول اللّه، فقال: فاخذتها فحلفت ان لاتعود فذكر نحوه (۱)

کہ ان کے گھر میں ایک تابدان تھا، جس میں کھجور رکھے رہتے تھے ایک جنی آیا کرتی اور وہاں سے کھجور اُٹھا لے جاتی، انہوں نے اس کی شکایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب جاؤ پھر اگر وہ تمہیں دکھائی دے تو یوں کہو: بسـم الـلّـه "اجيبى رسول اللّه" اللہ کے نام سے تجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونا ہے، میں نے اسے پکڑ لیا، تو اس نے قسم کھایا کہ وہ دوبارہ نہ آئے گی، پھر آگے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح حدیث ہے۔

مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے جن میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور دیگر اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قسم کا واقعہ منقول ہے ان تمام واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ جنات انسان کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

مسئلۂ تَمَثُّلُ (یعنی صورت مثالیہ میں کسی چیز کا ظاہر ہونا)

عـنـدالنسائى في حديث ابى هريرة وأبى ذر جاء جبرئيل عليه

(۱) تـرمـذی: فضائل القرآن، باب ما جاء فى سورة البقرة واية الكرسى : حديث:۲۳۱۱، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔

السلام عن أمور الدين،قول رسول الله ﷺ وإنه جبرئيل نزل في صورة دحية الكلبى (۱)

نسائی کی روایت میں اس حدیث میں کہ حضرتِ جبرئیل علیہ السلام کچھ مسائل دین معلوم کرنے کیلئے حضور ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے تھے یہ بھی مذکور ہے کہ وہ جبرئیل علیہ السلام تھے، وہ دحیہ کلبی کی صورت میں تشریف لائے تھے۔

کوئی ذات اپنی حالتِ اصلیہ کے ساتھ دوسری صورت میں ظاہر ہوتو اسے تمثّل کہتے ہیں اوراس دوسری صورت کوصورتِ مثالیہ کہتے ہیں، خواب ومکاشفات میں تو اکثر چیزیں دوسری شکل وصورت میں ظاہر ہوتی ہی ہیں کبھی بیداری کی حالت میں بھی یہ چیزیں مثالی صورت میں نظر آتی ہیں، اس حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام بشری اورانسانی صورت میں متمثل ہوئے، یہ نہ تھا کہ فرشتے سے آدمی بن گئے، قرآن مجید سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے: ”فتمثل لها بشرا سويًا“ حضرتِ جبرئیل علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے روبروایک صحیح سالم انسانی شکل میں متمثل ہوئے' اس سے کسی کو جواز تناسخ کا دھوکہ نہ ہوجائے کیونکہ صورت مثالیہ میں ذات کو اپنی کسی حالت سے بدلنانہیں ہوتااور تناسخ میں روح دوسری جنس کی طرف منتقل ہوتی ہے۔اس سلسلہ کی مزید بحث (مرحومین کوحالت بیداری میں دیکھنااس عنوان کے تحت مطالعہ فرمالیں)۔

عالمِ مثال کا ثبوت اوراس کے احکام

بہت سے واقعات کی توجیہ میں عالمِ مثال اور جسمِ مثالی کا تذکرہ ضمناً آ گیا، اس لئے ضروری تھا کہ عالمِ مثال، اس کی حقیقت، اس کے ثبوت پر شرعی دلائل تفصیلی طور پر ذکر کئے جائیں، اس لئے اس مضمون کا اضافہ کیا گیا۔

یہ جان لینا چاہئے کہ عالم دو ہیں، ایک عالمِ دنیا اور ایک عالمِ آخرت اور برزخ جس کا نام قبر ہے وہ اسی دنیا کا حصہ ہے جس میں آخرت کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔

ان دونوں عالم کے علاوہ ایک تیسرا عالم بھی ہے جس کو عالمِ مثال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ چیزیں جو اس وقت عالمِ دنیا میں موجود ہیں اور ہمارے مشاہدہ میں آرہی ہیں یہ بھی دراصل عالم

(۱) نسائی: الایمان، صفة الایمان والاسلام، حدیث: ۲۳۱۱، مناوی نے کہاہے کہ:اس روایت کے رجال ثقہ ہیں، البتہ یہ روایت مرسل ہے۔

مثال میں پہلے موجود تھیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس عالم مثال کی چند خصوصیات بیان فرمائی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱- وہ عالم غیر مادی ہے یعنی وہ عناصر اربعہ (آگ، ہوا، پانی، مٹی) سے نہیں بنا۔

۲- اس عالم میں معانی یعنی حقائق کیلئے جسم ہوتے ہیں اور یہ اجسامِ مثالی ہیں، ہر معنی کو اس کی حالت کا لحاظ کر کے جسم دیا جاتا ہے مثلاً بزدلی کو خرگوش کا اور دنیا کو ایسی بوڑھی عورت کا جس کے سر کے بال کھچڑی ہو رہے ہوں۔

۳- اس دنیا میں چیزیں پائے جانے سے پہلے عالمِ مثال میں پائی جاتی ہیں، وہاں ان کا تحقق مخصوص نوعیت کا ہے۔

۴- پھر وہ چیزیں اس دنیا میں خارج میں پائی جاتی ہیں تو یہ اور وہ ایک ہوتی ہیں۔ رہی یہ بات کی اتحاد کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ تو اس کا تعین مشکل ہے، اتحاد کی مختلف صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے۔

۵- اور بہت سی چیزیں وہ ہیں جن کیلئے عوام کے نزدیک جسم نہیں اور وہ عالم مثال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اور اترتی چڑھتی ہیں، اگرچہ لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔

۶- یہ عالم جس طرح مادی نہیں، مکانی اور زمانی بھی نہیں، اس لئے اس کی جگہ متعین نہیں کی جاسکتی، بس اتنا کہا جائے گا کہ ایسا عالم موجود ہے اور قرآن وسنت سے اس کا وجود ثابت ہے۔

۷- اس کو عالمِ مثال اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہاں دنیا و آخرت کی تمام چیزیں مثالی صورت میں پائی جاتی ہیں، اس کی ایک دوسری وجہ تسمیہ یہ بھی ہے کہ اس عالم کی چیزیں اور اس دنیا کی چیزیں بعینہٖ ایک ہیں۔

عالمِ مثال پر دلالت کرنے والی روایات

عالمِ مثال کے وجود پر بے شمار روایتیں دلالت کرتی ہیں، ان میں سے چند ایک روایتیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

○ قال النبی ﷺ: "لما خلق اللہ الرحم قامت، فقالت: ھذہ مقام

العائذ بك من القطيعة " (۱) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے ''ناتے'' کو پیدا فرمایا تو وہ کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ یہ قطع رحمی سے آپ کی پناہ چاہنے والے کی جگہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ جو تجھے کاٹے میں اس کو اپنے سے کاٹوں اور جو تجھے جوڑے میں اس کو اپنے سے جوڑوں؟ ناتے نے جواب دیا، میں اس پر راضی ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''جا یہ تیرے لئے ہے، یعنی میں اس کی گیارنٹی دیتا ہوں''۔

اِس روایت پر غور کیجئے ناتا ایک معنوی چیز ہے اس کا جسم نہیں ہوتا، مگر حدیث اس کے جسم دار ہونے پر دلالت کرتی ہے، یہ جسم مثالی ہے جو اس کو عالمِ مثال میں ملا ہے۔

- وقال: ان البقرة وآل عمران. تاتيان يوم القيامة كأنهما غمامتان، أو غيايتان أوفرقان من طيرٍ صوافٍ، تحاجان من أهلهما (۲) بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو، وہ دونوں قیامت کے دن سفارشی بن کر حاضر ہوں گے، گویا وہ دو بادل ہیں یا دو سائبان ہیں، یا صف بستہ اڑنے والے پرندوں کی دو قطاریں ہیں وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گے۔
- وقال: تجئى الأعمال يوم القيامة: فتجئى الصلاة، ثم تجئ الصدقة، ثم تجئى الصيام (۳) ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال حاضر ہوں گے، پس (سب سے پہلے) نماز آئے گی۔ پھر خیرات آئے گی، پھر روزہ آئے گا (آخر تک حدیث پڑھئے)۔

یہ لمبی حدیث ہے، یہاں تو صرف یہ بات عرض کرنی ہے کہ یہ اعمال جو جسم دار نہیں ہیں، قیامت کے دن اپنے مثالی اجسام کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

---

(۱) مشکوۃ : باب البر والصلة، حدیث:۴۹۱۹

(۲) مسلم : باب فضل قراءة القرآن ،حدیث:۱۹۱۰

(۳) مسند احمد: مسند أبی هریرة ،حدیث:۸۷۲۷، محقق شعیب الارنوط نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے، بوصیری کہتے ہیں کہ: اس کو احمد اور ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں (اتحاف: باب فی التلاعن :۸/۶۳)

- وقـال: ألا لإنّ الـمـعـروف والمنكر لخليقان، تنصبان للناس يوم الـقيـامة، فـأمـا المعروف فيبشّر اهله، واماالمنكر فيقول: إليكم! إليـكـم!! ولا يستطيعون له إلا لزوما (۱)اورارشادفرمایا کہ معروف (اللہ کی مرضی کے موافق قول وفعل) اور منکر (اللہ کی مرضی کے خلاف قول وفعل) دومخلوق ہیں۔ قیامت کے دن دونوں لوگوں کیلئے کھڑا کیا جائے گا، پس معروف اپنے لوگوں کوخوش خبری دے گا اور رہا منکر تو وہ کہے گا: اُوہٹو،بچو، مگرلوگ اس سے چپکتے ہی جائیں گے۔
- وقـال: ان الـلّـه يبعث الأيام يوم القيامة كهيئتها، ويبعث الجمعة زهـراء منيرة (۲)اوروہ فرمایااللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام دنوں کواٹھائیں گے، جیسے وہ ہیں اور جمعہ کو چمکتاروشن اٹھائیں گے۔
- وقـال: يـؤتی بالدنيا يوم القيامة فی صورة عجوز شمطاء، زرقاء، أنيابها بادية مشوّه خَلْقُها (۳)دنیا قیامت کے دن ایسی بوڑھیا کی شکل میں لائی جائے گی جس کے بال کھچڑی ہوں گے جس کی آنکھیں نیلگوں ہوں گی، دانت پھاڑ رہی ہوگی جونہایت بدشکل ہوگی۔

دنیا کوئی حسی اور جسم دار چیز نہیں ہے، وہ اس عالم کی حقیقت ہے، مگر قیامت کے دن وہ بڑھیا کی شکل میں آئے گی، یہ عالم مثال میں اس کو ملی ہوئی شکل ہے۔

- وقـال: رأيـتُ امرأةً سوداء ثائرة الرأس خرجت من المدينةِ حتّٰی نزلت بمهيعةٍ وهی الجحفة فاوّلتُ أنّ وباء المدينة نُقِلَ إليها (۴) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک سیاہ فام پراگندہ بال عورت کو (خواب میں) دیکھا کہ مدینہ سے نکل کر جحفہ میں جاکر ٹھہری، سومیں نے یہ تعبیر کیا کہ مدینہ کی وبا جحفہ میں چلی گئی۔ (یہ اس وبا کی صورت مثالیہ تھی)۔

---

(۱) كنز العمّال، حدیث: ۴۴۰۷۴

(۲) مستدرك حاكم: كتاب الجمعة، حدیث:۱۰۲۷، كنز العمال: حدیث:۱۰۹۰

(۳) شعب الإيمان: فصل فيما بلغنا عن الصحابة، حدیث:۱۰۶۷۱

(۴) بخاری: باب المرأة السوداء، حدیث:۶۶۳۱

○ وقال: اتيتُ ليلة اسري بى بقدحين من خمرٍ ولبنٍ، فأخذت اللبن، فقال الملك: الحمد لله الذى هداك للفطرة، لوأخذت الخمر لَغَوَتُ امتُك (۱) آپ ﷺ نے فرمایا: شبِ معراج میں میرے پاس دو پیالے لائے گئے، ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ، میں نے دودھ پی لیا، (ہمراہی) فرشتے نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے، جس نے آپ ﷺ کو دودھ پینے کی ہدایت کی اگر آپ ﷺ شراب لیتے تو آپ ﷺ کی امت گمراہ ہوجاتی۔

دودھ صورتِ مثالیہ دین کی تھی، اور شراب صورتِ مثالیہ لذات دنیا کی اور ان پیالوں کا پیش ہونا ایک نوع کا امتحان تھا، اس حدیث سے بھی عالمِ مثال کا ثبوت ہوتا ہے، جس کی تصریح اکابر کے کلام میں ہے۔

○ وقال: هل ترون ماارىٰ؟ فانى لأرى مواقع الفتن خلال بيوتكم كمواقع المطر (۲) اورفرمایا کیا تم وہ چیز دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میں تمہارے گھروں میں بارش کی طرح فتنوں کو گرتے دیکھ رہا ہوں۔

فتنے بھی معنوی چیز ہیں اور ان کا بارش کی طرح برسنا مثالی جسم کے ساتھ تھا۔

○ وقال: فى حديث الاسراء: فاذا اربعة أنهار نهران باطنان، ونهران ظاهران، فقلتُ: ما هذا ياجبرائيل؟، قال: اما الباطنان ففى الجنة واما الظاهران فالنيل والفرات (۳) اور معراج کی روایت میں فرمایا ہے کہ اچانک چار نہریں سامنے آئیں دو باطنی یعنی بہہ کر جنت میں جارہی ہیں اور دو ظاہری یعنی بہہ کر باہر آرہی ہیں آنحضرت ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا: باطنی دونہریں جنت کی ہیں اور ظاہری نیل اور فرات ہیں۔ دریائے نیل یہ وسطی آفریقہ سے نکلتا ہے اور مصر میں داخل ہوکر بحر ابیض متوسط میں گرتا ہے

---

(۱) بخاری: احادیث الانبیاء، حدیث:: ۳۳۹۴۔

(۲) بخاری: باب الغرفة والعلية، حدیث: ۲۳۳۵۔

(۳) بخاری: باب المعراج، حدیث: ۳۶۷۴

اور فرات عراق میں ہے' جو دجلہ میں شامل ہو کر خلیج فارس میں گرتا ہے، غرض یہ دونوں زمین کے دریا ہیں، مگر حضور ﷺ نے ان کو عالمِ بالا میں دیکھا ہے، یہ ان کی مثالی صورتیں ہیں۔

- وقال في حديث صلاة الكسوف: "صُوّرت لى الجنّة والنّار" وفي لفظ بيني وبين جدور القبلة" وفيه: أنه بسط يده يتناول عنقودًا من الجنّة، وانه تكعكع من النّار، ونفخ من حرّها، ورأى فيها سارق الحجيج، والمرأة التى ربطت الهرّة حتى ماتت، ورأى في الجنّة امرأة مومسة سقت الكلب. (۱) اور سورج گہن کی نماز کی روایت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جنت اور جہنم میرے لئے مُصَوَّر کی گئیں اور ایک روایت ہے کہ میرے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان میں نظر آئیں اور اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے ہاتھ بڑھایا! تا کہ جنت سے انگور کا خوشہ لیں اور یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ دوزخ کی وجہ سے رک گئے اور گرمی کی وجہ سے پھونک ماری، آپ ﷺ نے جہنم میں حاجیوں کے سامان چرانے والے کو دیکھا اور اس عورت کو دیکھا جس نے بلی کو باندھ کر بھوکے مار دیا تھا اور آپ ﷺ نے جنت میں ایک بدکار عورت کو دیکھا جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔

یہ بات بدیہی ہے کہ اس مسافت میں یعنی آپ ﷺ کے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان میں جنت وجہنم کی اس مقدار طول وعرض کے ساتھ جو عام لوگ جانتے ہیں کیسے سماتی، یہی تو جنت اور جہنم کی صورتِ مثالیہ تھی۔

- وقال : يؤتى بالموت كانّه كبش، فيذبح بين الجنّة والنّار (۲) ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن موت کو مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور جنت ودوزخ کے درمیان اس کو ذبح کر دیا جائے گا۔

- وقال تعالیٰ: " فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا " (۳) پس ہم نے مریم کے پاس روح بھیجی، پس وہ ایک دُرست انسان کی طرح اس کے سامنے ظاہر ہوئی۔

عام مفسرین کی یہ رائے ہے کہ اس آیت میں روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں، مگر شاہ

---

(۱) بخاری : الرقاق، القصد والمداومة على العمل، حديث:۶۴۶۸

(۲) مسلم : باب النار يدخلها، حديث:۲۸۴۹ (۳) المريم :۶۸-۶۴

ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ روح سے جاں مراد لیتے ہیں جو ایک امر رب اور معنوی چیز ہے جس نے درست انسان کی شکل اختیار کی، یہی مثالی جسم ہے۔(۱)

اس طرح کی متعدد روایتیں کتب احادیث میں موجود ہیں، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عالم ِمثال کا وجود ہے، ہر خارجی اور معنوی چیز کی اشکال وہاں موجود ہوتی ہیں، ان کیلئے زماں اور مکان کی کوئی قید اور پابندی نہیں ہے اور نہ عناصر سے مرکب ہے، یہ اترتی چڑھتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی یہ باب اس لئے قائم فرمایا ہے کہ عالمِ مثال کو ثابت کیا جائے اور ان احادیث کے صحیح محمل کو متعین کیا جائے۔

فضائلِ اعمال میں مذکورہ واقعات

لہٰذا فضائلِ اعمال میں حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت و ملاقات سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں، اگر اس کو جسم مثالی قرار دیتے ہیں، آپ ﷺ کی ذات کا عین نہیں قرار دیتے تو بہت سارے اعتراضات کا دفعیہ ہو جاتا ہے کہ اس رؤیت سے دیکھنے والا شخص صحابی کیوں نہیں ہوتا، اس آمد سے حضورِ اکرم ﷺ اپنی قبرِ اطہر پر موجود نہیں ہوتے ہوں گے۔ یا بیک وقت متعدد لوگوں کو شرفِ ملاقات کیوں کر نصیب ہوتی ہے وغیرہ؟ اگر اس جسم کو اور اس رؤیت (دیکھنے) کو مثالی قرار دیا جاتا ہے تو یہ سب اشکالات خود بخود درفع ہو جاتے ہیں کیونکہ جسم مثالی متعدد ہو سکتے ہیں اسی کو علامہ سیوطیؒ نے یوں فرمایا ہے :

> هل الرؤية بذات المصطفىٰ بجسمه وروحه أولمثاله؟ الذين رأئيهم أرباب الأحوال يقولون بالثانى وبه صرّح الغزالى فقال: ليس المراد أنّه يرى جسمه وبدنه بل مثالاً له، صار ذلك المثال اٰية تأدّى بهاالمعنى الذى في نفسه (۲)

حضور ﷺ کی یہ زیارت مع جسم اور روح کے ہوتی ہے یا یہ جسم مثالی ہے اربابِ احوال دوسرے کے قائل ہیں، امام غزالی نے بھی دوسری صورت یعنی جسمِ مثالی کی وضاحت کی ہے اور فرمایا ہے، مطلب یہ نہیں کہ اس نے آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کو دیکھا ہے، بلکہ

---

(۱) رحمۃ اللہ الواسعۃ شرح حجۃ اللہ البالغۃ:۱/۱۹۵ (۲) الحاوی للفتاویٰ : ۲/۶۲۳

آپ ﷺ کی مثال کو دیکھا ہے اور اس مثال سے وہ مطلب اور مقصد پورا ہو جاتا ہے جو براہِ راست آپ ﷺ کی ذات سے ہوتا۔

لہٰذا فضائلِ اعمال میں مذکورہ سید احمد رفاعی کا واقعہ جس میں ان کے حج سے فارغ ہو کر قبرِ اطہر کی زیارت کی غرض سے روضہ کے مقابل کھڑے ہو کر اشعار پڑھنا منقول ہے کہ دوری کی حالت میں اپنی روح کو خدمت اقدس میں بھیجا کرتا تھا وہ میری نائب بن کر آستانۂ مبارک چومتی تھی اب جسموں کی باری آئی ہے اپنا دستِ مبارک عطا فرمایئے تا کہ میرے ہونٹ اس کو چومیں) اس پر قبرِ اطہر سے دستِ مبارک کا نکلنا اور اس کو چومنا وغیرہ۔(۱)

اس طرح کے دیگر واقعات جیسے سفیان ثوریؒ کا واقعہ جسے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے ابونعیمؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ :

میں ایک دفعہ باہر جا رہا تھا کہ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ قدم اٹھاتا یا رکھتا ہے تو کہتا ہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ پھر آگے چل کر اس واقعہ میں یوں لکھا ہے کہ سفیان ثوریؒ نے اس سے اس کثرتِ درود کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتلایا میں اپنی ماں کے ساتھ حج کو گیا تھا، میری ماں وہیں رہ گئی یعنی مرگئی، اس کا منہ کالا ہو گیا اور اس کا پیٹ پھول گیا جس سے اندازہ ہوا کہ کوئی بہت بڑا سخت گناہ ہوا ہے، اس سے میں نے اللہ جل شانہ کی طرف دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تو میں نے دیکھا کہ حجاز سے ایک ابر آیا اور اس میں سے ایک آدمی ظاہر ہوا اس نے اپنا مبارک ہاتھ میری ماں کے منہ پر پھیرا جس سے وہ بالکل روشن ہو گیا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو ورم بالکل جاتا رہا، میں نے ان سے عرض کیا آپ کون ہیں کہ میری اور میری ماں کی مصیبت کو دور کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ میں تیرا نبی پاک ﷺ ہوں' میں نے عرض کیا کوئی وصیت کیجئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قدم رکھے یا اٹھایا جائے تو اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ پڑھا کر۔(۲)

رسول اللہ ﷺ کا خواب میں بہ زبان اردو گفتگو کرنا

سوال: یہ سوال بعض صلحاء کی اس تحریر پر کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اردو میں کلام فرماتے

(۱) فضائل حج : ۱۳۱ (۲) فضائل درود : ۱۲۱-۱۲۲

دیکھا، ان ہی صاحبِ رؤیا کے نام آیا تھا، آپ ﷺ عالم اور عربی داں، پھر باوجود اس کے جناب رسول اللہ ﷺ نے آپ سے منام میں عربی زبان میں کس وجہ سے کلام نہیں فرمایا؟

جواب: (من صاحب المکتوبات) خواب میں جو حقائق منکشف ہوتے ہیں خواہ وہ مضرات میں سے ہوں یا مسموعات میں اور کبھی صورتِ مثالیہ میں اور دوسری صورت اکثر ہوتی ہے اور احیانا پہلی صورت بھی ہوتی ہے، پس تکلم باردو میں غالب الوقوع یہ ہے کہ حضور ﷺ کی جانب سے افاضہ معانی کا ہوا ہے کہ حضور ﷺ حالت مخاطب اردو کلمات کی صورت میں متمثل ہو کر مسموع ہوئے اور احتمال یہ بھی ہے بطور خرق عادت کے احیانا آپ ﷺ ہی نے غیر عربی میں تکلم فرمایا ہو جیسا بعض روایات حدیثیہ میں بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: اشکمت درد، واللہ اعلم

اور ایک بار صاحب المکتوبات نے اس مضمون کو اس عنوان سے ارشاد فرمایا کہ: خواب عالم تمثل ہے کچھ عجب نہیں آپ ﷺ نے عربی میں فرمایا ہو، مگر خصوصیات طبعیہ رائی کے سبب وہ عربی اردو میں متمثل ہو گئی ہو ”وهذا أقرب إلى قواعد فن الرؤيا“ (۱)

اس قسم کے واقعات جو کتب فضائل میں مذکور ہیں اسے ناممکن اور مستبعد کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا، چونکہ روایات میں عالمِ مثال کا ثبوت ہے۔ حضور ﷺ اپنے جسمِ مثالی کے ساتھ بحکم خداوندی حاضر ہوئے ہوں اور بندوں کی ضروریات پورے کرتے ہوں اور جسمِ مثالی عین جسم سے مختلف ہوتا ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، لیکن چونکہ صورۃ اور شباہۃً دونوں ایک ہوتے ہیں، اس لئے اس پر جسم مثالی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض آنحضرت انے ایک غیر محرم کے چہرے اور اس کے سینے پر ہاتھ کیسے پھیرا، اس وجہ سے درست نہیں کہ ممکن ہے وہ آپ ﷺ کا جسمِ مثالی تھا اور جسم مثالی پر جسمِ عینی وعنصری کے احکامات جاری نہیں ہوتے۔

○ مرنے کے بعد روح کا کسی جگہ آموجود ہونا

عن سلمى امرأة من الأنصار قالت: دخلت على ام سلمة رضى الله عنها وهى تبكيى، فقلت مايبكيك؟ قالت: رايت الان رسول الله ﷺ في المنام وعلى رأسه ولحيته التراب،

(۱) بوادر النوادر: ۴۹، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

وھو یبکی فقلت: ما یبکیك یارسول اللّٰہ؟ قال: شھدت قتل الحسین انفاً۔(۱)

حضرت سلمیٰؓ سے جو انصار میں سے ایک بی بی ہیں، روایت کیا کہ میں حضرتِ ام سلمہؓ کے پاس آئی اور وہ رو رہی تھی، میں نے پوچھا کہ آپؓ کے رونے کا کیا باعث ہے؟ انہوں نے فرمایا: کہ میں نے اس وقت رسول اللہ ﷺ کو خواب میں اس حالت میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے سر مبارک اور ریش مبارک پر گرد پڑی ہے اور آپ ﷺ رو رہے ہیں، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کے رونے کا کیا باعث ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں حسینؓ کے قتل کی جگہ گیا تھا۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ گرچہ روح کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کا مقام دوسرا ہے، لیکن اللہ کے حکم سے خلاف عادت اس کا اس دنیا میں آنا ممکن ہے، جیسا کہ حضور ﷺ کی روح مبارک کا دنیا میں آنا دیکھا گیا۔

عن انسٍ رضی اللہ عنہ فی حدیث الاسراء لقاء ہ مع موسی علیہ السلام فی اٰخرین من الانبیاء علیھم السلام مع ماروی عن انس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ: اتیت لیلۃ اُسری بی علی موسی علیہ السلام قائما یصلي قبرہ عندالکثیب الاحمر (۲)

حضرتِ انس رضی اللہ عنہ سے اس حدیث میں جس میں شبِ معراج میں موسیٰ علیہ السلام سے آپ ﷺ کی ملاقات دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مجمع میں مذکور ہے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شب معراج میں میرا موسیٰ علیہ السلام پر گذر ہوا کہ اپنی قبر میں جو سرخ ٹیلہ کے پاس ہے کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔

مذکورہ بالا دونوں روایات سے یہ پتہ چلا کہ بزرگوں کی روح اگر کسی جگہ متجسّم (جسم کے ساتھ) ہوکر نظر آئے تو یہ ممکن ہے، لیکن یہ نہ ہمیشہ ہوتا ہے اور نہ یہ کسی کے اختیار میں ہوتا ہے،

---

(۱) ترمذی: المناقب، مناقب ابی محمد بن علی بن ابی طالب والحسین بن ابی طالبؓ: ۳۷۷۱، امام ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے۔

(۲) مسلم: الفضائل، فضائل موسیٰ علیہ السلام، حدیث:۱۶۴-۲۳۷۵، نسائی قیام اللیل وتطوع النھار، ذکر صلاۃ نبی اللّٰہ موسی علیہ السلام: حدیث:۱۶۳۲

جیسا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی قبر میں تشریف رکھنے کے باوجود دوسری جگہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ملے۔

- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان جارہے تھے، ہمارا ایک وادی پر گذر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وادی کونسی ہے؟ ہم لوگوں نے عرض کیا وادی ارزق ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گویا (میں اس وقت) موسی کو دیکھ رہا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے رنگ اور بالوں کی کچھ کیفیت بیان فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کی یہ حالت ہے کہ اپنی انگلیاں کانوں میں رکھے ہوئے ہیں اور لبیک سے اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر ہم آگے چلے، یہاں تک کہ ہم ایک گھاٹی پر پہنچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کونسی گھاٹی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ''ہرشیٰ'' ہے ''لفت'' ہے فرمایا: میں گویا (اس وقت) یونس علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں، ایک سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، ان پر اون کا ایک کرتا ہے، ان کی اونٹنی کی نکیل کھجور کی ٹہنی کی ہے اور اس وادی سے گذر رہے ہیں۔(۱)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ موسی علیہ السلام اور یونس علیہ السلام آپ کو نظر آئے اور یہ ان کی مثالی ارواح تھیں، ورنہ ان کے جسد قبور میں تھے۔ الغرض ان مجموعۂ روایات سے یہ پتہ چلا کہ بزرگ اللہ کے حکم سے بسا اوقات صورت مثالیہ میں نظر آتے ہیں بطور کشف وکرامت کے۔

لہٰذا فضائلِ اعمال میں ذکر کردہ اس قسم کے واقعات کوئی مشکل یا محال نہیں ہیں۔ بطورِ خرق عادت کے روحوں کا نظر آنا ممکن ہے۔

فضائلِ اعمال کے واقعات

حضرت عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ :

جب دشمنوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو محصور کررکھا تھا میں ان کی خدمت میں سلام کیلئے حاضر ہوا تو فرمانے لگے: بھائی بہت اچھا کیا آئے، میں نے اس کھڑکی میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عثمان تمہیں ان لوگوں نے محصور کررکھا ہے میں نے عرض کیا جی ہاں کررکھا ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) مسلم : الاسراء برسول اللّٰہ ا، الی السموات وفرض الصلوات : ۲۶۹-۱۶۶

تمہیں پیاسا کر رکھا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، اس پر حضور ﷺ نے ایک ڈول پانی کا لٹکایا جس سے میں نے پانی پیا، اس کی ٹھنڈک اب تک میرے دونوں شانوں اور دونوں چھاتیوں کے درمیان محسوس ہو رہی ہے، اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: چاہو تو ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کی جائے اور تمہارا دل چاہے تو یہاں ہمارے پاس آ کر ہی افطار کر لینا، میں عرض کیا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں؛ چنانچہ وہ اسی دن شہید کر دیئے گئے۔(۱)

موت کے بعد قیامت تک روحیں کہاں ٹھہرتی ہیں؟

موت کے بعد قیامت کے وقوع پذیر ہونے تک اس درمیانی وقفہ میں روحوں کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ آسمان پر ہوتی ہیں یا زمین پر؟ کیا جنت میں ہوتی ہیں یا کسی دوسرے مقام پر؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، اس بارے میں علامہ ابن قیمؒ نے سترہ اقوال ذکر کئے ہیں، جن میں سے چند اہم اقوال ہم ذکر کرتے ہیں:

- بعض کے نزدیک مومنین کی روحیں اللہ کے پاس جنت میں رہتی ہیں خواہ شہید ہوں یا نہ ہوں، بشرطیکہ کوئی گناہ کبیرہ یا قرض حائل نہ ہو، ان سے ان کا رب عفو ورحم کا معاملہ کرتا ہے، یہ قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ہے۔
- بعض کے نزدیک حدود جنت میں جنت کے دروازوں پر رہتی ہیں اور انہیں جنت کی ٹھنڈی ہوائیں، اس کی نعمتیں اور روزیاں پہنچتی رہتی ہیں۔
- بعض کے نزدیک روحوں کی جماعت اپنی اپنی قبروں کے صحنوں میں رہتی ہیں۔
- امام مالکؒ کا بیان ہے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ روحیں آزاد ہیں جہاں چاہتی ہیں آتی جاتی ہیں۔
- صحابہ رضی اللہ عنہم اور ایک تابعینؒ کی ایک جماعت کے نزدیک مومنوں کی روحیں جابیہ میں اور کافروں کی روحیں برہوت (حضرموت کے ایک کنویں) میں رہتی ہیں۔
- مومنوں کی روحیں "علیین" میں ساتویں آسمان میں رہتی ہیں اور کافروں کی روحیں ساتویں زمین میں میں "سجین" ابلیس کے لشکر کے نیچے۔

---

(۱) فضائلِ حج: ۱۳۲

جنت میں ارواح کے قیام کے دلائل

جولوگ اس بات کے قائل ہیں کہ روحیں جنت میں رہتی ہیں ان کے حسبِ ذیل دلائل ہیں :

"فَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٌ"(۱)

پھر اگر وہ مقرب حضرات میں سے ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہے اور روزی ہے اور نعمت والی جنت ہے۔

روح کی یہ حالت موت کے وقت جسم سے نکلنے کے بعد بیان کی گئی ہے اور روحوں کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں، مقرب روحیں (ان کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ نعمت والی جنت میں ہیں) دائیں جانب والی روحیں (ان پر سلامتی کا حکم لگایا گیا جو عذاب سے محفوظ رہنے کو شامل ہے اور گمراہ روحیں) ان کے بارے میں بتلا گیا کہ ان کی کھولتے ہوئے پانی اور دخول جہنم سے تواضع کی جاتی ہے۔ اول سورت میں قیامتِ کبری کے بعد والے حالات بیان کئے گئے ہیں اور یہاں آخر سورت میں قیامتِ صغریٰ (موت) کے بعد کے احوال بیان کئے گئے ہیں:

"يَاۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، اِرْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ، وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ" (۲)

"اے مطمئن روح اپنے رب کی طرف راضی وبخوشی لوٹ، رب بھی تجھ سے راضی ہے اور میرے بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا"۔

اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعینؒ فرماتے ہیں کہ روحوں سے یہ خطاب موت کے وقت جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہوتی ہیں کیا جاتا ہے۔

امام مالک نے موطا میں ابن شہاب سے وہ عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک سے نقل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"انما نسمة المومن طائر تعلق في شجر الجنة حتى يرجعه الله اليه الحياة يوم يبعثه" مومن کی روح ایک پرندہ ہے جو جنت کے درختوں سے کھاتی پیتی ہے جب تک اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس کے جسم میں نہ لوٹا دے۔

---

(۱) الواقعه : ۸۹-۹۰ (۲) الفجر : ۲۷-۳۰

ایک اعتراض اور اس کا جواب

مذکورہ بالا اس قول پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ بات حدیث کے اس مفہوم کے معارض ہے :

اذا مات احدكم عرض عليه مقعده بالغداة والعشى ان كان من اهل الجنة فمن اهل الجنة وان كان من اهل النار فمن اهل النار يقال له: هذا مقعدك حتى يبعثك الله إليه يوم القيامة مرنے کے بعد مردے پر اس کا جنتی یا جہنمی ٹھکانا صبح وشام پیش کیا جاتا ہے اور قیامت تک پیش کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات واحادیث سے جس طرح مومن اور شہید دونوں کی ارواح کا جنت میں ٹھکانا ہونا معلوم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مردے کا جو ٹھکانا اس پر صبح وشام پیش کیا جاتا ہے یہ پیشی میں دونوں (مومن اور شہید) شامل ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث اس قول کے معارض اس لئے نہیں ہے کہ کیونکہ شہید کی وہ خاص منزل جو اس کیلئے تیار کی گئی ہے اس میں تو وہ قیامت میں داخل ہوگا کیونکہ شہید کا محل وہ قندیلیں نہیں جن میں برزخ میں ان کی روحیں رہتی ہیں، لہٰذا عام مومنوں کی طرح شہید بھی ان قندیلوں سے اپنے جنتی ٹھکانے روزانہ صبح وشام دیکھتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اصل گھر تو قیامت میں ملیں گے، برزخ میں نہیں، اس کی نظیر جہنمی بدبخت ہیں کہ ان پر صبح وشام جہنم پیش کی جاتی ہے پھر قیامت کے دن یہ اس میں داخل ہو جائیں گے جو برزخ میں پیش کی جاتی رہیں، معلوم ہوا کہ جنت میں عالمِ برزخ میں روحوں کا آرام وچین اور ہے اور قیامت کے دن بدنوں کے ساتھ جنت میں اپنے گھروں میں جانا اور ہے، برزخ میں روح کو جو غذا ملتی ہے وہ اس غذا سے کم ہے جو زندگی بعد الموت جنت میں بدنوں کے ساتھ ملے گی، معلوم ہوا کہ ان دونوں حدیثوں میں ٹکراؤ نہیں...... شہید اور غیر شہید مومن دونوں کی روحیں جنت میں ہوں گی، لیکن چونکہ شہید کے بے شمار فضائل قرآن وحدیث میں بیان کئے گئے ہیں؛ لہٰذا ان کیلئے یہ خصوصیت اور امتیاز ہوگا کہ ان کی روحیں سبز پرندوں کی پپوٹوں میں رکھی ہوں گی اور عام مومنین کی روحیں پرندے کی صورت یا مثل پرندے کے ہوں گی جس پر حدیث کے الفاظ صراحۃً دلالت کرتے ہیں چونکہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ والی روایت میں ہے کہ مومن کی روح مثل پرندے کے ہے، مگر صحیح مسلم کی روایت میں فی "اجواف طيرٍ خضر" کے الفاظ آئے ہیں یعنی سبز پرندوں کے پپوٹوں میں ہیں، گویا

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ شہید مومن کی روح ایک پرندہ ہے جو جنت کے پھل کھاتا ہے اور عام مومن کی روح مثل پرندہ کے ہے۔(۱)

روحوں کے ٹھکانے کے بارے میں اکثر اقوال کا مآل (انجام) ایک ہی ہے

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ روحیں جنت میں نہیں ہوتی، مگر انہیں اس کے پھل اور خوشبو پہنچتی رہتی ہے اور اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام احمدؒ نے اپنے مسند میں ابن اسحاق سے نقل کیا ہے وہ عاصم بن عمر سے، وہ محمود بن لبید سے وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں :

"قال قال رسول اللہ ﷺ : الشهداء على بارق نهر بباب الجنة فى قبة خضراء يخرج عليهم رزقهم من الجنة بكرة وعشية"

شہید جنت کے دروازے والی نہر کے کنارے پر سبز گنبد میں ہوں گے اور ان کا رزق صبح وشام انہیں جنت سے ملتا رہے گا۔

اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جنت میں نہیں ہوتے، کیونکہ یہ نہر جو باب جنت پر ہے جنت ہی سے آئی ہے، اسی نہر کے کنارے پر ان کے محل ہوں گے اور جنت ہی میں روزی پیدا ہوگی، گو جنت کے آخرت والے متوقع محلوں میں نہ ہوں، اس قول کے قائل نے جنت میں نہ ہونے کی نفی ہے کہ وہ آخرت والے جنتی محلوں کی نفی ہے۔

اسی طرح جو لوگ روحوں کے قبروں یا قبروں کے صحنوں میں رہنے کے قائل ہیں اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہاں سے کبھی الگ نہیں ہوتیں تو یہ غلط ہے جس کی تردید قرآن وحدیث سے ہوتی ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ کبھی قبروں میں آجاتی ہیں یا اپنی جگہ رہ کر قبروں سے تعلق قائم رکھتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ محض مردوں پر جنت وجہنم پیش کئے جانے سے روحوں کا ہمیشہ قبروں میں یا قبروں کے پاس رہنا لازم نہیں آتا، بلکہ ان کا قبروں سے لگاؤ اور تعلق ثابت ہوتا ہے، اسی تعلق کی بناء پر ان کے ٹھکانے پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ روح کا معاملہ ہی جداگانہ ہے وہ رفیق اعلی اور اعلی علیین میں رہتے ہوئے بھی اس حیثیت سے بدن سے متصل ہے کہ جب مردے پر کوئی مسلمان سلام کرتا ہے تو اللہ پاک اس پر اس کی روح لوٹا دیتا ہے اور وہ اس کے سلام کا جواب دے دیتا ہے حالانکہ روح ملأ اعلیٰ میں ہے۔(۲)

---

(۱) کتاب الروح : ۸۶-۸۷-۸۸ (۲) کتاب الروح : ۹۰-۹۱

اس قول پر تبصرہ کہ مومنوں کی روحیں جابیہ

یا چاہ زمزم اور کافروں کی حضرموت کے ایک کنویں برہوت میں ہیں

علامہ ابن قیمؒ کتاب الروح میں اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ابنِ حزم کہتے ہیں کہ یہ رافضیوں کا قول ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ اہل سنت کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے۔صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مومنوں کی روحیں جابیہ میں ہیں۔ چنانچہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مومنوں کی روحیں جابیہ میں جمع ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ کعب رضی اللہ عنہ نے دیکھا لوگ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہیں اور ان سے مسائل پوچھ رہے ہیں، ایک شخص نے کہا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ مومنوں اور کافروں کی روحیں کہاں ہیں، آخر اس نے پوچھا تو فرمایا کہ جابیہ اور برہوت میں ابنِ مندہ نے اس روایت کو حماد بن سلمہ سے اور وہ عبدالجلیل بن عطیہ سے اور وہ شہر بن حوشب سے نقل کیا ہے)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ روئے زمین پر بہترین کنواں زمزم اور بدترین کنواں برہوت ہے اور زمین کا بہترین علاقہ مکہ کا علاقہ ہے اور بدترین علاقہ وہ ہے جہاں حضرتِ آدم علیہ السلام اُتارے گئے تھے، اسی علاقہ سے تمہاری خوشبو آتی ہے اور بدترین علاقہ احقاف ہے جو حضرموت میں ہے (ابنِ مندہ کہتے ہیں: اسے ابوداؤد وغیرہ نے عبدالجلیل کی سند سے روایت کیا ہے پھر انہوں نے سفیان کی حدیث جو فرات قزاز سے وہ ابوالطفیل سے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے ذکر کی ہے)۔

ابنِ مندہ کہتے ہیں: حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے، وہ یوسف بن مہران سے، وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں روئے زمین کی بدترین جگہ حضرت موت کی وادی ہے جسے برہوت کہتے ہیں اور جہاں کافروں کی روحیں ہیں اور وہاں ایک کنواں ہے جس کا پانی دن میں پیپ کی طرح سیاہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں کیڑے مکوڑے جمع رہتے ہیں۔

پھر ابن مندہ نے اسماعیل بن اسحاق قاضی کی سند نقل کی ہے وہ علی بن عبداللہ سے، وہ سفیان سے وہ ابان بن تغلب سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں' ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے وادی برہوت میں ایک رات گذاری، میں نے وہاں طرح طرح کی آوازیں سنیں جیسے لوگ پکار رہے ہیں

اے دومۃ! اے دومہ! کسی اہلِ کتاب نے بتایا کہ دومہ وہ فرشتہ ہے جو کافروں کی روح پر موکل ہے۔ سفیان کہتے ہیں کہ ہم نے حضرمیوں سے سنا کہتے تھے وہاں کوئی شخص رات نہیں گذار سکتا۔(۱)

موت سے لے کر وقوعِ قیامت تک روحوں کے ٹھکانے کے بارے میں اس بحث کا تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے فضائل صدقات ص ۱۹۵ میں تنبیہ الغافلین کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں مومنین کے ارواح کا بئر زمزم میں ہونا اور کفار کے ارواح کا برہوت نامی کنویں میں ہونے کا ذکر آیا ہے' فرماتے ہیں :

''فقیہ ابواللیث نے ایک عجیب قصہ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں: مکہ مکرمہ میں ایک نیک شخص امانت دار خراسان کے رہنے والے تھے' ایک شخص ان کے پاس دس ہزار اشرفیاں امانت رکھوا کر اپنی کسی ضرورت سے سفر پر گیا' جب وہ سفر سے واپس آیا تو خراسانی کا انتقال ہو چکا تھا' ان کے اہل وعیال سے امانت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے انکار کر دیا، چونکہ رقم بڑی تھی۔ اس نے علماء مکہ سے مسئلہ پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے، انہوں نے کہا کہ وہ آدمی تو بڑا نیک تھا، ہمارے خیال میں جنتی تھا تو ایک ترکیب یہ ہے کہ جب آدھی یا تہائی رات گذر جائے تو زمزم کے کنویں پر جا کر اس کا نام لے کر پکار کر اس سے دریافت کر اس نے تین دن تک ایسا ہی کیا وہاں سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پھر جا کر علماء سے تذکرہ کیا انہوں نے اناللہ پڑھا اور کہا ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ وہ شاید جنتی نہ ہو تو فلاں جگہ جا مکان کے اندر اس کو گاڑ دیا ہے، میرے لڑکے سے کہہ وہ تجھے وہاں پہنچا دے، وہاں سے زمین کھود کر نکال لے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور مال مل گیا''۔

روح کے بقاء اور فنا کے بارے میں چند بے بنیاد اقوال

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ روحوں کا بالذات اور مستقل وجود نہیں ہوتا، یہ عوارض اجسام میں سے ہوتے ہیں یہ ابن باقلانی اور ابوالہزیں خلاّف وغیرہ کا قول ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ جسم کی موت سے دیگر عوارض کی طرح روح بھی مرجاتی ہے ان کا کہنا ہے کہ ایک عرض دو زمانوں میں نہیں پایا جاتا، لہٰذا ہر تغیر کے بعد ایک نئی روح کا پیدا ہونا ضروری ہے، یعنی زندگی کے تھوڑے سے زمانے میں انسان کی ہزاروں روحیں پیدا اور ختم ہوتی رہتی ہیں اور مرنے پر پچھلی روح بھی ختم ہو جاتی ہے۔

---

(۱) کتاب الروح : ۹۷-۹۸

یہ قول قرآن وحدیث اور اجماع کے خلاف ہے اور عقلی وفطری دلائل بھی اسے رد کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے روحوں کو نکلنے اور داخل ہونے کا اور لوٹ آنے کا حکم دیا ہے اور صحیح وصریح دلائل بتاتے ہیں کہ روحیں چڑھتی اور اترتی اور پکڑی اور چھوڑی جاتی ہیں، ان کیلئے آسمان کے دروازے کھلتے ہیں وہ سجدہ اور گفتگو کرتی ہیں، وہ پانی کے قطرے کی طرح جسم سے نکل آتی ہیں، جنت یا جہنم کے کفنوں میں لپٹی جاتی ہیں، انہیں ملک الموت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، پھر اس کے ہاتھ سے فرشتے لے لیتے ہیں، اس سے خوشبو یا بدبو نکلتی ہے۔ انہیں ایک آسمان کے فرشتے دوسرے آسمان تک پہنچاتے ہیں، پھر وہ فرشتوں کے ساتھ زمین پر بھیجی جاتی ہیں، روح کو نکلتے وقت مرنے والے کی آنکھ دیکھتی ہے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں، حتیٰ کہ حلق تک پہنچ جاتی ہیں، علاوہ ازیں ارواح کی باہمی ملاقات اور ان کا باہمی تعارف بھی ہوتا ہے اور وہ ایک جگہ جمع کیا ہوا لشکر ہیں وغیرہ۔ پھر یہ کتنی فحش غلطی ہے کہ ایک انسان کی زندگی میں ہزاروں روحیں مانی جائیں اور مرنے کے بعد ایک روح بھی عذاب وثواب کیلئے باقی نہ مانی جائے یہ بات عقل وفطرت کے بھی خلاف ہے اور قرآن وحدیث کے بھی۔

باطل تناسخ

باطل تناسخ وہ ہے جس کے ملحد قائل ہیں اور جو زندگی بعد الموت نہیں مانتے، ان کے فاسد گمان میں روحیں اجسام سے جدا ہو کر اپنے اپنے عملوں کے مطابق حیوانات الارض (کیڑے مکوڑے) اور پرندوں کی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں اور اسی چکر میں رہتی ہیں، یہی ان کا عذاب وثواب ہے اور اس چکر سے انہیں کبھی نجات نہیں مل سکتی، کیونکہ ان کے گمان میں دُنیا کا چکر کبھی ختم نہیں ہوگا، زندگی بعد الموت کچھ نہیں، کیونکہ دنیا ختم ہی نہیں ہوگی، یہی وہ باطل تناسخ ہے جو تمام انبیاء کے متفقہ حقیقت (زندگی بعد الموت) کے خلاف ہے اور یہی اللہ اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اس گمراہ فرقہ کے نزدیک روحوں کا مستقر بدن سے جدا ہونے کے بعد مناسب حیوانوں کے اجسام ہیں۔ یہ انتہائی گھناؤنا اور غلط قول ہے۔(۱)

---

(۱) کتاب الروح : ۹۹-۱۰۰، اس سلسلہ کی تفصیلات کا معلوم کرنے کے لئے علامہ ابن قیم الجوزی کی ''کتاب الروح'' یا حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی کتاب ''عالم برزخ'' جو ''توضیحات حکیم الاسلام'' کے ضمن میں فرید بکڈپو نے طبع کیا ہے، مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

سماع موتیٰ (مُردوں کا سننا)

مُردے زِندوں کی پکار کو سنتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر سنتے ہیں تو اُس کا جواب دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں تفصیل ہے سماع موتی (مردوں کے سننے) کا مسئلہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی سے مختلف فیہ رہا ہے۔ ایک طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں جو سماع موتی کے قائل ہیں دوسری طرف حضرتِ عائشہؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ جو سماع موتی کا انکار کرتے ہیں، ہر ایک کے دلائل اور شواہد ہیں۔

منکرین کے دلائل

چنانچہ حضرتِ عائشہ ؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مستدل یہ آیتیں ہیں :

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۱) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم مردے کو سنا نہیں سکتے''

وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (۲) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کو سنا نہیں سکتے''۔

بعض لوگوں نے اس مذہب کی نسبت ابوحنیفہؒ کی طرف بھی کی ہے (واضح ہو کہ امام ابوحنیفہؒ سے صراحۃً یہ بات منقول نہیں ہے' نہ ہی انہوں نے صراحۃً اس کا انکار کیا ہے اور نہ ہی اثبات' بلکہ ایک دوسرا مسئلہ ہے جس کو فقہاء نے کتاب الأیمان میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ''اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص سے بات نہیں کروں گا، پھر وہ مرگیا اور اس کی قبر پر جا کر کلام کیا تو اس سے حانث (قسم نہیں ٹوٹے گی) نہیں ہوگا چنانچہ علامہ ابن ھمام شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں :

اعلم انّ اکثر مشائخ الحنفية على أن الميت لايسمع على ما صرّ حوابه فى كتاب الأيمان: لوحلف لا يكلمّه، فكلمّه ميّتًا لا يحنث: لأنّها تنعقد على ما يجيب بفهمٍ، والميت ليس كذلك(۳)

---

(۱) النمل : ۸۰ (۲) الفاطر : ۲۲

(۳) مرقاۃ المفاتیح، کتاب الجهاد، باب ما يقول الرجل، اذا دخل المقابر : ۲۰۲/۱ سعید

یہ جان لینا چاہئے کہ اکثر مشائخ حنفیہ کا یہ مسلک رہا ہے کہ وہ سماع موتی کے قائل نہیں ہیں، چونکہ انہوں نے ''کتاب الأیمان'' میں اس مسئلہ کی صراحت کی ہے کہ: اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ وہ فلاں سے کلام نہیں کرے گا، پھر اس کے مرنے کے بعد کلام کیا تو وہ حانث نہیں ہوگا، چونکہ یہ قسم اس بات پر تھی کہ وہ سمجھ کر جواب بھی دے سکے اور میت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔

اس مسئلہ سے بعض علماء نے یہ اخذ کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سماع موتی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے منکر ہیں، ملا علی قاریؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی طرف اس قول کی نسبت کو غلط قرار دیتے ہوئے ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے۔(۱)

قائلین کے دلائل

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور جمہور درج ذیل روایات سے ''سماعِ موتی'' کو ثابت کرتے ہیں:

۱- عن انس رضی اللہ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: العبد اذا وضع فی قبره وتولّی وذهب اصحابه حتی إنه یسمع قرع نعالهم (۲) حضرتِ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب مردہ قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے دوست واحباب اس کے پاس سے واپس ہونے لگتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آہٹ سنتا ہے۔

۲- عن صالح قال: حدثنی نافع أن ابن عمر رضی اللہ عنہ اخبره قال: اطّلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم لی أهل قلیب فقال أوجدتم ماوعدکم ربّکم حقًّا؟ فقیل له: تدعوا أمواتًا؟ قال: ماأنتم باسمع منهم ولکن لایجیبون (۳) صالح سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نافع نے بیان کیا کہ انہیں ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بتلایا کہ وہ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قلیب (غزوہ بدر کے موقع سے قلیب نامی کنویں میں کفار مشرکین کی نعشیں ڈال دی گئی تھیں) کو جھانک کر یوں فرمایا:

---

(۱) العرف الشذی علی سنن الترمذی: ۲۰۲/۱

(۲) بخاری، کتاب الجنائز، باب المیت یسمع خفق النعال: حدیث:۱۲۷۳

(۳) بخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر: حدیث:۱۳۰۴

تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا کیا تم نے برحق پایا؟ کسی نے آپ سے کہا کہ آپ مردوں کو آواز دیتے ہیں، فرماتے ہیں: تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، لیکن وہ لوگ جواب نہیں دے سکتے۔

آیات واحادیث کے درمیان تطبیق

دونوں جانب چونکہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، جس طرح آیات اپنے مفہوم میں قطعی ہیں، اسی طرح احادیث بھی ان اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جنھوں نے براہِ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان احادیث کا سماع کیا ہے ان کے حق میں قطعی ہیں، اس لئے آیات واحادیث کے درمیان ایسی تطبیق دی جائے کہ ان کے درمیان بالکل تعارض نہ رہے۔

اولاً یہاں تین چیزیں غور طلب ہیں:

اول: اسماع۔ دوم: استماع۔ سوم: سماع۔

۱- اسماع

اسماع (سنانا) کی نفی تو صراحتاً کلام اللہ میں مذکور ہے:

إِنَّكَ لَاتُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۱) وَمَااَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۲)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود مردوں کو نہیں سنا سکتے ہیں۔

۲- استماع

استماع کا حاصل یہ ہے کہ مردے کان لگا کر کسی کی بات سنیں، جب جسم سے روح جدا ہو جائے تو یہ جسم کا کام نہیں ہوسکتا، کیونکہ اصل ادراک کرنے والی چیز روح ہے اور یہ قوتِ سامعہ (سننے کی صلاحیت) اس کیلئے آلۂ ادراک (سمجھنے کا آلہ) ہے، جب روح نے جسم کو اور جسم میں لگے ہوئے آلات کو ترک کر دیا تو یہ اس کیلئے آلات کارآمد نہیں ہیں، جس طرح میت قوتِ باصرہ (دیکھنے کی صلاحیت) لامسہ (چھونے)، باطشہ (پکڑنے) وغیرہ سے کام نہیں لے سکتی، اس طرح قوتِ سامعہ سے بھی کام نہیں لے سکتی۔

---

(۱) النمل:۸۰ (۲) الفاطر: ۲۲

۳- سماع

سماع کا حاصل یہ ہے کہ کوئی خارجی (باہر) آواز اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے میت کو ادراک کرادیں جس میں نہ آواز دینے والے کا دخل ہو اور نہ میت کا تو یہ بالکل ممکن ہے، اللہ کی قدرت سے باہر نہیں' اس کیلئے بے شمار دلائل موجود ہیں۔

الف- حدیث شریف میں ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ کر ساتھی لوٹتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آہٹ سنتی ہے۔ (بخاری، کتاب الجنائز)۔ اس میں نہ میت کے کان لگانے اور اختیار کو دخل ہے اور نہ جوتوں والوں کے سنانے اور میت تک آواز پہنچانے کو دخل ہے۔ اس کے باوجود سماع ثابت ہے۔

ب- قبرستان پہنچ کر سلام کرنا اور دیگر کلمات کہنا مسنون ہے، اتنی کثیر مٹی کے اندر مدفون میت تک معمولی آواز کا پہنچا دینا صاحب آواز کے قابو سے باہر ہے، اس کے باوجود سماع ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

مرّ رسول اللّٰه ﷺ بقبور المدينة' فاقبل عليهم بوجهه فقال: السلام عليكم يا اهل القبور يغفر اللّٰه لنا ولكم وانتم سلفنا ونحن بالآثر (۱) رسول اللہ ﷺ کا اہل مدینہ کے قبرستان پر گذر ہوا، آپ ﷺ ان کے روبرو ہو کر فرمانے لگے: ''تم پر سلامتی ہو اے قبر والو! اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت کرے، تم ہم سے پہلے جاچکے ہم تمہارے نقشہ قدم پر ہیں۔

اسی قسم کی ایک روایت (مسلم، کتاب الجنائز: ۱/۳۱۳، قدیمی) (ابوداؤد: کتاب الجنائز: ۱۰۶/۲، امدادیہ ملتان) میں بھی ہے۔ جن روایات سے سماع کی نفی معلوم ہوتی ہے وہاں استماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی۔

بہر حال سماع ثابت ہے

ابھی اوپر مذکور ہوا کہ بندہ کے بس میں نہیں کہ وہ مردے کو اپنی آواز سنادے (یہی آیات کا محمل ہے) اور نہ خود مردہ سن سکتا ہے ہاں اگر اللہ چاہے تو باہر کی کسی آواز اپنی قدرت سے میت کو

(۱) ترمذی: الجنائز، باب ما يقول الرجل، اذا دخل المقابر : حديث:۱۰۵۳

سنا سکتا ہے، جس میں نہ سنانے والے کو دخل ہوتا ہے اور نہ میت کا اور احادیث میں جو سنانے کا ثبوت ہے اس کی یہی صورت ہے۔

چنانچہ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں :

والحق أنّ الموتى يسمعون فى الجملة، وهذاعلى وجهين، اولّهما ان يخلق اللّٰه عزّوجل فى بعض اجزاء الميت قوة يسمع لها متى شاء اللّٰه السلام و نحوه مما يشاء اللّٰه سبحانه بسماعه ايّاه وثانيهما: أن يكون ذلك السماع بلاواسطة في البدن (۱)

حق بات یہ ہے کہ فی الجملہ مردے سنتے ہیں، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ عز وجل میت کے بعض اجزاء میں ایسی قوت دے دے کہ جس سے وہ جب اللہ چاہے سلام اور اسی طرح کی دیگر چیزیں سن لے، دوسری صورت یہ ہے کہ یہ سننا جسم کے بغیر صرف روح کیلئے ہو۔

ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں :

والحق أن الموتى يسمعون فى الجملة ولا يمنع من ذلك كونه تحت اطباق الثرىٰ (۲) حق بات یہ ہے کہ بہر حال مردے سنتے ہیں، ان کا کثیر مٹی کے نیچے ہونا ان کے سننے کیلئے مانع نہیں ہوتا۔

علامہ ابن قیمؒ نے بھی سماعِ موتیٰ کو بہر صورت ثابت مانا ہے۔ (۳)

تفسیر منیر میں آیات واحادیث کے درمیان یوں تطبیق دی گئی ہے اور اس کے ضمن میں سماع کو ثابت کیا گیا ہے :

والمراد من نفى الاسماع للموتى الاسماع الذي يعقبه اجابةُ وتفاعل وتفاهم‘ فلايعارضه ثبوت السماع من جانبهم دون أن يتمكّنوا من الرّد، أواجابة من يكلّمه، كماثبت أنّ الميت

(۱-۲) روح المعانی، سورة الروم : ۲۱/۵۷،دار احياء التراث العربى

(۳) كتاب الروح، المسئلة السادسة ، هل الروح تعاد الى الميت فى قبره : وقت السوال ام لا:۶۳،مكتبه فاروقيه پشاور.

يسمع قرع نعال المشيعين له اذا انصرفواعنه، وأن النبى على قبور أهل بدر(۱)

مردے کیلئے اسماع کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ ایسا سنانا کہ وہ جواب بھی دے سکے اور سمجھ بھی سکے؛ لہٰذا مردوں کے سننے میں اور بات کرنے والے کا جواب نہ دینے میں کوئی تعارض نہیں، جیسا کہ احادیث سے مردے کا وداع کرنے والوں کے جوتوں کی آواز سننا ان کے لوٹتے وقت اور آپ ﷺ کا اہلِ بدر کی قبروں پر سلام کہنا ثابت ہے۔

غرض یہ کہ اسماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی۔

علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے بھی آیات کا صحیح محمل متعین کرنے کے بعد سماع کی مذکورہ بالا صورت کو ثابت کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ سماع موتی کے قائل نہ صرف عمر رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں بلکہ دیگر اصحاب نبی ﷺ بھی ان کے ساتھ ہیں۔فرماتے ہیں :

والجواب عن الاٰية أنه لايسمعهم وهم موتى، ولكنّ اللّٰه أحياهم حتّى سمعوا، كما قال قتاده رضي الله عنه، ولم ينفرد عمر ولا ابنه لحكاية ذلك بل وافقهما أبوطلحة كما تقدم‘ وروى الطبرانى من حديث ابن مسعود رضي الله عنه مثله باسنادٍ صحيح (۲)

آیت کا جواب یہ کہ وہ سنتے نہیں ہیں یعنی مردہ ہونے کی حالت میں لیکن اللہ عزّ وجل انہیں زندہ کرتا ہے تو وہ سنتے ہیں جیسا کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس واقعہ کے نقل کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ تنہا نہیں ہیں بلکہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس میں ان کی موافقت کی ہے، طبرانی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایسی ہی حدیث صحیح سند سے نقل کی ہے۔

بعض حضرات نے حضرت عائشہؓ کا اپنے قول (عدم سماع موتی) سے رجوع بھی نقل کیا ہے :

(۱) التفسير المنير : ۳۱/۲۰، دارالفكر المعاصر، بيروت، لبنان، سماع الموتى : محمد سرفراز خان صفدرؒ :ص/۱۷۳-۱۷۴

(۲) فتح البارى : ۲۳۶/۷

ومن الغريب أن فى المغازى لابن اسحاق رواية يونس بن بكير باسنادٍ جيّدعن عائشة مثل حديث ابى طلحة وفيه "وما انتم باسمع لما اقول منهم" واخرجه احمد باسنادٍ حسنٍ. فان كان محفوظًا، فكأنها رجعت عن الانكارمما ثبت عندها عن رواية هولاء الصحابة، لكونها لم تشهد القصة (۱)

عجیب بات یہ ہے کہ ابن اسحاق کی مغازی میں یونس بن بکیر نے جید سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے مثل روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ جملہ بھی ہے "وما انتم باسمع لما اقول منهم" اس کی حسن درجے کی سند کے ساتھ احمد نے بھی تخریج کی ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے انکار کے قول سے رجوع کر لیا ہے، چونکہ ان کو ان اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات کی صحت کا پتہ چل گیا تھا، چونکہ وہ مذکورہ واقعہ کے وقت موجود نہیں تھیں۔

علامہ ابن تیمیہ اور مسئلہ سماعِ موتی:

امام ابن تیمیہ جو اپنے کئی علمی تفردات واختیارات میں معروف ہیں، ان کے یہ تفردات ان کے فتاوی کی چوتھی جلد میں بھی موجود ہیں، مثلاً یہ کہ ایک مجلس یا ایک کلمہ کے ساتھ دی گئی تین طلاقیں صرف ایک ہی ہوتی ہیں اور یہ کہ حیض کی حالت میں طلاق نہیں ہوتی اور یہ کہ ہر بڑے چھوٹے سفر میں قصر اور دوگانہ ضروری ہے، اور یہ کہ اگر کوئی شخص عمداً نماز چھوڑ دے تو اس کی قضاء نہیں، سجدۂ تلاوت کے لئے وضو ضروری نہیں، اور یہ کہ توسل درست نہیں، اسی طرح استشفاع عندالقبر جائز نہیں، آج کے نئے فرقے جن میں غیر مقلدین سرفہرست ہیں ان کے ان مسائل کو خوب فروغ دیتے اور خوب اچھالتے ہیں، مگر انہیں علامہ ابن تیمیہ کی رائے سماعِ موتی کے حوالے سے یہ ہے کہ وہ اس کو حق تسلیم کرتے ہیں" سماع الميت للأصوات من السلام والقرأة حق "(۲) مردے کا سلام اور قرآت کی آوازوں کو سننا حق ہے، علامہ ابن تیمیہ کے شاگرد علامہ ابن قیم اور حافظ ابن کثیر جو اپنے دور کے بڑے موحدین میں شمار ہوتے تھے، یہ بھی سماع موتی کو حق جانتے ہیں، چنانچہ

(۱) فتح البارى: كتاب المغازى، باب قتل ابى جهل : ۳۸۵/۷-۳۸۶، قدیمی

(۲) کتاب الروح: ۴، طبع حیدرآباد دکن۔

علامہ ابن قیمؒ کتاب الروح میں فرماتے ہیں ''تحقیق سے آنحضرت ﷺ نے اپنے امتیوں کے لئے یہ مشروع قرار دیا ہے کہ وہ جب اہل قبور کو سلام کریں تو ان سے ایسے انداز سے سلام کریں جیسے مخاطب سے کیا جاتا ہے، اور یہ خطاب ان سے جو سنتے اور سمجھتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ خطاب معدوم اور جماد سے ہوتا، حالانکہ سلف صالحین کا اسی پر اجماع ہے اور تواتر کے ساتھ ان سے یہ خبریں منقول ہیں کہ مردہ اس زندہ کو (آواز سے) پہچانتا ہے جو اس کی زیارت کے لئے آتا ہے اور مردہ کو اس سے خوشی ہوتی ہے: "إن الميت يعرف زيارة الحی له ويستبشر به"۔(۱)

اِس مسئلہ کی شرعی حیثیت

یہ مسئلہ عقائد سے متعلق نہیں ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''یہ مسئلہ نہ عقائد ضروریہ میں سے ہے، نہ کسی عملِ دین کا موقوف علیہ ہے، نہ مجتہد کی نص کا اس میں (تلاش) ضروری، نہ کسی ایک جانب کا جزم ضروری ہے۔لہٰذا اس مسئلہ پر تشدد نہیں کرنا چاہئے''۔(۲)

فضائلِ اعمال اور مسئلۂ سماع موتیٰ

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں فضائلِ اعمال مولفہ حضرت زکریا صاحبؒ پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ اِس طرح کے واقعات کوئی مشکل اور مستبعد اور آیات کے مخالف نہیں، اللہ اپنی قدرت سے مردہ کو بات سنا سکتا ہے، بطورِ کرامت یہ ممکن ہے۔فضائلِ اعمال میں ہے:

مصر کے ایک صاحبِ خیر ایک ضرورت مند کیلئے ایک سخی کی قبر پر گئے اور وہاں درخواست گذار ہوئے، رات کو وہ بزرگ اُنہیں خواب میں ملے اور کہا کہ تم میرے گھر والوں کے پاس جاؤ اور اُن سے کہو کہ مکان کے فلاں حصہ میں جو چولہا بن رہا ہے اس کے نیچے ایک چینی کا مرتبان گڑا ہے، اُس میں پانچ سو (۵۰۰) اشرفیاں ہیں، وہ اُس فقیر کو دے دیں، یہ خواب حرف بہ حرف ثابت ہوا اور اُس پر عمل کیا گیا۔(۳)

---

(۱) اقتضاء الصراط المستقیم :۱۸۱،طبع مصر۔

(۲) امداد الفتاویٰ: ۵۷/۲۱،مکتبہ دار العلوم کراچی،حاشیہ الطحطاوی مراقی الفلاح:۶۲۰،قدیمی، باب احکام الجنائز

(۳) فضائل صدقات:۶۱۷

ایسے ہی یہ واقعہ شیخ ابوالخیر اقطع ایک مرتبہ مدینۂ طیبہ حاضر ہوئے اور وہاں پر پانچ دن ایسے گذر گئے کہ نہ کھانے کو ملا اور نہ ہی کوئی چیز چکھنے کی نوبت آئی، وہ قبرِ اطہر پر حاضر ہوئے اور حضور ﷺ اور شیخین پر سلام عرض کر کے انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں آج رات آپ ﷺ کا مہمان بنوں گا، وہ یہ کہہ کہ منبر شریف کے پاس سو گئے تو انہوں نے خواب میں حضور ﷺ کو دیکھا کہ تشریف فرما ہیں، دائیں بائیں شیخین ؓ ہیں اور سامنے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرتِ علی رضی اللہ عنہ نے اُنہیں بلایا اور کہا کہ دیکھو حضور ﷺ تشریف فرما ہیں وہ اٹھے تو آپ ﷺ نے انہیں روٹی مرحمت فرمائی، انہوں نے آدھی کھائی اور جب آنکھ کھلی تو آدھی روٹی ہاتھ میں تھی۔(۱)

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ سے بھی اِن واقعات پر سماعِ موتی کے تعلق سے اعتراض کیا گیا تھا کہ مردوں نے کیسے سن لیا۔

آپؒ نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ اولاً تو یہ واقعات خواب سے تعلق رکھتے ہیں اور خواب کوئی شرعی حجت نہیں، اچھا خواب ہو تو بشارت ہوتا ہے اس پر اللہ کا شکرگذار ہونا چاہئے اور اس طرح کے واقعات کوئی مشکل بھی نہیں ہیں جیسا کہ احادیث سے سماعِ موتی (مردوں کا سننا) ثابت ہے وہ مشیتِ خداوندی پر موقوف ہے، وہ چاہے تو کسی بزرگ کو بلکہ عامی مسلمان کو بھی سنوادے اور نہ چاہے تو کسی بڑے ولی کو بھی نہ سنائے۔(۲)

لہٰذا اس قسم کے واقعات پر قبر پرستی کا بھی اشکال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سنانے اور سننے والے میں اپنا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ چاہے تو سنادے اور نہ چاہے تو نہیں۔

☒☒☒

---

(۱) فضائلِ حج: ۱۳۳

(۲) کتبِ فضائل پر اشکالات اور اُن کے جوابات: ۱۹۵

خضر علیہ السلام کی حیات کے بارے میں

ائمہ اسلام میں دو مسلک رہے ہیں، محدثینِ عظام عموماً وفات کے قائل ہیں، جب کہ متشرع صوفیاء کرام احادیث وکشف کی بنیاد پر حیات کے، مگر ایک مکتبہ فکر فضائلِ حج وغیرہ میں مذکور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے واقعات کو یک طرفہ دلائل پیش کر کے غلط قرار دیا ہے۔اس لیے ذیل کی تحریر میں اس مسئلہ پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

○ مسئلۂ حیاتِ خضر علیہ السلام

جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں، چنانچہ حافظ ابن رجب حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں :

''کتاب الافصاح میں عجیب وغریب نکات مذکور ہیں۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جن خضر کی ملاقات ہوئی تھی، بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتے تھے، بعض کہتے ہیں وہ اِنسان تھے اور یہی بات صحیح ہے، پھر بعض علماء کا کہنا ہے کہ وہ نیک آدمی تھے، نبی نہیں تھے اور کچھ محققین کی تحقیق یہ ہے کہ وہ نبی تھے اور یہی قول درست ہے، ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں اوران کا کسی شخص کے دروازہ پر جا کر کچھ طلب کرنا اور دوسرے کا کام کرنا ممکن ہے۔ یہ بات مجھ سے محمد یحییٰ زُبیدی نے بیان کی ہے، اس کے بعد مصنف نے زبیدی کی روایت سے حضرت خضر کو دیکھنے اور ملنے کے کئی واقعات ذکر کئے ہیں''۔(۱)

اس تحریر کی روشنی میں یہ پتہ چلا کہ صحیح قول کے مطابق حضرتِ خضر حیات ہیں اور وہ انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ کی تحریر بھی حیاتِ خضر پر بڑی چشم کشا ہے :

قال ابن الصلاح: هوحي عند جمهور العلماء والعامّة معهم فى ذلك، وانما شدبانكاره بعض المحدثين وتبعه النووى، وزادأنّ ذلك متفق عليه بين الصوفية واهل الصلاح وحكاياتهم فى رويته والاجتماع به، اكثر من ان تحصىٰ، روى الدار قطنى في الحديث المذكور قال: مدّ للخضر فى اجله حتّى يكذّب الدجّال...... وقال عبدالرزاق في مصنفه عن محمد فى قصته الذى يقتله الدجّال ثم يحييه: بلغنى أنه الخضر. وكذا قال ابراهيم بن سفيان الراوي عن مسلم في صحيحه (۲)

---

(۱) ذیل علی طبقات الحنابلة : ۲۷۷/۱

(۲) فتح الباری : کتاب احادیث الانبیاء باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہ السلام

''ابن صلاح کہتے ہیں کہ وہ جمہور علماء کے نزدیک باحیات ہیں اور اکثر لوگ جمہور کے ساتھ ہیں، بعض محدثین نے حیاتِ خضر کا سختی سے انکار کیا ہے۔ امام نوویؒ نے بھی انہیں کی پیروی کی ہے اور انہوں نے مزید یہ بات کہی ہے تمام صوفیاءؒ اور اہل صلاح حیات خضر پر متفق ہیں، ان کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کے بے شمار قصے ہیں...... دار قطنی نے اس حدیث کے تحت روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ خضر کی مدت حیات اس قدر لمبی کی گئی ہے کہ وہ دجال کو جھٹلائیں گے۔ عبدالرزاقؒ اپنی مصنف میں معمر سے اس قصے میں جس میں دجال کے قتل کرنے اور زندہ کرنے کا ذکر ہے: فرمایا ہے: مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ خضر ہیں۔ ایسے ہی ابراہیم بن سفیان نے جو صحیح مسلم کے راوی ہیں فرمایا ہے''

امام نوویؒ نے بھی شرح مسلم میں جمہور علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

''اُن کے یہاں حضرتِ خضر علیہ السلام باحیات ہیں اور ان کے درمیان موجود ہیں اور ان کے دیکھنے، ملاقات کرنے، اُن سے سننے، سوال و جواب کرنے، مقدس جگہوں پر اُن کی موجودگی اِس قسم کے بے شمار و بے حساب ایسے واقعات ہیں جو چھپائے نہیں جاسکتے''(۱)

اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر تعزیت کیلئے تشریف لائے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں تعزیت کی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام ہیں، یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، جس میں انہوں نے ان کا کچھ حلیہ بھی بیان فرمایا ہے :

''عن انس بن مالك رضی اللہ عنہ قال: لمّا قبض رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم احدق به أصحابه فبكوا حوله، واجتمعوا، فدخل رجل اشهب اللحية، جسيم، صبيح، فتخطّى رقابهم فبكى ثم التفت الى اصحاب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فقال إن فى الله عزاءً من كلّ مصيبةٍ، وعوضًا من كلّ فائتٍ، وخلفًا من كلّ هالكٍ، فأنيبوا إليه، واليه فارغبوا، ونظره اليكم فى البلاء فانظروا فانّ

---

(۱) شرح مسلم للنووی، كتاب الفضائل، باب من فضائل الخضر: ۲۶۹/۲، قدیمی و كذا فی روح المعانی: الكهف، باب من فضائل الخضر: ۲۶۹/۲، قدیمی

المصاب من لم یجبر فانصرف، وقال بعضھم لبعضٍ: تعرفون الرجل؟ قال: ابوبکر وعلی رضی اللہ عنھما: نعم ھذا اخورسول اللہ ﷺ الخضر علیہ السلام“ (۱)

”انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: جب حضور ﷺ کا وصال ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے اردگرد بیٹھ کر رونے لگے؟ آپ ﷺ کے اطراف اکٹھے ہوگئے، ایک شخص جن کی داڑھی کے بال کچھ سفید تھے، لحیم، شحیم، روشن چہرہ والے اندر آئے۔ لوگوں کی گردنوں کو پھلاندا پھر رو پڑے، اس کے بعد اصحابِ نبی ﷺ کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے: اللہ کی جانب سے ہر مصیبت میں تسلّی کا سامان ہوتا ہے، ہر فوت شدہ چیز کا بدل ملتا ہے اور ہر کھوئی ہوئی چیز کا عوض حاصل ہوتا ہے، اللہ کی جانب متوجہ رہو، اس کی جانب رغبت کرو، مصیبت میں تمہاری نگاہ اسی پر ہو، غور تو کرو کہ اس مصیبت کی تلافی نہیں ہوسکتی، پھر وہ چلے گئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک دوسرے سے کہا: کیا تم لوگ ان کو جانتے ہو، حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرتِ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں یہ رسول اللہ ﷺ کے بھائی خضر علیہ السلام ہیں“۔

مذکورہ بالا حضرتِ انس رضی اللہ عنہ کی اِس روایت سے وفاتِ نبوی کے بعد تک حیاتِ خضر کا پتہ چلتا ہے، پھر اس کے بعد موجودہ وقت تک ان کے حیات پر اہلِ باطن، صلحاء واتقیاء کے بے شمار واقعات جو تواتر کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں صراحت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں۔ (۲)

اِن روایات، ائمۂ سلف کے اقوال اور جمہور علماء کے مذہب سے حیات خضر کا ثبوت ہوتا ہے؛ لہٰذا جو لوگ حیاتِ خضر کے قائلین کو کافر کہتے ہیں دراصل یہ ان کی ناواقفیت اور علمی کم مائیگی کی وجہ سے ہے یا چوں کہ یہ فروعی اختلافی مسئلہ ہے اور فریقین کے نزدیک دلائل ہیں، اس لیے اپنے موقف پر اصرار کر کے دوسرے کی تغلیط کرنا زیادتی ہے۔

---

(۱) دلائل النبوۃ للبیھقی: باب ما جاء فی عظم المصیبۃ التی نزلت بالمسلمین بوفاۃ رسول اللہ ﷺ: ۲۶۹/۷، دارالکتاب العلمیۃ، جمع الفوائد: التعزیۃ واحوال القبور، وزیارتھا، رقم: ۲۶۳۷، ۲۴۱/۱، المکتبۃ الاسلامیۃ پاکستان.

(۲) امداد الفتاویٰ: ۵۴۲/۴، زکریا بکڈپو.

چونکہ فضائلِ اعمال میں خضر علیہ السلام کے حیات ہونے سے متعلق جو واقعات آئے ہیں وہ دراصل جمہور کا مذہب ہے۔

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ لکھتے ہیں :

''ایک بزرگ کو خضر علیہ السلام نے بتلایا میں صبح کی نماز مکہ میں پڑھتا ہوں، عصر کی بیت المقدس میں اور عشاء کی سد سکندریہ میں'' (۱)

حیاتِ خضر علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

جو لوگ حضرتِ خضر کو باحیات نہیں مانتے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: '' وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدُ '' (۲) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کو حیاتِ ابدی نہیں دی ہے۔

اِس آیت کا جواب واضح ہے کہ کوئی بھی حیاتِ خضر کی ابدیت کا قائل نہیں، بلکہ آئندہ قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مانند وہ بھی وفات پا جائیں گے، درازئ عمر کو حیاتِ ابدی نہیں کہا جا سکتا۔

حیاتِ خضر کا اِنکار کرنے والے یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے پھر فرمایا کہ کیا تم آج کی یہ رات دیکھ رہے ہو؟ یہ واضح رہے کہ: لا يبقى على وجه الأرض بعد مأة سنةٍ ممن هو عليها اليوم احد (۳) آج جو شخص بھی بقیدِ حیات ہے، ایک صدی گذرنے پر ان میں سے ایک بھی زمین پر زندہ نہ رہے گا۔

علامہ حجر عسقلانیؒ نے اس روایت کے جواب میں یوں لکھا ہے :

واجاب من اثبت حياته بأنه كان حينئذٍ على وجه البحر

جو حیاتِ خضر کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں وہ اس وقت سمندر پر تھے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ روایت بیان کی وہ زمین پر نہیں تھے وہ سمندر پر تھے' لہٰذا اس حدیث کی صحت پر کوئی اشکال نہیں اور حضرت خضر علیہ السلام باحیات ہو سکتے ہیں۔

---

(۱) فضائلِ حج: فصل ۱۰، اللہ والوں کے قصے : ۶۲

(۲) الأنبياء :۳۴ (۳) المعجم الكبير

اس روایت کا دوسرا جواب یہ ہے کہ :

وهذا لا يعارض الحديث الأوّل فانّ ذلك قبل المائة

حیاتِ خضر کا یہ مسئلہ اس حدیث کے معارض نہیں ہے، اس لئے کہ حضرتِ خضر علیہ السلام اس سو سال سے پہلے سے با حیات ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیثِ مبارکہ کے اندر جن لوگوں کی عدم موجودگی کو بتلایا ہے وہ اس صدی کے دوران کے لوگ ہیں اور حضرتِ خضر علیہ السلام اس صدی سے پہلے سے با حیات ہیں، لہٰذا وہ اس حدیث کے مفہوم میں شامل ہی نہیں ہیں۔(۱)

☒☒☒

---

(۱) فتح الباری: کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہ السلام

قطب وابدال کا شرعی ثبوت

ملفوظات ومکتوباتِ صوفیاء میں ابدال واقطاب اوراوتادوغوث وغیرہ کے الفاظ اوران کے مصداق، ان کے صفات وبرکات اورتصرفات کا ذکر ملتا ہے، بے شمار روایات واحادیث سے ان کے وجوداورمنجانب اللہ ان کے کائنات میں تصرف پر مامور ہونا معلوم ہوتا ہے، ان کے وجود کا محض یہ کہہ کرانکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہستیاں گویا کائنات کے نظام کو چلانے میں اللہ کے سہیم وشریک ہیں، بلکہ اللہ جل شانہ بذات خودان کوان اوصاف وکمالات اورتصرفات کی صلاحیت عنایت کرتا ہے، وہ اپنے مجاہدات اورتوجہ الی اللہ اور ماموراتِ شرعیہ کی کامل پابندی سے وہ اس مقام پر بحکم ِ خداوندی فائز ہوتے ہیں، روایات کے مقابلے میں اپنے عقلی قیاس اوراپنے معمولی فہم وادراک کی بنیاد پران کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا لہٰذا فضائلِ اعمال میں حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے جو روح البیان، جامع صغیراورسخاوی کی مقاصد سے یہ روایت حضرت ابن عمرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جوارشادنقل کیا ہے کہ: میری امت میں ہروقت پانچ سو برگزیدہ بندے اور چالیس ابدال ہوتے ہیں، جب کوئی شخص ان میں سے مرجاتا ہےتو فوراًدوسرااس کی جگہ لے لیتا ہے۔(١)

اس قسم کی روایات مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ میں اس قدرتواتر وتسلسل کے ساتھ منقول ہیں کہ مجموعی طور پر یہ روایات اس قدرقوی اور طاقتور ہوجاتی ہیں کہ محض اپنے عقلی گھوڑے دوڑا کران کا انکار نہیں کیا جاسکتا اورخوداولیاءؒ وبزرگانِ دین کے واقعات اس بارے میں اس قدر بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ انکار کی گنجائش نہیں۔اولاً ہم ان الفاظ کی کچھ توضیح اورتشریح بیان کرتے ہیں پھرروایات واحادیث کے ذیل میں ان کے وجود کوثابت کرتے ہیں۔

١- اقطاب

اقطاب یہ قطب کی جمع ہے، اصطلاحِ صوفیاء میں قطب العالم ایک ہوتا ہے، اسے قطب

(١) فضائلِ رمضان : ١١

اکبر و قطب الارشاد، قطب الاقطاب بھی کہتے ہیں اور عالم غیب میں اس کا نام عبداللہ ہوتا ہے۔

۲- غوث

غوث یہ ایک ہوتا ہے بعض نے کہا ہے کہ قطب الاقطاب ہی کو غوث کہتے ہیں۔

۳- ابدال

ابدال یہ بدل کی جمع ہے، انہیں بدل اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے نائب ہوتے ہیں، یا انہوں نے اخلاقِ سیئہ کو ترک کر کے محاسن اخلاق کو اپنایا ہوا ہے یہ چالیس لوگ ہوتے ہیں، بائیس یا بارہ شام میں اور اٹھارہ یا اٹھائیس عراق میں رہتے ہیں۔

۴- اوتاد

اوتاد انہیں کو بعض لوگ جبال بھی کہتے ہیں، ان کی حیثیت روئے زمین پر پہاڑوں کی اور میخوں کی سی ہوتی ہے جن سے زمین کا یہ سکون اور قرار قائم ہے۔ یہ چار ہوتے ہیں، عالم کے چار کناروں میں رہتے ہیں۔

۵- نقباء

نقباء تین سو ہوتے ہیں: ملک مغرب میں رہتے ہیں ان کا نام علی ہوتا ہے۔

۶- نجباء

نجباء ستر ہوتے ہیں اور مصر میں رہتے ہیں، سب کا نام حسن ہوتا ہے۔

۷- اخیار

اخیار پانچ سو یا سات سو ہوتے ہیں اور ان کو ایک جگہ قرار نہیں، سیاح ہوتے ہیں، ان کا نام حسین ہوتا ہے۔(۱)

اقطاب واوتاد اور غوث وابدال کا ثبوت احادیث سے

پہلے یہ بات ملحوظ رہے کہ حدیث میں جب ایک قسم کا اثبات ہے تو دوسرے اقسام بھی

(۱) شریعت وطریقت : ۳۳۸

مستبعد نہ رہے، ایک نظیر سے دوسری نظیر کی تائید امر مسلم ہے، ان کے برکات تو درج ذیل احادیث سے ثابت ہیں، ان کے تصرفاتِ تکوینیہ قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کے قصے سے ثابت ہوتے ہیں۔

○ قال الامام احمد بن حنبل في مسنده، حدثنا ابوالمغيرة، حدثنا صفوان عن شريح بن عبيد، قال: ذكر اهل الشام عندعلي بن ابى طالبٍ. وهو بالعراق فقالو: العنهم يا امير المومنين؟ قال: لا سمعت رسول الله ﷺ يقول: والابدال بالشام اربعون رجلاً كلمّا مات رجل ابدل اللّٰه مكانه رجلاً يُسقٰى بهم الغيث، وينتصر بهم على الأعداء، ويصرف عن اهل الشام بهم العذاب. (۱)

''شریح بن عبید اللہؒ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روبرو اہلِ شام کا ذکر آیا، کسی نے کہا: اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ! ان پر لعنت کیجئے فرمایا: نہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ: ابدال شام میں رہتے ہیں اور وہ چالیس آدمی ہوتے ہیں، جب کوئی شخص ان میں سے مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دیتا ہے ان کی برکت سے بارش ہوتی ہے اور ان کی برکت سے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور ان کی برکت سے اہل شام سے عذاب (دُنیوی ہٹ جاتا ہے)''۔

اس حدیث کے سب رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں بجز شریح کے مگر وہ بھی ثقہ ہیں اور ان کا سماع ان حضرات سے بھی ثابت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پرانے لوگ ہیں (اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا سماع مشکل نہیں) پھر سخاوی نے اس حدیث کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے: غرض یہ کہ اس حدیث کے تمام روات صحیح کے روات ہیں، البتہ شریح بن عبید کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح طریقہ سے ثابت نہیں البتہ اس مضمون پر دلالت کرنے والی

(۱) مسند احمد: مسند علي بن ابى طالب، حدیث:۸۹۶، محقق شعیب الأرنوط کہتے ہیں کہ: یہ سند انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں سوائے شریح بن عبید کے وہ ثقہ ہیں اور انہوں نے مقداد سے سماعت کی ہے۔ (مجمع الزوائد: باب ما جاء فی الأبدال وأنهم بالشام، حدیث:۱۶۶۷۱)

مجموعی روایات سے یہ حدیث قوت کے درجے کو پہنچ جاتی ہے، علامہ سیوطیؒ نے اس روایت کو مزید سندوں سے ذکر کیا ہے جن میں کچھ تو مرفوع اور کچھ موقوف، تقریباً یہ پندرہ اسنادات ہیں جس کیلئے (الحاوی للفتاوی میں شامل علامہ سیوطیؒ کا رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب والابدال" ۲۴۱/۲ ملاحظہ کیا جائے)۔

○ قال الحكيم الترمذى في نوادر الأصول حدثنا ابى ثنا سليمان، ثنا اسحٰق بن عبدالله بن أبى فروة عن محمود بن لبيد عن حذيفة ابن اليمان قال: الابدال بالشام وهم ثلاثون رجلاً على منهاج ابراهيم كلما مات رجل أبدل الله مكانه اٰخر، عشرون منهم على منهاج عيسى بن مريم وعشرون منهم قد أُوتُوا من مزامير داؤد.

حکیم ترمذیؒ نے نوادرالاصول میں کہا ہے: ہم سے ہمارے والد نے، ان سے سلیمان نے ان سے اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ نے، ان سے محمود بن لبید نے ان سے حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: ابدال یہ ملک شام میں ہوتے ہیں ان کی تعداد بیس ہوتی ہے' یہ حضرات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طور طریقے کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی جب مرجاتا ہے تو دوسرے کو اس کے قائم مقام بنایا جاتا ہے، ان میں سے بیس حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے طریقے پر ہوتے ہیں اور بیس کو حضرت داؤد علیہ السلام کی سی سریلی آواز دی گئی ہوتی ہے۔

○ (حديث عبادة بن ثابت رضي الله عنه) قال الإمام احمد فى مسنده، ثنا عبد الوهاب بن عطاء، انا الحسن بن ذكوان عن عبدالواحد بن قيس عن عبادة بن صامت عن النبى صلى الله عليه وسلم الحديث مثله، اخرجه الحكيم الترمذي فى نوادر الاصول، والخلّال فى كرامات الأولياء، ورجاله رجال الصحيح غيرعبدالواحد، وقد وثقهٗ العجلى وابوزرعة.

احمد بن حنبلؒ اپنی مسند میں فرماتے ہیں: ہم سے عبدالوہاب بن عطاء نے ہم سے حسن بن ذکوان نے، ان سے عبدالواحد بن قیس نے ان سے عبادۃ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: گذشتہ حدیث کے مانند حکیم ترمذی نے نوادرالاصول میں اور خلّال نے "کرامات الأولیاء" میں اس روایت کی تخریج کی ہے' عبدالواحد کے علاوہ اس کے تمام رجال صحیح کے رجال ہیں' عبدالواحد کی عجلی

اور ابوذرعہ نے اس کی توثیق کی ہے۔

- (حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ) قال الامام احمد فی الزهد ثنا عبد الرحمن، ثنا سفیان عن الأعمش عن المنهال بن عمرو وعن سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: "ماخلت الأرض من بعد نوح من سبعةٍ یدفع الله بهم عن اهل الأرض، اخرجه الخلال".

امام احمدؒ کتاب الزہد میں فرماتے ہیں' ہم سے عبدالرحمٰن، ان سے سفیان نے ان سے اعمش نے، ان سے منہال بن عمرو نے، ان سے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے، ان سے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ روئے زمین نوح علیہ السلام کے بعد سے اب تک سات ایسے اشخاص سے خالی نہیں رہی ہے جن کی برکت سے اللہ دنیا والوں کی بلاؤں کو دور کرتے ہیں۔

- (حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ) قال الطبرانی ثنامحمد بن الخزر الطبرانی ثنا سعید بن أبی زید' ثنا عبد الله بن هارون الصوری، ثنا الأوزاعی، عن الزهری عن نافعٍ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم "خیار أمتی في کلّ قرنٍ خمس مائةٍ والأبدال أربعون فلا ینقصون وکلّما مات رجل أبدل اللّٰه من الخمس مائة مکانه وأدخل من الأربعین مکانه" قالوا : یا رسول اللّٰه : دلنا علی اعمالهم، قال: یعفون عمن ظلمهم، ویحسنون إلی من أساء الیهم، ویتوا سون فیما اٰتاهم اللّٰه، أخرجه أبونعیم' اخرجه ابن عساکر من طرق اخر.

طبرانی کہتے ہیں' ہم سے محمد بن الخزر طبرانی نے ان سے سعید بن زید نے ان سے عبداللہ بن ہارون نے ان سے اوزاعی نے' ان سے زھری نے ان سے نافع نے وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اُمت میں ہر وقت پانچ سو برگزیدہ بندے اور چالیس ابدال رہتے ہیں' ان کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوتی ان میں کا ایک مرجاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں آپ ان کے اعمال وعلامات بتلادیجئے' فرمایا: ظلم کرنے والوں سے درگذر کرتے ہیں' غلط پیش

آنے والوں سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں غریبوں کا خیال کرتے ہیں۔ ابونعیم نے اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

○ (حديث معاذبن جبل رضي الله عنه) قال ابوعبدالرحمن السلمى في كتاب سنن الصوفية : ثنا احمد بن على بن الحسن، ثنا جعفر بن عبد الوهاب السرخسى، ثنا عبيدبن آدم عن ابيه عن ابى ميسرة بن عبد ربه عن المغيرة بن قيس عن شهر بن حوشب عن عبد الرحمن بن غنم عن معاذ بن جبل رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاث من كن فيه فهو من الأبدال الذين لهم قوام الدنيا وأهلها الرضا بالقضا والصبر عن محارم اللّه والغضب فى ذات اللّه" أخرجه الديلمى فى مسند الفردوس.

ابوعبدالرحمٰن سلمیٰ "سنن الصوفیہ" نامی کتاب میں فرماتے ہیں: ہم سے احمد بن علی بن حسن نے، ان سے جعفر بن عبدالوہاب السرخسی نے، ان سے عبید بن آدم نے، وہ اپنے باپ سے وہ میسرہ بن عبداللہ سے وہ مغیرہ بن قیس سے وہ شہر بن حوشب سے وہ عبدالرحمٰن بن غنم سے وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص تین صفات کا حامل ہوگا وہ ابدال میں سے ہوگا، جن پر دنیا کا دارومدار ہوتا ہے یہ تقدیر پر راضی ہوتے ہیں، اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے رُکتے ہیں اور اللہ کے بارے میں غضبناک ہوتے ہیں، اس کی دیلمی نے مسند الفردوس میں تخریج کی ہے۔

○ (حديث ابى الدرداء رضي الله عنه) قال الحكيم الترمذي فى نوادر الأصول: قال: إنّ الأنبياء كانوا اوتادالارض، فلما انقطعت النبوّة أبدل اللّه مكانهم قوما من أمّة محمّد صلى الله عليه وسلم يقال لهم الأبدال لم يفضلوا الناس بكثرة صوم ولاصلوة ولا تسبيح ولكن بحسن الخلق وبصدق الورع وحسن النيّة وسلامة قلوبهم لجميع المسلمين والنصيحة للّه.

ارشاد فرماتے ہیں: ہم سے عبدالرحیم بن حبیب نے، ان سے داؤد بن محبر نے، ان سے میسرہ نے، ان سے ابوعبداللہ الشامی نے، ان سے مکحول نے ان سے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

انبیاء علیہم السلام روئے زمین پر اوتاد ہوتے تھے، جب نبوت ختم ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ امتِ محمدیہ کے کچھ لوگوں کو قائم مقام بنایا، انہیں ابدال کہا جاتا ہے، یہ روزے، نماز، تسبیح وغیرہ کی وجہ سے لوگوں پر فضیلت نہیں حاصل کرتے، بلکہ حسن اخلاق، ورع وتقوی، حسن نیت، تمام مسلمانوں کیلئے صفائی قلب اور خیر خواہی ان امور کی وجہ سے ان کو یہ فضیلت ہوتی ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے اپنے رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال" میں متعدد روایتیں اور آثار ایسی ذکر کی ہیں جو صاف اور صریح طور پر ابدال واوتاد کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔(١)

مذکورہ بالا روایات میں سے بیشتر ضعیف ہیں، لیکن مجموعی روایات سے ان مضامین اور اس کے مقصود ومدلول میں ایک قسم کی قوت آتی ہے، گویا یہ متواتر بالمعنی ہیں۔

چنانچہ اسی کو ابن عابدین شامیؒ نے یوں فرمایا ہے :

قال الشهاب المنيبى قال طعن ابن الجوزى فى أحاديث الابدال وحكم بوضعها تعقبه السيوطى بأن خبر الأبدال صحيح وإن شئت قلت متواتر وأطال ثم قال مثل هذا بالغ حدالتواتر المعنوى بحيث يقطع بصحة وجود الأبدال ضرورة.(٢)

شہاب منیبی کہتے ہیں کہ ابن الجوزی نے ابدال کی احادیث پر طعن کیا ہے اور ان کے موضوع ہونے کا فیصلہ کیا ہے، علامہ سیوطیؒ نے ان کی بات پر نقد وتبصرہ کیا ہے کہ ابدال کی روایتیں صحیح ہیں، اگر چاہے تو اسے متواتر بھی کہا جاسکتا ہے، پھر فرمایا ان جیسی روایات تواتر معنوی کو پہنچی ہوئی ہیں، جس سے بالضرورۃ ابدال کے وجود کے صحت کا پتہ چلتا ہے۔

---

(١) الحاوی للفتاویٰ :٢/٢٤١

(٢) مجموعہ رسائل ابن عابدین : ٢/٢٧٢

(اللہ تعالیٰ کو دیکھنے) کا مطلب اور اُس کی شرعی حیثیت

فضائلِ اعمال میں مولفہ حضرت مولانا زکریاؒ میں ایک واقعہ منقول ہے، جس سے دنیا میں ذاتِ باری کی زیارت کا تحقق ثابت ہوتا ہے۔

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مجنون شخص ہے لڑکے اس کو ڈھیلے مار رہے ہیں۔ میں نے ان کو دھمکایا۔ وہ لڑکے کہنے لگے: کہ یہ شخص کہتا ہے کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ میں اس کے قریب گیا تو وہ کچھ کہہ رہا تھا میں نے غور سے سنا۔ تو وہ کہہ رہا تھا کہ تو نے بہت اچھا کیا کہ ان لڑکوں کو مجھ پر مسلط کر دیا۔ میں نے کہا یہ لڑکے تجھ پر تہمت لگاتے ہیں، کہنے لگا کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا یہ کہتے ہیں کہ تم خدا کو دیکھنے کے مدعی ہو، اس نے ایک چیخ ماری اور کہا: شبلی! اس ذات کی قسم جس نے اپنی محبت میں مجھ کو شکستہ حال بنا رکھا ہے اور اپنے قرب وبعد میں مجھ کو بھٹکا رکھا ہے۔ اگر تھوڑی دیر بھی وہ مجھ سے غائب ہو جائے (یعنی حضوری میں نہ رہے) تو میں دردِ فراق سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں، یہ کہہ کر وہ مجھ سے منہ موڑ کر یہ شعر پڑھتا ہوا بھاگ گیا۔

خیالك في عینی وذکرك في فمی ومثواك في قلبی فاین تغیب

''تیری صورت میری نگاہ میں جمی رہتی ہے، اور تیرا ذکر میری زبان پر ہر وقت رہتا ہے، تیرا ٹھکانا میرا دل ہے، پس تو کہاں غائب ہو سکتا ہے؟'' (۱)

غور کیجئے اس واقعہ سے بظاہر دیدارِ خداوندی اور شرفِ رؤیت باری کا وہم ہوتا ہے، اس طرح کے دیگر واقعات بھی کتابوں میں مذکور ہیں؛ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں: ''کلّما نظرت في شيءٍ إلا رأیت الله فیه'' یعنی میں جس چیز کو بھی دیکھا اس میں خدا ہی کو دیکھا، خواجہ

(۱) فضائلِ اعمال : ٦٦١

ابوالحسن نوری کا قول ہے: اگر ایک لمحہ بھی ہمارے لئے مشاہدۂ حق میسر نہ ہوتو ہم اپنے ہوش میں ہی نہ رہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے کبھی دیکھے بغیر رب کی عبادت نہیں کی۔اس قسم کے بہت سے اقوال صوفیاء حضرات سے منقول ہیں؛ حالانکہ اللہ عزوجل قرآن پاک میں اس کا انکار فرما رہے ہیں" لَا تُدرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدرِکُ الْاَبْصَارَ" نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے(۱) ایسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس کے دیدار سے مشرف ہوں تو اللہ عزّ وجل نے فرمایا تھا"لن ترانی" (۲) "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے" ایسے ہی قرآنِ کریم کی آیت ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاءُ، اِنَّهٗ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (۳)

"اور کسی آدمی میں یہ ہمت نہیں کہ (براہ راست) اللہ سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ پردے کے آڑ میں' یا پیغام پہنچانے والا فرشتہ بھیج کر، بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور رحمت والا ہے۔"

اس قسم کی بے شمار آیتیں،ان بزرگان دین کے واقعات کے خلاف رؤیت باری کے اس دنیا میں ناممکن ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور علماء حق کا مذہب بھی یہی ہے کہ ان مادّی آنکھوں کے ذریعے ذات باری کا مشاہدہ ناممکن ہے، چنانچہ مفتی شفیع صاحبؒ "لَا تُدرِکُہُ الْاَبْصَارُ" والی آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

"ساری مخلوقات جن وانس وملائکہ اور تمام حیوانات کی نگاہیں مل کر بھی اللہ جل شانہ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتیں کہ اس کی ذات کا پورا احاطہ کریں اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کی نگاہوں کو پوری طرح دیکھتے ہیں"۔

تو پھر صوفیاء کے اِن اقوال کی کیا مراد ہے؟ جبکہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم حق تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور مشاہدۂ حق تعالیٰ کے متعلق اُن صوفیا اور اولیاء اللہ کے اس قدر اقوال ہیں کہ اُن کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا، آخر اُن کی کچھ نہ کچھ حقیقت تو ہوگی۔

---

(۱) انعام : ۱۰۳ (۲) اعراف :۱۴۳ (۳) شوریٰ : ۵۱

دنیامیں رؤیتِ باری کی حقیقت

دنیامیں بزرگوں کے رؤیت باری اور مشاہدۂ حق پر دلالت کرنے والے اس قسم کے اقوال کا صحیح مطلب وہ ہے جسے ہم بزرگان دین اور اکابرین اُمت کی تحریروں کی روشنی میں پیش کررہے ہیں۔

ملاعلی قاریؒ شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں :

واقره الشيخ علاء الدين القونوي في شرحه وقال: ان صح عن احدٍ دعوى نحوه، فيمكن تأويله بأن غلبة الأحوال تجعل الغائب كالشاهد، حتى اذاكثر الاشتغال المرء بشيءٍ واستحضاره له، يصير كأنه حضر بين يديه، ويؤيده حديث: "الاحسان أن تعبد كأنك تراه" وكذا حديث عبدالله بن عمر رضى الله عنهما (حال الطواف كنّا نترائ الله) وقال صاحب عوارف المعارف فى كتابه "اعلام الهدى وعقيدة أرباب التقى" ان رؤية العيان متعذرة في هذه الدار، أنّها دارالفناء والاٰخرة هى دارالبقاء (۱)

''شیخ علاء الدین القونوی نے اپنی شرح میں اس بات کی تصدیق کی ہے اور فرمایا ہے: اگر کسی شخص سے اس طرح کا دعویٰ (رویتِ باریٔ عزوجل) پایہ ثبوت کو پہنچ جائے' تو اس کی اس طرح تاویل کی جاسکتی ہے کہ غلبہ حال کی وجہ سے غیر موجود چیز موجود نظر آنے لگتی ہے' جب کسی چیز کی کھوج اور مسلسل اس کے دھیان میں لگا رہا جاتا ہے تو وہ چیز ایسے محسوس ہوتی ہے کہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے ''احسان یہ ہے کہ اس طرح عبادت کرے کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہے'' ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ''دوران طواف ہمیں حق جل مجدہ کا دیدار ہوجاتا ہے'' صاحبِ عوارف المعارف اپنی کتاب "أعلام الهدى وعقيدة ارباب التقى" میں فرماتے ہیں: اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھنا تو اس دنیا میں محال ہے' چونکہ

(۱) شرح الفقه الاكبر للملا على القارى: ۱۲۳، قدیمی

دارالفناء(ختم ہونے والا گھر) ہےاورآخرت دارالبقاء ہے(قائم ودائم رہنے والا گھر)''

الفتاوی الحدیثہ میں بھی صوفیہ کےان اقوال کی جورویۃ باری پر دلالت کرتی ہیں ایسی ہی توضیح کی گئی ہے :

وحال الشهود وليس له الرؤية، ولكنه كالرؤية كما قال ﷺ: "أن تعبد الله كأنك تراه" وهذه هي حالة المشاهدة التي أشار إليها القوم بتوالي التجلي على قلبه، فصار كالعيان في حاله (١)

''یہ مشاہدہ کی حالت ہوتی ہے'حقیقۃً دیدارخداوندی نہیں ہوتی،لیکن چونکہ یہ بھی دیدار ہی کے درجہ میں ہےجیسا کہ ارشادنبوی ﷺ ہے:''تو اللہ کی ایسی عبادت کر کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے'' حضوری کی اس حالت کو جوانوارات الٰہیہ کےتسلسل کے ساتھ دل پر پڑنے کی وجہ سے ان لوگوں کےحق میں حقیقۃً دیدار کے مانند ہوجاتی ہے''۔

شیخ ابورضا محمد جوشاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چچااوراپنے وقت کے مشائخ کبار میں سے تھےفرماتے ہیں :

''مشاہدہ ذات حق سے مرادیعنی ماسوااللہ(غیرکےانکار) کےلحاظ سے حقیقت الحقائق کی طرف دل کی توجہ ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب یہ کہا کہ میں نے دیکھےبغیراپنے رب کی عبادت نہیں کی توسائل نے پوچھا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کس طرح اپنے رب کو دیکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیااسےآنکھوں سےنہیں دیکھا'بلکہ قلب یقین کےساتھ دیکھا''

شاہ ولی اللہؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اس قول کا مطلب یہ ہے کہ بدن کی آنکھیں جوجہت،اشکال اورالوان کی متقاضی ہیں،ان آنکھوں سےنہیں دیکھا،بلکہ وہ حق الیقین کےساتھ دیکھا گیا''۔(۲)

امام ربانی مجددالف ثانیؒ اس سوال کے جواب میں اپنے ایک خلیفہ ہاشم کشمی کوتحریرفرماتے ہیں:

''آپ نے پوچھا ہے کہ بعض محققین صوفیہ دل کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی رؤیت اورمشاہدہ کوثابت کرتے ہیں جیسا کہ شیخ عارف قدس سرہٗ نے اپنی کتاب ''العوارف''میں

---

(١) الفتاوىٰ الحديثية، مطلب معنى توحيد الصوفيه الموهم للحول والاتحاد الموجب لكثير من الفقهاء الاعتراض : ٤٣٧، قديمي (٢) انفاس العارفين

کہا ہے کہ مشاہدے کی جگہ دل کی آنکھ ہے اور شیخ ابواسحاق کلاباذی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب ''تصرف'' میں بیان کیا ہے کہ سب کا اتفاق ہے اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ دل سے مگر یقین کی جہت سے۔ان دونوں تحقیقات میں تطبیق کی کیا صورت ہے اور اس میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس مسئلہ میں فقیر کے نزدیک پسندیدہ قول صاحب عارف قدس سرہ کا ہے اور یہ فقیر جانتا ہے کہ دل کو اس دنیا میں سوائے یقین کے اللہ تعالیٰ کی ذات سے اور کچھ حصہ نہیں،اس کو رؤیت کہہ لیں یا مشاہدہ اور جب دل کو رؤیت نہ ہوگی تو آنکھوں کی کیا حیثیت؟ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یقین کا معنی جو دل کو حاصل ہوا ہے عالم مثال میں رؤیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب سالک اس کو مثال کے آئینہ میں مشاہدہ کرتا ہے تو آئینے کے واسطے کو بھول جاتا ہے اور صورت کو حقیقت جانتے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو حقیقی رؤیت حاصل ہوگئی ہے۔حالانکہ وہ رؤیت اس کے یقین کی صورت ہے،یہ حقائق اشیاء سے صورتِ اشیاء کا اشتباہ ہے''۔(۱)

بزرگوں کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ سالکین کو اکثر اپنی باطنی بصیرت وانوار کا ظاہری بصر (دیکھنے) سے اشتباہ ہوجاتا ہے،جیسا کہ حضرت غوث الاعظم جیلانی قدس سرہٗ کے ایک مرید کو پیش آیا کہ وہ دعویٰ کرنے لگا کہ مجھے رؤیت باریٔ تعالیٰ ہوئی ہے حالانکہ وہ اس کی اپنی ذات کے انوار تھے یا روح کی تجلی کہہ سکتے ہیں،جس نے اس کو غلط فہمی میں ڈال دیا۔

خلاصۂ کلام

فضائلِ اعمال اور دیگر کتابوں میں مذکور اس قسم کے واقعات جو اس دنیا میں رؤیت باری پر دلالت کرتی ہیں،ان واقعات کی حقیقت مذکورہ بالا احادیث بزرگانِ دین کے اقوال وارشادات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ اس دنیا میں جسم کی آنکھوں سے نہیں ہوسکتی اور جن حضراتِ صوفیاء سے اس قسم کے اقوال منسوب ہیں کہ ہم نے خدا کو دیکھا تو اس یقین کا اعلیٰ درجہ مراد ہے اور ''ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ'' (ایسے عبادت کرو جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو) کے مقاماتِ عالیہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض حضرات کو اپنی باطنی بصیرت یعنی تجلی روحیہ اپنی آنکھوں سے نظر آتی ہے تو وہ اس کو تجلی حق سمجھتے ہیں،جیسا کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مرید کا ایک واقعہ المعارف میں لکھا ہے کہ:

---

(۱) مکتوب : ۲۰ دفتر سوم

''ایک بزرگ جب اپنے حجرے میں گئے تو ان کو ایسا نور نظر آیا کہ بے ساختہ چیخ اٹھے کہ میں نے حق تعالیٰ کی زیارت کی۔ان کے شیخ کو جب اپنی بصیرت باطنی سے اس کا علم ہوا تو وہ ان کے پاس آئے اور کہا کہ یہ حق تعالیٰ کی تجلی نہیں تھی، بلکہ یہ تو تمہارے وضو اور طہارت کے انوار تھے۔یعنی باطنی پاکیزہ اور اعمال کی بلندی اور اس کے انوارات کو مشاہدۂ حق تصور کرلیا''(۱)

رضائے خداوندی اور دیدارِ الٰہی سب سے عظیم نعمت ہے

اُخروی نعمتوں میں سے سب سے بڑی اور سب سے عظیم نعمت یہ ہے کہ رضائے خداوندی اور دیدارِ الٰہی نصیب ہوجائے، اعمال اِس لئے انجام دیئے جائیں کہ جنت کا حصول ہو اس سے بڑا رتبہ یہ ہے کہ محض خوشنودیٔ رب اور رضائے الٰہی کیلئے عمل ہو، اِس لئے بسا اوقات اللہ والے اس طرح کے جملے کہتے ہیں کہ میری عبادت اور اعمال کا مقصود صرف اور صرف رضائے الٰہی ہے۔ جنت کا حصول بالکل میرا مطمحِ نظر نہیں ہے، اس طرح کے جملوں میں کوئی قباحت نہیں ہوتی، اس لئے عمل کا اونچا اور آخری درجہ یہی ہے کہ عمل محض رضائے خداوندی کے حصول کیلئے کیا جائے، چونکہ خدا حاصل ہوجائے تو پھر اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے۔اس طرح کے قول کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے جنت کی ناقدری لازم آتی ہے، بلکہ یہاں تو اس سے بھی اعلیٰ درجہ کی چیز پیش نظر ہے، عام بول چال میں بھی یوں کہا جاتا ہے۔ جب کوئی بادشاہ کسی سے اس کی سب سے بڑی خواہش دریافت کرے اور کہے اس کی جو بھی خواہش ہو اس کی تکمیل کی جائے گی۔وہ شخص یوں کہے مجھے تو بس آپ کی رضا اور خود آپ کی ذات مطلوب ہے تو یہ چیز کچھ خراب شمار نہیں ہوتی' بلکہ اسے اعلیٰ درجہ کا اخلاص شمار کیا جاتا ہے۔

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار سب سے بڑا انعام ہے، جس کے سامنے جنت اور اس کی تمام نعمتیں ہیچ در ہیچ ہیں اس پر دلیل:

وعن صهيبٍ رضي الله عنه عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا دخل أهل الجنة الجنة يقول الله تعالىٰ تريدون شيئاً ازيدكم فيقولون ألم تبيّض وجوهنا الم تدخلنا الجنة وتنجنا من النار قال فيرفع الحجاب

---

(۱) آئینۂ سلوک : ۲۵۲ تا ۲۵۶

فینظرون الی وجه اللّٰه فمأ اعطو شیئًا احب الیهم من النظر إلی ربهم ثم تلا :" لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَزِیَادَۃٌ" (۱)

حضرتِ صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرمائیں گے کہ کیا تم کو ایک چیز مزید عطا کروں، وہ بندے عرض کریں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے (یعنی سرخروئی اور خوب روئی عطا فرمائی) اور دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کیا (اب اس کے آگے کیا چیز ہوسکتی ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان بندوں کے اس جواب کے بعد یکایک حجاب اٹھ جائے گا یعنی ان کی آنکھوں کا پردہ اٹھا دیا جائے گا، پس وہ جمالِ الٰہی اور رؤیت حق کو بے پردہ دیکھیں گے، پس ان کا یہ حال ہوگا کہ جو کچھ اب تک انہیں ملا تھا، ان سب سے زیادہ محبوب اور پیاری چیز ان کیلئے یہی دیدار کی نعمت ہے یہ بیان فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت تلاوت فرمائی لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَزِیَادَۃٌ جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھی بندگی والی زندگی گزاری ان کیلئے اچھی جگہ ہے (جنت اور اس کی چیزیں) اس پر ایک مزید نعمت (یعنی دیدارِ حق)۔

دیکھئے اس حدیث نے بغیر کسی ابہام کے بتا دیا کہ دیدارِ خداوندی کے مقابلہ میں جنت اور اس کی تمام نعمتیں کمتر نظر آئیں گی تو اگر کسی بندہ کو دنیا ہی میں یہ مقام حاصل ہو کہ اسے دیدار کے شوق میں جنت کی طرف التفات نہ ہو تو اس میں کونسی گمراہ کن یا خلاف شرع بات ہے، لہٰذا فضائلِ اعمال میں مذکورہ یہ واقعہ اوپر ذکر کردہ تفصیلات کی روشنی میں پڑھئے:

''حضرت ممشاد دینوریؒ کے انتقال کے وقت ایک بزرگ ان کے پاس بیٹھے تھے وہ ان کیلئے جنت کے ملنے کی دعا کرنے لگے حضرت ممشاد ہنسے اور فرمایا تیس برس سے جنت اپنی ساری زینتوں سمیت میرے سامنے آتی رہی میں نے ایک مرتبہ بھی اس کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا''۔(۲)

اِس واقعہ میں ان کے اس قول سے کہ میں نے اسے ایک مرتبہ بھی نگاہ بھر کر نہیں دیکھا کوئی

---

(۱) صحیح مسلم، باب اثبات رؤیة المؤمنين بالاخرة ربهم سبحانه وتعالیٰ حدیث:۲۹۸، مع تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی (۲) فضائلِ صدقات : ۴۷۴

قباحت نہیں، چونکہ اللہ کی رضا یقیناً جنت سے بڑی چیز ہے، اس لئے انہوں نے جنت کی طرف نہیں، بلکہ جنت والے کی طرف پوری عمر تک توجہ مبذول رکھی۔

شیخ ابوالخیر اقطع کے واقعہ پر اعتراض

(خواب میں آنحضرت ﷺ کے روٹی دینے کا ذکر)

''حضرت شیخ ؒ نے (فضائل حج ص ۱۲۸ پر) شیخ ابوالخیر اقطع ؒ کا واقعہ لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسلسل پانچ دن کے فاقہ کے بعد حضور ﷺ کی قبرِ اطہر پر حاضر ہوئے، آپ ﷺ کو اور حضراتِ شیخین کو سلام کیا اور حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں آج رات کو آپ ﷺ کا مہمان بنوں گا، اس کے بعد وہ منبر شریف کے پیچھے سو گئے تو خواب میں آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرتِ علی کرم اللہ وجہہ کی زیارت ہوئی، حضور ﷺ نے انہیں ایک روٹی مرحمت فرمائی انہوں نے خواب ہی میں آدھی روٹی کھالی اور جب آنکھ کھلی تو آدھی ہاتھ میں تھی''

بعض لوگوں کو اس واقعہ پر یہ اعتراض ہوا کہ آخرت کی چیز دنیا میں کیوں کر آسکتی ہے؟ حالانکہ قرآن وحدیث سے یہ بات صراحۃً ثابت ہے کہ آخرت کی چیز کا دنیا میں آنا کوئی محال اور دشوار چیز نہیں ہے بلکہ قرآن میں اس قسم کے واقعات بصراحت موجود ہیں کہ آخرت کی چیزیں دنیا میں آتی ہیں:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا، قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هٰذَا ، قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۱) جب کبھی زکریا علیہ السلام ان کے پاس عمدہ مکان میں تشریف لاتے تو ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پاتے تو یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں وہ کہتی کہ اللہ کے پاس سے آئیں۔

جلالین شریف میں من عند اللہ کی تفسیر ''یأتینی به من الجنة'' سے کی ہے، یعنی جنت سے میرے پاس آیا ہے۔ حضرت تھانویؒ حضرت شیخ الہندؒ اور کئی مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ حضرت مریم کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے موسمی پھل بھیجے جاتے تھے، سردی کے پھل

---

(۱) آل عمران : ۳۷

گرمی میں اور گرمی کے پھل سردی میں۔ تفسیر ابن کثیر میں مجاہدؒ، عکرمہؒ، سعید بن جبیرؒ، ابوالشعثاء، ابراہیم نخعیؒ، ضحاکؒ، قتادہؒ، ربیع بن انسؒ، عطیہ اوفیؒ اور سدی سے اس آیت کی یہی تفسیر نقل کی گئی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا گیا ہے:

قَالَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ، وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ۔ قَالَ اللّٰهُ اِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ، فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۱)

''عیسیٰ بن مریم نے دعا کی اے اللہ اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمایئے کہ وہ ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اول ہیں اور جو بعد میں سب کیلئے خوشی کی بات ہو جاوے اور آپ کی طرف سے ایک نشانی ہو جائے اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں وہ کھانا تم پر نازل کرنے والا ہوں، سو جو شخص تم میں سے اس کے بعد ناحق شناسی کرے گا تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا دنیا جہاں والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا''۔

اس آیت میں ایک نبی کی آسمان سے کھانا نازل کرنے کی دعا ہی سے اس کا ممکن ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ کر لینا، اس امکان کو قوی تر کر دیتا ہے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت جو ترمذی شریف جلد ثانی ص ۱۳۲ پر ابوابِ تفسیر میں آئی کہ وہ خوان اتارا گیا تھا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: عن عمار بن یاسر قال قال رسول اللہ ﷺ انزلت المائدة من السماء فيه خبزًا ولحمًا (۲)

بہرحال قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ آخرت کی چیزیں دنیا میں آسکتی ہیں اس لئے اس قسم کے واقعات کو دشوار اور محال کہہ کر رد کرنا، دراصل یہ قرآن وحدیث سے ثابت شدہ حقیقت کا انکار ہے۔

---

(۱) المائدة: ۱۱۴،۱۱۵

(۲) سننِ ترمذی، سورة المائدة، حدیث: ۳۰۶۱، مع تحقیق احمد محمد شاکر

ابو مسلم خولانی کا ایک واقعہ (صحابہ رضی اللہ عنہ کو چیلنج کرنے کا شبہ)

فضائلِ صدقات میں حضرت شیخ تحریر فرماتے ہیں :

''حضرت ابو مسلم خولانی نے ایک کوڑا اپنے گھر کی مسجد میں لٹکا رکھا تھا اور اپنے نفس کو خطاب کر کے کہا کرتے کہ اٹھ کھڑا ہو، میں تجھے (عبادت میں) اچھی طرح گھسیٹوں گا، یہاں تک کہ تو تھک جائے گا، میں نہیں تھکوں گا اور جب ان پر کچھ سستی ہوتی تو اس کوڑے کو اپنی پنڈلیوں پر مارتے اور فرماتے کہ یہ پنڈلیاں پٹنے کیلئے میرے گھوڑے کی نسبت زیادہ مستحق ہیں یہ بھی کہا کرتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یوں سمجھتے ہیں (کہ جنت کے سارے درجے) وہی اڑا کر لے جائیں گے، نہیں ہم ان سے (ان درجوں میں) اچھی طرح مزاحمت کریں گے، تا کہ ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ وہ بھی اپنے پیچھے مردوں کو چھوڑ کر آئے ہیں'' (۱)

بعض لوگوں کو فضائلِ صدقات کے مذکورہ بالا واقعہ پر یہ شبہ ہوا کہ گویا ابو مسلم خولانی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان کے مقام و مرتبہ میں مقابلہ آرائی اور زور آزمائی کر رہے ہیں، حالانکہ کوئی غیر صحابی کم درجے کے صحابی کے ادنیٰ مرتبہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

یہ اعتراض دراصل اس وجہ سے ہوا کہ مذکورہ واقعہ کو بغور نہیں پڑھا گیا، بس اس واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عبادات میں مشقتیں برداشت کرنا اور اپنے نفس کا علاج کرنا آسان تھا، لیکن بعد والوں کو تزکیہ کیلئے سخت مجاہدات کرنا ناگزیر ہو گیا ہے، حضرت مسلم خولانی بھی نفس کا علاج کرتے ہوئے شدید ریاضتیں کرتے تھے، جب نفس سست ہو جاتا تھا تو حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات، عبادات کو یاد کر کے نفس کو مجاہدہ پر برانگیختہ کیا کرتے تھے چونکہ قصے کے یہ جملے:

۱- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یوں سمجھتے ہیں کہ (جنت کے سارے درجے) وہی اڑا کر لے جائیں گے۔

۲- نہیں، ہم ان سے (ان درجوں میں) اچھی طرح مزاحمت کریں گے، پہلے جملہ سے صاف معلوم ہوتا کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنت کے تمام درجات کا مستحق سمجھتے تھے۔

---

(۱) فضائلِ صدقات : ۲۳۱-۲۳۲

دوسرا جملہ بتا رہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اعمال کی وجہ سے خود کو جنت کے تمام درجات کا حق دار بنالیا تھا ہم بھی مجاہدوں کے ذریعہ کچھ درجات حاصل کرلیں۔

اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ چیلنج اور مقابلہ آرائی یہ تو مساوی شخص سے ہوتی ہے اور یہاں سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے تو کسی ولی یا قطب وغیرہ کا کوئی تقابل نہیں ہے تو ان کو چیلنج کرنے کے کیا معنی؟

کیا امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے حکایاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایک مہاجر اور انصاری کا ایک غزوہ سے واپسی کے موقع سے رات کی نگرانی اور چوکیدار اور انصاری کو دورانِ نماز تیر لگنے اور خون کے بہہ جانے کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے یہ واقعہ بیہقی اور ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور فوائد کے ذیل میں دورانِ نماز خون کے بہہ جانے سے وضو کے ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے میں ائمہ کے اختلاف کا ذکر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

> ’’یہاں ایک فقہی مسئلہ اختلافی ہے کہ خون کے نکلنے سے ہمارے امام یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹتا ممکن ہے کہ ان صحابی کا مذہب بھی یہی ہو یا اس وقت اس کی تحقیق نہ ہوئی ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں تشریف فرما نہ تھے، یا اس وقت تک یہ حکم ہی نہ ہوا ہو‘‘۔

نشان زدہ عبارت سے بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا، بلکہ یہ اعتراض ہوا کہ ’’ممکن ہے ان صحابی کا مذہب بھی یہی ہو‘‘ یعنی کیا امام شافعیؒ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے کہ جس کی وجہ سے ان صحابی رضی اللہ عنہ نے ان کے مذہب کو اختیار کیا؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت کا مطلب وہ نہیں ہے جو سمجھا گیا، بلکہ اس قول کا منشا یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے احادیث کی روشنی میں دورانِ نماز خون کے جاری ہو جانے پر نماز کے نہ ٹوٹنے کی جو رائے اپنائی ہے، ہوسکتا ہے کہ ان صحابی کی رائے بھی اس مسئلہ میں امام شافعیؒ جیسی ہو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام شافعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھے کہ جس کی بناء پر ان صحابی نے اس مسئلہ میں ان کی رائے اور مذہب کو اپنایا ہو۔ بلکہ محض اتفاق رائے کو بتلانا ہے۔

فقہِ حنفی، فقہِ شافعی، حدیثِ بخاری، حدیثِ مسلم، یہ سب تعارفی نام ہیں

یہاں پر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ جو ائمہ مجتہدین ہوتے ہیں یہ بذات خود شریعت نہیں بناتے بلکہ یہ قرآن واحادیث کی روشنی میں شریعت بتاتے ہیں' جو حنفی ہے وہ بھی حدیث پر عمل کررہا ہے، جو شافعی ہے وہ بھی قرآن وحدیث سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ جو صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ بھی سنت پر عمل کررہے ہیں اور جو رکوع میں جاتے وقت اور اٹھتے وقت اٹھاتے ہیں وہ بھی سنت کے خلاف نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح ان مسلکوں سے اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دوعالم ﷺ کی ہر سنت کو معمول بنادیا ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ بھی زمانۂ نبوت میں نہیں تھے، مگر جو مسائل امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ نے بتلائے اور جو حدیثیں امام بخاریؒ نے لکھیں وہ تمام رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھیں، لیکن ان مسائل پر عمل کرنے والوں کو حنفی، شافعی یا اس زمانہ میں حدیث بیان کرنے والا بخاری یا مسلم کی حدیث نہیں کہتا تھا، مطلب یہ ہے کہ فقہِ حنفی، فقہِ شافعی اور حدیث بخاری اور حدیثِ مسلم یہ تمام تعارفی نام ہیں۔ اس تعارف کی مثال ایسے ہی ہے کہ پہاڑوں پر بارش برستی ہے تو اس پانی کو بارش کا پانی کہتے ہیں، وہی پانی اکٹھا ہوکر دریائی شکل میں بہہ پڑتا ہے تو اس کو دریا کا پانی کہتے ہیں، بلکہ یہاں بھی اس کے نام مختلف ہوجاتے ہیں کہ یہ دریائے نرمدکا پانی ہے، وہ دریائے جہلم کا، یہ دریائے سندھ کا، ہر دریا کے آس پاس کی زمینیں اس سے سیراب ہورہی ہیں، یہ بارانِ رحمت کا پانی ہے' اگرچہ بادلوں ہی سے برسا، مگر ان دریاؤں کے نام دریائے سندھ، دریائے جہلم وغیرہ ہیں، حالانکہ وہاں بادل نہیں برسے، یہ علاقہ ہی کی نسبت سے رکھ لئے گئے ہیں، ان مختلف ناموں سے پانی کی حقیقت نہیں بدلتی، جس طرح نبی کریم ﷺ کی حدیث کے مختلف تعارفی نام مثلاً یہ بخاری کی حدیث ہے۔ وہ ابنِ ماجہ کی، اس کے بعد بھی وہ نبیٔ پاک ﷺ کی حدیث رہتی ہے۔ ان تعارفی ناموں کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی، اسی طرح سنتِ محمدیہ کو ہی تعارفی ناموں سے کبھی فقہ حنفی کہا جاتا ہے۔ کسی علاقہ میں سنتِ نبوی کا نام فقہ شافعی ہے۔

مجتہد کی حیثیت

یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ اسے بذاتِ خود واجب الاطاعت سمجھ کر اتباع کی جارہی ہے یا اسے ''شارع'' یعنی شریعت بنانے والا

اور قانون ساز کا درجہ دے کر اس کی ہر بات کو لازم الاتباع سمجھا جا رہا ہے، بلکہ ان سب کا مطلب صرف یہ ہے کہ پیروی تو قرآن وسنت کی مقصود ہے، لیکن قرآن وسنت کی مراد کو سمجھنے کیلئے بحثیت ''شارحِ قانون'' ان کی بیان کی ہوئی تشریح وتعبیر پر اعتماد کیا جا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت کے قطعی اور واضح احکام میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید ضروری نہیں سمجھی گئی، کیونکہ وہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا اصل مقصد اس کے بغیر بآسانی حاصل ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ہندوستان میں یا کسی بھی ملک میں جو قانون نافذ ہے، وہ حکومت نے کتابی شکل میں مدون اور مرتب کر کے شائع کر رکھا ہے' لیکن ملک کے کروڑوں عوام میں سے کتنے آدمی ہیں، جو براہِ راست قانون کی عبارتیں دیکھ دیکھ کر اس پر عمل کر سکتے ہیں؟ ان پڑھ لوگوں کو تو چھوڑیئے، ملک کے وہ بہترین تعلیم یافتہ افراد جنہوں نے قانون کا باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا، اعلی درجہ کی انگریزی جاننے کے باوجود یہ جرأت نہیں کرتے کہ کسی قانونی مسئلہ میں براہِ راست قانون کی کتاب دیکھیں اور اس پر عمل کریں، اس کے بجائے جب انہیں کوئی قانون سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ کسی ماہر وکیل کو تلاش کرتے ہیں اور اس کے قول پر عمل کرتے ہیں، کیا کوئی صحیح العقل انسان اس طرزِ عمل کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے اس وکیل کو قانون سازی کا اختیار دے دیا ہے اور وہ ملکی قانون کے بجائے وکلاء کو اپنا حاکم تسلیم کرنے لگے ہیں؟ بالکل یہی معاملہ قرآن وسنت کے احکام کا ہے کہ ان کی تشریح وتفسیر کیلئے ائمہ مجتہدین کی طرف رجوع کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا نام تقلید ہے لہٰذا تقلید کرنے والوں کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ وہ قرآن وسنت کے بجائے ائمہ مجتہدین کی اتباع کر رہے ہیں۔(۱)

اس مجموعی تحریر کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوئی کہ فقہ حنفی، یا شافعی رحدیثِ مسلم، حدیث بخاری کی طرح صرف تعارفی نام ہیں ورنہ یہ بھی دراصل سنتِ نبوی اور طریقہ محمدی ہی کی مدوّنہ شکلیں ہیں، اس لئے فقہ شافعی، فقہ حنفی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ بذاتِ خود ان کا اپنا بنایا ہوا کوئی قانون ہے، بلکہ ان کی حیثیت تو محض شارح قانون کی ہوتی ہے، یہ شارع (بنانے والے) قانون نہیں ہوتے یہ قانون بناتے نہیں بتاتے ہیں۔

---

(۱) تقلید کی شرعی حیثیت : ۱۴

فضلاتِ نبی ﷺ پاک ہیں

جمہورِ اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فضلات خون، پیشاب وغیرہ پاک ہیں۔ اکثر محدثینؒ وفقہاءؒ اس کے قائل ہیں اور مختلف روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں؛ چنانچہ مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور ﷺ کے خون اور پیشاب کا پینا منقول ہے۔ وہ اصحابِ نبی ﷺ جن سے حضورِ اکرم ﷺ کا خون پینا منقول ہے ایک تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں دوسرے حضرت سفینہؓ ہیں تیسرے مالک بن سنان رضی اللہ عنہ ہیں۔ پیشاب پینے والوں میں ایک تو حکیمہ بنتِ اُمیمہ ہیں، دوسرے برکتہ اُم ایمن اور تیسرے برکتہ ام یوسف ہیں۔ ان اصحابِ نبی ﷺ سے خون یا پیشاب پینے کے واقعات منقول ہیں۔ جب حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے ان پر نکیر نہیں فرمائی، بلکہ ان مختلف واقعات میں آپ ﷺ نے انہیں مختلف بیماریوں سے شفایاب ہونے کی خوشخبری سنائی۔ حضور ﷺ کے فضلات پاک ہوں ایسا ہوسکتا ہے کہ اس بارے میں آپ ﷺ کی خصوصیت ہو، چونکہ حضور ﷺ کیلئے بعض باتیں جائز ہیں؛ لیکن اُمت کیلئے وہی باتیں ناجائز وحرام قرار دی گئی ہیں۔ مثلاً امتی کیلئے بیک وقت چار سے زائد بیویاں حرام ہیں، لیکن حضورِ اکرم ﷺ کیلئے جائز، اس قسم کی چیزیں آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہیں۔

ایسے ہی عوام کے میل کچیل پر مکھی بیٹھتی ہے، مگر آنحضرت ﷺ کے جسدِ اطہر پر مکھی نہ بیٹھتی تھی اور یہ بھی متفق علیہ حقیقت ہے کہ عوام کا پسینہ بدبودار ہوتا ہے مگر آنحضرت ﷺ کا پسینۂ مبارک دنیا کی اعلیٰ ترین خوشبوؤں کو شرماتا تھا۔ آپ ﷺ کی نیند مبارک کو بھی نیند ہی کہا جاتا تھا مگر وہ نیند ہماری ہزار بیداریوں سے اعلیٰ وارفع تھی۔ آپ ﷺ کا خواب بھی وحی ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کی نیندِ مبارک سے وضو نہیں ٹوٹتا تھا تو جیسے آپ ﷺ کا پسینۂ مبارک پسینہ ہی کہلاتا ہے مگر یہ کس نے کہا کہ آپ ﷺ کے پسینۂ مبارک کو عام انسانوں جیسا سمجھا جائے۔ وہ آپ ﷺ کیلئے پسینہ ہی تھا مگر عشاق کیلئے بہترین خوشبو، بادام روغن نکالنے کے بعد جو فضلہ بادام کا بچتا ہے وہ بادام کا تو فضلہ ہی

ہے، مگر بنولہ کہے کہ میرے فضلہ جیسا ہے تو کوئی عقل منداس کوتسلیم نہیں کرے گا۔آنحضرت ﷺ بیشک انسان ہیں، لیکن آپ ﷺ کو جن خصائص سے اللہ تعالیٰ نے نوازا تھا، ان خصائص کا انکار کیوں کیا جائے؟ یاقوت بھی پتھر حجرِ اسود بھی ایک پتھر ہے، مگر یاقوت اس کا مقابلہ کہاں کرسکتا ہے؟۔ حجراسود جنت سے آیا ہوا ہے، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے اجسام مقدسہ ومطہرہ میں اللہ تعالیٰ نے جنت کے خواص رکھ دیئے ہیں؛ اِس لئے اِن اجسامِ مطہرہ کا پسینہ مثل جنت کے پسینے کے خوشبودار بنادیا گیا، اسی طرح دوسرے فضلات بھی اگر خصوصیتِ طہارت رکھتے ہوں تو اس میں اشکال کیا ہے؟

حضورِاکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی پر دلالت کرنے والی روایات

- ابویعلیٰ اور بیہقی نے دلائل میں عامر بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ان سے ان کے والد نے بیان کیا کہ :

أنّه اتی النبی ﷺ وهو یحتجم، فلمّا فرغ قال: یا عبد الله! اذهب بهذا الدم فاهرقه حیث لا یراك احد، فلمّا برزعن رسول الله ﷺ عمد الی الدم فشربه فلمّا رجع قال: یا عبد الله ما صنعت بالدم؟ قال جعلته فی اخفی مکانٍ علمت انّه یخفی علی الناس قال: لعلّك شربته؟ قال! نعم قال! ولم شربت الدم؟ ویل للناس منك، ویل لك من الناس" قال ابوموسیٰ قال ابوعاصم فکانوا یرون القوّة التی به من ذلك الدم "(۱)

''وہ حضورِاکرم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ سنگیاں لگوارہے تھے، جب آپ ﷺ اس سے فارغ ہوگئے تو فرمایا: عبداللہ! اس خون کو لے جاؤ اور اسے ایسی جگہ بہادو جہاں تمھیں کوئی نہ دیکھے، جب یہ حضورِاکرم ﷺ کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تو اس خون کو لے کر پی گئے، پھر حضور ﷺ کے پاس واپس آگئے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ: عبداللہ تم نے خون کو کیا کیا؟ انھوں نے فرمایا، میں نے اسے ایسی جگہ ڈال دیا کہ لوگوں کیلئے اس سے زیادہ مخفی جگہ کوئی دوسری نہیں ہوسکتی آپ ﷺ نے

---

(۱) مجمع الزوائد : باب منه فی الخصائص ، حدیث:۱۴۰۱۰،اس کو طبرانی اور بزار نے مختصراً روایت کیا ہے اور بزار کے رجال صحیح کے رجال ہیں سوائے جنید بن القاسم کے وہ ثقہ ہیں۔

فرمایا: شاید کہ تم نے اسے پی لیا ہے، انہوں نے فرمایا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے خون کیوں پی لیا؟ تم سے لوگوں کی تباہی ہوگی اور لوگوں سے تمہاری، ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ ابو عاصم نے فرمایا: ان کی قوت وطاقت کا اصل پیش خیمہ یہی خون تھا"۔

ایک روایت میں ہے تمہیں جہنم کی آگ نہ چھوئے گی۔ طبرانی نے حضرت سفینہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں :

احتجم النبی ﷺ قال: خذ هذا الدم، فادفنه من الدواب والطير والناس، فتغيّبتُ فشربته ثمّ ذكرت ذلك له فضحك (۱)

حضورِ اکرم ﷺ نے پچھنے لگوائے، فرمایا: یہ خون لے جاؤ اور اسے جانوروں، پرندوں اور لوگوں سے بچا کر دفن کردو، میں نے تنہائی میں جا کر اسے پی لیا، پھر میں آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ مسکرادیئے۔

- طبرانی نے اوسط میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ :

أن اباه مالك بن سنان رضي الله عنه لما اصيب رسول الله ﷺ فی وجهه مصّ دم رسول الله ﷺ واذ دَرَدَهُ، فقيل له: أتشرب الدم؟ فقال: نعم، اشرب دم رسول الله ﷺ فقال رسول الله ﷺ من خالط دمی دمه لاتمسه النار (۲)

"ان کے والد مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے جس (غزوۂ اُحد) کے موقع پر حضورِ اکرم ﷺ کا چہرۂ انور زخمی ہوگیا تھا تو انہوں نے آپ ﷺ کا خون چوس کر نگل لیا تھا۔ ان سے پوچھا گیا: کیا آپ نے خون پیا ہے؟ فرمایا: ہاں میں نے حضورِ اکرم ﷺ کا خون پیا ہے اور حضورِ اکرم ﷺ نے اس موقع سے یوں فرمایا ہے: جس کے خون کے ساتھ میرا خون شامل ہوگیا ہے لہٰذا جہنم کی آگ اُسے نہ چھوئے گی" (ہیثمی کہتے ہیں کہ میں نے اس سند میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو باتفاق ضعفاء میں شمار ہوتا ہو)۔

---

(۱) مجمع الزوائد: باب منه فی الخصائص، حدیث:۱۴۰۱۱، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو طبرانی اور بزار نے مختصر اروایت کیا ہے اور طبرانی کے رجال ثقہ ہیں۔

(۲) مجمع الزوائد : باب منه فی الخصائص، حدیث:۱۴۰۱۲، علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ: اس کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا اور میں اس کی سند کے ضعف کے سلسلے اجماع نہیں دیکھا۔

- طبرانی نے حکیمہ بنت امیمۃ سے اور وہ اپنی والدہ سے نقل کرتی ہیں کہ فرماتی ہیں:

کان للنبی ﷺ قدح من عیدان یبول فیه ویضعه تحت سریره فقام فطلبه فلم یجده فسأل، فقال أین القدح؟ قالوا: شربتُه سرّة خادمة امّ سلمة التی قدمت معها من ارض الحبشة، فقال النبی ﷺ لقد احتضرن من النار بحضارٍ (۱)

''نبی کریم ﷺ کے پاس لکڑی کا ایک پیالہ تھا جس میں آپ ﷺ پیشاب کرتے تھے اور اسے اپنے تخت کے نیچے رکھا کرتے تھے۔ایک مرتبہ آپ ﷺ اٹھ کر اسے تلاش کرنے لگے، وہ نہ مل سکا تو اس کے بارے میں دریافت کیا،فرمایا: کہ پیالہ کہاں ہے؟ لوگوں نے بتلایا کہ ام سلمہؓ کی خادمہ سرہ نے جوان کے ساتھ ملک حبشہ سے آئی ہیں پی لیا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس نے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے محفوظ کرلیا ہے''۔

- حسن بن سفیان نے اپنی مسند میں، حاکم، دارقطنی، طبرانی اور ابونعیم سے وہ ابومالک الحنفی سے اور وہ اسود بن قیس سے وہ نبیح العزی سے وہ ام ایمن سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں:

قام رسول اللّٰه ﷺ من اللیل الی الفخّارة في جانب البیت. فبال فیها. فقمتُ من اللیل وانا عطشانة فشربتُ مافیها وانا لا اشعر، فلمّا اصبح النبی ﷺ قال: یا اُمّ ایمن! قومی فأهر یقی ما في تلك الفخّارة فقلتُ: واللّٰه! شربتُ مافیها، قالت: فضحك رسول اللّٰه ﷺ حتی بدت نواجذه، ثم قال: واللّٰه لا یجعنّ بطنك ابدًا (۲)

---

(۱) مجمع الزوائد: باب منه فی الخصائص، حدیث:۱۴۰۱۴،علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ:اس کے رجال صحیح ہیں سوائے عبداللہ بن احمد بن حنبل اور حکیمۃ، یہ دونوں ثقہ ہیں۔

(۲) شرح الشفاء للقاضی عیاض مع شرحه للملا علی القاری، الباب الثانی فی تکمیل اللّٰه تعالٰی له المحاسن خلقًا وخلقًا

’’نبی کریم ﷺ رات کے وقت گھر کے ایک کونے میں مٹی کے برتن کے پاس تشریف لے گئے اور وہاں پیشاب کیا، میں رات کو پیاسی بیدار ہوئی، میں نے بے شعوری میں اس برتن کا پیشاب پی لیا، صبح ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا: امّ ایمن کھڑی ہو جاؤ اور اس مٹی کے برتن کو بہادو، میں نے کہا: اللہ کی قسم میں نے اس برتن میں جو تھا اسے پی لیا ہے فرماتی ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ میری اس بات سے اس قدر مسکرادیئے کہ آپ ﷺ کے دندانِ مبارک نظر آنے لگے، پھر فرمایا: کبھی بھی تمہارے پیٹ میں درد نہیں ہوگا‘‘۔

”وصح ابن رميه أنّهما قصّتان وقعتا للإمرأتين“ (۱)

’’ابن رمیہ سے بہ سندِ صحیح یہ روایت منقول ہے کہ یہ دو قصے دو مختلف عورتوں کے ساتھ پیش آئے ہیں‘‘۔

حضورِ اکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی پر فقہاء و محدثین کے اقوال

ابنِ حجر مذکورہ بالا روایات کے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

و بهذا استدل جمعٌ من ائتمنا المتقدمين وغيرهم على طهارة فضلاته ﷺ وهو المختار وفاقاً بجميع من المتأخّرين، فقد تكاثرت الأدلّة عليه وأعدّه الأئمة من خصائصه وقيل: سبقه شق جوفه الشريف، وغسل باطنه (۲)

’’ان روایات سے ہمارے متقدمین علماء وغیرہ نے حضورِ اکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی کو ثابت کیا ہے، متاخرین کا متفقہ طور پر یہی مسلک رہا ہے، اس پر بے شمار دلائل ہیں اور ائمہ نے اس کو حضورِ اکرم ﷺ کے خصائص میں شمار فرمایا ہے اور یہ کہا ہے کہ:

---

(۱) المواهب اللدنية مع شرحه للعلامه الزرقاني، الفصل الاول فى كمال خلقته وجمال صورته: ۵۷۴/۵-۵۷۵ عباس احمد الباز مكة المكرمة.

(۲) كذا فى جمع الوسائل شرح الشمائل: ۳۷/۲ عمدة القارى: ۵۲/۳، كتاب الوضوء باب الماء الذى يغسل به شعر الانسان، دارالكتب العلمية، فتح البارى: ۳۶۱/۱ كتاب الوضوء، باب الماء الذى يغسل به شعر الانسان قديمى

چونکہ آپ ﷺ کے بطنِ مبارک کوشق کیا گیا تھا اوراس کی اندرونی صفائی کی گئی تھی‘‘۔

شامی جوفقہ حنفی کی معتبر کتاب ہے اس میں وہ فرماتے ہیں :

”صحّح بعض ائمة الشافعية طهارة بوله ﷺ وسائر فضلاته وبه قال ابوحنيفه كما نقله في المواهب اللدنية عن شرح البخاري للعينى، و صرّح به البيرى في شرح الأشباه وقال الحافظ ابن حجر: تظافرت الأدلّة على ذٰلك، وعدّ الأئمة ذلك من خصائصه، ونقل بعضهم عن شرح المرقاة للملا على القاري أنّه قال: اختاره كثير من اصحابنا واطال في تحقيقه في شرحه على الشمائل فى باب ما جاء فى تعطر عليه السلام (۱)

”بعض ائمہ شافعیہ نے حضورا کرم ﷺ کے پیشاب اورآپ ﷺ کے فضلات کے پاک ہونے کوصحیح قراردیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ مواہب اللدنیہ میں علامہ عینی کی شرح بخاری سے نقل کیا گیا ہے،شرح اشباہ میں علامہ بیری نے اس کی صراحت فرمائی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ کے فضلات کی طہارت پر دلائل بہت زیادہ ہیں۔تمام ائمہ نے اس بات کوحضور ﷺ کی خصوصیتوں میں شمار کیا ہے، ملاعلی قاریؒ جو بہت بڑے حنفی عالم ہیں فرماتے ہیں: اسی مذہب کو ہمارے بیشتر اصحاب نے اختیار کیا ہے اوراس بارے میں انہوں نے شرح شمائل میں تفصیلی گفتگو کی ہے‘‘۔

مذکورہ بالاحوالہ جات میں ان ائمہ کے اس مسلک کواپنانے کا ذکرآیا ہے :

۱- اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ ۲- اِمام شافعیؒ ۳-علامہ عینیؒ ۴- حافظ ابنِ حجرؒ

۵- علامہ شامیؒ ۶-علامہ سیدیؒ ۷-قاضی عیاض مالکیؒ ۸-ملاعلی قاریؒ وغیرہ

مذکورہ ائمہ کے نزدیک حضورِاکرم ﷺ کے فضلات پاک ہیں اور جمہور کا بھی یہی مسلک ہے۔

---

(۱) درالمختار: كتاب الطهارة، باب الانجاس، مطلب فى طهارة بوله ﷺ: ۳۱۸/۱،سعید

ان احادیث اور ائمہ کے اقوال اور جمہور امت کے مذہب کے مطابق حضورِاکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی کا ذکر فضائل اعمال میں کوئی نئی چیز اور اچھنبے کی بات نہیں ہے کہ اس کو ہدفِ تنقید بنایا جائے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات حکایات صحابہ رضی اللہ عنہم، ص:۲:۱۷۲-۱۷۳ پر مذکور ہیں۔ ہم نے اسے عربی عبارت کے ساتھ مع حوالہ اور سند کی تحقیق کے ساتھ ذکر کردیا ہے۔ حضرت شیخؒ کا ان واقعات کے ذیل میں فوائد کے ذکر میں یہ فرمانا: ''حضور ﷺ کے فضلات (بول و براز)، وغیرہ سب پاک ہیں'' ان کا یہ قول مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں ہے' اس لئے اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

ضعیف خاتون صحابیہؓ کی دُعا سے مردہ زندہ ہوگیا (واقعہ دُرست ہے)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

ہم ایک انصاریؓ کے پاس گئے، وہ بہت بیمار تھے، ہم ان کے یہاں ٹھہرے، یہاں تک کہ ان کی روح پرواز کرگئی، ہم نے ان پر چادر ڈالدی، ان کے سر کے پاس ان کی بوڑھی والدہ کھڑی ہوئی تھیں، ایک شخص نے ان کی طرف دیکھ کر کہا: اماں جان! اس مصیبت پر اللہ کے پاس ثواب کی اُمید رکھیں، اس پر اس خاتون نے کہا: کون سی مصیبت؟ کیا میرے بیٹے کا انتقال ہوگیا؟ ہم نے کہا کہ: ہاں! انصاریؓ کی ماں نے پوچھا کیا تم بالکل سچ کہہ رہے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں! انہوں نے پھر وہی سوال کیا کیا تم سچ بول رہے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں! تب انہوں نے اللہ کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلائے اور دعا کرنے لگیں کہ اے اللہ! آپ جانتے ہیں کہ میں مسلمان ہوئی اور آپ کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کی اس امید پر کہ آپ ہر مصیبت و پریشانی کے وقت میری مدد فرمائیں گے۔ اے اللہ! آج مجھ پر یہ مصیبت مت ڈال دیجئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے چہرہ کو کھولا گیا تو وہ بالکل زندہ وصحیح سلامت تھے؛ چنانچہ ہم نے ان انصاریؓ کے ساتھ کھانا تناول کرکے وہاں سے رخصت ہوئے۔(۱)

دُعا کی برکت سے چکی چلنے لگی (واقعہ دُرست ہے)

اس روایت کو مسندِ احمد میں حضرتِ ابوہریرہ ﷺ سے نقل کیا گیا ہے، ہم اس حدیث کا

(۱) صفوۃ الصفوۃ امرأۃ من المهاجرات لم یذكر اسمه:۸۲/۲،دارالمعرفة بیروت

ترجمہ نقل کئے دیتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ: (رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں) اللہ کا ایک بندہ اپنے اہل وعیال کے پاس پہنچا، جب اس نے ان کو فقر و فاقہ کی حالت میں دیکھا تو (الحاح کے ساتھ اللہ سے دُعا کرنے کیلئے) جنگل کی طرف چل دیا جب اس نیک بیوی نے دیکھا (کہ شوہر اللہ تعالیٰ سے مانگنے کیلئے گئے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کرکے اس نے تیاری شروع کردی) اور اٹھ کر چکی کے پاس آئی اور اس کو تیار کیا (تا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہیں سے کچھ غلہ آئے تو جلدی سے اس کو پیسا جا سکے) پھر وہ تنور کے پاس گئی اور اس کو گرم کیا (تا کہ آٹا پس جانے کے بعد پھر روٹے پکانے میں دیر نہ لگے) پھر اس نے خود بھی دعا کی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے مالک: ہمیں رزق دے' اب اس کے بعد اس نے دیکھا کہ چکی کے گرداگرد آٹے کیلئے جو جگہ بنی ہوئی ہے وہ آٹے سے بھری ہوئی ہے۔ پھر وہ تنور کے پاس گئی تو دیکھا کہ تنور بھی روٹیوں سے بھرا ہوا ہے (اور جتنی روٹیاں اس میں لگ سکتی ہیں، لگی ہوئی ہیں) اس کے بعد اس بیوی کے شوہر واپس آئے اور بیوی سے پوچھا کہ میرے جانے کے بعد تم نے کچھ پایا؟ بیوی نے بتایا کہ ہاں! ہمیں اپنے پروردگار کی طرف سے ملا ہے (یعنی براہِ راست خزانۂ غیب سے اس طرح ملا ہے) یہ سن کر یہ بھی چکی کے پاس گئے (اور اس کو اٹھا کر دیکھا، یعنی تعجب اور شوق میں غالباً اس کا پاٹ اٹھا کر دیکھا) پھر جب یہ ماجرا رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگر یہ اس کو اٹھا کر نہ دیکھئے تو چکی قیامت تک یوں ہی چلتی رہتی اور اس سے ہمیشہ آٹا نکلتا رہتا۔(١)

☒☒☒

(١) مسند احمد، محقق شعیب الارنؤط، حدیث:١٠٦٥٨، مطبوعة مؤسسة الرسالة (بحواله معارف الحديث:٣١٨/٢)

عبادات کی کثرت بدعت نہیں

اسماء الرجال اور سوانح وسیر کی کتابوں پر نگاہ رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ، تابعینؒ، اولیاءؒ اور علماء کے بکثرت عبادت کرنے کے واقعات حدِتواتر کو پہنچے ہوئے ہیں۔طویل ممارست ومزاولت مزید برآں اللہ تعالیٰ کی ان کے ساتھ خصوصی عنایت وبرکت کی وجہ سے ان کے مختصر اوقات میں بڑے بڑے حیرت انگیز کارنامے یا اعمال کا انجام دینا ایک ایسی حقیقت ہے جو زمانۂ قدیم ہی میں نہیں بلکہ اس پرفتن، قحط الرجال سے متاثر دورِحاضر میں بھی اس قسم کی چیزیں اللہ والوں کی زندگیوں میں محسوس کی جاتی ہیں۔

ذیل کی تحریر میں عبادات کی کثرت کا بدعت نہیں؛ بلکہ عزیمت ہونا اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم وخیر القرون کے احوال ذکر کئے گئے ہیں اور کثرتِ عبادت کی جواز کی شرطیں مفصلاً بیان کی گئی ہیں۔

عبادات کی کثرت بدعت نہیں

بزرگانِ دین اور اللہ کے محبوب اور مقبول بندوں سے منقول کثرتِ عبادات مثلاً نماز، تلاوتِ قرآن اور روزے وغیرہ کو بعض لوگ دُشوار، ناممکن اور محال سمجھتے ہیں۔ اِس قسم کے واقعات کو بدعت، رہبانیت اور دین میں غلو قرار دیتے ہیں' حالانکہ کثرتِ عبادت مطلقاً منع نہیں ہے اور نہ ہی اُسے بدعت اور رہبانیت یا دین میں غلو کا نام دیا جاسکتا ہے بلکہ اِس طرح کے واقعات خود حضورِ اکرم ﷺ، آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور بعد کے اَسلاف سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، جس کا اِنکار آفتاب نیم روز کا انکار ہے۔ اِس کی حقیقت وہی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں جنہیں عبادت کی لذت وحلاوت کا چسکہ لگ گیا ہو۔ جولوگ دنیا کی ہرلذت اور چاہت کے مقابلہ میں عبادت کی حلاوت اور چاشنی کو گراں قدر متاعِ عزیز سمجھتے ہوں۔ پہلے ہم بدعت کی تعریف کرتے ہیں، تاکہ ہم اس کی روشنی میں یہ سمجھ سکیں کہ کثرتِ عبادت سے متعلق یہ اسلاف اور بزرگانِ دین کے واقعات بدعت کی حقیقت کے تحت آتے ہیں یا نہیں؟ چنانچہ علامہ عبدالحئ لکھنویؒ اپنے رسالہ "إقامة الحجة علی أنّ الاکثار فی التعبّد لیس ببدعةٍ" میں "شرعة الاسلام" کے حوالہ سے بدعت وسنت کی یہ تعریف فرماتے ہیں:

وفی شرعة الاسلام، المرادمن السنة التی یجب التمسك بها ما کان علیه القرن المشهودلهم بالخیرو الصلاح والرشاد وهم الخلفاء الراشدون ومن عاصر سیّدالخلائق' ثم الذین بعدهم من التابعین، ثم من بعدهم' فما أحدث بعد ذٰلك من امرٍ علی خلاف مناهجهم فهو من البدعة و کل بدعةٍ ضلالة.(۱)

"شرعة الاسلام میں ہے کہ سنت جس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا ضروری ہے وہ ہے جس کا رواج قرونِ مشہود لہا بالخیر (جن صدیوں کے خیر وصلاح کی شہادت کی گئی ہے) میں رہا ہے، یعنی دورِ خلفاء رضی اللہ عنہم، دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور دورِ تابعینؒ وتبع تابعینؒ میں، ان کے طریقہ کے خلاف جو چیزیں بعد میں ایجاد ہوتی ہیں یہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے"۔

(۱) الاکثار فی التعبد لیس ببدعة : ۹

الغرض بدعت اس کو کہتے ہیں کہ کوئی ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب وسنت اور قرون مشہود لھا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے۔(۱)

بدعت کی تفصیلی بحث علامہ عبدالحیؒ کی مذکورہ بالا کتاب میں ملاحظہ ہو،(۹-۲۱)۔

حضورِ اکرم ﷺ کی کثرتِ عبادت

- اِمام بخاری نے حضرتِ عائشہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ :

کان النبی ﷺ لیقوم لیصلّی حتّی ترم قدماہ فیقال لہ؟ فیقول: افلا اکون عبدًا شکورًا(۲)

''نبی کریم ﷺ اس قدر نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک پر ورم آجاتا تھا، آپ ﷺ سے جب اس کثرتِ عبادت کے متعلق پوچھا جاتا تو آپ فرماتے: کیا میں شکر گذار بندہ نہ بنوں؟''۔

ترمذی نے بھی الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ حضرتِ مغیرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت یوں نقل کی ہے :

صلّی رسول اللّٰہ ﷺ حتی انتفخت قدماہ، فقیل لہ اتتکلّف ھذا وقد غفرلك ماتقدم من ذنبك وما تأخر؟ قال: افلا اکون عبدًا شکورًا۔(۳)

''آنحضرت ﷺ نے اس قدر نماز پڑھی کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک پھول گئے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ اس قدر تکلیف اور مشقت کیوں اٹھاتے ہیں، حالانکہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ (اگر ہوں بھی وہ سب) بخشے جاچکے ہیں، آپ نے فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''۔

بعینہٖ اِسی روایت کو نسائی اور ابن ماجہ نے حضرتِ مغیرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، قسطلانی نے ''مواھب اللدنیة ''میں یوں کہا ہے :

''قال ابن بطّالٍ: فی ھذاالحدیث اخذالانسان علی نفسہ بالشدة فی العبادة وان اضرّ ذٰلك ببدنہ' لأنّہ ﷺ إذا فعل ذلك

---

(۱) تفسیرِ عثمانی

(۲) بخاری: باب قیام النبیا، حدیث:۷۸، تحقیق دکتور مصطفی دیب البغا، مطبوعة بیروت

(۳) ترمذی: باب الاجتھاد فی العبادہ،حدیث:۴۱۲، مع تحقیق احمد محمد شاکر

مع علمه بما سبق له، فكيف بمن لم يعلم بذالك؟ فضلاً عمّن لم يأمن أنه استحق النّار...... ومحلّه. كما قال الحافظ ابن حجر. مالم يُفض إلى الملال، لأن النبى ﷺ كان اكمل الأحوال، فكان لا يملّ من عبادة ربّه وإن اضرّ ذلك ببدنه بل صحّ أنّه ﷺ قال: "وجُعلت قرّة عينى فى الصلاة" كما اخرجه النسائى من حديث انس رضی اللہ عنہ"

''ابنِ بطال کہتے ہیں: اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کثرتِ عبادت کو اختیار کرسکتا ہے، گرچہ کہ وہ اس کے جسم کیلئے نقصاندہ ہی کیوں نہ ہو' چونکہ جب نبی کریم ﷺ نے آپ کے بخشے بخشائے ہونے کے باوجود عبادت کو اس کثرت سے اپنایا ہے' تو اس کی کیا حالت ہوگی جو اپنے انجام کو نہیں جانتا؟ حتی کہ اس کا جہنم سے مامون ہونا بھی معلوم نہیں ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: کثرتِ عبادت کی یہ اجازت اس وقت تک ہے جب تک کہ طبیعت میں اکتاہٹ پیدا نہ ہو' چونکہ حضور ﷺ کے احوال سب سے اعلیٰ درجہ کے تھے، آپ ﷺ اللہ عزوجل کی عبادت سے نہیں اُکتاتے تھے گرچہ یہ چیز آپ ﷺ کے جسم کیلئے نقصان دہ بھی نہیں تھی، بلکہ صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔

- حضور ﷺ کے کثرتِ عبادت پر دلالت کرنے والی ایک دوسری روایت حضرتِ ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: عن أبى ذرٍ أنّ رسول الله ﷺ قام حتّى اصبح بآيةٍ "ان تعذّبهم فإنّهم عبادك وان تغفرلهم فانّك أنت العزيز الحكيم.(۱)

حضرتِ ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمام شب نماز میں کھڑے رہے اور صبح تک یہ آیت پڑھتے رہے: "اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" (اگر آپ اُنہیں عذاب دیں گے تو وہ آپ کے بندے ہیں اگر آپ انھیں معاف کردیں گے تو آپ ہی زبردست اور حکمت والے ہیں)۔

---

(۱) نسائی : الافتتاح، ترديد الآية، رقم: ۱۱۰۱۱

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں :

''بعض لوگوں پر ان کے کثرتِ مجاہدات کے بارے میں متقشفین نے اعتراض بدعت ہونے کا کیا ہے، اس حدیث سے اس کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے، بعض احادیث میں جو اس کی نہی آئی ہے تو خود ہی ان حدیثوں میں تصریح ہے کہ وہ اس شخص کیلئے ہے جس کو اس میں نشاط نہ ہو اور اس پر دوام نہ کرسکے''۔(۱)

ایک اعتراض اور اُس کا جواب

حضورِ اکرم ﷺ کی ان کثرتِ عبادت پر دلالت کرنے والی روایات کے مقابل وہ روایات ذکر کی جاتی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی پوری رات شب بیداری نہیں کی یا آپ ﷺ نے ایک رکعت میں مکمل قرآن نہیں پڑھا یا آپ ﷺ نے رات میں گیارہ رکعت سے زیادہ نفل نماز ادا نہیں کی، چنانچہ ابوداؤد سعد بن ہشام سے اور وہ حضرتِ عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں: حضور ﷺ کبھی بھی مکمل رات عبادت نہیں کرتے تھے، اور نہ آپ ﷺ نے کبھی پوری رات تلاوتِ قرآن میں گذاری ہے اور نہ ہی ماہِ رمضان کے علاوہ کسی مہینہ کے مکمل روزے رکھے ہیں، آپ ﷺ جو بھی نماز پڑھتے تو پابندی کے ساتھ۔

لم یقم رسول اللّٰہ لیلةً یُتمّھا حتی الصباح ولم یقرأ القرآن فی لیلةٍ قطّ، ولم یصم شھرًا یتمّه غیر رمضان، وکان اذا صلّی داوم علیھا.(۲)

کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ یہ روایات مذکورہ بالا کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں۔ بخاری وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے :

"ما کان یزید رسول اللّٰہ ﷺ لا فی رمضان ولا فی غیرہ علی إحدی عشرة رکعة"(۳)

''نبی کریم ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نفل ادا نہیں فرماتے تھے''۔

---

(۱) مسائلِ تصوف:۱۶۷ (۲) ابوداؤد : دارمی، فی سنه، مسلم، ابنِ ماجه

(۳) بخاری : باب فضل من قام رمضان، حدیث:۱۹۰۹، تحقیق دکتور مصطفی دیب البغا

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تلاوت قرآن، شب بیداری اور روزے میں آپ ﷺ کے معمول کے خلاف عمل بدعت ہے۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ

- آپ ﷺ کا پوری رات عبادت کیلئے جاگنا یہ روایات سے ثابت ہے، چنانچہ مسلم، ابوداؤد وغیرہ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرتِ عائشہؓ سے مروی ہے:

وکان النبی ﷺ إذا دخل العشر الأواخر من رمضان احي الليل، وايقظ اهله، وشدّ المئزر". (۱)

"آنحضرت ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں مکمل رات جاگتے اپنے اہل وعیال کو بیدار کرتے اور عبادت کیلئے کمر بستہ ہوجاتے"۔

"احیاءالیل" کی تشریح امام نوویؒ نے مکمل شبِ بیداری سے کی ہے؛ لہٰذا یہ دعویٰ کہ "اور نہ کبھی آپ ﷺ تمام شب جاگے" غلط ہے۔

ایسی ہی ایک دوسری روایت جسے عبد بن حمید اور ابن ابی الدینا نے "کتاب التفکر" میں اور ابن حبانؒ نے اپنی "صحیح ابن حبان" (۲) میں، ابنِ مردویہ اور اصبہانی نے "کتاب الترغیب والترہیب" سے نقل کیا ہے کہ ابن عساکر عطا سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرتِ عائشہؓ سے یوں کہا: حضور ﷺ کا سب سے زیادہ تعجب خیز عمل بتلائیے، تو انہوں نے کہا: حضور ﷺ کی کونسی ادا حیرت کن نہ تھی۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ میرے پاس تشریف لائے، میرے لحاف میں آرام فرما ہوئے، پھر کہنے لگے "ارے چھوڑو میں اپنے رب کی عبادت کروں" چنانچہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور نماز کیلئے کھڑے ہوگئے، آپ ﷺ اس قدر روئے کہ آپ ﷺ کے آنسو سینے پر بہہ پڑے، پھر رکوع فرمایا، پھر رونے لگے، پھر سجدہ کیا پھر رونے لگے، پھر آپ ﷺ نے سجدہ سے سر اٹھایا اور رونے لگے "فلم یزل كذلك حتى جاء بلال يؤذّنه بالصلاة" آپ ﷺ کی یہی حالت رہی یہاں تک کہ حضرتِ بلال رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو نمازِ فجر کی اطلاع دینے کیلئے آئے، میں نے آپ سے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اس قدر کیوں روتے ہیں حالانکہ آپ

---

(۱) مسلم: ۳۷۲/۱، بخاری: ۲۷۱/۱

(۲) صحيح ابن حبان، باب التوبة، حديث:۶۲۰، مع تحقيق الأرنؤط

بخشے بخشائے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں شکر گذار بندہ نہ بنوں؟'' ''میں اِس طرح کا مجاہدہ کیوں نہ کروں'' جبکہ اللہ عزوجل نے اِسی رات یہ آیت نازل فرمائی ہے:

اِنَّ فِیُ خَلُقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرُضِ وَاخُتِلَافِ اللَّیُلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیَاتٍ الِّاُولِی الْأَلُبَابِ ''آسمانوں اورزمینوں کی پیدائش' رات ودن کے آنے جانے میں عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں۔''

ان روایات سے یہ پتہ چلا کہ تمام رات نہ جاگنے سے متعلق جو روایتیں ہیں وہ آپ ﷺ کے عام معمول کو بتلاتی ہیں، ایسے ہی گیارہ رکعت سے زیادہ نفل کا پڑھنا یہ اغلب احوال پر محمول ہے، ورنہ بکثرت روایات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے پندرہ رکعت بھی ادا فرمائی ہیں۔(۱)

- اگر یہ بات ہم مان بھی لیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مکمل رات شب بیداری نہیں کی' نہ ایک رات میں قرآن پڑھا اور نہ ہی آپ ﷺ نے گیارہ رکعت سے زیادہ نفل پڑھیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ کثرت اور شدت پر دلالت کرنے والی روایات تو آپ ﷺ سے ثابت ہیں کہ آپ ﷺ نے اس قدر شب بیداری فرمائی کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک پھول گئے' لہٰذا آپ ﷺ سے اس قدر بات کا ثبوت بھی اس قسم کی ریاضت اور مجاہدوں پر بدعت کے اطلاق کیلئے مانع ہوتا ہے۔ چونکہ بدعت اس طریقے کو کہتے ہیں کہ خود وہ یا اس جیسی کوئی چیز عہدِ رسالت میں نہ ملتی ہو' عبادت وریاضت کے ہر ہر جزء کا آپ ﷺ سے ثبوت ضروری نہیں ہوا کرتا۔
- آپ ﷺ اس طرح کے مجاہدے اس وجہ سے نہیں کیے ہیں کہ اُمت کیلئے حرج اور تنگی نہ ہو اور آپ ﷺ اس قدر شفیق اور رحیم تھے کہ امت کی پریشانی آپ ﷺ کیلئے ناقابل برداشت تھی' اس طرح کہ یہ مجاہدے آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے جن کی اقتداء وپیروی اور جن کے سلوک اور طریقے کو اپنانے کے ہم مکلّف قرار دیئے گئے ہیں' انہوں نے بکثرت کئے ہیں؛ لہٰذا اِسے کیوں کر بدعت قرار دیا جا سکتا ہے؟

---

(۱) بخاری : ۱۰۴/۱،مسلم : ۲۵۶/۱، کذا ذکرہ النووی فی شرح مسلم

صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثرتِ عبادت

○ حضرتِ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حافظ ابونعیم اصبہانی رحمہ اللہ ''حلیۃ الاولیاء'' میں فرماتے ہیں: ہم سے احمد بن جعفر بن حمدان نے' ان سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے' ان سے ان کے والد احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے' ان سے حماد بن خالد نے' ان سے زبیر بن عبداللہ نے اور وہ اپنے دادی جو رھیمہ کے نام سے موسوم تھیں بیان کیا کہ: کان عثمان يصوم الدهر ويقوم الليل الّا هجعة من اوّله حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صائم الدھر تھے اور آپ رضی اللہ عنہ سوائے رات کے ایک حصے کے پوری رات عبادت میں گذارتے تھے۔

ایک دوسری روایت اس طرح ہے :

ہم سے ابراہیم بن عبداللہ نے' ان سے محمد بن اسحاق نے' ان سے قتیبہ بن سعید نے ان سے علقمہ بن محمد نے ان سے عثمان بن عبدالرحمٰن التیمی نے بیان کیا کہ وہ مقام ابراہیم کے پاس تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور نماز میں سورۃ الفاتحہ شروع فرمائی یہاں تک کہ سارا قرآن ختم فرمایا پھر رکوع سجدہ کیا، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے جوتے لئے یہ نہیں معلوم کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے پہلے کچھ پڑھا یا نہیں۔

مزید ایک روایت جو کہ بہ سند محمد ابن سیرین مروی ہے فرماتے ہیں:

حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے جس وقت لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے ارادہ سے ان کے گھر کا چکر لگا رہے تھے یوں فرمایا :

> ''ان تقتلوه اوتتركوه فانّه كان يحي الليل كلّه في ركعةٍ يجمع فيها القرآن '' خواہ تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو یا ان کی حالت پر چھوڑ دو وہ تو ساری رات جاگ کر ایک رکعت میں مکمل قرآن پڑھتے ہیں۔

○ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں جو ''البداية والنهاية'' کے نام سے موسوم ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں یوں فرمایا ہے :

> ''كان يصلى بالناس العشاء ثم يدخل بيته فلايزال يصلى الى

الفجر'' آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھا کر گھر تشریف لاتے اور پھر فجر تک نماز کا سلسلہ جاری رہتا۔

- عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں یوں کہا ہے :

''ہم سے سلیمان نے' ان سے ابویزید القراطیسی نے' ان سے اسد بن موسی نے ان سے ولید بن معلم نے' ان سے ابن جابر نے' ان سے سلیمان بن موسیٰ نے' ان سے نافع نے بیان کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ساری رات نماز پڑھتے ہوئے گذار دیتے'' کان یحي اللیل صلاۃ'' پھر فرماتے: نافع کیا سحری کا وقت ہو چکا' وہ کہتے نہیں تو پھر دوبارہ نماز شروع کر دیتے' پھر فرماتے: نافع کیا سحر ہوگئی' وہ کہتے: ہاں تو بیٹھ کر استغفار کرتے اور صبح تک دُعا میں مصروف رہتے''۔

مذکورہ بالا کتاب میں ایک دوسرے طریق سے یہ روایت نقل کی گئی ہے :

"انّ ابن عمر اذا فاتته صلاۃ العشاء فی جماعةٍ احي بقية ليلته " ابن عمر رضی اللہ عنہ کی جب عشاء کی نماز چھوٹ جاتی تو بقیہ رات عبادت میں گذار دیتے۔

- تمیم بن اوس بن خارجہ الداری رضی اللہ عنہ

جن کی دجال کی خبریں دینے سے متعلق روایات ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں، ابوسعد السمعانی نے کتاب ''الانساب'' میں یوں فرمایا ہے :

کان تميم يختم القرآن فی رکعةٍ و ربما ردّد الآية الواحدة الليل کلّه حتّی الصباح، وکان من عبّاد الصحابة و زهّا دهم' ممن جانب اسباب العز، ولزم التخلّی بالعبادة الٰی ان مات.

کہ تمیم رضی اللہ عنہ ایک رکعت میں سارا قرآن پڑھ جاتے، بسا اوقات ایک آیت کا ساری رات ورد کرتے رہتے اسی میں صبح ہو جاتی، یہ عابد و زاہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ اُنہوں نے جاہ وعظمت کے اسباب کو ترک کر کے مرتے دم تک عبادت کیلئے خلوت نشینی اختیار کر لی تھی۔

یہی بات ابنِ حجر المکی الھیثمی نے ''فتح المبین فی شرح

الاربعین“ میں کہی ہے۔

○ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ

ابونعیم کہتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم بن عبداللہ نے، اُن سے محمد بن اسحاق نے، اُن سے قتیبہ بن سعید نے، اُن سے فرج بن فضاء نے، اُن سے فرج بن فضالہ نے، اُن سے اسد بن وداعہ نے، اُن سے شداد بن اوس انصاریؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں:

أنّـه اذا دخل الفراش يتقلّب على الفراش لايأتيه النوم، فيقول: اللّٰهُمّ انّ النار أذهبت عنى النوم فيقوم فيصلى حتى يصبح

جب وہ بستر پر تشریف لاتے تو نیند نہ آتی اور وہ کروٹیں بدلتے رہتے، یوں فرماتے: جہنم کی آگ نے میری نیند اڑا دی، پھر کھڑے ہو کر نماز شروع کر دیتے پھر صبح تک نماز کا سلسلہ چلتا رہتا۔

○ علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ

یہ ایک دن میں آٹھ قرآن مکمل پڑھ لیتے۔ شراح بخاری نے ان کا یہ معمول ذکر کیا ہے۔

تابعین کی کثرتِ عبادت

○ عمیر بن ھانیؒ

ترمذی نے ”أبـواب الدعاء“ میں مسلمہ بن عمرو سے یہ روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

”كـان عـمـيـر بن هانى يصلّى كل يوم الف ركعةٍ ويسبّح مائة الف تسبيـحةٍ“ (۱) عمیر بن ھانی ہر دن میں ایک ہزار رکعت نفل پڑھتے اور ایک لاکھ تسبیح پڑھا کرتے۔

○ اویس قرنیؒ

جن کے توسط سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو مغفرت طلب کرنے کا حکم فرمایا تھا، ابونعیم کہتے ہیں ابوبکر محمد بن احمد نے اُن سے حسن بن احمد نے، اُن سے عبداللہ بن عبدالکریم نے، اُن سے سعید بن اسد بن موسیٰ نے، اُن سے حمزہ بن ربیعہ نے، اُن سے اصبغ بن زید نے

---

(۱) سنن الترمذی، باب ما جاء فی الدعاء اذ انتبه من الليل، حدیث: ۳۴۱۵، مع تحقیق احمد محمد شاکر

روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں :

”کان اویس القرنی اذا امسٰی یقول: هذه لیلة الرکوع فیرکع حتّی یصبح، وکان إذا امسٰی یقول: هذه لیلة السجود فیسجد حتی یصبح“ .اویس قرنی جب رات ہوتی تو یوں کہتے: یہ رکوع کی رات ہے، پھر صبح تک رکوع میں رہتے (پھر کبھی) رات ہوتی یوں کہتے: یہ سجدے کی رات ہے، پھر صبح تک سجدے میں رہتے۔

○ عامر بن عبداللہ بن قیسؒ

ابونعیم کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن احمد بن محمد العبدی نے، ان سے ابوبکر بن عبید نے، ان سے محمد یحیٰی ازدی نے، ان سے جعفر بن ابی جعفر رازی نے، ان سے جعفر السائح نے ان سے ابن وھیب وغیرہ نے بیان کیا :

”انَّ عامر بن عبد اللّٰه کان من افضل العابدین و فرض علی نفسه فی کل یوم الف رکعةٍ“.عامر بن عبداللہ بہت بڑے عبادت گذار تھے، ہر روز ایک ہزار رکعت اُن کا معمول تھا۔

○ مسروق بن عبدالرحمٰن ابوعائشہ الھمدانی الکوفیؒ

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن علی نے، ان سے عبداللہ بن محمد نے، اُن سے جعد نے، اُن سے شعبہ نے، اُن سے ابواسحاق نے بیان کیا فرماتے ہیں: حج مسروق فمابات الّا ساجدًا :مسروق نے دوران حج تمام راتیں سجدہ میں گذار دیں شیخ الاسلام ابوعبداللہ الذہبی نے ”العبر فی اخبار من غبر“ میں یوں فرمایا ہے :

”کان مسروق یصلی تورّم قدماه‘ وحج فما نام الّا ساجدًا“ .
مسروق اس قدر نمازیں پڑھتے تھے کہ ان کے پیروں میں ورم آجاتا تھا انہوں نے دوران حج تمام راتیں سجدے کی حالت میں گذاری ہیں۔

یافعی کی ”مرآة الجنان“ اور ”تاریخ ابن کثیر“ میں یہی بات نقل کی گئی ہے۔

○ اسود بن یزید النخعی الکوفیؒ

ذہبی اور یافعی کہتے ہیں :

"ورد أنّه كان يصلّي في اليوم والليلة سبع مائة ركعةٍ" یہ دن ورات میں سات سونمازیں پڑھا کرتے۔

حلیۃ الاولیاء میں ہے: ہم سے ابوبکر بن مالک نے، اُن سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے، اُن سے عبداللہ بن مندل نے، اُن سے فضیل بن عیاضؒ نے، اُن سے منصور نے ان سے ابراہیم نے نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

"كان الاسود يختم القرآن في رمضان فى كل ليلتين، وكان ينام بين المغرب والعشاء، وكان يختم فى غير رمضان فى كل ست ليالٍ" اسود رمضان میں ہر دورات میں ختم قرآن فرماتے، یہ مغرب اور عشاء کے درمیان سوجاتے اور غیر رمضان میں ہر چھ رات میں ایک ختم فرماتے۔

- سعید بن مسیّب، ابومحمد المخزومیؒ

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابومحمد نے، اُن سے احمد بن روح نے، اُن سے احمد بن حامد نے، اُن سے عبدالمنعم بن ادریس نے، وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں فرماتے ہیں:

"صلّى سعيد بن المسيب الغداة بوضوء العتمة خمسين سنةً" سعید بن مسیّب نے پچاس سال تک رات کے وضو سے چاشت کی نماز پڑھی۔

- عروہ بن زبیر بن عوامؒ

ذہبیؒ کہتے ہیں: كان يقرأ كلّ يوم ربع الختمة فى المصحف، ويقوم الليل به، فما تركه الاليلة قطعت رجله. یہ ہر دن چوتھائی قرآن پڑھتے، اسی کو تہجد میں دوبارہ پڑھتے، آپ کے معمول میں اس دن ناغہ ہوا جس دن آپ کا پیر کاٹا گیا تھا۔

- صلہ بن اشیم

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابومحمد بن حیان نے، اُن سے عبداللہ نے، اُن سے نجدہ بن مبارک نے، اُن سے مالک بن مغول نے بیان کیا کہ فرماتے ہیں کہ:

"بصرہ میں تین عبادت گذار اشخاص تھے، صلہ بن اشیم، کلثوم بن اسود اور ایک شخص۔ صلہ جب رات ہوتی تو جنگل وبیابان میں نکل جاتے اور وہاں مصروف عبادت رہتے، ایک شخص کو جب اس بارے میں معلوم ہوا تو وہ جنگل میں کھڑے ہوکر ان کی عبادت کا

نظارہ کرنے لگے' ایک درندہ آیا' اس کے پاس صلہ تشریف لائے اور کہا کہ جا کر رزق تلاش کر' وہ درندہ چلا گیا' پھر عبادت کیلئے کھڑے ہو گئے' جب سحر کا وقت ہونے لگا تو کہنے لگے' اے اللہ صلہ آپ سے جنت کے طلب کا استحقاق نہیں رکھتا' لیکن اسے جہنم کی آگ سے بچا لیجئے''۔

- ثابت بن اسلم البنانیؒ

سمعانی کہتے ہیں: یہ بصری تابعیؒ ہیں، یہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، اُنہوں نے حضرتِ انس رضی اللہ عنہ کی صحبت میں چالیس سال گذارے ہیں، یہ بصرہ کے عابدین وزاہدین میں سے تھے۔ یہ ۱۲۷ھ میں وفات پا گئے۔

''حلیہ'' میں ہے کہ ہم سے ابوبکر بن مالک نے، اُن سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے، اُن سے ان کے والد نے، اُن سے روح نے، اُن سے شعبیؒ نے بیان کیا، فرماتے ہیں کہ:

''كان ثابت يقرأ القرآن في يومٍ وليلةٍ ويصوم الدهر'' ثابت ہر دن اور رات میں ایک قرآن ختم فرماتے اور یہ صائم الدھر تھے۔

- علی بن حسین رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ بن ابوطالب (اِمام زین العابدین ہاشمی)

ذہبیؒ اپنی کتاب ''العبر'' میں فرماتے ہیں :

''كان يصلى فى اليوم والليلة الف ركعةٍ الى ان مات' قاله مالك؛ وقال: وكان يسمّى زين العابدين لكثرة عبادته''. یہ اپنی وفات تک ہر دن ورات میں ایک ہزار رکعت ادا فرماتے رہے، مالک نے یہ بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں' یہ اپنی اسی کثرتِ عبادت کی وجہ سے ''زین العابدین'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔

- قتادہ بن دعامۃ

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن احمد نے، اُن سے محمد بن ایوب نے، اُن سے موسیٰ بن اسماعیل نے، اُن سے سلام بن ابی مطیع نے بیان کیا کہ :

''أن قتادة كان يختم القرآن فى كل سبع ليالٍ مرّة، فاذا جاء رمضان فى كل ثلاث ليالٍ مرّةً فاذاجاء العشر ختم فى كل ليلةٍ مرة''. قتادہ

ہر سات رات میں ایک ختم قرآن فرماتے، رمضان کی آمد کے بعد ہر تین رات میں ایک ختم قرآن کیا کرتے، پھر جب رمضان کا آخری عشرہ ہوتا تو ہر رات میں ایک قرآن کا ختم کرتے۔

○ سعید بن جبیرؒ

یافعی نے "مرأة الجنان" میں یوں کہا ہے:

رُوی أنه قرأ القرآن فی رکعةٍ فی البیت الحرام.

اُن سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے بیت اللہ میں ایک رکعت میں قرآن ختم فرمایا۔

محمود بن سلیمان الکفوی کی اعلام الاخبار من طبقات فقهاء مذهب النعمان المختار میں ہے کہ اسماعیل بن عبدالملک نے کہا :

کان سعید بن جبیر یؤمنّا فی رمضان، فیقرأ لیلة بقرأة ابن مسعود، ولیلةً بقراء ة زیدبن ثابت.

سعید بن جبیرؒ رمضان میں ہماری اِمامت فرماتے، ایک رات ابن مسعود کی قرأت میں قرآن پڑھتے، دوسری رات زید بن ثابت کی قرأت میں۔

یہی بات ذہبی نے "طبقات القرّاء" میں کہی ہے۔

○ محمد بن واسع، ابوعبداللہ

ابونُعیم کہتے ہیں: ہم سے عبداللہ بن محمد نے، اُن سے احمد بن نصر نے، اُن سے احمد بن کثر نے، اُن سے شبابہ نے، اُن سے ابوالطیب موسیٰ بن یسار نے بیان کیا فرماتے ہیں: مجھے محمد بن واسع کی مکہ سے بصرہ تک صحبت حاصل رہی ہے۔

فکان یصلّی اللیل اجمع، یصلی فی المحمل جالسًا یؤمی برأسه ایماءً وربّما عرّس باللیل فینزل فیُصلّی، فاذا اصبح ایقظ اصحابه رجلاً رجلاً یجیء علیه. فیقول: الصلاة الصلاة.

یہ پوری رات نماز پڑھتے رہتے، یہ اپنے کجاوے میں بیٹھ کر سر کے اشارے سے نماز ادا کرتے، کبھی رات میں پڑاؤ ڈالتے تو اتر کر نماز پڑھنے لگتے، پھر صبح اپنے ایک ایک ساتھی کو اس کے پاس آ کر جگاتے کہتے: نماز، نماز (یعنی نماز کا وقت ہو گیا اٹھو)۔

○ مالک بن دینارؒ

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابوحامد نے، اُن سے محمد بن اسحاق نے، اُن سے ہارون بن عبداللہ نے، اُن سے سیار نے، اُن سے جعفر نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے مغیرہ بن حبیب ابوصالح مالک بن دینار کے داماد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے:

صلّيتُ العشاء مع مالك، و جاء فأ كل ثم قام إلى الصلاة، فاستفتح ثم اخذ بلحيته فجعل يقول: اذاجمعت الأوّلين والاٰخرين، فحرّم شيبة مالك على النّار، فوالله مازال كذلك حتى غلبتُني عينى، ثم انتبهت فاذا هوعلى تلك الحال، لما زال كذلك حتى طلع الفجر.

میں نے مالک کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، نماز سے فراغت کے بعد آپ تشریف لائے کھانا کھایا پھر نماز کیلئے کھڑے ہوگئے اور نماز شروع کردی، پھر اپنی ڈاڑھی کو پکڑ کر کہنے لگے اے اللہ جب آپ اگلوں اور پچھلوں کو اکھٹے فرمائیں گے تو مالک کے بوڑھاپے پر جہنم کو حرام کردینا، آپ کی یہی حالت رہی، حتیٰ کہ مجھے نیند لگ گئی، پھر جب میں بیدار ہوا تو آپ کی ابھی یہی حالت تھی، پھر فجر تک آپ اسی کیفیت میں رہے۔

○ سلیمان بن طرخان التمیؒ

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن ابراہیم بن عاصم نے، اُن سے محمد بن تمام الحمصی نے، اُن سے مسیّب بن واضح اور وہ ابن مبارک سے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

اقام سليمان التيمى اربعين سنةً امام جامع البصرة' يصلى العشاء والصبح بوضوء واحدٍ.

سلیمان تیمی بصرہ کی جامع مسجد کے سامنے چالیس سال تک رہے وہ اس دوران عشاء اور صبح کی نماز ایک وضو سے پڑھتے تھے۔

○ منصور بن زادان

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابومحمد بن حیان نے، اُن سے احمد بن الحسین نے، اُن سے احمد بن

ابراہیم الدورقی نے،اُن سے محمد بن عیینہ نے،اُن سے مخلد الحسین نے،اُن سے ہشام بن حسان نے بیان کیافرماتے ہیں:

کنت اصلّی انا ومنصور جمیعًا، وکان اذا جاء رمضان ختم القرآن فیما بین المغرب والعشاء ختمین، ثم یقرأ الی الطواسین قبل ان تقام الصلاۃ وکانوا اذ ذاك یؤخرون العشاء فی رمضان الٰی ان یذهب ربع اللیل.

میں اور منصور ایک ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے جب رمضان آتا تو وہ مغرب اور عشاء کے درمیان دوختم قرآن فرماتے پھر جماعت کھڑی ہونے سے طواسین (سورۂ فیل یا روم تک) پڑھ لیتے یہ لوگ اس وقت عشاء کو رمضان میں چوتھائی رات تک موخر کرتے تھے۔

- علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب المدنی

حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب میں یوں فرماتے ہیں:

کان یدعی: (السجّاد) لکثرۃ صلاته.

ان کو بکثرت نماز میں مشغول رہنے کی وجہ سے ''جانماز'' کہا جاتا تھا۔

ضمرہ کہتے ہیں:مجھ سے علی بن ابوحملۃ نے بیان کیا فرماتے ہیں:

کان علی بن عبداللّٰه یسجد کلّ یوم الف اسجدۃ

علی بن عبداللہ ہر روز ایک ہزار سجدے کیا کرتے تھے۔

میمون ابن زیاد العدوی کہتے ہیں:

یہ ہر دن ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

''العبر باخبارِ من غبر'' اور ''حلیة الأولیاء''میں ان کے متعلق اِسی طرح کی روایات نقل کی گئی ہیں۔

- ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی،اِمامِ اعظمؒ

اِن کی کثرتِ عبادت کو تمام معتبر اور معتمد کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔حضرت اِمامِ اعظمؒ کی کثرتِ عبادت،قرأتِ قرآنِ کریم،حج وعمرہ اور زہد وتقویٰ کے بے شمار واقعات منقول ہیں،جس کا اِنکار دراصل آفتاب نیمروز کا انکار ہے۔حضرت اِمامِ اعظمؒ نے اپنی زندگی میں پچپیں حج کیے۔(۱)

---

(۱) مفتاح السعادۃ :۷۲/۲، ذیل الجواهر :۴۹۵/۲

اورصرف ایک رمضان میں ایک سوبیس عمرے کئے ہیں گویا روزانہ چار عمرے۔(۱)

اور آپ ساری رات جاگتے اور ایک ہی رکعت میں سارا قرآنِ کریم ختم کردیتے تھے اور رات کو خوفِ خدا کی وجہ سے گریہ وزاری کا یہ عالم تھا کہ اُن کے پڑوسی اُن پر ترس کھاتے تھے۔(۲)

اِن کے متعلق یہ بات نقل کی گئی ہے کہ اُنہوں نے جس جگہ وفات پائی وہاں سات ہزار قرآن ختم کئے۔(۳)

خطیب نے لکھا ہے کہ تیس چالیس سال تک امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ایک وضو سے نماز عشاء اور صبح پڑھی۔(۴)

اس طرح کے بے شمار واقعات کتبِ تاریخ وغیرہ میں اِمامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے متعلق نقل کئے گئے ہیں۔آپؒ کے اِس طرح کے تقویٰ وطہارت اور جہد وعبادت کے بے شمار واقعات کو صاحب ہدایہ نے مختارات النوازل میں اور "العبر باخبار من غبر" میں کفوی نے "اعلام الأخیار فی طبقات فقہاء مذہب النعمان المختار" میں سیوطی نے تبییض الصحیفة بمناقب الامام ابی حنیفة اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اس طرح بے شمار متقدمین ومتاخرین نے آپ کی کثرتِ عبادت کے واقعات کو نقل کئے ہیں، یہ ان کی تعداد حدتواتر تک پہنچ جاتی ہے، جو جزم ویقین کیلئے کافی ہے۔

تبع تابعین کی کثرتِ عبادت

○ سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف الزہری

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے احمد بن محمد نے، اُن سے محمد بن اسحاق نے، اُن سے عبیداللہ بن سعد نے، اُن سے ابراہیم بن سعد نے، اُن سے اُن کے والد نے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں کہ:

کان ابی سعد بن ابراهیم اذا کانت لیلة احدی وعشرین وخمس وعشرین وسبع وعشرین لم یفطر حتّی یختم القرآن.

میرے والد سعد بن ابراہیم اکیسویں، پچیسویں، ستائیسویں رات کو ختم قرآن سے پہلے افطار نہ فرماتے۔

---

(۱) ذیل الجواہر : ۴۹۵/۲ (۲) بغدادی : ۳۵۴/۱۳
(۳) مفتاح السعادة : ۷۸/۲ (۴) ذیل الجواہر : ۳۵۴/۱۳

''عبر'' اور ''ألمراۃ'' میں ہے شعبی کہتے ہیں :

سعد صائم الدھر (ہمیشہ روزہ رکھنے والے) تھے، ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

○ ابراہیم بن ادھمؒ

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے عبداللہ بن محمد جعفر نے، اُن سے اسحاق بن احمد نے، اُن سے حجاج بن حمزہ نے، اُن سے ابویزید نے، اُن سے ابواسحاق نعزاری نے بیان کیا ہے فرماتے ہیں:

کان ابراھیم فی شھر رمضان یحصد الزرع بالنھار ویصلی باللیل، فمکث ثلاثین یوماً لاینام باللیل ولابالنھار.

ابراہیمؒ رمضان کے مہینے میں دن میں کھیتی کاٹ لیتے اور رات میں نماز میں مصروف رہتے، تیس دن ایسے گذرے ہیں کہ وہ دن ورات میں بالکل نہیں سوئے۔

○ شعبہ بن حجاج

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے احمد بن جعفر نے، اُن سے احمد بن علی نے، اُن سے علی بن الحسین البلخی نے بیان کیا فرماتے ہیں کہ عمر بن ہارون نے کہا :

کان شعبة یصوم الدھر کلّه' وکان الثوري یصوم فی کلّ شھرٍ ثلاثه ایّام' قال الھروی، رأیتُ شعبة یصلّی حتی ترم قدماہ

شعبہ صائم الدھر تھے، ہر مہینے تین روزے رکھا کرتے تھے ہروی کہتے ہیں کہ میں نے شعبہ کو کثرتِ نماز کی وجہ سے ان کے پیروں میں ورم دیکھا ہے۔

○ فتح بن سعید الموصلی

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابوزرعۃ محمد بن ابراہیم نے، اُن کو محمد بن قارن نے، اُن کو ابوحاتم نے، اُن کو محمد بن روح نے، اُن کو ابراہیم بن عبداللہ نے بیان کیا فرماتے ہیں:

صُدِع فتح الموصلی ففرح' فقال! ابتلیتنی ببلاء الأنبیاءؑ' فشکر ھذا ان اصلّی اللیة اربع مائةِ رکعة.

فتح موصلی کے سر میں درد ہوگیا تو خوش ہوگئے، کہنے لگے، تو نے مجھے انبیاءؑ کی سی پریشانی میں مبتلا کیا، اُس کا شکرانہ یہ ہے کہ میں (آج) رات چار سو رکعت پڑھوں۔

- محمد بن ادریس الامام الشافعی

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن علی نے' ان سے حسن بن علی نے اور انہوں نے ربیع بن سلیمان سے سنا ہے کہتے ہیں:

کان محمد بن ادریس الشّافعی یختم فی شہر رمضان ستین ختمة، مامنھا شیئ الافی صلاةٍ.

محمد بن ادریس الشافعی رمضان میں ساٹھ قرآن ختم فرماتے تھے، یہ تمام ختم نماز میں ہوتے تھے۔

مجھ سے میرے والد نے، اُن سے ابراہیم بن محمد ابن الحسن نے بیان کیا فرماتے ہیں: ربیع بن سلیمان کہتے ہیں میں امامِ شافعیؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا :

"کنت اختم القرآن فی رمضان ستین مرّة"

(میں رمضان میں ساٹھ قرآن ختم کیا کرتا ہوں)۔

"نووی کی تہذیب الاسماء واللغات" میں ہے: ربیع کہتے ہیں:

نمتُ فی منزل الشافعی لیالی، فلم یکن ینام الّا یسیرًا من اللیل وقال الحمیدی کان الشافعی یختم القرآن کل یومٍ ختمة.

میں نے امام شافعیؒ کے گھر پر کئی راتیں گذاری ہیں، وہ رات کا کچھ حصہ ہی سوتے تھے، اِمامِ شافعیؒ ہر دن ایک قرآن ختم فرماتے تھے۔

- امام احمد بن حنبلؒ

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے سلیمان بن احمد نے، اُن سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے بیان کیا فرماتے ہیں:

کان أبی یصلّی فی کلّ یوم ولیلة ثلاثمائه رکعة، فلما مرض من تلك الأسواط اضعفته' فکان یصلّی فی کلّ یوم ولیلة مائهٍ وخمسین رکعةً وکان قرب الثمانین.

میرے والد ہر دن ورات میں تین سو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ کوڑوں کی مار کی کمزوری کی وجہ سے جب وہ بیمار ہوگئے تو ہر دن اور رات میں ایک سو پچاس رکعتیں پڑھنا ان کا

معمول ہوگیا،اس وقت آپ کی عمر اسّی سال کے قریب تھی۔

- احمد بن محمد بن سہل بن عطاء ابو العباس

ابو نعیم کہتے ہیں: میں نے ابو الحسن محمد بن علی سے سنا کہتے ہیں :

''میرا ابو العباس بن عطا کی صحبت میں ان سے آداب واخلاق سیکھنے کی غرض سے کئی سال تک رہنا ہوا، آپ ہر دن میں ایک قرآن ختم فرماتے، ہر رمضان میں ہر دن ورات میں تین قرآن شریف کے ختم فرماتے:'' وکان له فی کل یومٍ ختمةُ، وفی کل شهر رمضان فی کلٍ یومٍ ولیلةٍ ثلاث ختماتٍ''.

- منصور ابو عتاب السلمی الکوفی الحافظ

ذہبی نے ''العبر'' میں ۱۳۱ھ کے واقعات میں یوں کہا ہے:

قال زائدة: صام اربعین سنةً، وکان یبکی اللیل کله

زائدہ کہتے ہیں کہ منصور نے چالیس سال روزے رکھے' وہ تمام رات رویا کرتے۔

- محمد بن عبد الرحمٰن بن المغیرة ابو الحارث

انہوں نے نافع اور عکرمہ وغیرہ سے روایتیں نقل کی ہیں' ذہبی اور یافعی نے ۱۵۹ھ کی واقعات میں یوں کہا ہے :

قال الواقدی کان یصلّی اللیل اجمع، ویجتهد فی العبادة

واقدی کہتے ہیں کہ یہ پوری رات نماز پڑھتے اور عبادت میں بکثرت مجاہدہ فرماتے۔

- وکیع بن جراح الکوفی

یہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور امام احمد کے اساتذہ میں سے ہیں: کفوی نے ''اعلام الاخیار'' میں کہا ہے' یحییٰ بن اکثم فرماتے ہیں:

صحبتُه فی الحضروالسفر وکان یصوم الدهر' ویختم القرآن کل لیلة' وعن محمد بن جریر قال: مکث وکیعُ بعبّادان اربعین لیلة' وختم اربعین مرّة' تصدق باربعین الف درهم

میرا ان کے ساتھ سفر وحضر میں رہنا ہوا ہے، یہ صائم الدھر تھے، یہ ہر رات ایک ختم

قرآن فرماتے، محمد بن جریر کہتے ہیں، وکیع مقامِ عبادان میں چالیس رات ٹھہرے، چالیس مرتبہ ختمِ قرآن فرمایا، اور چالیس ہزار درہم صدقہ کئے۔

چند قابل توجہ نکات

- ہم نے جن کے واقعات کا اوپر ذکر کیا ہے یہ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، فقہاء، مجتہدین اور محدثین رحمہم اللہ میں سے ہیں۔ اُنہوں نے عبادت میں اس درجہ کا مجاہدہ کیا ہے اور عبادت کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور اپنے مقاصد ومطالب کو پالیا ہے۔
- مولانا عبدالحئ فرنگی محلیؒ فرماتے ہیں: اِن واقعات کے ذکر کرنے کے دوران ہم نے ذہبی کی "العبر" اور" سیرا اعلام النبلاء " یافعی کی"مرآۃ الجنان" اور"الارشاد والتطریز بذکرفضل الذکرو تلاۃ القرآن العزیز " نووی کی"تہذیب الأسماء واللغات"" ابونعیم اصبہانی کی"حلیۃ الأولیاء" سمعانی کی "کتاب الأنساب" اس کے علاوہ دیگر کتب تاریخ اور اسماءِ رجال سے استفادہ کیا ہے' واقعات اس قسم کے بے شمار ہیں، بطورِ مثال کے چند واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔
- یہ واقعات بہ سند ذکر کئے گئے ہیں تا کہ کسی کو یہ کہنے کا حق نہ رہے کہ ان جیسی چیزوں کے ثبوت کیلئے یا تو بذاتِ خود مشاہدہ یا بہ سند ذکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ عموماً ان واقعات کے حوالہ کیلئے الحلیۃ کے متصل اور مسلسل سند ذکر کئے ہیں۔
- جن لوگوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعینؒ، تبع تابعینؒ کے یہ فضائل ومناقب ذکر کئے ہیں یہ بھی معتبر اور معتمد لوگ ہیں، بلکہ یہی لوگ ائمہ اسلام اور مخلوق کا خلاصہ ہیں۔ دین وشریعت کے نقل درنقل میں ان ہی پر اعتبار کیا جاتا ہے' انہوں نے یہ جو باتیں بتلائی ہیں شریعت میں قطع اور یقین کا درجہ رکھتی ہیں۔ جیسے ابونعیم، ابنِ کثیر، سمعانی، ابنِ حجر المکی، ابن حجر العسقلانی، سیوطی، علی القاری، شمس الائمہ الکردری، نووی، عبدالوھاب شعرانی، شیخ الاسلام ذہبی وغیرہ یہ اِسی قبیل کے لوگ ہیں۔

کیا ان جیسے لوگ اپنی کتابوں میں کذب بیانی اور جھوٹے واقعات کے نقل کی جرأت کر سکتے ہیں؟ کیا یہ لوگ ان واقعات کو دروغ گو اور جھوٹے و مکار لوگوں سے نقل کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ نہیں بلکہ یہ لوگ نقل کے معاملہ میں نہایت ہی محتاط اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے

والے ہیں۔ان کے ذکر کردہ چیزوں پر بحث ومناقشہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی‘ اگر بیان اور توضیح کے باوجود بھی ان کے متعلق کوئی شک وشبہ رہ جاتا ہے تو ان کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال ملاحظہ کر لیجئے۔ پھر بھی ان لوگوں کے متعلق بھروسہ اور اعتماد نہیں تو پھر سارا فن اسماء الرجال کا ذخیرہ غیر معتمد ہو کر رہ جائے گا۔

○ کوئی یہ نہ کہے کہ اس جیسے مجاہدات کو عقل تسلیم ہی نہیں کرتی ،تھوڑے سے وقت میں دیگر مصروفیات کے ساتھ یہ اعمال شاقہ کیوں کر انجام پا سکتے ہیں؟ جیسے دن ورات میں آٹھ قرآن کا ختم کرنا، ایک رات میں ہزار رکعت نفل ادا کرنا وغیرہ۔

کیونکہ ان جیسی چیزوں کا گرچہ عوام سے صادر ہونا مشکل اور محال ہوسکتا ہے‘ لیکن اللہ والوں سے اس قسم کے ریاضات ومجاہدات کوئی مشکل چیز نہیں ہیں‘ چونکہ انھیں رب ذوالجلال کی جانب سے ایسی قوت ملکہ عطا ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ اِن اُمور کو بآسانی وسہولت انجام دے لیتے ہیں۔

اب تک کی یہ گفتگو عبدالحیٔ فرنگیؒ کی ہے۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ آج کے اس مادّیت وغفلت، گناہوں کے نہ تھمتے سیلاب اور نفس پرستی کے دور میں اللہ والوں کی صحبت سے دور رہ کر ان واقعات کو سمجھنا مشکل ہے۔مزید برآں جب دل میں عشق الٰہی کا چسکہ اور تعلق مع اللہ کی دولت نہ ہو، ورنہ تو یہ حقیقت ہے کہ جس کام میں لذت اور انہماک ہو یا اس عمل کے نفع کا یقین تو یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو آدمی کو گردوپیش اور دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دیتی ہیں۔ہم جیسے لوگوں کیلئے ان لوگوں کو دیکھ کر سمجھنا آسان ہوگا جو ختم ہونے والی دنیا کیلئے دن بھر یا رات کی شفٹوں میں سالہا سال ملازمتیں کرتے ہیں، جس میں نہ کھانے کا دھیان ہوتا ہے، نہ پینے کا۔اسی طرح معاشرہ میں ان جوانوں اور بوڑھوں کی بڑی تعداد مل جائے گی جو ٹی.وی دیکھنے، کمپیوٹر پر کام کرنے یا کرکٹ وغیرہ جیسے کھیلوں میں کئی گھنٹے گذار دیتے ہیں، جس میں بھوک اور دھوپ کسی چیز کا خیال نہیں ہوتا۔اب تو اخبارات میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے حوالہ آتے رہتے ہیں کہ فلاں نے ۲۵/ گھنٹے پانی میں گذارے، ۳۶/ گھنٹے گانے گائے وغیرہ وغیرہ، حالانکہ ان تمام کارناموں کا حاصل صرف چند کوڑیاں اور سستی وجھوٹی شہرت ہے ،اس کے علاوہ کچھ نہیں اور ان اللہ والوں کے دل میں (جو ہر زمانہ میں رہے ہیں) محبت خداوندی کی بھڑکتی ہوئی آگ ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں

کھانے، پینے اور دنیا کی تمام لذتوں سے بڑھ کر انہیں اللہ کا نام لینے میں مزہ آتا ہے اور پھر انہیں جنت کی لافانی اور لامتناہی نعمتوں کا ایسا استحضار اور دیدارِ الٰہی اور لقاءِ خداوندی کا ایسا جوش ہوتا ہے جس کو ایک مادّہ پرست، دین سے بیزار اور حقیقی معنی میں فکرِ آخرت سے خالی آدمی تصور نہیں کرسکتا۔

اِس قسم کے مجاہدے بدعت نہیں ہوسکتے

صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعینؒ، تبع تابعینؒ سے جو کثرتِ عبادت سے متعلق واقعات نقل کئے گئے ہیں ان پر بدعت کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا چند وجوہات کی بناء پر:

- اس وجہ سے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے بقدرِ وسعت اور طاقت اِس طرح کے مجاہدات کئے ہیں، اُنہوں نے اِس حوالہ سے ایک دوسرے پر نکیر بھی نہیں کی ہے، دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم تابعینؒ وتبع تابعینؒ میں جس چیز کا رواج رہا ہو اور ان کی جانب سے اس پر کوئی اعتراض یا انکار نہ کیا گیا ہو، وہ چیز بدعت نہیں ہوتی۔
- اس قسم کے مجاہدے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم خصوصاً بعض خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم جیسے عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بھی ثابت ہیں اور جو چیز حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغیر کسی انکار کے ثابت ہو تو وہ سنت ہوتی ہے چونکہ سنت کا اطلاق صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال پر نہیں ہوتا' بلکہ تمام یا کچھ اصحاب نبی سے صادر اعمال وافعال پر بھی ہوتا ہے' بلکہ جن اعمال وافعال کو خود تو انھوں نے انجام نہ دیا ہو' بلکہ دوسرے کے وہ افعال جن پر انھوں نے نکیر نہ کی ہو اس پر سنت کا اطلاق ہوتا ہے اس کی وضاحت ابن ہمام نے ''تحریر الاصول'' میں عینی نے ''البنایہ شرح الہدایۃ'' میں اور صاحب الکشف، عبدالعزیز بخاری وغیرہ فقہاء واصولیین نے کی ہے۔
- جن حضرات کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔ یہ تمام لوگ ائمہ مجتہدین، محققین عظام اور محدثینِ کرام میں سرفہرست لوگ ہیں، اگر اس قسم کے مجاہدات کو بدعت قرار دیا جاتا ہے تو یہ لوگ بدعتی اور گمراہ لوگوں میں شمار ہوجائیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔
- جن مورخین نے ان واقعات کو نقل کیا ہے وہ بھی نہایت ہی متقی وپرہیزگار لوگ ہیں، یہ لوگ بدعت اور دین میں نئی باتوں کے شامل کئے جانے کے سخت مخالف تھے۔ ان لوگوں نے مذکورہ بالا لوگوں کے حالات زندگی میں اس قسم کے واقعات نقل کئے ہیں اور اس قسم کے مجاہدات کو ان کے

فضائل ومناقب میں ذکر کیا ہے' اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح کے مجاہدات بدعت نہیں ہیں' کیونکہ بدعت کی تائید کوئی عالم دین کر ہی نہیں سکتا۔

○ حضورِ اکرم ﷺ نے عبادت کے معاملے میں قدرت وطاقت کے بقدرِ زیادتی کی اجازت دی ہے چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اکلّفوامن العمل ماتطیقون' فان اللّٰہ لا یملّ حتّی تملوا وان احبّ العمل الی اللّٰہ ادومہ وان قل وکان اذاعمل عملاً اثبتہ۔

بقدرِ طاقت ووسعت اعمال انجام دیا کرو، چونکہ تم تو تھک سکتے ہو، لیکن اللہ عزوجل نہیں اکتاتا، اللہ کے یہاں پسندیدہ عمل دائمی ہوتا ہے گرچہ وہ تھوڑی سی مقدار میں ہو، آپ ﷺ بھی ثبات کے ساتھ عمل کو انجام دیتے تھے۔

اِمامِ بخاریؒ نے بھی ایسی ہی روایت نقل کی ہے :

اس روایت کی روشنی میں عمل میں اس قدر اضافہ کی اجازت ملتی ہے کہ جس کی وجہ سے تھکاوٹ واکتاہٹ پیدا نہ ہو۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگوں کی طاقت اور قوت بھی مختلف ہوتی ہے' بہت سے لوگ جو کام نہیں انجام دے پاتے بعض دوسرے لوگ اسے انجام دے لیتے ہیں' بہت سے لوگ کسی کام کو انجام دیتے ہوئے اکتاہٹ کا شکار ہوجاتے ہیں' جب کہ بعض دوسرے لوگ بالکل نہیں اکتاتے۔ پڑھنے کے معاملے بعض لوگ بالکل تیز رفتار ہوتے ہیں' وہیں بعض لوگ سست رو ہوتے ہیں: چنانچہ مجدالدین شیرازی ''القاموس'' اور ''سفرالسعادۃ'' کے مصنف نے صحیح مسلم کو تین دن میں پڑھ لیا تھا، قسطلانی نے ''بخاری'' کو پانچ بیٹھک یا اس سے کچھ زیادہ میں پڑھ لیا تھا، حافظ ابوبکر خطیب نے ''صحیح بخاری'' کو تین بیٹھک میں پڑھ لیا تھا حافظ ابن حجر نے سنن ابن ماجہ' وصحیح مسلم' کتاب النسائی الکبیر' کو دس بیٹھک میں پڑھ لیا تھا ہر بیٹھک تقریباً چار گھنٹہ کی ہوتی تھی ،اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔

اصل اس معاملہ میں ذوق وشوق اور انسانی نفسیات کا خاص دخل ہوتا ہے' بعض لوگوں کے نفوس نہایت پاکیزہ اور ملکوتی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔انہیں بالکل عبادت سے اکتاہٹ نہیں ہوتی' جس کسی کو کسی چیز کی لذت اور چاشنی کا احساس ہوجاتا ہے' اس کو اس عمل کی کثرت اور زیادتی

کے باوجود اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ بے لذیذ اور غیر مرغوب چیز کو اختیار کرنے سے بہت جلد اکتاہٹ پیدا ہوجاتی ہے، چنانچہ ابن حجرؒ ذھبیؒ سیوطی ان جیسے لوگوں نے اپنی عمر عزیز کے کسی حصّے کو ضائع ہونے نہیں دیا ہے' ساری زندگی مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں گذاردی ہے' پھر بھی انہیں کبھی تھکاوٹ وسستی کا احساس نہیں ہوا، اور حضورِ اکرم ﷺ کے عمل کی کثرت وزیادتی کی ممانعت اکتاہٹ کے ساتھ مقید ہے۔ اگر کسی کو کثرتِ عبادت' تلاوت قرآن اور رات کے جاگنے میں اکتاہٹ نہ ہوتی ہو تو اس طرح کے مجاہدے منع نہیں ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ نے اس طرح کے مجاہدے اور اعمال کی کثرت اس وجہ سے نہیں کی ہے کہ آپ ﷺ اپنی اُمت پر نہایت شفیق اور مہربان تھے آپ ﷺ کی عبادت میں کثرت کیلئے یہ بات مانع ہوتی تھی کہ آپ کی اس عمل پر مداومت اور ہمیشگی کی وجہ سے وہ عمل امت کے حق میں فرض نہ قرار دیا جائے' جس کی وجہ سے امت کو دقت اور پریشانی کا سامنا ہو اسی بات کو حضرت عائشہؓ نے یوں نقل کیا ہے:

ان کان رسول الله ﷺ ليدعُ العمل وهويحب ان يعمل به خشية أن يعمل به الناس فيُفرض عليهم (١)

''حضورِ اکرم ﷺ عمل کو چھوڑ دیتے تھے حالانکہ آپ ﷺ اس عمل کو انجام دینا پسند کرتے تھے، آپ ﷺ کو یہ اندیشہ ہوتا تھا لوگ بھی اس عمل کو انجام دینے لگیں، جس کی وجہ سے وہ عمل فرض ہوجائے''۔

یہی وجہ ہے کہ آپ نے تراویح کو محض چند رات باجماعت ادا فرمایا ہے، پھر اس کے بعد ترک فرمایا، یہاں بھی آپ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذوق وشوق کو دیکھ کر اس کے فرض قرار دیئے جانے کا اندیشہ تھا۔(٢)

عبادت میں کثرت کے جواز کی شرطیں اور ممانعت والی روایات کا صحیح مفہوم

پوری رات عبادت کیلئے جاگنا، دِن ورات میں ایک مرتبہ یا کئی مرتبہ قرآن کا ختم کرنا،

---

(١) بخاری: باب تحريض النبی ﷺ، حديث: ١٠٧٦، دكتور مصطفى ديب البغا

(٢) صحيح مسلم، من نعش فی صلاته او استعجم : حديث: ٧٨٧، تحقيق محمد فؤاد عبد الباقی.

ہزار رکعت یا اس سے زیادہ کا ایک دن میں پڑھ لینا، اس قسم کے ریاضات ومجاہدات بدعت نہیں ہیں، جب یہ بدعت نہیں ہیں تو پھر شرعاً ان کو کرنا منع بھی نہیں ہے بلکہ اس طرح کے مجاہدے محبوب اور مطلوب ہیں لیکن اس کیلئے چند شرطیں ہیں جس کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

- اس طرح کی کثرتِ عبادت سے طبیعت میں ملال اور اکتاہٹ پیدا نہ ہو' چونکہ اکتاہٹ کی وجہ سے عبادت میں لذت وحلاوت' خشوع وخضوع اور حضور قلب باقی نہیں رہتا۔ اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس کو امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تشریف لائے۔ دوستونوں کے بیچ ایک رسی بندھی ہوئی دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتلایا زینبؓ نماز پڑھتی ہیں۔ جب طبیعت میں نشاط باقی نہیں رہتا' سستی پیدا ہونے لگتی ہے تو اس سے اپنے آپ کو تھام لیتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُسے کھول دو۔

۱) یصلی احدکم نشاطه' فاذا کسل أو فتر قعد (۱) ہر شخص اپنی نشاط بھر نماز پڑھتا رہے' جب طبیعت میں سستی پیدا ہو تو بیٹھ جائے۔

- اپنے آپ پر اس قدر مشقت اور پریشانی نہ لادے کہ جس کا برداشت کرنا مشکل ہو جائے' بلکہ بقدرِ وسعت وطاقت ہی عبادت انجام دے اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس کو امام مسلم نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ :

حولاء بنت تویت بن حبیب بن اسد بن عبدالعزی کا گذر ان کے پاس سے ہوا' ان کے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرماتے تھے' میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا :

۲) هذه الحولاء بنت تُويت' وزعموا انّها لاتنام الليل فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ، لاتنام الليل؟! خذوا من العمل ماتطيقون' فو الله لايسأم الله حتى تسأموا" (۲)

یہ حولاء بنت تویت ہیں، ان کے بارے میں یہ بتلایا جاتا کہ یہ ساری رات نہیں سوتیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا وہ رات بھر نہیں سوتیں؟! بقدرِ طاقت اعمال انجام دو' اللہ کی قسم انسان تھک سکتا ہے، لیکن اللہ کی ذات نہیں تھکتی۔

---

(۱) صحیح مسلم، من نعش فی صلاته او استعجم : حديث:۲۱۹، تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی.

(۲) بخاری : باب ما یکره من التشدید فی العبادة، حدیث:۱۱۰۰، مع تحقيق مصطفى ديب البغا.

○ اس طرح کی نفل عبادت میں مصروف رہنے سے اس سے اہم چیز چھوٹے نہ جائے: مثال کے طور پر شب بیداری اور رات کے جاگنے کی وجہ سے فجر کی نماز چھوٹ جائے، تو پھر اس طرح کی شب بیداری کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے امام مالکؒ نے ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہؒ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں :

انّ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فقد سليمان ابن ابى حثمة فى صلاة الصبح وان عمر غدالى السوق، ومسكن سليمان ابن ابى حثمة بين المسجد والسوق فمرّعلى الشفاء ام سليمان فقال لها: لم ار سليمان فى الصبح، فقالت: انه يصلى فعلبته عيناه فقال عمر: لان شهد صلاة الصبح فى جماعةٍ احبّ اليّ من أن اقوم ليلةً. (۱)

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سلیمان بن ابی حثمہ کو فجر کی نماز میں نہ پایا، عمر رضی اللہ عنہ بازار جارہے تھے، سلیمان کا گھر مسجد اور بازار کے درمیان پڑتا تھا، آپ کا گذر سلیمان کی والدہ ''شفا'' کے پاس سے ہوا، آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: سلیمان فجر میں دکھائی نہیں دیئے، ان کی والدہ نے کہا: انہوں نے ساری رات عبادت میں گذاردی، نیند کی شدت سے آنکھ نہیں کھل پائی، عمرؓ نے کہا: میں جماعت کے ساتھ فجر کی نماز کی ادائیگی کو رات بھر جاگنے سے بہتر سمجھتا ہوں۔

ایسے ہی جس کے رات میں جاگنے کی وجہ سے جماعت کی شرکت، جنازوں کی حاضری، علم کی نشر واشاعت تدریس وتالیف کا مشغلہ چھوٹ جاتا ہو اس کیلئے بھی رات کا جاگنا مناسب نہیں ہے۔

○ ان مجاہدوں کی وجہ سے حقوقِ شرعیہ چھوٹنے نہ پائیں مثلاً اولاد اہل وعیال اور مہمان داری کا حق اس مصروفیت کی وجہ سے ادا نہ ہو پائے، اس پر ابودرداء رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ابونعیم نے ''حلیہ'' میں ذکر کیا ہے کہ :

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے انھوں نے ان کی اہلیہ کو

(۱) مؤطا مالك، باب ما جاء فى العتمة والصبح، حديث:۲۹۴، مع تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی

پراگندہ حال دیکھا تو فرمایا: تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ انہوں نے کہا: تمہارے بھائی کو تو عورت کی خواہش ہی نہیں ہے۔ وہ دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں؛ چنانچہ وہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے :

" انّ لاهلك عليك حقا، فصل ونم، وصم وافطر، فبلغ ذلك النبى صلی اللہ علیہ وسلم فقال: لقداوتى سلمان من العلم" (۲)

تمہارے اہل وعیال کا تم پر حق ہے نماز بھی پڑھو، سو بھی جاؤ، روزہ بھی رکھو افطار بھی کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان رضی اللہ عنہ کو علوم عطا کئے گئے ہیں۔

○ یہ مجاہدے اس طور پر انجام نہ دیئے جائیں کہ اس کے بالمقابل رخصت شرعیہ کو بالکل بیکار اور باطل سمجھا جائے، اور جوان رخصتوں پر عمل کرتا ہو اُسے بالکل نکما اور ناکارہ خیال کر رہے ہوں، اس طرح کے تصور کے غلط ہونے پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں تین صحابہ رضی اللہ عنہم کا ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی عبادت کے متعلق دریافت کرنا اور آپ کے عبادت کو کمتر سمجھ کر آپ کی اس معمول کے بارے میں یہ تاویل کرنا منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بخشے بخشائے ہیں اور اپنے آپ کو مختلف عبادتوں میں مکمل مصروف رکھنے کا ارادہ کرنے کا ذکر ہے؛ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا تھا: میں مکمل رات ہمیشہ اپنے آپ کو عبادت میں مصروف رکھوں گا' دوسرے نے کہا تھا' میں ہمیشہ روزہ رہوں گا بالکل افطار نہیں کروں گا' تیسرے نے کہا تھا' میں عورت سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤں گا کبھی بھی نکاح نہ کروں گا، اسی دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگوں نے ایسے ایسے کہا تھا:

اما والله انى لأخشاكم لله واتقاكم به لكنّى اصوم وافطر، واصلّى وارقد، اتزوّج النساء' فمن رغب عن سنّتى فليس منّى (۲)

اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ کا خوف کرنے والا اور متقی و پرہیزگار ہو' لیکن میں روزہ بھی رہتا ہوں' افطار بھی کرتا ہوں' نماز بھی پڑھتا ہوں' سوتا بھی ہوں نکاح بھی کرتا ہوں جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، باب فی صوم شوال، حدیث:۲۱۹، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، مطبوعۃ دارا

(۲) بخاری : باب الترغیب فی النکاح، حدیث:۴۷۷۶، مع تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغا.

- ان مجاہدات کی وجہ سے غیرضروری چیزوں کا التزام لازم نہ آتا ہو اور شریعت کی حلال کردہ چیزوں کو حرام نہ قرار دیا جا رہا ہو' اس پر عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی روایت دلالت کرتی ہے جسے ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں اور ابن جریر نے ابو مالک نے اللہ عزوجل کے اس ارشاد: یَـــا اَیُّھَـا الَّـذِیْـنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبَاتِ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ ''اے ایمان والو! پاکیزہ اور حلال چیزوں کو حرام نہ کرو'' کے شان نزول کے تحت ذکر کیا ہے کہ یہ آیت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی تھی ان لوگوں نے اپنے اوپر بہت سے لذیذ چیزوں اور عورتوں کو حرام کرلیا تھا' ان میں سے بعض حضرات نے تو اپنے عضوِتناسل کو تک کاٹنے کا ارادہ کرلیا تھا' بعض دوسری روایات میں ان کے گوشت نہ کھانے' بستر پر نہ سونے کے ارادہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔
- ان عبادتوں میں فرائض وارکان کی مکمل ادائیگی کا اہتمام ہو، ایسا نہیں کہ رکعتوں کی زیادتی کے چکر میں محض کوے کی طرح ٹھونگ مارے' یا زیادہ سے زیادہ تلاوتِ قرآن کے چکر میں مخارج کی ادائیگی اور تدبر و تفکر کا حق ادا نہ کرے۔
- عبادت پر مداوت اور ہمیشگی اختیار کرے' بغیر کسی عذر کے ترک نہ کرے' چونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''احب الأعمال الی اللّٰہ ادومھا وان قل''(۱) اللہ کے یہاں سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جو دوام واستمرار کے ساتھ کیا جائے گرچہ وہ عمل تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔
- اِس مجاہدہ کی وجہ سے کسی دوسرے مسلمان کو اکتاہٹ نہ ہو' بایں طور کہ باجماعت نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنے لگ جائے یا پورا قرآن ہی ختم کرے، یہ فعل نمازیوں کی اکتاہٹ کا باعث ہوگا۔ چونکہ نمازیوں میں ضعیف' کمزور' بیمار ضرورت مند ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس پر بخاری مسلم کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں: اذا صلّی احدکم للناس فلیخفف فان فیھم الضعیف والسقیم والکبیر، واذا صلی فلُیطوّل ماشاء (۲) اگر تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرے تو ہلکی نماز پڑھائے' چونکہ بعض مقتدی کمزور' بیمار' بوڑھے بھی ہوتے ہیں' تنہا نماز پڑھے تو اس کیلئے اختیار ہے جس قدر چاہے طویل کرے۔

---

(۱) بخاری، باب الجلوس علی الحصیر ونحوہ، حدیث:۵۵۲۳، مع تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغا.

(۲) بخاری : باب تخفیف الامام فی القیام واتمام الرکوع والسجود، حدیث:۶۷۰

○ اپنے ان مجاہدوں اور کثرتِ عبادت کی وجہ سے یہ نہ گمان کرنے لگ جائے کہ حضور اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے بھی اس کا اپنا عمل بڑھا ہوا ہے چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ "فمن رغب عن سنتی فلیس منی" کا مطلب بیان کرتے ہیں کہ اس کا مصداق وہ شخص ہے جو مثلاً فعل (نکاح) کے سنت ہونے کا عقیدہ ہی نہ رکھے اور اسے ہلکا اور خفیف سمجھ کر ترک کردے، بہرحال جو آدمی نکاح کو (مصارفِ نکاح نہ ہونے کی وجہ سے یا عبادت کیلئے فراغت چاہنے کے عذر سے) مذکورہ طریقہ پر چھوڑ دے جس میں اس کو چھوڑنا مستحب ہے یا بستر پر اس لئے نہ سوئے کہ اُسے سلیقہ ہی نہیں یا وہ ایسی عبادت میں مشغول رہتا ہے جس کی اجازت ہے یا اس جیسے اور اعذار ہیں یہ مذمت اور نہی اسے شامل نہیں۔

علامہ عینیؒ پورے واضح الفاظ میں فرماتے ہیں اور اگر اس نے آنحضرت ﷺ کی سنت سے اعراض کرتے ہوئے اُسے چھوڑا تو وہ مذموم اور بدعتی ہے اور اگر اس لئے چھوڑا کہ ترک اس کیلئے زیادہ موافق ومناسب ہے اور عبادت میں زیادہ معاون ہے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ جو شخص ان تمام شرطوں کی پابندی کرسکتا ہو، تو وہ اس طرح کے مجاہدے کرنے کا اہل ہے، سلف صالحین جن سے عبادت میں ریاضت اور مجاہدے کا جو ذکر ملتا ہے وہ ان تمام شرطوں کے جامع تھے اور جو شخص ان شرطوں کا پاس ولحاظ نہ کرسکتا ہو وہ اعمال میں میانہ روی ہی اختیار کرے۔(۱)

☒☒☒

(۱) شرح مسلم: ۳۶۵/۱، ۴۴۹/۱، بحواله الکلام المفید فی اثبات التقلید :۲۶۲

مسئلہ توسل کی حقیقت

مسئلۂ توسل کی حقیقت سب سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام ،اولیاءؒ اور صلحاءؒ کے وسیلے سے دُعا کرنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اے اللہ! میرے گمان کے مطابق اس بندے کے اعمال میرے نزدیک قابلِ قبول ہیں آپ کے اس مقدس بندے کے اعمال کے طفیل میری دُعا کو قبول فرما، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نبی یا ولی کی دُہائی دے کر قبول کرنے کیلئے اللہ عزّ وجل پر جبر کیا جارہا ہو اور نہ یہ عقیدہ ہے کہ فلانے نبی یا ولی کا نام قبولیتِ دُعا کیلئے لینا ضروری ہے یا ان کا نام لینے سے دُعا لازماً وحتماً قبول ہو کر ہی رہے گی۔

ذیل کی تحریر میں مدلل طریقہ سے اسی جائز وسیلہ لینے کی حقیقت کے اقسام کی شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے اور ناجائز وسیلہ پکڑنے کی انواع کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

مسئلہ توسل کی حقیقت

دُعا کا مسنون طریقہ جو متعدد احادیث سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ دُعا کرنے والا پہلے پہلی اللہ عزوجل کی خوب حمد وثنا بیان کرے، اس کے بعد درود شریف پڑھے، پھر اس کے بعد نہایت ہی اخلاص، بے حد عاجزی اور تضرع کے ساتھ اللہ عزوجل سے اپنی حاجت برآوری کا مطالبہ کرے ، دل میں جس قدر سوز وگداز ہوگا یہ اس قدر دعا کے مؤثر ہونے کا سبب ہوگا، غفلت اور لاپرواہی کے ساتھ کی جانے والی دعا غیر مؤثر ہوتی ہے اور پھر آخر میں درود شریف پڑھ کر ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے، اس بارے میں اہلِ اسلام میں کوئی اختلاف نہیں ہے؛ ہاں البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا دعا میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نہیں؟ مثلاً اے پروردگار تو بوسیلہ آنحضرت ﷺ ، یا بطفیل حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ یا بابرکت حضرتِ امام ابوحنیفہؒ، یا بحرمت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ، یا بجاہ مجدد الف ثانیؒ میرا یہ کام کردے؟ اس قسم کا کوئی مفہوم اپنی زبان ولغت اور عرف کے اعتبار سے ادا کرے تو یہ درست ہے یا نہیں؟ جمہور امت اس طرح کے وسیلہ کو جائز قرار دیتے ہیں، صرف حافظ ابن تیمیہؒ اور ان کے اِتباع اس کا انکار کرتے ہیں اور اس مسئلہ کے سب سے پہلے منکر حافظ ابن تیمیہؒ ہی ہیں۔

چنانچہ علامہ سبکیؒ اس مسئلہ میں حافظ ابن تیمیہؒ کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

حسبك ان انكار ابن تيميةؒ للإستغاثة والتوسل قول لم يقله عالم قبله او صاربه بين اهل الإسلام مثله .(۱)

تیرے تعجب کیلئے یہ بات کافی ہے کہ ابن تیمیہؒ کا طفیل اور توسل سے انکار کا قول ایسا ہے کہ ان سے پہلے یہ بات کسی عالم نے نہیں کہی۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفیؒ نے بھی سبکیؒ کے حوالہ سے توسل کے جواز پر اجماع اور حافظ ابن تیمیہؒ کے شذوذ (تنہا ہونے) کا ذکر کیا ہے۔(۲)

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں :

وقد شنع التاج السبكى كما هو عادته على المجد وقال :

(۱) شفاء السقام : ۱۲۰ (۲) شامی : ۳۵۰/۵

ویحسن التوسل والاستغاثه بالنبی ﷺ ربه ، ولم ینکر ذلك أحد عن السلف والخلف حتیٰ جاء إبن تیمیهؒ وقال مالم یقله عالم وصار بین الأنام مثله.(۱)

علامہ سبکیؒ نے اپنی عادت کے مطابق ابن تیمیہؒ کی شناعت اور برائی بیان کی ہے اور کہا ہے: کہ آنحضرت ﷺ کے توسل اور طفیل سے دعا، اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحسن امر ہے،اورسلف وخلف میں اس کا کسی نے انکار نہیں کیا ہے؛ یہاں تک کہ ابن تیمیہؒ آئے ، انہوں نے اس کا انکار کیا اور سیدھی راہ سے تجاوز کیا اور بدعت کی ایسی بات ایجاد کی جو کسی عالم نے نہ کہی اور لوگوں میں بدنام ہوگئے۔

ان عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام ہی ائمہ جمہور سلف وخلف توسل کے جواز کے قائل ہیں،صرف حافظ ابن تیمیہؒ اوران کے تلامذہ نے اس سے انحراف کیا ہے۔

توسل کی شرعی حیثیت اوراس کا مقام

توسل کے بارے میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ توسل اختیار کئے بغیر دُعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو سنتا ہی نہیں ہے اور نہ یہ عقیدہ ہو کہ وسیلہ کے ساتھ دُعا کی جائے اس کو اللہ تعالیٰ لازماً (بالکل) قبول ہی کرتے ہیں۔صرف اتنا سمجھنا چاہئے کہ مقبول بندوں کے وسیلہ وطفیل کے ساتھ جو دُعا کی جائیگی اس کی قبولیت کی اُمید زیادہ ہے۔اسی مسئلہ کو فقہاء کرام یوں بیان کرتے ہیں :

ویکره ان یقول في دعائه بحقّ فلانٍ اوبحق انبیائك ورسلك لأنّه لاحق للمخلوق علی الخالق

دُعا میں یہ کہنا "بحق فلان وبحق انبیائك ورسلك" مجھے فلاں چیز عطا فرما یہ مکروہ ہے کیونکہ مخلوق کا کوئی حق خالق کے ذمہ نہیں ہے۔

اس جیسی عبارات کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ عقیدہ رکھ کر توسل اختیار کرتے ہوئے دُعا کی جائے کہ یہ دُعا ضرور قبول ہوگی تو یہ توسل جائز نہیں اور ایسا عقیدہ رکھے بغیر بھی ارجاء للقبول (قبولیت کے زیادہ قریب) سمجھے تو جائز بلکہ بہتر ہے، بایں طور کہ محبت واطاعت ایمان واتباع نبوی ﷺ کے وسیلہ سے دُعا کرے۔

---

(۱) روح المعانی : ۱۲۶/۴

حافظ ابن تیمیہؒ توسل کے مطلقاً منکر نہیں ہیں

وہ توسل کی چند صورتوں کو درست سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ ایک جگہ توسل کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

أسئلك بنبيك محمد ﷺ،اى اسالك بإيمانى به وبمحبته (۱)

میں تجھ سے تیرے نبی حضرت محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں' کا معنی یہ ہے کہ چونکہ میرا آپ ﷺ پر ایمان ہے اور آپ ﷺ سے محبت ہے اس لئے اِس کی وجہ سے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں :

لو سأل اللّٰه بإيمانه بمحمّد ﷺ له وطاعته له، واتباعه له لكان قد سأله بسبٍ عظيم يقتضى اجابة الدُّعا، بل هذا اعظم الأسباب والوسائل.

اگر کوئی اپنے حضور ﷺ کے ساتھ ایمان' اطاعت وپیروی کے واسطے اللہ سے سوال کرے تو اس نے ایک بہت بڑے ذریعے سے سوال کیا جو قبولیتِ دُعا کے زیادہ قریب ہے، بلکہ یہ تو دُعا کی قبولیت کا سب سے بڑا ذریعہ اور سبب ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

فأتوسّل إلى اللّٰه بالنبيّين هو التوسل بالإيمان لهم وبطاعتهم كالصلوٰة والسلام عليهم ومحبتهم وموالاتهم أو بدعاءٍ لهم أو شفاعتهم، وأما النفس ذواتهم فليس فيها ما يقتضى حصول مطلوب العبد، وإن كان لهم عند اللّٰه تعالى الجاه العظيم (۲)

اللہ تعالیٰ کے ہاں حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے توسل کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کرنے کی وجہ سے توسیلہ لینا ہے جیسے ان پر صلوٰۃ وسلام کہنے اور ان سے محبت کرنے یا ان کی دُعا اور ان کی شفاعت کی وجہ سے وسیلہ کیا جائے، وجہ توسل ہے باقی ان کی شخصیتیں تو ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو بندے

(۱) القاعدة الجليلة : ۳۸ (۲) فتاویٰ ابنِ تیمیةؒ : ۱۳۳/۲۷

کے مطلب کو پورا کرے اگر چہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بڑا درجہ ہے۔

گویا ان کے نزدیک یہ توسل' بصالح الاعمال عمال (نیک اعمال سے وسیلہ لینے) اور اس کے ثبوت کیلئے بخاری (۱) کی روایت ہے جس میں تین آدمی غار میں چلے گئے تھے اور بارش کی وجہ سے ایک چٹان نے غار کا منہ بند کر دیا تھا تو انہوں نے اپنے اعمال کے توسل سے اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا کی جو قبول ہوگئی، چٹان غار کے منہ سے ہٹ گئی اور وہ صحیح سالم باہر نکل آئے۔

اعمال یا اشخاص سے وسیلہ لینے میں کوئی فرق نہیں ہے

ہمارے نزدیک توسل بالذات (بابرکت اور نیک ہستیوں سے وسیلہ لینا) اور توسل بالاعمال (خود مقدس اور صالح شخصیات سے وسیلہ لینے) میں صرف نزاع لفظی ہے، کیونکہ جو حضرات توسل بالذات کے قائل ہیں ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ مثلاً جنابِ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو (العیاذ باللہ تعالیٰ) وصفِ نبوت و رسالت اور ان کی دینی خدمات سے جو آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں انجام دی ہیں الگ کر کے توسل کیا جائے، یا معاذ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ سے محبت کرنے کی شرط سے صرف نظر کر لی جائے یہ کسی کے وہم میں نہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیگر مقبول بندوں کو ان کی مذہبی سرگرمیوں اور خلقِ خدا کی ہدایت کی کوششوں سے جدا کر کے محض ان کی ذات ہی کو ملحوظ رکھا جائے ایسا نہیں؛ بلکہ جہاں بھی ان حضرات سے توسل (وسیلہ لینا) ہوگا وہاں ان کی تمام خوبیوں اور کمالات کو پیش نظر رکھا جائے گا اور ان نیک کاموں کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی جو خصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں ان کو کسی صورت میں فراموش نہ کیا جائے گا، ذکر گرچہ ذات کا ہوتا ہے؛ اس لئے کہ وہ موصوف ہے؛ لیکن اس کے اعمال' کمالات اور صفات کو بھی اس میں دخل ہے اور اسی وجہ سے توسل کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ محبت ان کی عظیم قربانیوں کی وجہ سے ہے، جو حسب ارشاد جنابِ رسول اللہ ﷺ "أفضل الأعمال الحب لله والبغض لله" (۲)

ہر دُعا کرنے والے کا اپنا نیک اور صالح عمل ہے اور اسی طرح اعمالِ صالحہ آخر کسی ذات ہی سے صادر ہوں گے، از خود تو ان کا صدور نہیں ہوسکتا تو توسل بصالح الاعمال ذات کے واسطے کے

---

(۱) بخاری: باب حدیث الغار، حدیث: ۲۴۶۵، مع تحقیق زھیر بن ناصر

(۲) سنن ابی داؤد: باب مجانبة اهل الأهواء وبغضهم، حدیث: ۴۶۰۱ مطبوعة بیروت.

بغیر سمجھ سے باہر ہے؛ اس لئے ہمارے نزدیک توسل بالذات اور توسل بصالح الاعمال (انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے) بالآخر ایک ہی ہیں۔ صرف اس کی تعبیر اور تشریح میں فرق ہے، جب حافظ ابن تیمیہؒ توسل بصالح اعمال کے قائل ہیں تو توسل بالذات کا بھی ان کو اقرار کر لینا چاہیے، ان کے ذہن میں یہ جو وہم ہے کہ ذات کے توسل سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) اس ذات کے رتبہ شان اور درجہ خدا تعالیٰ سے بڑھا ہوا ہے اس پر کوئی جبر اور زور ہے (العیاذ باللہ) یہ کسی مسلمان کے وہم میں بھی نہیں آتا، ان کے الفاظ یہ ہیں :

لأنّ فيهما ايهام أن المتوجّه المستغاث به اعلىٰ من المتوجه عليه والمستغاث عليه. (۱)

ان الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ جس کے جاہ اور وسیلے سے سوال کیا گیا ہے اس کا درجہ اس سے اعلیٰ ہے جس کے یہاں التجا کی گئی ہے۔

چنانچہ امام تقی الدین سبکیؒ نے ان کے اس وہم اور نظریہ کا اس طرح رد کیا ہے کہ :

فالتَوَسُّل والتشفُّع والتوجُّه والإستغاثة بالنبّى صلى الله عليه وسلم وسائر الانبياء والصالحين ليس لها معنى فى قلوب المسلمين غير ذلك ولا تقصد بها أحد منهم سواه فمن لم ينشرح صدره لذلك فليبك على نفسه۔(۲)

آنحضرت ﷺ اور اسی طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور نیک لوگوں کے وسیلہ، سفارش جاہ اور طفیل سے دُعا کرانے کا معنی مسلمانوں کے دلوں میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ (ان پر ایمان لانا اور ان سے محبت کرنا نیکی ہے) اور کوئی مسلمان اس معنی کے علاوہ اور کچھ اس ارادہ سے توسل نہیں کیا کرتا مگر جس کا سینہ اس کے فہم کیلئے نہ کھلے تو اس کو اپنے نفس پر رونا چاہیے۔

الغرض نہ تو اس توسل سے یہ بات وہم میں آتی ہے کہ معاذ اللہ اولیاء کا درجہ اور شان خدا تعالیٰ سے بڑھ کر ہے اور نہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے جبراً اس کو منوا سکتے ہیں، کہاں خالق؟ کہاں مخلوق؟

---

(۱) شفاء السقام : ۱۲۶ (۲) شفاء السقام : ۱۲۹

اس توسل سے ہرگز وہ توسل مراد نہیں ہے جو ابن تیمیہؒ سمجھتے ہیں کہ کسی مردہ اور غائب سے مراد مانگی جائے، شیخ کو مستقل بالتاثیر سمجھا جائے، اس قسم کا توسل یقیناً باطل اور مردود ہے، کسی مومن اور مسلمان کے تصور میں یہ معنی نہیں ہوتا، یہ بھی انہیں معانی کو ملحوظ رکھتا ہے جو خود حافظ ابن تیمیہؒ جس کے قائل ہیں۔ از بس توسل کی حقیقت یہ ہوتی ہے۔ توسل اختیار کرنے والا گویا یہ کہتا ہے کہ یا اللہ میں اپنے حسن ظن کے اعتبار سے آپ کے دربارِ عالی میں فلاں بزرگ کو مقبول سمجھتا ہوں اور مقبولین سے محبت رکھنا افضل اعمال میں سے ہے، میرا تو کوئی عمل ایسا نہیں جسے تیری بارگاہ میں پیش کروں، البتہ آپ کا فلاں بندہ آپ کی خصوصی رحمت کا مورد ہے، موردِ رحمت سے محبت رکھنا جالبِ رحمت ہوتا ہے (رحمت کو کھینچنے والا) اس محبت اور وسیلہ کے تعلق سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دُعا قبول فرمائیے۔ اسی مضمون کو مختصر کر کے دُعا کرنے والے یوں کہتے ہیں کہ یا اللہ فلاں بزرگ کے وسیلہ سے دُعا قبول فرمائیے۔ (علامہ تیمیہؒ اس قسم کے وسیلہ کے منکر نہیں ہیں) اس قسم کے توسل میں عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ تواضع وعبدیت کی شان اس میں زیادہ ٹپکتی ہے کہ آدمی کی نظر بجائے اپنے اعمالِ صالحہ کے مقبولانِ الٰہی کی محبت کو وسیلہ بنانے پر ہوتی ہے توسل کی یہ صورت صحیح ہے اور جمہورِ امت سے منقول بلکہ معمول میں داخل رہی ہے۔

مسئلہ توسل اور جمہور علماء کرام

جمہور اہلِ سنت والجماعت توسل کے جواز کے قائل ہیں؛ لیکن اس میں تفصیل سے کام لیتے ہیں، توسل کی بعض صورتوں کو حرام اور بعض کو جائز قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ علامہ آلوسیؒ مسئلہ توسل پر خاصی بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وبعد هذا كله إنّا لا نرى بأسا في التوسل إلى الله تعالىٰ بجاه النبي ﷺ عند اللّٰه حيّا وميّتا ويُراد بجاهه معنى يرجع إلى صفةٍ من صفاته مثلاً أن يراد المحبّة التامة المستدعية عدم رده وقبول شفاعته فيكون معنى قول الهي التوسل بجاه نبيك ﷺ أن تقضي لي حاجتي ولا فرق بين هذا وبين قولك الهي اتوسّل برحمتك أن تفعل كذا، إذ معناه أيضاً الهي اجعل

رحمتك وسيلة. (۱)

اس ساری بحث کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں آنحضرت ﷺ کی جاہ سے آپ کی زندگی میں اور بعد از وفات توسل میں کوئی حرج نہیں سمجھتا اور آپ ﷺ کی جاہ و توسل سے مراد کوئی ایسا معنی لیا جائے گا، جو آپ ﷺ کی صفات میں سے کسی صفت کی طرف راجع ہو، مثلاً آپ ﷺ کی محبت تامہ جو عدم رد اور قبول شفاعت کو چاہتی ہے؛ لہٰذا قائل کے اس طرح کہنے کا کہ اے اللہ! میں تیرے نبی ﷺ کی جاہ سے توسل کرتا ہوں کہ تو میری حاجت پوری کر دے، یہ معنی ہوگا کہ اے میرے اللہ تیری جو محبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے اس کو میری حاجت پورا کرنے کا وسیلہ بنا دے اور اس میں تیرے اس قول میں کوئی فرق نہیں کہ اے میرے اللہ میں تیری رحمت سے توسل کرتا ہوں کہ تو ایسا کر دے؛ کیونکہ اس کا بھی یہی معنی ہے کہ اے اللہ تو اپنی رحمت کو اس میں وسیلہ بنا دے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ علامہ آلوسیؒ آنحضرت ﷺ کی زندگی اور بعد از وفات دونوں حالتوں میں آپ کی جاہ سے توسل کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، پھر آگے یوں لکھتے ہیں:

إن التوسل بجاه غير النبي ﷺ لا بأس به ايضاً إن كان المتوسل بجاهه ممّا علم أن له جاها عند الله تعالىٰ كا لمقطوع بصلاحه وولايته۔(۲)

کہ آپ ﷺ کے علاوہ اوروں کی جاہ و برکت سے توسل میں بھی کوئی حرج نہیں ہے؛ جبکہ یہ معلوم ہو کہ جس کی جاہ سے توسل کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی جاہ ہے، جیسے وہ شخصیت کہ یقینی طور پر اس کی صلاح و ولایت معلوم ہو۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے علاوہ بھی ان کی زندگی اور بعدِ موت کے توسل دُرست ہے؛ جبکہ ان کی نیکی و تقویٰ اور ولایت یقینی طور پر معلوم ہو۔

توسل کے یہ معنی نہیں کہ اس بزرگ سے مرادیں مانگی جائیں، یا اس کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا و تصور کیا جائے؛ جیسا کہ بعض جاہل عوام کا خیال ہے؛ چنانچہ علامہ آلوسیؒ واشگاف الفاظ

(۱-۲) روح المعانی: ۱۲۸/۶

میں ''یاسیدی أغثنی'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

ولا أرى أحدًا ممّن يقول ذلك إلا وهو يعتقد أنّ المدعو الحى الغائب او الميت المغيب يعلم الغيب أو يسمع النداء ويقدر بالذات أو بالغير على جلب الخير ودفع الأذى وإلّا لما دعاه.(١)

کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اے میرے سردار میری مدد کر وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندہ غائب یا مردہ غائب کو پکارا جاتا ہے وہ غیب جانتا ہے یا پکار سنتا ہے اور بالذات یا بالغیر جلبِ نفع اور دفع مضرت پر قادر ہے ورنہ وہ کیوں اس کو پکارتا ہے۔

توسل کے کچھ دلائل

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں توسل کے جائز ہونے کے بعض دلائل کا بھی تذکرہ کر دیا جائے تاکہ اذعان ویقین کی کیفیت میں مزید اضافہ ہو۔

بعض حضرات نے قرآن کریم کی بعض آیات سے بھی جوازِ توسل پر استدلال کیا ہے، مثلاً:

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا.

''وہ یہود پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر''۔

چنانچہ علامہ سید محمد آلوسیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

نزلت فى بنو قريظة والنضير كانوايستفتحون على الأوس والخزرج برسول الله قبل مبعثه قاله ابن عباس وقتاده.أللهمّ إنّا نسألك بحق نبيك الذى وعدتناأن تبعثه فى آخرالزمان ان تنصرنا اليوم عليه عدونا، فينصرن.(٢)

یہ آیتِ کریمہ بنوقریظہ اور بنونضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اوس وخزرج کے خلاف آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ کے وسیلہ سے فتح طلب کیا کرتے تھے؛ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور ان

(١) روح المعانى : ١٢٨/٦ (٢) روح المعانى : ٣٢٠/١

الفاظ میں دعا کرتے تھے: اے اللہ ہم تجھ سے تیرے اس رسول ﷺ کے حق اور وسیلہ سے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ تو اس کو آخری زمانے میں بھیجے گا، سوال کرتے ہیں کہ آج کے دن تو ہمیں ہمارے دشمن پر غلبہ عطا فرما، پس ان کی مدد کی جاتی۔

حافظ ابن قیمؒ اسی آیت کریمہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

إنّ اليهود يحاربون جيرانهم من العرب فى الجاهليّة ويستنصرون عليهم بالنّبىّ ﷺ قبل ظهوره ، فيفتح لهم وينصرون عليهم فلما أظهر النبى ﷺ كفروا وجحدوا بنبوته (۱)

بے شک یہود جاہلیت میں اپنے عربی پڑوسیوں سے لڑتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی آمد سے پہلے وہ آپ ﷺ کے طفیل سے دشمن کے خلاف مدد طلب کرتے تھے، تو ان کو فتح ونصرت حاصل ہوتی تھی، پھر جب آپ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے کفر اختیار کیا اور آپ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا۔

توسل کی مختلف صورتیں

التوسل بالدعا (کسی برگزیدہ ہستی سے دُعا کرانا)

استشفاع (سفارش کرانا)

یعنی کسی بزرگ اور زندہ ہستی کو اللہ تعالیٰ کے یہاں بطورِ وسیلہ پیش کیا جائے؛ بایں طور کہ اس سے دعا کی التجا کی جائے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بدست دُعا (اللہ کے حضور دُعا کرے) ہو اور حاضرین مجلس بھی اس کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر خالق کائنات کے ہاں عاجزی اور زاری کریں اور دل کی تہہ سے فریاد رسی کریں۔

علامہ آلوسی حنفیؒ لکھتے ہیں:

الاستشفاع وهو أن يطلب من الشخص الدعاء والشفاعة ويطلب من اللّٰه تعالىٰ أنّ يتقبّل دعائه ويؤيد ذلك أن العباس كان يدعو وهم يؤمّنون لدعائه حتى سقوا۔(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع : ۱۴۵/۴ (۲) روح المعانی : ۱۲۷/۲

استشفاع کا یہ مطلب ہے کہ کسی شخص سے دُعا اور سفارش کرائی جائے اور اللہ تعالیٰ سے یہ طلب کرے کہ وہ اس کی دُعا کو قبول فرمائے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ دُعا کرتے تھے اور لوگ اُن کی دعا پر آمین کہتے تھے حتیٰ کہ اُن پر بارش برسائی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی عہدِ مبارک میں ایک دفعہ خشک سالی ہوئی اور کافی عرصہ تک بارش نہ ہوئی؛ جس کی وجہ سے لوگ خاصے پریشان ہوئے، اسی اثناء میں :

أتى أعرابىّ من أهل البدو إلى رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يوم الجمعة فقال : يا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ! هلكت الماشية هلك العيال هلك الناس فرفع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يديه و يدعو ورفع الناس أيديهم مع رسول الله يدعون (۱)

ایک دیہاتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جمعہ کے دن حاضر ہوا، اس نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مویشی ہلاک ہوگئے، گھر والے فاقہ کشی پر مجبور ہوگئے، لوگوں پر ہلاکت کا خوف طاری ہوگیا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک اُٹھائے اور دُعاء کی اور لوگوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھائے اور دُعا کی۔

اِس آنے والے دیہاتی کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر اور مقبول الدعاء ہیں، دُعا فرمائیں تاکہ بارش ہو اسی روایت میں آتا ہے کہ دُعا کا نتیجہ فوراً ظاہر ہوا اور خوب بارش ہوئی۔(۲)

خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (المتوفی : ۲۴ھ) دور میں بھی ایسی ہی خشک سالی کی تکلیف پیش آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو توسل کے طور پر پیش کیا اور یوں ارشاد فرمایا:

أللّهم إنّا كنّا نتوسّل إليك بنبيّنا صلی اللہ علیہ وسلم فستقينا و إنّا نتوسّل اليك بعمّ نبيّنا فاسقنا ،قال:فسيقون.(۳)

---

(۱) بخاری: باب رفع الناس ایدیھم مع الامام فی الاستسقاء، حدیث: ۹۸۳

(۲) طحطحاوی شریف : ۱۹۰/۱

(۳) بخاری: باب سؤال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا، حدیث: ۹۶۴

اے اللہ بیشک ہم تیرے سامنے اپنے نبی ﷺ کو بطور توسل پیش کیا کرتے تھے اور تو ہم پر بارش نازل کیا کرتا تھا اب ہم تیرے سامنے اپنے نبی ﷺ کے چچا کو بطور وسیلہ پیش کرتے ہیں، سوتو ہم پر بارش نازل فرما تو ان پر بارش برسائی گئی۔

ایسے مواقع پر جس قدر اہلِ خیر وصلاح کو آگے کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے؛ چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے چچا تھے اور اس کے ساتھ ایمان اور آپ کی صحبت کے فیض سے مالا مال تھے؛ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دعا کیلئے آگے کیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی یہ دُعا درحقیقت آنحضرت ﷺ کی برکت اور آپ ﷺ کے تعلق کی وجہ سے قبول ہوئی؛ چنانچہ علامہ تاج الدین سبکیؒ لکھتے ہیں:

فهذه دعوة مستجابة ببركة نبيّنا محمّدٍ ﷺ (۱)

پس یہ دعا ہمارے پیغمبر ﷺ کی برکت ہی سے قبول ہوئی اور ان کی دُعا کے الفاظ بھی علامہ سبکیؒ نے نقل کر دئے ہیں۔

اس روایت سے مزید ایک مضمون یہ ثابت ہوا کہ غیر نبی کے ساتھ بھی توسل درست ہے جو کہ دراصل حسی (رشتہ داری) یا معنوی (دینداری) کے طور پر آپ سے تعلق اور قرابت ہی کی وجہ سے توسل ہوتا ہے۔

توسل فعلی

گذشتہ ذکر کردہ توسل بالدعا سے قریب قریب توسل فعلی ہے (یعنی کسی زندہ کو آگے کر دینا؛ تا کہ یہ دعا کرتا رہے اور قوم دعا میں اس کا ساتھ دے۔) اسی کو علامہ کشمیریؒ یوں فرماتے ہیں :

اللّٰهم إنا نتوسل إليك بنبينا ﷺ ليس فيه التوسل المعهود الذى يكون بالغائب حتى قد لايكون به شعور أصلا ؛ بل فيه توسل السلف وهو أن يقدم رجلاذو وجاهة عند اللّٰه تعالىٰ ويأمره أن يدعو لهم ثم يحيل عليه فى دعائه كما فعل بعباس رضی اللہ عنہ النبى ﷺ، ولو كان فيه توسل المتأخرين لما احتاجوا

(۱) طبقات السبکی : ۶۹/۲،طبع مصر.

بإذهاب عباس رضی اللہ عنہ معهم ويكفي لهم التوسل بنبيهم بعد وفاته أيضاً أو بالعباس عند عدم شهوده معهم.(۱)

کہ اس قول سے وہ معہود (مشہور و معروف توسل مراد نہیں جو غائب سے کیا جاتا ہے؛ یہاں تک کہ اس کو اس کا بالکل شعور بھی نہ ہو بلکہ اس حدیث میں سلف کے توسل کا ذکر ہے وہ یہ کہ کسی ایسے شخص کو آگے کیا جائے جس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں درجہ ہو اور اس سے التجاء کی جائے کہ وہ ان کیلئے دعا کرے، پھر دعا اسی کے سپرد کی جائے؛ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ سے کیا گیا اور اگر اس سے متاخرین کا توسل مراد ہوتا (کہ دعا کرنے والے کسی بزرگ کا نام بطورِ توسل پیش کر کے دُعا مانگے) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے جانے کی ان کو حاجت نہ پڑتی اور ان کیلئے یہ کافی تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا توسل کرتے یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ان کی غیر حاضری میں توسل کر لیتے۔

حضراتِ متقدمین کے اس توسل میں دُعا کرنے والا امام کی حیثیت سے ہوتا ہے اور اس کی دعا پر آمین کہنے والے مقتدی کے درجے میں ہوتے ہیں؛ چنانچہ علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ۱۴۸/۳ میں یہی بات کہی ہے۔

توسلِ قولی یعنی توسل بالذوات

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مذکورہ بالا تحریر کے بارے میں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ توسل بالذات (یعنی کسی بزرگ اور فاضل ہستی کی ذاتِ گرامی کو ان کے تمام اوصافِ جمیلہ وحمیدہ کے ساتھ دعا میں بطورِ توسل پیش کرے) کا جواز نہیں ہے؛ بلکہ وہ اپنی اس عبارت سے توسلِ فعلی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک بھی مسلم ہے، ہاں البتہ توسل بالذات بھی جائز ہے؛ چنانچہ ایک دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:

قلت وهذا توسل فعلي؛ لأنه كان يقول له بعد ذلك قم يا عباس واستسق فكان يستسقي لهم فلم يثبت منه التوسل القولي، الإستسقاء بأسماء الصالحين فقط بدون شركتهم

(۱) فيض الباري: ۳۷۹/۲

أقول وعند الترمذی أن النبی ﷺ علم أعرابیا هذه الکلمات وکان أعمٰی اللّٰهم انی أتوجه إلیك بنبیك محمد نبی الرحمة الی ان قال فشفّعه فیَّ فثبت منه التوسل القولی أیضاً وحینئذ انکار الحافظ ابن تیمیة تطاول.(۱)

میں کہتا ہوں: یہ توسل فعلی ہے؛ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کھڑے ہوں اور بارش طلب کریں تو انہوں نے لوگوں کیلئے بارش طلب کی تو اس سے توسل قولی ثابت نہیں ہوتا، یعنی نیک لوگوں کی شرکت کے بغیر محض ان کے ناموں کی برکت سے بارش طلب کرنا، میں کہتا ہوں: کہ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک اعرابی کو جو نابینا تھے ان کلمات کی تعلیم دی۔''اے اللہ میں تیرے سامنے تیرے نبی محمد ﷺ کے وسیلہ سے جو نبی رحمت ہیں میں التجاء کرتا ہوں، پھر آگے فرمایا: اے اللہ تو ان کی سفارش میرے حق میں قبول فرما۔اس سے توسل قولی کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔اس وقت حافظ ابن تیمیہؒ کا اس کا انکار زیادتی ہے۔

مذکورہ بالا روایت کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمود بن غیلان نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں: ہم سے عثمان بن عمرؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں: ہم سے شعبیؒ نے بیان کیا اور وہ ابو جعفر سے روایت کرتے ہیں اور وہ عمارہ ابن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے، وہ فرماتے ہیں:

أن رجلاً ضریر البصر أتی النبی ﷺ فقال أدع اللّٰه أن یعافینی، فقال إن شئت صبرت فهو خیر لك ، قال فادعه قال فأمره أن یتوضّأ فیحسن وضوئه ویدعو بهذه الدعاء: أللّٰهمّ إنّی أسئلك وأتوجّه إلیك بنبیّك محمّد نبیّ الرحمة إنّی توجّهت بك إلٰی ربّی فی حاجتی هذه تقضی فشفّعه فیّ۔(۲)

---

(۱) فیض الباری : ۶۸/۴

(۲) ترمذی : ۱۹۷/۲، واللفظ له وقال حسن صحیح غریب ومسند احمد : ۳۱۳/۱ ابنِ ماجه، باب ماجاء فی صلوة الحاجة، حدیث: ۱۳۸۵، مع تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی، مستدرك الحاکم، کتاب صلوة التطوع، حدیث: ۱۱۸۰، مع تحقیق مصطفی عبد القادر عطا

ایک نابینا شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: حضرت! آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے صحت یاب (اور بینا) کردے، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ اچھی طرح وضو کرے اور یہ دعا کرے۔ ''اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی حضرت محمد ﷺ کو جو نبیٔ رحمت ہیں کے وسیلہ سے توجہ کرتا ہوں، میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں بطورِ وسیلہ پیش کرتا ہوں کہ میری یہ حاجت پوری ہوجائے، اے اللہ! تو ان کی شفاعت کو میرے حق میں قبول فرما۔

امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ اس روایت کو ایک مقام پر بخاری اور مسلم دونوں کی شرط پر صحیح فرماتے ہیں (۱) اور دوسرے مقام پر بخاری کی شرط پر صحیح کہتے ہیں۔ (۲)

حافظ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں:

رواه اهل السنن وصححه الترمذی (۳)

اہلِ سنن نے یہ حدیث روایت کی ہے اور امام ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ جس طرح اعمالِ صالحہ سے توسل دُرست ہے اسی طرح دوسرے سے دُعا کی درخواست کرنا بھی دُرست ہے، نیز اسی طرح مقبول بندہ کی ذات کا توسل بھی بلاشبہ جائز ہے۔

بعد وفات کے بھی توسل دُرست ہے۔

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں توسل آپ ﷺ کی حیات کا توسل تھا، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضرتِ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں یہی دعا ایک شخص کو بتلائی تھی اور اس نے دعا کی تھی اور اس کا کام بن گیا تھا؛ چنانچہ امام طبرانیؒ فرماتے ہیں: ہم سے طاہر بن عیسیٰ بن قیرس المصری المقری نے بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ہم سے اصبغ بن الفرج نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے عبداللہ بن وہبؒ نے بیان کیا، وہ ابوسعید مکی سے، وہ روح بن القاسم سے اور وہ ابوجعفر الخطمی المدنیؒ سے اور وہ ابوامامہ بن سہل بن حنیفؒ سے اور وہ اپنے چچا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

---

(۱) مستدرک: ۱/۳۱۳ مع التلخیص (۲) مستدرک: ۱/۵۲۶

(۳) فتاویٰ ابنِ تیمیہؒ: ۱/۳۷۴

أنّ رجلاً كان يختلف إلى عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ في حاجة له فكان عثمان رضی اللہ عنہ لا يلتفت إليه ولا ينظر في حاجته فلقي عثمان ابن حنيف فشكى ذلك اليه فقال له عثمان بن حنيف رضی اللہ عنہ ايت الميضاة ثم ايت المسجد فصل فيه ركعتين ثم قل أللهم إني أسألك وأتوجه إليك بنبيك محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبي الرحمة.(۱)

ایک شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس ضروری کام کے سلسلے میں آیا جایا کرتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غالباً مصروفیت کی وجہ سے نہ تو اس کی طرف توجہ فرماتے اور نہ اس کی حاجت براری کرتے، وہ شخص حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے ملا اور اس کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا: وضو کی جگہ جا اور وضو کر، پھر مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ، پھر کہہ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور بوسیلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں جو نبی الرحمہ ہیں۔

اِسی روایت کے آخر میں اس کی تصریح ہے کہ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور اس دعا کی برکت کی وجہ سے حضرتِ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کی تعظیم وتکریم بھی کی اور اس کا کام بھی پورا کر دیا۔

امام طبرانیؒ فرماتے ہیں :

والحديث صحيح (۲)

اِمام منذریؒ بھی اس روایت کو نقل کر کے امام طبرانیؒ کے اس قول ''والحدیث صحیح'' کی تائید کرتے ہیں۔(۳)

امام بیہقیؒ نے بھی یہ روایت دو سندوں کے ساتھ روایت کی ہے، پھر آگے سند بیان کی ہے۔ (۴)

امام سبکیؒ فرماتے ہیں: اس روایت سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا توسل دُرست ہے۔(۵)

---

(۱) معجم الصغير : ۱۰۴، شفاء السقام : ۱۲۴-۱۲۵، وفاء الوفاء : ۴۲۰/۲-۴۲۱،السنن الكبرىٰ للنسائي : ۱۶۹/۱، رواه البيهقي في دلائل النبوة : ۱۶۶/۲، كنز الاعمال: ۷۹/۲

(۲) معجم الصغير : ۱۰۴ (۳) الترغيب والترهيب : ۲۴۲/۱

(۴) شفاء السقام : ۱۲۵ (۵) شفاء السقام : ۱۲۴

الغرض جمہور جس توسل کے قائل ہیں وہ دلائل کی رو سے بزرگوں سے ان کی زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی جائز اور صحیح ہے۔

ضروری تنبیہ

حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنانے سے بعض لوگوں نے توسل کو زندہ بزرگوں کے ساتھ خاص کیا ہے، یہ لوگ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کی وجہ سے مردوں سے توسل کی اجازت نہیں دیتے حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ یہ روایت وفات پانے والے بزرگوں کے ساتھ توسل کے اختیار کرنے کے بارے میں خاموش (ساکت) ہے۔ اس کے بالمقابل عثمان بن حنیف کی روایت بعد از وفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل کی تلقین کرتی ہے۔ پس یہ روایت ناطق اور بخاری کی روایت ساکت ہے اور ناطق کو ساکت پر ترجیح ہوتی ہے۔

بخاری شریف کی حدیثِ بالا سے استدلال کرتے ہوئے جو حضرات توسل کو زندوں کے ساتھ جائز اور وفات پانے والے بزرگ سے شرک قرار دیتے ہیں، ان سے عرض یہ ہے کہ اگر تمہارے مقابل کوئی شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی اس حدیث شریف کو سامنے رکھتے ہوئے مزید تخصیص کا قائل ہو جائے اور دعویٰ کرے کہ صرف حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ سے توسل جائز ہے۔ ان کے علاوہ کسی زندہ بزرگ سے جائز نہیں۔ تیسرا شخص کھڑا ہو کر اور تخصیص پیدا کر دے کہ صرف مدینہ طیبہ میں توسل اختیار کرنا جائز ہے۔ دیگر مقامات پر ہرگز جائز نہیں، بلکہ کفر ہے، پانچواں شخص ایک اور قید بڑھا دے کہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توسل اختیار کرنا جائز تھا کسی اور کو ہرگز جائز نہیں اور یہ سب لوگ حدیث بخاری سے استدلال کریں تو جو جواب ان سب تخصیصات (بلا دلیل) کا دیا جائے وہی جواب ہماری طرف سے عدمِ تخصیص بالاحیاء (زندوں) کا بھی سمجھ لیں۔

کسی شخص کو یہ عامیانہ اشکال ہو سکتا ہے کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ سے توسل کو کیوں اختیار فرمایا تھا؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ بعد وفات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل کو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے ناجائز سمجھ کر نہیں کیا ایسا ہرگز نہیں بلکہ اس کی چند وجوہات تھیں۔

- حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ سے توسل کے ساتھ ان سے دعاء کرانا بھی مقصود ہو، یعنی جس

طرح نبی کریم ﷺ کے دنیا میں تشریف فرما ہونے کے عہدِ مبارک میں توسل کے ساتھ دُعاء کراتے تھے وہی صورت اب اختیار کرتے ہیں۔

- اس پر تنبیہ مقصود ہو کہ غیر انبیاء یعنی صلحاء اور اولیاء سے بھی توسل دُرست ہے۔
- اپنے عمل سے بتانا چاہتے ہیں کہ توسل بالذات کی دو صورتیں ہیں : ایک: توسل بذاتہ دوسرے :توسل بقرابتہ (رشتہ داری، تعلق)۔
- حدیثِ شریف میں ہے کہ جب دور سے صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے تو فرشتے قبرِ اطہر میں پہنچاتے ہیں اور فرشتوں کے پہنچانے میں امانت میں کوتاہی ،غفلت ونسیان کا بالکل خطرہ نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود انسانی وسائط کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ قبرِ اطہر پر ہمارا سلام پہنچائیں کیونکہ فطرتِ انسانی ہے کہ مبصّر (دیکھی جانے والی چیز) وموجود شخص پر دل کو اطمینان بعض حالات میں زیادہ ہوتا ہے، ممکن ہے اسی امر طبعی کی رعایت میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا توسل اختیار کیا ہو۔

☒☒☒
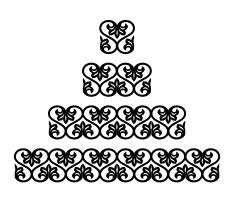
تصوّف کیا ہے؟

فضائلِ اعمال میں صوفیاءِ شرع اصطلاحاتِ تصوف، وسائل تصوف، ابنِ عربی وغیرہ کا جابجا ذکر آیا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک تصوف کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اصطلاحات ووسائل کی کیا حیثیت ہے؟ اور جاہل صوفیاء کا مسخ کردہ وہ تصوف وطریقت جو شریعت سے آزاد ہو، اس سے ہمارا اور مصنفِ فضائلِ اعمال کا کوئی تعلق نہیں، ان اہم اور ضروری امور پر باحوالہ گفتگو کی گئی ہے۔

تصوّف کیا ہے؟

تصوّف،حقیقت،اہمیت وضرورت

رسولِ اکرم ﷺ جس دینِ حق اور جس طور وطریقے کی دعوت دینے کیلئے مبعوث ہوئے تھے،اس کا کامل ومکمل ترین نمونہ خود آپ ﷺ کی ذات اقدس تھی،خود آپ کی ذات گویا دین اسلام کی جیتی جاگتی وہ چلتی پھرتی مکمل ومجسم تصویر تھی جس کو اپنا کر اللہ کی رضا وخوشنودی، رحمت ورأفت کا مستحق ہو یا سکتا تھا۔

آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ مندرجہ ذیل تین شعبے نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱- ایمان

ایمان یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، وحی ورسالت۔ قیامت۔ حشر ونشر اور جنت ودوزخ،جیسی غیبی حقیقتوں کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ نے جو خبریں دی ہیں اور جو کچھ بتلایا ہے،اس کو حق ماننا اور دل سے اس کی تصدیق کرنا یہ دین حق کا سب سے اہم شعبہ ہے اور پورے دین کی اساس وبنیاد ہے اور یہی شعبہ ہمارے علم عقائد کا موضوع ہے۔

۲-اعمالِ صالحہ

اعمالِ صالحہ یہاں اس سے ہماری مراد دین کا وہ تمام تر عملی حصہ ہے جو جوارح یعنی ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتا ہے،جس میں اسلامی عبادات اور دعوت وجہاد اور معاملات وآداب،معاشرت وغیرہ داخل ہیں یہ شعبہ گویا دین کا پورا قالب ہے اور یہی اسلام کا عملی نظام ہے اور ہمارے علمِ فقہ کا تعلق اسی شعبہ سے ہے۔

۳- روحانی وقلبی صفات وکیفیات اور تزکیہ اخلاق

جن لوگوں کی کتاب وسنت پر کچھ نظر ہے، وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہوسکتے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح ایمانیات واعتقادات،عبادات اور آداب معاشرت ومعاملات کے

ابواب میں اپنی تعلیم وہدایت اور عملی نمونہ سے امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔اس طرح آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت، یقین وتوکل، احسان واخلاص جیسی روحانی وقلبی صفات وکیفیات اورتزکیۂ اخلاق کے متعلق بھی اہم ہدایات دی ہیں اوران کا نہایت اعلیٰ اورمثالی نمونہ اُمت کیلئے چھوڑا ہے، الغرض ایمان اوراعمالِ صالحہ کی طرح یہ بھی دین کا مستقل اوراہم شعبہ ہے اوریہی تصوف وسلوک کا خاص موضوع ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی تالیف تفہیماتِ الٰہیہ میں اس مذکورہ بالا شعبہ جات کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے :

ومعظم مادعت إلى اقامته الرسل أمور ثلثه: تصحيح العقائد فى المبدأ والمعاد والمجازاة وغيرها. وتصحيح العمل فى الطاعات المقربة والارتفاقات الضرورية على وفق السنة، وتصحيح الاخلاص والاحسان الذين هم اصلا الدينى الحنيفى ارتضاه الله بعباده.

جس چیز کے قیام واہتمام کی اللہ کے رسول ﷺ نے دعوت دی ہے وہ بنیادی طور پر تین اُمور ہیں: (۱) عقائد کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق مبدأ سے ہو یا معاد سے یا قبر جزاوسزا وغیرہ سے۔ (۲) اعمال کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو، یا زندگی کے مسائل ومعاملات سے۔(۳) اخلاص واحسان کی تصحیح کہ یہ دونوں چیزیں دین حنیف کی اصل بنیاد ہیں وہ دین حنیف جس کواللہ نے اپنے بندوں کیلئے منتخب اور پسندفرمایا ہے۔

پھراس کی اہمیت وافادیت کوذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والذى نفسى بيده هذا الثالث أدقُّ المقاصد الشرعية مأخذًا وأعمقها محتدًا بالنسبة الى سائرالشرائع وبمنزلة الروح من الجسد و بمنزلة المعنى من اللفظ وتكفّل لها الصوفيه رضوان اللّٰه عليهم اجمعين، فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوىٰ وحازوالسهم الأعلى. (۱۳/۱)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ تیسرا اَمْر مقاصد شرعیہ میں

سے سب سے دقیق اور سب سے گہرا ہے، بہ نسبت دوسرے احکام کے، یہ ایسا ہے جیسے بدن کیلئے روح اور لفظ کیلئے معانی، اس اہم مقصد کا تکفل حضراتِ صوفیہ نے کیا، پس وہ خود راہ یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی راہ پر لگایا خود سیراب ہوئے اور دوسروں کو بھی سیراب کیا اور انتہائی سعادت سے سرفراز اور مقصد اعلیٰ کے اوپر فائز المرام (مقصد کو پالینا) ہوئے۔

ایک جگہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے تصوف کی حقیقت یوں بیان کی ہے :

''وہ ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سے نفوس کا تزکیہ اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کے احوال پہچانے جاتے ہیں، جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے غرض جس تصوف کے ہم قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے، یا تعمیر الظاہر والباطن (ظاہر و باطن کی دُرستگی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے''۔(۱)

ایک مرتبہ حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ نے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ سے دریافت کیا کہ ''یہ تصوف کیا بلا ہے؟''، انہوں نے یہ جواب دیا کہ

''تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء ''انّما الاعمال بالنیات '' سے ہوتی ہے اور انتہا ''ان تعبد اللّٰہ کأنك تراہ'' پر ہے اس کو یادداشت حضوری اور نسبت کہتے ہیں، میں نے کہا: مولانا سارے پاپڑ اِسی کیلئے بیلے جاتے ہیں، اسی لئے ذکر و شغل ہوتا ہے، اسی کیلئے مجاھدے اور مراقبے ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا: جس کو اللہ جل شانہ اپنے لطف و کرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطا کر دے اس کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے، اس کے بعد اکابر اور حکماء امت نے قلبی امراض کے کثرت کی بنا پر مختلف علاج تجویز فرمائے جیسا کہ اطباء بدنی امراض کے علاج کیلئے مختلف نسخے تجویز کرتے ہیں''(۲)

حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ تصوف کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اِحسان و تصوف یہ دین کا ایک اہم شعبہ اور اس کا تکمیلی مرحلہ ہے، یہ وہ ہے جسے

(۱) اکابر کا سلوک واحسان : ۲۳ (۲) اکابر کا سلوک واحسان : ۳۱

حدیث نبوی میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے ہمارے عرف میں تصوف بھی کہا جاتا ہے، جس کی حقیقت مختصر الفاظ میں یوں بیان کی جاسکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بندہ کے قلب کو ایسا یقین واطمینان نصیب ہوجائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدہ سے ہوجایا کرتا ہے جس کے بعد کسی وہم اور وسوسے کی گنجائش نہیں رہتی، پھر جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہوجائے کہ جس کی وجہ سے دل ہمہ دم اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت سے معمور رہے''۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا اقتباسات میں تصوّف کی جو حقیقت اور اس کی تعریف اور مصداق کو بیان کیا گیا ہے یہ تو عین مطلوب شریعت ہے اور یہی کمالِ دین وایمان ہے، یہ دولت جس کو جس قدر نصیب ہوجائے کم ہے' غرض جس تصوف کے ہم قائل ہیں یہ وہی ہے جسے آیات واحادیث میں تزکیہ واحسان سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسے حضور ﷺ کے مقاصد بعثت اور ایمان کے تکمیلی شعبوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

تصوّف وسلوک یا تزکیہ واحسان کا ثبوت قرآن وحدیث سے

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوچکی کہ تصوّف اور اس کے اعمال واشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات وملکات کی تحصیل ہے جن کو کتاب وسنت میں کمالِ ایمان واسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا، قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کیلئے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے مثلاً محبت کے بارے میں ارشادِ باری ہے :

- الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۱) اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔

حدیثِ صحیح میں ہے :

- ''ثلٰث من کن فیه وجد حلاوة الایمان'' (۲)

یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں ان میں سے اول یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو اور دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی

---

(۱) سورۂ بقرہ : ۱۶۵ (۲) بخاری ، باب حلاوة الایمان، حدیث :۶۵۴۲

سے اس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ کے واسطے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اس کیلئے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔

○ سورۃ الانفال میں ہے:اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ.(۱) سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے نور ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

○ اور سورہ مؤمنون میں اچھے اور کامیاب بندوں کے اوصاف میں یہ بھی آیا ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ (۲) اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک اعمال کرتے وقت) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں لوٹ جانا ہے۔

○ اور سورۃ الزمر میں قرآن مجید کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۳) اس سے ان لوگوں کے بدن کانپنے لگتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور پھر ان کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔

○ اور سورۃ آل عمران میں ہے:اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (۴) وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو (ہر وقت اور ہر حالت میں) یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔

○ اور سورۃ مزمل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا گیا: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (۵) اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہو کر، اسی کی طرف متوجہ ہو۔

مذکورہ قرآنی آیات میں اہل ایمان کیلئے جن کیفیات و اوصاف کا ہونا لازمی اور ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) انفال: ۲ (۲) مؤمنون : ۶۰ (۳) زمر : ۲۳
(۴) آل عمران : ۱۹۱ (۵) مزمل : ۸

- ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت ہو۔
- ان کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف ولرزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔
- ان کے سامنے جب آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جائے تو ان کے نورِ ایمان میں اضافہ ہو۔
- اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔
- وہ ہر دم خوف سے ہیبت زدہ ہوں۔
- اللہ کا خوف ان پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی ان کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابلِ قبول ہوگی یا نہیں۔
- قرآن مجید کی تلاوت یا اس کی آیتیں سننے سے ان کے جسم کانپ جاتے ہوں اور ان کا ظاہر وباطن اللہ کی طرف اور اس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔
- وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔
- ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

احادیث میں تصوّف واحسان کا ذکر

قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال وکیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :

- مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وأبغض لِلّٰہِ وَأَعْطٰی لِلّٰہِ وَ مَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانْ (۱) جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کیلئے محبت کرے، (جس سے محبت رکھے) اور اللہ ہی کیلئے بغض رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کیلئے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا ہی کیلئے ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔

(۱) ابوداؤد: باب الدلیل علی زیادة الایمان، حدیث : ۴۶۸۳

○ اِسی طرح حدیث مشہور حدیث جبرئیل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے :

أن تعبد اللّٰه كأنّك تراه فان لم تكن تراه فإنه يراك (بخاری مسلم) وفی رواية أن تخشى الله مكان ان تعبد الله (۱)

''احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرو (یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو) گویا تم اسکو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر چہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو پر وہ تم کو (ہر جگہ ہر آن) دیکھتا ہے''۔

پہلی حدیث میں ''اخلاص'' کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں ''احسان'' کا اور یہ دونوں ان ہی احوال و کیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دُعاؤں میں تصوّف واحسان کا ذکر

دین میں ان احوال و کیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حصول اور ان میں ترقی کیلئے دعائیں فرماتے تھے۔ چند دُعائیں بھی نقل کئے دیتے ہیں :

○ اللهم اجعل حبّك احب الّي من نفسى واهلى ومن الماء البارد (۲)
اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا ملوں۔

○ اللّٰهم انّى اسئلك ايماناً يباشر قلبى ويقينًا صادقًا حتّى اعلم أنه لا يصيبنى الّا ما كتبتَ لى ورضًا من المعيشة بما قسّمت لى .(۳) اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئے گی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے دل کا حال بن جائے) اور اس دنیا میں

(۱) بخاری : باب سؤال جبريل النبى عن الايمان والاحسان وعلم الساعة، حديث: ۴۶۸۳
(۲) كنز العمّال : الفصل السادس، فى جوامع الادعية، حديث: ۳۷۱۸
(۳) كنز العمّال : الفصل السادس، فى جوامع الادعية، حديث: ۳۶۵۷

جس قسم کا گذارہ تو نے میرے لئے مقدر کر دیا ہے میں اس پر اپنے دل سے تیری رضا تجھ سے چاہتا ہوں۔

○ اللّٰھمّ اجعل وساوس قلبی خشیتك وذکرك واجعل همّتی وھوای فیما تُحبّ وترضی. اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت انہی چیزوں کی طرف ہو جو مجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔

یہ سب دعائیں اور اس قسم کی اور بے شمار دعائیں کتبِ حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں خود آپ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم وتلقین بھی فرماتے تھے۔

اِن دُعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ کا خوف، اللہ سے شوق ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات وخواہشات فراموش یا فنا ہو جائیں۔ عبادت میں آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال وجبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقین صادق، رضا بالقضاء، توکل علی اللہ، حسن ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا اور اس کی عطا پر قانع ہونا، ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا، اس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا، اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ کی یاد اور اس کا خوف، وساوس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے اور بندہ کا جی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں، اس قسم کی کیفیات کا مطالبہ حضور ﷺ نے اللہ عزوجل سے کیا ہے، ظاہر ہے ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے' نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

پس تصوف دراصل اسی قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس کے خاص اعمال واشغال (مثلاً صحبتِ شیخ اور کثرتِ ذکر وفکر) کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں۔

وسائل اور مقاصد کا فرق

تصوف کی حقیقت اور اس کی اہمیت کو سمجھنے میں جو چیز سب سے بڑی حائل اور رکاوٹ بنی ہے وہ وسائل اور مقاصد کے درمیان فرق کو نہ سمجھنا ہے۔ اس غلطی فہمی کا سبب جہاں وسائل اور مقاصد کی جداگانہ حیثیت اور مقام کو ملحوظ نہ رکھنا ہوا ہے وہیں کچھ جاہل اور کوتاہ بین صوفیاء نے جو دراصل اپنی اس تصوف کی دکان سے اپنی شہرت وعزت اور حلقہ احباب وارادت کے اضافہ کے خواہاں تھے بجائے مقاصد پر توجہ دینے کے وسائل کو اپنا مقصود اور مطمح نظر بنانے کی وجہ سے بھی تصوف کی حقیقت اور اہمیت پردۂ خفاء میں چلی گئی ہے اور اس کے تعلق سے بدگمانیاں اور غلط تصورات پیدا ہوگئے ہیں اس لئے ہم پہلے وسائل اور مقاصد کی حیثیت اور ان کا اپنا مقام بیان کرتے ہیں، جو لوگ تصوف کو کتاب وسنت کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس وقت یہ بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسری جگہوں پر یہ بات انہیں اچھی طرح یاد ہوتی ہے کہ شریعت نے ان چیزوں کو جو بطور مقصود اور مطلوب کے ہیں خود اسے اس نے متعین اور مشکل کردیا ہے، البتہ ان مقاصد کے حصول کے ذرائع اور وسائل میں وسعت اور کشادگی کا راستہ اپنایا ہے، گرچہ بعض مواقع سے تو شریعت نے مقصد کے ساتھ حصول کا طریقہ بھی متعین کیا ہے جس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں، لیکن یہ شاذ ونادر ہی ہوا ہے، جسے طہارت کیلئے پانی یا بوقت ضرورت مٹی کا استعمال یا نماز کے اعلان کیلئے اذان پکارنا کہ یہ ذرائع ہیں، لیکن چونکہ حصولِ مقصد کیلئے شریعت نے انہیں ذرائع کو متعین کردیا ہے، اس لئے وضو کیلئے آدمی بجائے پانی کے کوئی اور سیال چیز استعمال کرے تو اس سے طہارت حاصل نہ ہوگی، اسی طرح نماز کی اطلاع کیلئے بجائے اذان کے اور کسی ذریعہ سے کام لیا جائے تو درست نہ ہوگا۔

لیکن زیادہ تر مواقع پر شریعت نے حصولِ مقصود کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ہے، زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اس کے طریقۂ کار کے تعین کا اختیار اصحاب معاملہ کو دیا ہے، البتہ یہ حدود متعین کردیئے کہ یہ ذرائع جواز کے درجے میں آتے ہوں خواہ وہ طریقہ عہد نبوت میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اس طریقے کو کتاب وسنت سے خارج نہیں کہا جاسکتا، مثلاً تحصیل علم مقاصد شرعیہ میں سے

ایک عظیم مقصد ہے، لیکن اس کیلئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ منضبط نہیں کیا، آدمی کوئی بھی جائز طریقہ اختیار کرے جس سے علم حاصل ہوجائے درست ہے آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اورصحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اس کیلئے صرف صحبت کافی ہوجاتی تھی، تعلیم کیلئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا نہ مدارس تھے۔ نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہوگئے کہ صحبت اس مقصد کیلئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی ضرورت درپیش ہوگئی اوراس کے بعد سے دین کے تعلّم اور تعلیم کا یہ سلسلہ چل پڑا، کیا حصولِ علم کے اس طریقۂ کار اور نظامِ عمل کو دین میں اضافہ یابدعت قرار دیا جاسکتا ہے؟ نہیں، کیونکہ یہ چیزیں وسائل کے قبیل سے ہیں اور وسائل میں شریعت نے توسع سے کام لیا ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اوراشاعت امت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا کہ فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتی کہ جب عہدِ صدیقی میں یمامہ کی جنگ میں چارسوحفاظِ قرآن صحابہ شہید ہوگئے تو سب سے پہلے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا انتظام کرنا چاہئے۔ حضرتِ ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کو اوّلاً تامل ہوا بالآخر وہ مطمئن ہوگئے اور پھر انہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا، پھر حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں ایک اور قدم اٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اوراپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کرواکر تمام بلادِ اسلامیہ میں روانہ کیں اوراس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت واشاعت، تعلیم وتبلیغ اور ترجمہ وتفسیر کے سلسلے میں خدمت قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اٹھائے جاچکے ہیں۔ پھر آئندہ صدیوں میں حدیث کے جمع وتدوین کا کام، مجتہدین کا استنباط احکام اور جزئیات فقہ کی تفریع، علم نحو وقرأت یہ تمام چیزیں مقصود کے حصول کیلئے وسائل کے درجے میں ہیں۔ پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو، اس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح وتعین بھی کتاب وسنت میں ہونی ہی چاہئے اور امت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعین کے ساتھ کتاب وسنت میں ملنی چاہئے، بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاءؑ کے طریق تعلیم اور اُصولِ تشریع سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تصوف کی جو غرض وغایت بیان کی ہے (یعنی اللہ کی محبت وخشیت اوریقین واستحضار اور اخلاص واحسان ان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) سو اس کی دین میں اہمیت

ہے اور یقیناً ایمان واسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس کی تعلیم دی ہے۔ کتاب وسنت کے جو نصوص اس حوالہ سے پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت کیلئے کافی سے زائد ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے شریعت نے کچھ قواعد اور کچھ دستور اور طریقے متعین کئے ہیں، ان کو نہ تو بدلا جاسکتا ہے اور نہ انہیں ترک کیا جاسکتا ہے، یہ ذرائع قرب ورضا کے اعتبار سے تو ذرائع ہیں، ورنہ وہ بذات خود مقصود اور عبادت ہیں، مثلاً: نماز، روزہ، حج، ارکان، تلاوت کے اور ذکر وغیرہ۔

لیکن ان مقاصد کے حصول اور ان کے مذکورہ بالا وسائل کو عمل میں لانے کی راہ میں بہت سے موانع اور رکاوٹیں آتی ہیں۔ ان موانع اور رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے کچھ تدبیروں اور معالجات کی ضرورت پڑتی ہے۔ شریعت نے ان معالجات اور تدبیروں کو خاص شکل میں متعین نہیں کیا ہے، انہیں تدبیروں اور معالجات کو اُصولِ صوفیہ میں ''مجاہدات وریاضات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ مجاہدات نہ عبادت ہوتے ہیں اور نہ مقصود، اگر کسی شخص کو بغیر ریاضات کے مقصود حاصل ہو جائے تو ان کی کوئی ضرورت نہیں، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو آنحضرت ﷺ کی فیضِ صحبت اور کیمیاء اثر رفاقت کی وجہ سے ان اصطلاحی مجاہدات کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کیلئے نماز، روزہ، ذکر وتلاوت کافی تھے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا نفوس اور طبائع میں دنیاداری اور غفلت کا غلبہ ہوتا گیا۔ اب نماز، روزہ، تلاوت، اذکار وغیرہ سب موجود ہیں؛ لیکن خشوع وخضوع یقین واستحضار کی کیفیات نہیں رہیں جو کہ اس دین کی تکمیلی شعبہ جات سے تعلق رکھتے ہیں، جو قربِ خداوندی کا موثر ذریعہ ہیں۔

چنانچہ مولانا شاہ اسماعیل شہید تصوف کے ان وسائل (ذکر وشغل مراقبہ ومجاہدات) کے مقام اور ان کی شرعی حیثیت کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا ومعالجہ کی ہے کہ بوقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو۔(۱)

معالجہ کے یہ طریقے حالات کے اعتبار سے بدلتے ہیں اس حوالے سے ''صراطِ مستقیم'' میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

---

(۱) ایضاح الحق الصریح: ۷۸

ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں' اس لئے ہر طریق کے محققین تجدید اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔(۱)

اس لئے محققین یہ فرماتے ہیں کہ :

یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجزان اشغال کے اور کسی طریقے سے حاصل نہیں ہوتی۔ (القول الجمیل) بلکہ اگر کوئی ان طریق واوضاع اور اعمال واشغال کو مقصد جانتا ہے تو یہ حضرات اس پر نکیر کرتے ہیں۔

چنانچہ شاہ اسماعیل شہیدؒ فرماتے ہیں:

وظائف واذکار' ریاضات، خلوت، چلہ کو مقرر کرنا، ذکر جہری اور ذکر خفی کی وضعوں کو مقرر کرنا، ضرب عدد اور مراقبہ برزخیہ کا مقرر کرنا، اگر طالب وسالک ان سب کو اصل کمالِ شرعی یا مکمّلات میں سے جانتا ہے تو یہ سب بدعت حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف وسائل وذرائع جان کر رواج دیتے ہیں، ان کے حق میں بدعت حکمیہ ہیں اور اخص الخواص جو ان چیزوں سے بہ وقت ضرورت کام لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھڑا دیتے ہیں ان کے حق میں یہ بدعت نہیں ہیں۔(۲)

محققین صوفیاء ان اشغال واعمال سے کس طرح کام لیتے ہیں اور پھر کس طرح ان سے الگ کر کے اصل مقصود میں لگا دیتے ہیں اس کو جاننے کیلئے حضرت گنگوہیؒ مکاتیبِ رشیدیہ میں فرماتے ہیں:

جب سب اذکار ومراقبات تحصیل نسبت کے واسطے ہیں، جب نسبت یادداشت حاصل ہو چکی اب مراقبات کی درخواست عجیب بات ہے۔اب تمہارا ذکر لسانی، قرآن وصلوٰۃ ذکر مسنون مراقبہ ہے، سب میں یادداشت ہے کہ ثمرۂ مراقبات یہی ہے، اب کسی مراقبہ کی حاجت نہیں اذکارِ مسنونہ پڑھو، قرآن ونوافل صلوۃ مسنونہ ادا کرو اور بس۔(۳)

تصوّف کے مقصد اور اس کے اعمال واشغال کی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عرض ہے کہ اگر کوئی خوش نصیب ایسا ہے کہ اس کو کسی ریاضت ومجاہدہ کے بغیر اخلاص واحسان کا مرتبہ

---

(۱) صراطِ مستقیم : ۷

(۲) ایضاح الحق الصریح : ۳۷ (۳) مکاتبِ رشیدیہ : ۲۱

حاصل ہو گیا ہے تو وہ بہت ہی مبارک ہے، ورنہ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے نفع ہوتا ہے اسی کو وہ دوسروں کو بتلاتا ہے۔ اہل اللہ کی بڑی جماعت (جن کے صدق وصفا پر سب کو اتفاق ہے) خبر دیتی ہے کہ ذکر وفکر کی راہ سے ان کو اخلاص ویقین کی دولت حاصل ہوئی، لہٰذا اگر کسی کو ان کیفیات مطلوبہ کی ضرورت اور تلاش ہے تو وہ اس راہ کو اختیار کرے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ راہ بحث ونظر کی نہیں بلکہ جد وجہد وعمل کی ہے۔

تصوّف کے مقصد یعنی اخلاص ویقین کے حصول کیلئے ان وسائل (ذکر وشغل مراقبہ) کے موثر ومفید ہونے کا ثبوت اور ذکر کتاب وسنت میں نہ صرف اشارۃً بلکہ صراحتاً ملتا ہے (جس کیلئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طریقت وشریعت ملاحظہ ہو)۔

بالفرض اگر کتاب وسنت میں اس کا کوئی اشارہ نہ بھی ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سوسالہ تاریخ میں اللہ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ کر رہے ہیں کہ ان اعمالِ صالحہ سے کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت ہمیں مان لینا چاہئے کہ اس وقت سے لے کر اب تک خدا کے کثیر التعداد مخلص بندوں نے اس طریقہ کو اختیار کیا اور اس کی دعوت دی، خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ زمانی اور مکانی اختلاف کے باوجود صادقین ومخلصین کا یہ گروہ اس اعلیٰ باطنی اور روحانی کمالات کے حصول کے اس ذریعہ کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ اگر کسی مسئلہ کے سلسلہ میں عوام الناس کی اس قدر بڑی تعداد بھی اکٹھا ہو کر اس کی حمایت کرتی تو اس قدر بڑی تعداد کے جھوٹ پر متفق نہ ہونے کا خیال کر کے بات مان لی جاتی۔ یہاں پر صوفیاءِ کرام کے اس طریقہ (جس کا نام تصوف وسلوک ہے) یہ اصولاً صحیح اور نتیجۃً کامیاب ہے اور اس سے باتفاق نور یقین اور رابطہ مع اللہ یعنی احسانی کیفیت حاصل ہوتی ہے' اس پر مشاہیر اولیاءِ اُمت مثلاً خواجہ معروف کرخیؒ، بشر حافیؒ، سری سقطیؒ، شقیق بلخیؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، ابوبکر شبلیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ احمد رفاعیؒ، ابوالحسن شاذلیؒ، خواجہ عثمان ہارونیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ پھر ہمارے اس دوسرے ہزارہ کی گذشتہ چار صدیوں میں خواجہ باقی باللہؒ، اِمامِ ربانی مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے خلفاء اور شاہ ولی اللہ محدّثِ دہلویؒ اور سید احمد شہیدؒ اُن جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد نے جن میں سے ایک ایک اپنے عہد کا گل سرسبدٗ مینارۂ نور اور نوعِ اِنسانی کیلئے شرف

وعزّت کا باعث تھا اس کی افادیت سے اتفاق کیا ہے، اگر ان بزرگانِ دین اور خلاصۂ اُمت کے تجربہ پر ہمیں اعتماد نہیں تو پھر لائقِ اعتماد اور بھروسہ مند جماعت کونسی ہوگی؟۔ حالانکہ جو شخص ان بزرگوں اور ان کے احوال سے واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان بزرگوں کو جو کچھ حاصل ہوا اسی راہ سے حاصل ہوا تھا۔ لہٰذا اس طریقہ کار کے کامیاب اور مقبول ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

تصوّف کے اصطلاحات اوران کی حقیقت واہمیت

آج کا یہ دور جو کہ سطحیت کا دور ہے۔ علمی گہرائی وگیرائی ناپید ہوتی جارہی ہے' اسی سطح بینی اور سرسری مطالعہ نے نہ صرف یہ کہ تصوف کی اصطلاحات کو اچنبھا بنادیا ہے' بلکہ بعض خالص دینی اور علمی اصطلاحات بھی لوگوں کیلئے غیر مانوس اور اجنبی بن گئے' آج کل لوگ بجائے اس لئے کہ اپنی کوتاہ علم اور قصور نظر اور علمی کم مائیگی اور معلومات کی بے بضاعتی اور بے سروسامانی کا اعتراف کرتے جہاں کوئی لفظ ان کی عقل وفہم اور ان کے شعور وادراک سے بالاتر نظر آتا ہے، ان الفاظ کو بے اثر اور بے معنی بتانے اور اس کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی انتھک کوشش کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام الفاظ اور اصطلاحات جو آج سے ایک صدی بیشتر نہ صرف یہ کہ مانوس تھے بلکہ ناخواندہ حضرات بھی اس کی حقیقت سے متعارف تھے، آج پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے اجنبیت محسوس کرنے لگے ہیں، یہی کچھ حال تصوف کی اصطلاحات کا بھی ہوا ہے کہ جو کہ خالص دینی اور علمی اور قرآن وحدیث سے مستنبط اصطلاحات ہیں، ان کی حقیقت تک عدمِ رسائی نے انہیں غیر مانوس اور اجنبی بنادیا ہے' ان اصطلاحات اور ان کی حقیقت سے ناآشنائی کا لوگ اعتراف کرتے ؛ لیکن اپنی کوتاہ عقل کی وجہ سے ان اصطلاحات کو ہدفِ تنقید بنانے لگے، اس لئے ضرورت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ تصوف کی ان مختلف اصطلاحات کی حقیقت واضح کردی جائے تاکہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يَحْيٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ہم تصوّف کی ان اصطلاحات کو اس کے مقاصد، وسائل اور توابع کے ضمن میں بالترتیب بیان کریں گے۔

ابوالحسن علی ندویؒ کا ایک مختصر وجامع اقتباس

اخیر میں ہم تصوف کی حقیقت وحیثیت اور اس میں مقاصد ومسائل کے فرق اور اس کے بارے میں غلط فہمیوں کی اصل وجوہات کو بتلانے کیلئے حضرت ندویؒ کا یہ اقتباس لکھنا مناسب سمجھتے

ہیں جو اِس حوالے سے نہایت جامع اور پر مغز ہے:

''تصوف کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ جہاں تک اس کے مقصد وحقیقت کا تعلق ہے وہ ایک متفق علیہ حقیقت ہے؛ لیکن اس کو ان ہی دو چیزوں نے نقصان پہنچایا کہ ایک وسائل کے بارے میں غلو اور افراط سے کام لینا، دوسرے اصطلاح پر غیرضروری حدتک زور دینا اوراس پر بے جا اصرار کرنا، اگرکسی سے پوچھا جائے کہ اخلاص واخلاق ضروری ہیں یا نہیں؟ یقین کا پیدا ہونا مطلوب ہے یا نہیں؟ فضائل سے آراستہ ہونا اوررذائل سے پاک ہونا، حسد، کبر، ریاء، بغض اور کینہ، حب مال اور حب جاہ اوردوسرے اخلاقِ ذمیمہ سے نجات پانا، نفس امارہ کی شدید گرفت سے خلاصی پانا، کسی درجے میں ضروری یا مستحسن ہے یا نہیں؟ نماز میں خشوع وخضوع دعا میں تضرع وابتہال کی کیفیت، محاسبہ نفس کی عادت اورسب سے بڑھ کراللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، حسی لذت وحلاوت کا حصول یا کم ازکم اس پر شوق واہتمام، صفائی معاملات، صدق وامانت اورحقوق العباد کی اہمیت وفکر، نفس پر قابو رکھنا، غصہ میں آپے سے باہر نہ ہوجانا، کسی درجہ میں مطلوب ہے یا نہیں؟ توہر سلیم الفطرت انسان اور خاص طور پر وہ مسلمان جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے یہی جواب دے گا کہ یہ چیزیں نہ صرف مستحسن بلکہ شرعاً مطلوب ہیں اورساراقرآن اورحدیث کے دفتر اس کی ترغیب وتاکید سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن اگر کہا جائے کہ انہی صفات کے حصول کا ذریعہ وہ طریق عمل ہے جس کو بعد کی صدیوں میں تصوف کے نام سے پکارا جانے لگا تو اس کے سنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانی پر شکن پڑجائے گی، اس لئے اس اصطلاح سے ان کو وحشت اور اس کے بعض برخود علمبرداروں اور دعویداروں کے متعلق ان کے تجربات نہایت ہی تلخ ہیں''۔

تصوّف کے سلسلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو تمام اجزاء کو علحدہ علحدہ تسلیم کرتا ہے، لیکن جب اس کے مجموعے کو کوئی نام دیا جاتا ہے تو وہ اس سے انکار کردیتا ہے، ہم نے اوپر جن مقاصد اور صفات کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً سب لوگوں کو علحدہ علحدہ تسلیم ہیں، لیکن جب کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے (کسی وجہ سے) اس مجموعہ کا نام تصوف رکھ دیا ہے تو فوراً تیوری پر بل آجاتے ہیں

اور کہنے لگتے ہیں کہ ہم تصوف کو نہیں مانتے اور تصوف نے بڑا نقصان پہنچایا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ اگر کوئی اس حقیقت کا نام بول کر پیش کرے تو اس کو قبول کر لیتا ہے مثلاً کہا جائے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تزکیہ، حدیث کی اصطلاح میں اس کا نام احسان اور بعض علمائے متاخرین کی اصطلاح میں اس کا نام فقہ باطن ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سب چیزیں منصوص ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک لکھی ہوئی ساری کتابوں میں نہ ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ زبانِ خلق کو جو نقارۂ خدا کہی گئی ہے روکا جا سکتا ہے، ورنہ اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم اس کو تزکیہ واحسان کے لفظ سے یاد کرتے اور تصوف کا لفظ ہی استعمال نہ کرتے، لیکن اب اس کا معروف نام یہی پڑ گیا اور یہ کسی فن کی خصوصیت نہیں، علوم وفنون کی ساری تاریخ اسی طرح کی مروّجہ اصطلاحات سے پُر ہیں، محققین نے ہمیشہ مقاصد پر زور دیا اور وسائل کو وسائل ہی کی حد تک رکھا۔(۱)

نسبت کسے کہتے ہیں؟

ویسے تو نسبت کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں، ان میں سے چند سہل اور آسان فہم تعریفات کا ہم ذکر کرتے ہیں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:

> اصطلاحِ صوفیاء میں جس کو نسبت کہا جاتا ہے اس تعلق مع اللہ کا نام ہے جس کے لوازم میں سے دو چیزیں ہیں ایک دوام طاعت، دوسرے کثرتِ ذکر۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

> رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ: یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس نا کارہ نے جواب دیا کہ تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی ابتداء "انّما الأعمال بالنيات" اور انتہاء "ان تعبد اللّٰه كانك تراه" اس کو یادداشت کہتے ہیں، اس کو حضوری کہتے ہیں اور اسی کو نسبت بھی کہتے ہیں، سارے مجاہدے اور مراقبے اور ذکر وشغل اسی کے حصول کیلئے کئے جاتے ہیں اور جس کو حق تعالیٰ یہ دولت عطا کر دیں اس کو پھر کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔(۲)

---

(۱) شریعت وطریقت کا تلازم: ۵۶-۵۷-۶۱ (۲) آپ بیتی: ۶

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نسبت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نسبت لغت میں دو شئے کے ارتباط کا نام ہے' طرفین میں جو علاقہ ہے وہ نسبت ہے اور جو دنیا میں مخلوق ہے اس کو اپنے خالق کے ساتھ ربط ہے وہ ربط کہ جس کی کوئی انتہا نہیں، جس قدر اسماء وصفات اور نزول رحمت ہے اسی قدر نسبتیں ہیں، مثلاً خالق ومخلوق میں نسبت خلق ہے، رازق ومرزوق میں نسبت رزق ہے' رحیم ومرحوم میں رحمت ہے، پس اس شئی کو نسبت کہتے ہیں جو بندوں کو حاصل ہے، اس نسبت کا حقیقی حصول یہ ہے کہ اس نسبت کا علم یقین حاصل ہو کہ موثر ہو جائے اور حضوری کے درجے تک پہنچ جاتے''۔(۱)

مشہور بزرگ اور محقق شیخ حضرت مولانا وصی اللہ نوّرہ اللہ حضرتِ محدّثِ دہلویؒ کی ایک عبارت جو نسبت سے متعلق ہے اس کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات، طہارات اور اذکار وغیرہ پر مداومت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرنے کا ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے اور حصولِ نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجۂ تام ہوگئی اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو گیا، ورنہ بندہ کو حق تعالیٰ سے نسبت ہوتی ہی ہے''۔(۲)

خلاصہ یہ ہوا کہ نسبت یا ولایت کہتے ہیں تقرب الی اللہ اور حضور مع اللہ کو اور یہ بغیر تقویٰ، تزکیۂ نفس اور اتباعِ شریعت کسی کو حاصل نہیں ہوتی، حصول اس کا حق تعالیٰ کی عطا پر مبنی ہے، مگر خلوص کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف توجہ دینے اور اشغال واوراد سلوک اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ کرم فرما دیتے ہیں۔ سلوک کے مقامات طے کرتے ہوئے جو کیفیت سالک کو محسوس ہوتی ہے اس کو بھی اس مقام کی نسبت کہتے ہیں، مثلاً نسبتِ صبر، نسبتِ توکل وغیرہ۔

صحبت اور اس کی تاثیر

جہاں تک انسانی طبیعت کا تعلق ہے، تمام زمانے کے عقلاء اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی

---

(۱) مکتوب بنامِ خلیل احمد، آئینہ سلوک: ۱۷۰ (۲) تصوف ایک تعارف: ۹۹

طبیعت کے بناؤ اور بگاڑ میں جس قدر صحبت اور معیت کو دخل ہے، اتنا کسی چیز کو نہیں، صحبت کی یہ تاثیر اس قدر بدیہی اور فطری مسئلہ ہے کہ جس پر کسی کی دورائے نہیں قرآن سے حدیث سے، اقوالِ علماء حتی کہ عام انسانی افراد سے یہ بات اس قدر محقق ہے کہ اس کیلئے کسی ثبوت کا پیش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ کی ساری فضیلت وکمال کا راز اسی ایک بات میں ہے کہ ان کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ومعیت ایمان وعقیدت کے ساتھ حاصل ہوئی تھی، اگر کسی کو یہ صحبت حاصل نہیں ہے تو وہ ایمان وعمل کے خواہ کتنے اونچے درج پر فائز ہو باتفاق امت اسے کسی صحابی کے مقابل نہیں رکھا جاسکتا۔ ''حدیثِ حنظلہ'' میں بھی صحبت کی اسی اثر انگیزی کا ذکر ہے، یہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا یہ حال پاتے تھے کہ صحبت اور مجلس میں رہتے تو دل کی یہ کیفیت رہتی کہ ایک لمحہ کیلئے غفلت نہ ہوتی اور غیب گویا شہود ہوجاتا، لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے یہ کیفیت نہ ہوتی۔

حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں دفن کرکے ہم نے مٹی سے ہاتھ جھاڑے نہیں تھے کہ ہمیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عالم سے عالمِ برزخ میں منتقل ہوجانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں فرق پڑا۔ ان دونوں روایتوں سے صحبت کا قلبی کیفیات میں مؤثر ہونا صاف طور پر معلوم ہوتا ہے)۔

ضرورتِ مرشد

اسی لئے مشائخ صوفیاء نے طریق کا مدار صحبت پر رکھا ہے، اس لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی دینی کمال اور تقویٰ کا حسن وجمال حاصل کرنا ہو تو وہ کسی صاحب کمال، متقی وخوش خصال کو تلاش کرے، اس سے عقیدت ومناسبت ہو تو اس کی صحبت میں رہے، اس سے علم وعمل سیکھے، اس طریقے سے اسے کمال حاصل ہوگا۔ اس لئے طالب کا سہل کام اور پہل قدم یہ ہونا چاہئے کہ اپنی رہنمائی کیلئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے وہ کسی صاحبِ نسبت اور صاحبِ ارشاد بندہ کا انتخاب کرے اور اس سے اپنے باطنی امراض کے علاج اور رہنمائی کا طالب ہو۔

حدیث شریف میں ہے: ''عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم المرء على دين خليله فلينظر أحدكم من يخالل ''(۱) حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

(۱) مستدرك : كتاب البر والصلة، حديث: ۸۳۱۹،تحقيق محمد مصطفٰى عبد القادر عطا.

سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے، سو ذرا دیکھ بھال لینا چاہئے کہ کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے۔

جب معمولی دوستی کا یہ اثر ہوتا ہے تو پھر شیخ اور استاذ جن سے اعلیٰ درجہ کی محبت وعقیدت اور احترام اور پاس ولحاظ ہوتا ہے ان کی صحبت ورفاقت کا کیا کچھ اثر نہ ہوگا۔اس لئے تلاش مرشد میں بھی بہت احتیاط کرنی چاہئے۔

شیخِ کامل کی پہچان

ضرورتِ مرشد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص کہیں بھی پیر بن بیٹھا ہو وہ اس کی رہنمائی کا اہل ہو، کون اس صورتحال سے ناواقف ہے کہ آج کل جس طرح عالموں، مولویوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص وکامل اور اصلی ونقلی سب طرح کے ہیں۔اس طرح پیروں میں سب طرح کے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے یہاں نقل اصل سے زیادہ ہے، اس لئے محققین نے جو علمِ شریعت کے ماہر ہیں (مثلاً قریبی زمانے کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناءاللہؒ) کتاب وسنت کے اشارات اور اپنی دینی فہم وفراست اور اس راہ کے تجربہ سے اللہ کے صادق بندوں کی ایسی علامتیں لکھی ہیں جن سے اہل قلوب اور اصحابِ ارشاد لوگوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔سب سے بڑی نشانی اُن اللہ کے صادق اور صاحبِ نسبت وارشاد بندوں کی یہ لکھی ہے کہ تقویٰ واتباع شریعت کے ساتھ ان کی یہ کیفیت ہو کہ ان کے قریب رہنے سے خدا یاد آتا ہو۔دنیا کی محبت کم ہوتی ہو اور اللہ کی محبت اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والوں میں یہ چیزیں صاف محسوس ہوتی ہوں۔(۱)

جس شخص میں یہ علامات ہوں، تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ شخص صاحبِ تصرفات ہے یا نہیں۔ یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں، یا اس کی دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں، چونکہ یہ مقاصد نہیں زوائد ہیں۔

بیعت کا مفہوم اور اُس کی شرعی حیثیت

شریعتِ مطہرہ پر عمل آوری میں راہ کی رکاوٹوں اور نفسانی وشیطانی مکروفریب سے بچنے کا

(۱) دین وشریعت : ۲۴۸-۲۴۹

جب ارادہ ہوتا ہے تو اپنے کو کسی مردِ کامل اور شیخِ طریقت کے سپرد کرنا بیعت کہلاتا ہے گویا بیعت گناہوں سے توبہ کا عزم مصمم اور نیکیوں کو اختیار کرنے کا ایک پختہ اِرادہ ہوتا ہے جس کیلئے کسی مرد کامل کو اپنا گواہ بنایا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ حضرات مشائخ اور صوفیہ جب کسی سالک اور مرید کو اپنے حلقۂ اِرادت میں داخل کرتے ہیں اور آئندہ معصیت نہ کرنے اور معصیت ہوجانے کی صورت میں توبہ کرنے کا عہد لیتے ہیں، مزید اعمال صالحہ پر استقامت اور سنت وشریعت کی کامل اتباع کا معاہدہ کراتے ہیں تو یہ کام خود سالک اور مرید کے کرنے کا ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ اپنے کسی عمل پر دوسرے کو گواہ بنالیتا ہے تو اس میں پختگی آجاتی ہے اور اس کا اہتمام بڑھ جاتا ہے، اسی اپنے عمل پر کسی مردکامل کو گواہ بنالینے کا نام بیعت ہے خود قرآن کریم میں ایمان وعمل صالح پر بیعت لینے کا ذکر موجود ہے۔ یہ بیعت' بیعتِ جہاد، بیعتِ ہجرت' بیعتِ طاعت' بیعتِ اسلام کے علاوہ ہے۔گویا بیعت توبہ یا تقویٰ ہے' اس بیعت سے متعلق ارشاد خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاءَ كَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى أَنْ لَّايُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (۱)

"اے نبی ﷺ! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس غرض سے آئیں کہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کسی پر بہتان نہ باندھیں گی اور بھلائی میں تمہاری نافرمانی نہیں کریں گے، تو ان کو بیعت کرلو اور ان کیلئے اللہ سے استغفار کرو، بیشک اللہ غفور اور رحیم ہے"۔

یہ تو گناہوں سے اجتناب سے متعلق بیعت ہے، جسے بیعتِ توبہ یا بیعتِ تقویٰ کہتے ہیں، اس بیعت کی بنیاد یہ آیت ہے اور یہ بیعت اسلام بھی نہیں ہے اس لئے کہ مخاطب مومن عورتیں ہیں۔اسی بیعتِ تقویٰ کو اس روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"عن عوف بن مالك الاشجعی رضی اللہ عنہ قال كنّا عند النبی سبعة

---

(۱) الممتحنة : ۱۲

او ثمـانية اوتسـعة، فقال الا تبايعون رسول الله ﷺ فبسطنا ايـدينـا، فقال قائل يا رسول الله انا قد بايعناك فعلى ما نبايعك قـال ان تـعبـد الله ولا تشركوا به شيئًا وتقيموا الصلوة الخمس واستمعوا وتطيعوا، واسرّ كلمةً خفيّة ولا تسئلوا النّاس شيئا (۱)

''حضرتِ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم سب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے ہماری تعداد' سات تھی یا آٹھ تھی یا نو' سرکار ذی وقار ﷺ نے فرمایا کہ: کیا تم لوگ اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت نہیں کروگے تو ہم لوگوں نے ہاتھ بڑھایا۔ وہاں موجود ایک صاحب نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! ہم لوگ تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں اب ہم آپ سے کس بات پر بیعت کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا (بیعت اس بات کی کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کروگے، کسی کو اس کا شریک نہ کروگے، پانچوں وقت کی نماز ادا کروگے (اللہ اور اس کے رسولوں کے حکم کو) سنوگے اور اطاعت کروگے اور آہستگی سے فرمایا کہ کسی سے کچھ مانگنا نہیں''۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بیعت تجدید عہد کے طور پر لی تھی، تا کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ ایمانی زندگی گذاریں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم جو تازہ اسلام لائے تھے اور بیعتِ اسلام وایمان کر چکے تھے انہیں پہلے مرحلہ میں حیرت بھی ہوئی کہ یہ دوسری بیعت کیسی؟ اس روایت کا یہ جملہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے:

فقال قائل يارسول الله انا قد بايعناك فعلى مانبايعك (۲)

ایک کہنے والے نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں، اب ہم کس بات پر بیعت کریں؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کے تعجب کا دفعیہ یوں فرمایا کہ:

بیعت اسلام کے سوا دوسری بیعت بھی ہوتی ہے، پھر آپ ﷺ نے وہ اُمور ذکر فرمائے اور پھر دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی بھی بیعت لی اور یہی بیعت تقویٰ ہے کیونکہ کلمات بیعت

---

(۱) سنـن الـكبرىٰ للبيقهى، باب كراهية السؤوال والترغيب والترك، حدیث:۳۶۵۷، مع تحقيق محمد عبد القادر عطا.

(۲) سنـن الـكبرىٰ للبيقهى، باب كراهية السؤوال والترغيب والترك، حدیث: ۳۶۵۷،مع تحقيق محمد عبد القادر عطا.

میں اسلام لانے کا تذکرہ نہیں ہے۔ نہ جہاد کی تلقین کی گئی ہے، نہ ہجرت کا حکم دیا گیا ہے، روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ سب مشرف بہ اسلام تھے یہ اسلامی احکام کی تعمیل اور تکمیل پر بیعت لی گئی، اسے بعض روایات میں بیعت نساء (قرآنی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بھی کہا گیا ہے۔(۱)

اور جسے بیعت تقویٰ کہتے ہیں جسے بزرگوں نے بیعت توبہ کہا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس بیعت کی حقیقت اس حدیث کی روشنی میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''حضراتِ صوفیاءِ کرام میں بیعت کا معمول ہے، جس کا حاصل التزام احکام (یعنی احکام ظاہری و باطنی پر استقامت) اور اہتمام کا معاہدہ ہے، جس کو ان کے عرف میں بیعت طریقت کہتے ہیں، بعض اہلِ ظاہر اس کو اس بناء پر بدعت کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ سے منقول نہیں ہے، صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعت جہاد کرنا معمول ہے، مگر اس حدیث میں صریح اثبات موجود ہے کہ یہ مخاطبین چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، اس لئے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں ہے کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں ہے، پس اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں''۔(۲)

بیعت کی ضرورت

یہ بات یقینی ہے کہ بیعت کی ضرورت اس درجہ عام نہیں کہ ہر شخص کو اس کا پابند بنایا جائے، بہت سی سلیم طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ خود بخود نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور مختلف اسباب وعوامل سے ان کے اندر تقویٰ ودیانت اور بھلائی کا رجحان ہوتا ہے، ایسے لوگ بیعت نہ ہوں تو مضائقہ نہیں، لیکن عام انسانی طبائع کی حالت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے، اس لئے ان طبائع کا لحاظ کرتے ہوئے بیعت کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

''نفس میں بعض خفیہ امراض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جاتے ہیں تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا اور جو معلوم ہوتا ہے تو نفس کی کشاکش سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے، ان ضرورتوں سے

---

(۱) اوجز المسالك : ۱۲ (۲) شریعت وطریقت : ۵۸

پیرِ کامل تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے، ان کا علاج اور تدبیر بتاتا ہے اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے''۔(۱)

ریاضات ومجاہدات

اہلِ تصوّف کے یہاں تلاش مرشد کے بعد سب سے اہم کام ریاضت اور مجاہدۂ نفس کا ہے اور یہ بات صرف اسی فن کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ آدمی کوئی بھی کمال حاصل کرنا چاہے تو اسے محنت ومجاہدہ کے اس مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے، کاشت کار سے لے کر صاحب قلم وقرطاس ہر شخص کو دیکھ لیں بغیر مغز ماری اور جگر کاوی کہ وہ میدان سر نہیں ہوتا ہے یہی حال علومِ دینیہ ودنیویہ کا ہے کہ اُستاذ کی رہنمائی کے بعد مجاہدہ اور محنت ہی انسان کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرتے ہیں۔آرام وچین کو تج دینا، فاقے کرنا، سردی گرمی کو برداشت کرنا، کونسی ایسی مشقت ہے جو حصولِ علم کی راہ میں نہیں ہوتی، تمام راتوں جاگنا' تکالیف حصولِ علم اور حصولِ کمال کے خاطر برداشت کی جاتی ہیں، شیدایانِ علم کے مجاہدوں کی داستانیں کتابوں میں رقم ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ ہر کام کیلئے مجاہدہ مُسلّم اگر صوفیہ قربِ خداوندی کیلئے مجاہدہ کا نام لیں تو لوگوں کی پیشانیوں پر بل آنے لگتے ہیں۔اگر کوئی ماہرِ فن استاذ اپنے شاگردوں کیلئے اس فن پر عبور حاصل کرنے کیلئے کوئی خاص مجاہدہ یا محنت ومشقت تجویز کرے تو ہم اس فن کے حصول کی خاطر اس مجاہدہ ومحنت کو بطور وسیلہ کے اپنانے میں کوئی تردد نہیں کرتے، یہی بات جب نور یقین اخلاص واحسان اور تمام باطنی خصوصیات کے حصول کیلئے صوفیاء بطور تدبیر کے کچھ ریاضات سالکینِ طریق کیلئے تجویز کرتے ہیں تو فوراً اس کیلئے کتاب وسنت سے دلیل مانگی جاتی ہے، یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کے اس مادّی جسم کے ساتھ جو عناصر اربع (ہوا، آگ، پانی، مٹی) سے مرکب ہے، ایک غیر مادّی چیز بھی جوڑ رکھی ہے، جس کا تعلق جسم سے کم اور عالمِ غیب سے زیادہ ہے، جس طرح محسوس چیزوں کے ادراک وعلم کیلئے اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی میں مختلف اعضاء بنا کر ان میں احساس کی طاقت رکھی ہے، مثلاً آنکھ میں دیکھنے، کان میں سننے، زبان میں ذائقہ، ناک میں سونگھنے اور کھال میں چھونے کی طاقت رکھی ہے، اس طرح عالم غیب کی چیزوں کے ادراک کیلئے روح کو جسم کا ایک حصہ عطا فرمایا اور اس میں امورِ غیبیہ کی ادراک کی قوت ودیعت کی اس کا نام ''قلب'' ہے۔جس طرح جس حاسّہ سے کام لیا جاتا رہے گا وہ کارآمد رہے ہیں اور جس حاسّہ کو معطل کر دیا جائے وہ رفتہ رفتہ اس کی اپنی طاقت

(۱) شریعت وطریقت : ٦٠

کھودے گا، مثلاً ہمیشہ آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، اس سے کام نہ لیں تو وہ کچھ مدت نہیں گذرے گی کہ اس کی بصارت کمزور ہو کر ختم ہو جائے گی۔ یہی حال دل کا ہے، اگر اس کو امورِ غیبیہ سے جوڑے رکھا گیا اور اس کے موانع دور کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس کو غیبی امور کے ساتھ مناسبت باقی رہے گی۔ یہ مجاہدات، اذکار، اشغال اور مراقبات اس لئے کروائے جاتے ہیں کہ دل کی قوت میں اضافہ ہو اور اس میں عبادات وطاعات کا ذوق بڑھے۔

مجاہدات کی شرعی حیثیت

مجاہدہ کی شرعی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

''مجاہدہ ضروری کاموں میں سے ہے، کیونکہ شریعت میں اس کا حکم دیا گیا ہے، نصوص میں جابجا مجاہدہ کا ذکر ہے، پس اس کی تفسیر وہی ہونی چاہئے جو شریعت نے بتلائی ہے، اس لئے مجاھدہ تمام عبادات' بلکہ تمام شریعت کی روح ہے اور اصطلاح میں مخالفت نفس کا نام مجاہدہ ہے اور دین بھی سارا مجاھدہ ہی ہے، کیونکہ مخالفت نفس میں تعب ضرور ہوتا ہے اور دین کا خلاصہ بھی مشقت ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ نفس کے اوپر پابندی لازم ہوتی ہے اور نفس پر پابندی گراں ہے، وہ تو طبعی طور پر آزادی کا طالب ہے، نفس پر اعمال دینیہ شاق ہوتے ہیں۔ اس لئے دین کا نام تکلیف ہے اور احکام شرعیہ کو احکامِ تکلیفیہ کہا جاتا ہے اور بندے کو مکلّف کہتے ہیں۔ تو مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق وعادت ہے۔ حق تعالیٰ کی رضا وطاعت کے مقابلے میں نفس کی جانی ومالی اور جاہی خواہشات ومرغوبات کو مغلوب رکھا جا سکے۔ اسی مجاہدہ پر ہدایت کا وعدہ ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۱) جو لوگ ہماری راہ میں مشقت برداشت کرتے ہیں ہم ان کو قرب وثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھائیں گے''۔

ایک روایت میں ہے: عن فضالة الكامل قال قال رسول الله ﷺ المجاهد من جاهد من نفسه فى طاعة الله. (۲) حضرت فضالہ کامل سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجاہدہ وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

(۱) عنکبوت: ۶۹ (۲) شعب الایمان: باب السابع والسبعون من شعب الایمان، حدیث: ۱۱۱۲۳، تحقیق محمد السعید، مطبوعة بیروت

مجاہدہ کے اقسام اور ارکان

صوفیاء کے نزدیک مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں جس کو اختیار کئے بغیر مقصود کا حصول ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں :

مجاہدہ دو قسم کے ہیں: مجاہدۂ جسمانی، مجاہدہ مخالفتِ نفس

مجاہدۂ جسمانی یہ کہ نفس کو مشقت کا عادی بنایا جائے، مثلاً نوافل کی کثرت، روزے سے کھانے وغیرہ کی حرص کم کرنا۔

مجاہدہ مخالفتِ نفس یہ ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضہ کرے اس وقت اس تقاضہ کی مخالفت کرنا۔ اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ بھی اس کی تحصیل کیلئے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو جائے گا تو اس کو اپنے جذبات ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی، لیکن اگر کسی کو بغیر مجاہدۂ جسمانی کے نفس پر قدرت حاصل ہو جائے تو اس کو مجاہدۂ جسمانیہ کی ضرورت نہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں، اس لئے صوفیاء نے مجاہدۂ جسمانیہ کا اہتمام کیا ہے۔(۱)

مجاہدۂ جسمانی کے چار ارکان ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی فن میں اعلیٰ کمال کو حاصل کرنے کیلئے ان چاروں مشقتوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

۱- کھانے میں اعتدال۔ ۲- سونے میں اعتدال۔

۳- لوگوں سے میل جول میں اعتدال ۴- بات چیت میں اعتدال

یعنی ان تمام امور کو بقدرِ ضرورت اپنایا جائے ایسا نہیں کہ جو چیز مل گئی کھا گئے، بلکہ بقدرِ ضرورت، ایسے ہی زیادہ نہ سویا جائے اس سے سستی پیدا ہوتی ہے زیادہ نہ بولا جائے اس میں وقت اور قوت کی بچت ہوتی ہے، ایسے ہی خلوت اختیار کی جائے تاکہ کام کی تکمیل میں حرج نہ ہو۔ یعنی ان چاروں چیزوں میں کمی کرنی ہے لیکن اعتدال کے ساتھ نہ حد سے زیادہ کمی کی جائے جس سے رہبانیت لازم آئے اور نہ حد سے زیادہ ان چیزوں کو اختیار کیا جائے کہ انسان کی ساری قوت اور صلاحیت انہیں چاروں چیزوں پر صرف ہو، بلکہ اعتدال اور میانہ روی شریعت کی ہر چیز میں مطلوب ہے۔

(۱) شریعت وطریقت : ۸۰

چنانچہ حضرت تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں :

''پس مجاہدہ میں اعتدال کی رعایت کرنا چاہئے، مگر اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کرے، بلکہ کسی محقق سے درجہ اعتدال اور طریقِ مجاہدہ معلوم کرے''۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کی تجویز میں سلوک وطریق کے ماہرفن سے دریافت کیا جائے اور اسی کے بقدر مجاہدہ کرے اس لئے کہ احوال وامراض ہرایک کے مختلف ہوتے ہیں اسی اعتبار سے علاج تجویز کئے جاتے ہیں۔

اذکار....اشغال....مراقبات

تصوّف کے بارے میں تیسری اہم چیز اذکار، اشغال اور مراقبات ہیں۔

اذکار

ذکر کی دو حیثیتیں ہیں' ایک حیثیت سے تو یہ مقاصد میں داخل ہے ارشاد خداوندی ہے :

یَـا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اذْکُرُوا اللّٰهَ ذِکْرًا کَثِیْرًا (۲)''اے ایمان والو اللہ کا ذکر بکثرت کرو''۔

وَاذْکُـرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِـالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَاتَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ ۔(۳)اور اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح وشام اور غافلوں میں سے مت ہو۔غفلت ذکر کی ضد ہے، غفلت حرام ہے اور ذکر فرض ہے اور یہ خود مطلوب ہے۔

لیکن ذکر کی دوسری حیثیت مقصود ومطلوب کیلئے معاون اور ذریعہ کی ہے، چونکہ مقاصد ِشرعیہ میں سے محبتِ الٰہی کا حصول بھی ہے، جس قدر اللہ کا ذکر کیا جائے اسی قدر اللہ سے محبت ہو اور محبت کے بعد خدا کی اطاعت وبندگی پر دوام اور اس کے نتیجے میں قرب خداوندی حاصل ہوگا۔ مقصود ہونے کے اعتبار سے صوفیاء اپنی پوری زندگی کو ذکر سے سرشار رکھتے ہیں جو''ذکرِ کثیر'' کا اعلیٰ مصداق ہے۔ یہاں تک کہ ذکر کا رنگ ان پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آنے لگتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں نیک لوگوں کی علامت بیان کی گئی ہے۔

(۱) وعظ، المجاہدہ تعلیم الدین (۲) الاحزاب :۴۱ (۳) الاعراف :۲۰۵

اذا رءُوا اذکر اللّٰہ ......جب ان پر نظر پڑے تو خدایاد آجائے لیکن ذکر کا یہ رنگ ان پر چڑھے کیسے؟اس کے لئے بطور وسیلہ کے ذکر ہی کو استعمال کیا گیا اور اس طرح کے ذکر کے مختلف طریقے تجربے کی رو سے تجویز کئے گئے، ان کی خاص تعداد متعین کی گئی، ان کی وضع وہیئت مقرر کی گئی، جہر اور سر کی حد بنائی گئی۔ان سب کا مقصد یہ ہے کہ ذکر بجلد اور بعجلت دل میں راسخ ہوجائے۔ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث میں ذکر کا مطلق حکم ہے، اس مطلق حکم کی تعمیل کیلئے اگر کوئی خاص طریقہ بشرطیکہ وہ جائز ہو، وضع کیا جائے اور اُسے بطورِ وسیلہ کے عمل میں لایا جائے، اس طریقہ کو مقصود اور عبادت نہ قرار دیا جائے تو اس میں کیا کلام ہوسکتا ہے؟ حضراتِ صوفیاء بھی ذکر کا جہراً حکم دیتے ہیں، کبھی اس کیلئے سیکھنے کی کوئی خاص ہیئت بتاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ مثلاً لا الہ پر سر اور گردن کو پیچھے لے جاؤ اور یہ خیال کرو کہ غیر اللہ کی محبت اور اس کا اثر دل سے خارج ہورہا ہے اور پھر الا اللہ کی ضرب دل پر لگاؤ اللہ کا نور یا اللہ کی محبت دل میں پیوست ہورہی ہے، ان ضربوں کا مقصد یہ ہے کہ دل سے غیر اللہ کی محبوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت راسخ ہوجائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے یہ طریقہ زیادہ موثر ثابت ہوا ہے، کبھی مشائخ ذکر قلبی کی تلقین کرتے ہیں اور اس کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً یہ خیال کرو کہ دل کی دھڑکنیں بول رہی ہیں اور اللہ اللہ کررہی ہیں یہ طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں کہ ذکر کا رسوخ ہوجائے، کبھی پورے کلمہ لا الہ الا اللہ کی مشق کراتے ہیں، کبھی الا اللہ کی ضرب لگاتے ہیں کبھی صرف اللہ اللہ رٹاتے ہیں یہ سب تمرینات ہیں اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اس سے قلب پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ سب وسائل اور ذرائع ہیں، انہیں بدعت قرار دینا کج فہمی کا نتیجہ ہے۔(۱)

اشغال

''شغل'' بھی صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دل کی توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کیلئے کوئی عمل کیا جائے تا کہ اس سے یکسوئی پیدا ہو، مثلاً لفظ اللہ موٹے حرفوں میں لکھ کر اس پر نگاہ جمائی جائے کہ پلک تک نہ جھپکے، اس سے قلب کی یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور اس پر کچھ ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جس سے ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے پھر دل تشویشات سے خالی ہوکر ہمہ تن متوجہ بحق رہتا ہے۔ایسے ہی سانس روکنے کا عمل جو ''حبس دم'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

---

(۱) تصوّف ایک تعارف : ۸۷

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

''اشغال کا مقصود یہ ہے کہ دل کا انتشار جو ہجوم افکار کا باعث ہوتا ہے ختم ہو کر جمعیت خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو! تاکہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام حاصل ہو۔ نماز میں سترہ قائم کرنے کا حکم اس عمل کا ماخذ ہے کیونکہ بہ تصریح علماء سترہ کا مقصود بھی جمع خاطر اور ربطِ خیال اور انتشار کا دفعیہ ہے جیسا کہ ابن ہمامؒ نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے اور سترہ اس کی تدبیر ہے''۔(۱)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :

''غرض جتنے اشغال ہیں وہ جمع خاطر کیلئے ہیں مقصود بالذات نہیں، ذکر کے وقت اگر قلب میں جمعیت وخشوع معلوم ہو اور وہ روزانہ بڑھتی جائے اور وساوس وخطرات میں کمی ہونے لگے اور دل لگا کرے تب تو اشغال کی حاجت نہیں اور اگر ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی وخشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل بھی کرلیا جائے''۔(۲)

مراقبات

مراقبات بھی حضرات صوفیہ کے اصطلاحات میں سے ہے۔اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا یا اس سے متعلق کسی اور مضمون کا اکثرِ احوال یا کسی محدود وقت میں دل سے پورے تدبر اور کامل غور وفکر کے ساتھ خیال جمائے۔اس تصور پر مواظبت کرے تاکہ اس کا مقتضا حاصل ہو، یہی عمل مراقبہ کہلاتا ہے،اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان تعبد اللّٰہ کانّك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے (اسی کو مراقبۂ رؤیت کہتے ہیں)۔

مشائخین' اللہ عزوجل کے اس گہرے تصور کو دل ودماغ میں بٹھانے کیلئے مختلف مراقبات کرواتے ہیں جیسے مراقبۂ موت (اپنے آپ کے مرنے کا تصور) مراقبۂ عذاب آخرت،اس طرح کے مراقبے جو مشائخ تجویز کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضارِ تام حاصل ہو جائے۔

---

(۱) شریعت وطریقت : ۲۷۳ (۲) شریعت وطریقت : ۲۷۴

شجرۃ المراد یعنی نقشۂ امورِ تصوّف

تـــــــــمت الشجـــــــــرة

(۱) مبادی التصوف مگر x نشان والے متفرق جگہ سے ماخوذ ہیں۔

تجدید تصوف وسلوک
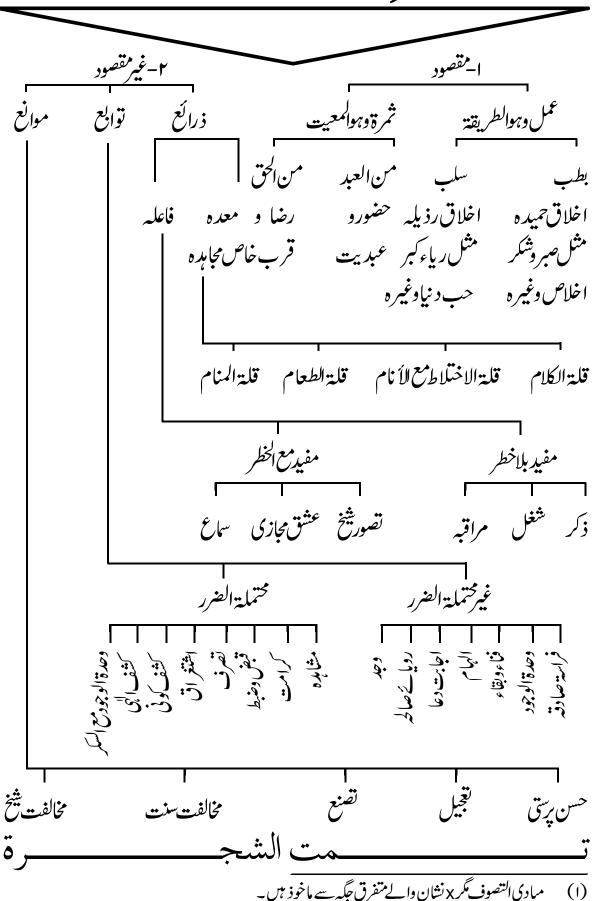
گذشتہ سطور میں ہم نے تصوّف کی جو حقیقت بیان کی ہے، اس اعتبار سے تصوف کوئی دین وشریعت سے کوئی علیحدہ اور مستقل چیز نہیں ہے، بلکہ یہ دین ہی کا تکمیلی شعبہ ہے، جس کو اپنا کر ہی حقیقت میں اللہ عزوجل کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کیا جاسکتا ہے دین کے دیگر شعبہ جات کی طرح دین کا یہ اہم اور تکمیلی شعبہ بھی نام ونہاد، شہرت کے طالب جاہل صوفیا کے دست وبرد سے خالی نہیں رہا ہے۔ انہوں نے اپنے مطلب براری اور عزت وشہرت کا سکہ جمانے کیلئے بہت ساری غیر اہم چیزوں کو یا تو اہمیت اور اصلیت کا درجہ دے دیا یا غیر متعلق چیزوں کو اس شعبہ کے ساتھ منسلک کردیا۔ یہی چیز دراصل دین کے اس اہم شعبہ کی بدنامی اور اس کے نام سے لوگوں کے بدکنے کا باعث ہوئی۔ چنانچہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ دوسری چیز جس نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کردیا، وہ پیشہ ور، جاہ طلب، حقیقت فروش اور الحاد شعار اور فاسد العقیدہ نام ونہاد صوفی ہیں، جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی وبے قیدی کی تبلیغ کرنے کیلئے تصوّف کو آلۂ کار بنالیا اور اس کے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہلِ حمیت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبے کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے ناآشنا تھے، وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کرسکے بعض اوقات انہوں نے وسائل پر تو بہت اِصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کردیا اور اس شعبہ میں ایسی چیزیں داخل کیں، جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس کو اس فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود ومطلوب سمجھ بیٹھے، بسا اوقات انہوں نے دین کی اس روح اور زندگی کی اس ضرورت کو معمہ فلسفہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، ان تمام وجوہ واسباب کی بناء پر دین کا یہ اہم شعبہ لوگوں کیلئے غیر مانوس ہوگیا''۔(۱)

---

(۱) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک : ۱۷-۱۸

لیکن اللہ عزوجل کا یہ قانون اور دستور رہا ہے کہ وہ جب بھی دین میں تحریف یا تزویر کی جانے لگتی ہے تو اس کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف' باطل پرستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک وصاف کرنے کیلئے رجال کار پیدا کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اس دوراخیر میں بھی جب یہ شعبہ ان جاہل' حقیقت نا آشنا' خودغرض جاہل صوفیا کی زیادتی اور تحریف کا نشانہ بنا تو اللہ عزوجل نے ان کے اس ناپاک عزائم کو ملیامیٹ کرنے اور تصوف کے حقیقی تابناک وروشن چہرے کو عوام الناس کے سامنے لانے کیلئے بڑے بڑے مردِ میدان پیدا کئے۔ جنہوں نے ان کے اغلاط وضلالات کی قلعی کھول کر اس کا کچا چٹھا الگ کردیا؛ چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اس حوالہ سے یوں ارشاد فرماتے ہیں:

''جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کے دیگر شعبوں کی غلطیوں کی اصلاح علماءِ ربانی اور مجددین امت کے ذریعہ ہوتی رہی ہے' اسی طرح اس شعبۂ احسان وتصوّف کے سلسلہ کی اغلاط وضلالات کی اصلاح بھی منجانب اللہ محققینِ صوفیاء کرتے رہے ہیں۔

خاص کر ان آخری تین چار صدیوں میں تصوّف کی اصلاح وتجدید کا جو کام ہندوستان میں ہوا ہے، وہ تو دودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے کا بہترین نمونہ ہے۔ امامِ ربانی مجدد الف ثانیؒ اور ان کے فرزند وجانشین خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات کے ضخیم ضخیم دفتر پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تصانیف اور ان کے مکاتیب، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا مرتب کیا ہوا حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات وافادات کا مجموعہ (صراطِ مستقیم) اور پھر خاص ہماری اس صدی میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کے اس سلسلہ کے رسائل ومکاتیب اور سب سے اخیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا تصنیف کیا ہوا اس سلسلہ کا پورا کتب خانہ ان کوششوں نے تصوف کو اتنا صاف وروشن اور ایسا بے غل وبے غش کردیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بدقسمتی ہے۔'' پھر آگے فرماتے ہیں :

''پس کسی کیلئے جس طرح یہ درست نہیں ہے کہ وہ دین کے نظام عقائد یا نظامِ اعمال میں کچھ طبقوں کی غلط روی کی وجہ سے غیر مطمئن ہوکر عقائد واعمال کی فکر سے بے نیاز

ہو جائے، اسی طرح کسی کیلئے یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ سلوک وتصوف میں کچھ لوگوں کی غلط روی کی وجہ سے دین کے اس شعبہ سے بے نیاز ہو جائے، جس کے بغیر بندہ کا دین کامل نہیں ہوتا اور حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی''۔(۱)

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی حقیقت اور غلط فہمیوں کا ازالہ

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود یہ تصوف کی دو اصطلاحیں ہیں، اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب سالک راہِ معرفت کو اختیار کرتا ہے تو دورانِ راہ مقاماتِ سلوک میں سے اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ بھی اس عالم میں موجود ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے اور تمام اشیاءِ کائنات ایک ہی وحدت سے وابستہ ہیں' جب یہ حالت غلبہ پالیتی ہے تو پھر سالک کی نظروں سے اشیاء کی کثرت غائب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ خود اُس کا وجود بھی اُسے محسوس نہیں ہوتا، صرف ایک ذاتِ حق کے سوا دوسری ہر چیز اور اس کا اپنا وجود اُس کی نظروں میں کالعدم ہو جاتا ہے، اس کیفیت کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ :

''کثرتِ اشیاء معدوم نہیں ہوتیں وہ سب اپنی جگہ موجود رہتی ہیں، البتہ سالک کو غلبۂ توحید کی وجہ سے ایک قسم کا ذہول ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی توجہ ذاتِ حق کی طرف ہوتی ہے جیسے آسمان پر ستارے کہ آفتاب طلوع ہوتے ہی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ اپنی جگہ موجود ہیں، اس کو ''وحدۃ الشہود'' کہتے ہیں۔ یعنی سوائے ذاتِ حق کے اور کچھ مشاہد نہیں ہوتا یہ ایک کیفیت ہے اور اس کو وہی شخص اچھی طرح جانتا ہے جس پر یہ کیفیت گذری ہو، یہ کوئی شریعت کا مسئلہ نہیں اور اکتسابی بھی نہیں''۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی حقیقت اور اس کے صحیح مفہوم کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھتے ہیں :

''گو ممکنات موجود ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو وجود دیا ہے، موجود کیوں نہ ہوتے مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص اور ضعیف وحقیر ہے، اس لئے وجودِ ممکن کو وجودِ حق کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے، جب یہ کالعدم ہوا تو

(۱) دین وشریعت : ۲۴۷

وجود معتدبہ (حقیقی) ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدۃ الوجود کے! کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے ایک ہونا وجود کا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا گو ہے سہی مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں، مگر اسے اِدعاءِ وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے......اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توحید کہتے ہیں، جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں ...... کہلاتا ہے۔ یہ البتہ مطلوب ومقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدۃ الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے، ایک ہونا شہود کا کہ واقعہ میں تو ہستی متعدد ہیں، مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں، پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے ''کما قال مرشدی'' مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہوگئے تھے، اس لئے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا جو بہ نسبت پہلے عنوان کے مقصود پر زیادہ وضاحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے، دلیل نقلی اس مسئلہ کی یہ ہے کہ '' کُلُّ شَیٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ'' (ہر چیز سوائے اس کی ذات کے معدوم ہے) جیسا کہ شارح عقائد نسفیؒ نے تفسیر کی ہے''۔(۱)

حافظ ابنِ قیم اور حافظ تیمیہؒ جن کے حوالہ سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ دونوں تصوف کے بالکل مخالف ہیں، بہرِ صورت انھیں تصوف سے بیر ہے وہ وحدۃ الوجود کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں، حافظ ابن قیم جو کہ علامہ کے اخص الخواص شاگردوں میں سے ہیں اِس مسئلہ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''جس طرح انوارِ مخلوق نورِ حق کے سامنے اور علمِ خلق علمِ حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے، اسی طرح زمان' دہر اور وقتِ دوامِ اِلٰہی کے سامنے مضمحل ہے' لیکن جب سالکین پر یہ اِستغراق طاری ہوتا ہے، قوتِ تمیز کمزور ہوجاتی ہے اور حال غالب ہوجاتا ہے تو اہلِ اِستقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے ''ما في الوجود الا الله، ما ثم موجود الحقيقة الا الله، هناك يفنى من لم يكن ويبقىٰ من لم يزل'' بے شبہ وجودِ حق اور اُس کا دوام جب

(۱) شریعت وطریقت : ۳۱۰-۳۱۱

ماسویٰ پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور یہیں سے وحدۃ الوجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہوگئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے اور اِس قسم کے مشتبہ کلمات کو (جو کہ اہلِ استقامت کی زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سنگ بنیاد قرار دیا''۔(۱)

حافظ ابن قیمؒ کی وسعتِ خیال کا یہ عالم ہے کہ اگر سالک غلبۂ حال میں ''سبحانی'' یا ''ما في الجبة الا اللّٰه'' کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق سمجھتے ہیں۔(۲)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ غیرِ حق عین ہوگیا، یا ذاتِ باری اشیاء کے اندر حلول کر گئی اور وہ بعینہٖ اُس کی ذات قرار پائی یا تمام موجودات ومشاہدات بعینہٖ ذاتِ باری کا پرتو ہیں، اس طرح کا اعتقاد تو بالکل کفر ہے، اس کا صحیح مطلب جیسا کہ بیان کیا گیا یہ ہے کہ جب سالک پر غلبۂ توحید کا ہوتا ہے اور اس پر استغراق اور غلبۂ حال کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کیلئے باری تعالیٰ کے وجود کے سامنے ہر چیز حقیر' ناتواں کمزور بالکل عدم کے درجے میں نظر آنے لگتی ہے جیسا کہ ذاتِ باری کے مقابل میں کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے) اس طرح سے وہ یہ کہتا ہے کہ لَا موجود الَّا اللّٰہُ ،صرف موجود اللہ کی ذات ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسری چیزیں حقیقۃً معدوم ہوگئیں بلکہ وہ سب اپنی جگہ موجود ہوتی ہیں، البتہ سالک غلبۂ توحید کی ذاتِ باری کی طرف توجہ کامل کی وجہ سے ان اشیاء کی طرف سے ذہول ہو جاتا ہے۔

ہمہ اوست کا مطلب

ہمہ اوست کے معنی ہیں سب کچھ وہی ہے، یہ بھی صوفیہ کا ایک قول ہے جو وحدۃ الوجود کی اس اصطلاح سے قریب تر مفہوم رکھتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو واقعی مقربین بارگاہِ الٰہی ہوتے ہیں جب ان پر محبتِ الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے تو اُن کی نظروں میں حق تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا سب پوشیدہ ہو جاتا ہے اور ہر جگہ ذاتِ حق کا ظہور نظر آتا ہے تو وہ کہہ اُٹھتے ہیں ہمہ اوست (سب کچھ وہی ہے) اور یہ اپنے اس قول میں حق اور درستگی پر ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس لفظ کی حقیقت اور مراد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

(۱) مدارج السالکین :۸۶/۳

(۲) مدارج السالکین : ۸۴/۱، وطریق الھجرتین

حدیثِ قدسی میں ارشاد باری ہے:"یوذینی ابن ادم یسب الدھر وانا الدھر" (۱)
''ابنِ آدم مجھے آزردہ کرتا ہے کہ وہ زمانہ کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ میں میں خود ہوں''۔

پھراس کی آگے تفسیر ہے:بیدی الامر اقلب اللیل والنھار میرے ہی قبضہ میں سب کام ہیں (جوکہ زمانہ میں واقع ہوتے ہیں)۔

اِس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ وزمانہ دونوں متحد ہیں دونوں کا وجود ایک ہی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ میں جو افعال وآثار ہیں وہ میرے قبضۂ قدرت میں، لہٰذا اس طرح حقیقی تصرف کرنے والے اور موجود مستقل خدا کی ذات ہوتی، ایسے ہی ''ہمہ اوست'' کا مطلب ''سب کچھ وہی ہے'' یعنی کل ممکنات تو موجود ظاہری ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود حقیقی یعنی تمام اوصاف کا حامل نہیں ہے یہ ایسے ہی ہوا جیسے کوئی حاکم کسی مظلوم اور فریادی سے یوں کہے کہ تم نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی؟ تم نے کسی وکیل سے مشورہ بھی کیا؟ اور وہ یوں کہے جناب وکیل اور پولیس سب آپ ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ حاکم اور پولیس اور وکیل سب ایک ہی ہیں ان میں کچھ فرق نہیں، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور وکیل کوئی چیز آپ کے سامنے قابلِ شمار نہیں، آپ اُن سب اختیارات کے حامل ہیں' اِسی طرح یہاں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمہ اوست کے یہ معنیٰ نہیں ہیں ''ہمہ'' اور ''او'' ایک ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمہ کی ہستی قابل اعتبار نہیں صرف ''او'' کی ہستی لائق شمار ہے اور باقی جتنے موجودات ہیں ہستی تو ان کی بھی واقعی ہے، مگر ان کی ہستی ہستیٔ کامل کے سامنے ایک ظاہری ہستی ہے متقی یعنی کامل نہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ کامل کے روبرو ناقص ہمیشہ کالعدم (نہیں) شمار ہوتا ہے۔

اس لفظ کی حقیقت کو سمجھنے میں جو غلطی عموماً ہوتی ہے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں :

> ''اس عبارت کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہے جو حلول اور اتحاد سے دور ہے یعنی ''یہ سب کچھ نہیں بس وہی موجود ہے'' یہ مطلب نہیں کہ یہ بھی ہیں اور اس کے ساتھ متحد ہیں یہ بات تو کوئی بے وقوف بھی نہیں کہے گا تو ان بزرگوں سے اس کا تصور کیسے ہوسکتا ہے؟

---

(۱) بخاری : باب قول اللہ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ، حدیث:۷۰۵۳،مسلم، باب النھی عن سبّ الدھر ،حدیث: ۶۰۰۰

جب غلبۂ محبت میں محبوب کے سوا ہر چیز ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس ذات کے سوا کوئی ہستی ان کے شہود میں نہیں رہتی تو وہ کہہ دیتے ہیں ''ہمہ اوست'' یعنی سب کچھ وہی ہے یعنی یہ سب کچھ جو نظر آرہا ہے وہم اور خیال ہے اور موجود صرف اللہ سبحانہ کی ذات ہے''۔(۱)

عینیت وغیرت

یہ دو اصطلاحیں بھی مسئلہ وحدۃ الوجود کی بڑی اہم اصطلاحیں ہیں، عین کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک جیسا ہونا، صوفیہ خالق اور مخلوق میں عینیت ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ واجب الوجود کے سامنے کوئی اور وجود نہیں اور جو کچھ عالم میں نظر آرہا ہے وہ حق تعالیٰ شانہ کے وجود سے کوئی الگ وجود نہیں رکھتا، مخلوق چونکہ خالق کی صفتِ خلق کا مظہر ہے اور صفت موصوف سے جدا نہیں ہو سکتی، اس لئے مخلوق بھی خالق سے جدا نہیں، چنانچہ مولانا جامیؒ اِس بات کو بیان کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں :

''پس یہ کائنات حق تعالیٰ شانہ کا ظاہر ہے اور حق تعالیٰ شانہ اس کا باطن ہے، یہ کائنات ظہور سے پہلے عینِ حق تھی اور حق تعالیٰ بعدِ ظہور عینِ کائنات ہے، حقیقت میں ہستی ایک ہے اور ظہور و بطون اور اوّل ہونا اور آخر ہونا محض اعتباری اور اضافی ہے جیسا کہ قرآن میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ''هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ'' (۲) خالق اور مخلوق کی اس نسبتِ عینیت کو بعض گمراہ اور جہلاء نے لغوی اور حقیقی سمجھ کر خود گمراہ ہوئے اور ہزاروں کو گمراہ کیا۔ عبد و رب میں عینیت و غیریت دونوں موجود ہیں، وہ ایک وجہ سے اور یہ ایک وجہ سے مثلاً کوئی شخص اپنے اردگرد کئی آئینے رکھ لے تو ہر آئینے میں ذات وصفات اس کی بعینہٖ ظاہر ہوں گی، مثلاً خوشی، غم، ہنسنا، رونا وغیرہ بھی آئینہ کے عکس میں دکھائی دیں گے، اس سبب سے یہ کہہ سکتے ہیں، کہ عکس اس شخص کا عین ہے، مگر یہ عینیت اصطلاحی اور اعتباری ہے لغوی نہیں، اگر لغوی ہوتی تو کیفیت عکس پر گذرتی وہی شخص پر گذرنا واجب ہوتا، لیکن عکس پر اگر پتھر مارا جائے یا کوئی نجاست ڈالی جائے تو اس شخص کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ وہ

---

(۱) آئینہ سلوک : ۱۱۵-۱۱۶ (۲) الحدید : ۳

نجاست سے پلید ہوگا بلکہ وہ اپنے حال پر ان نقصانات سے بچا رہے گا تو اس طرح سے غیریت ہوئی، پس شخص اور عکس میں عینیت و غیریت دونوں پائی گئیں۔اس طرح بندے اور رب میں عینیت' وغیرت دونوں پائے جانا چاہئے، جو شخص عبد (بندہ) اور رب میں عینیتِ حقیقی کا اعتقاد رکھے اور غیرت کا انکار کردے وہ ملحد اور زندیق ہوگا کیونکہ اس عقیدہ سے عابد و معبود، ساجدہ و مسجود کا کچھ فرق نہیں رہ جائے گا''۔(۱)

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں مسئلہ وحدۃ الوجود کوئی شرکیہ اور کفریہ چیز نہیں ہوتی بلکہ حقیقی اور واقعی اور نفس الامری چیز ہوتی ہے، اس کا انکار محض وہ شخص کرسکتا ہے جوضد اور انانیت پر اڑا ہو اور جو رائے کو پربت بنانا خوب جانتا ہو۔

غلط فہمی کی اصل وجہ

وحدۃ الوجود کے اس مسئلہ میں غلط فہمی کی اصل وجہ اس کے غالی مبلغین وداعی حضرات کا اس بارے میں ورع واحتیاط اور اس کے خاص تحقیقی مزاج و مذاق کو ملحوظ نہ رکھنا تھا، انہوں نے اس مسئلہ کی پوری تحقیق و جستجو کے بغیر محض خوش اعتقادی میں مبتلا ہوکر بزرگانِ دین اور توحید و معرفت کے حقیقی شناور لوگوں نے اس بارے میں جو اعتبارات ملحوظ رکھتے تھے، اس کو پس پشت ڈال کر اس حوالے سے شریعت، عقل اور اخلاق ہر طرح کے حدود پھلانگنے لگے تھے اور پورے معاشرہ کو اپنے غلط عقائد ونتائج کے نتیجے میں ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا کررکھا تھا، ان الفاظ کے صحیح منشا کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انہوں نے فتنہ کا ایک دروازہ کھول رکھا تھا، خود بھی گمراہ ہورہے تھے اور عالم انسانیت کو گمراہی کا شکار کررہے تھے۔انہوں نے بندے اور رب کے درمیان عینیت اعتباری واصطلاحی جس کا خیال بزرگان دین رکھا کرتے تھے اس کو چھوڑ کر بندے اور رب کے درمیان عینیت حقیقی اور لغوی کے قائل ہوگئے تھے جس سے بہت سارے مفاسد جنم لے رہے تھے، رب اور بندے کا ایک ہونا لازم آرہا تھا اور چیزوں کو غیر حق نہیں بلکہ عین حق قرار دے رہے تھے اور اس کی آڑ میں بہت سے محرمات کا ارتکاب کررہے تھے اور شریعت سے منہ موڑ رہے تھے' جب ہر چیز وجود حق تعالی ہے تو پھر شریعت کی ضرورت کیسی؟، جب غیرت ختم ہوگئی اور عینیت ثابت ہوگئی اور حق' حق رہا تو حق کیلئے شریعت کی پابندی کیسی؟ اس طرح کی گمراہی وجود میں آگئی تھی، چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

(۱) آئینہ سلوک بحوالہ شمائم امدادیہ:۱۱۵

ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے اس مسئلہ کے غالی معتقدین کے کچھ اقوال بھی نقل کئے ہیں جس سے ان کی گمراہی کا اچھی طرح پتہ چلتا ہے :

''وہ لوگ شراب پیتے تھے اور محرّمات کا ارتکاب کرتے تھے (کہ جب موجود ایک تو حلال وحرام کی کیا تفریق)''۔

ایک مرتبہ اس مسئلہ میں غلو کی حد تک تجاوز کرنے والوں کا گذر کتے کے پاس سے ہوا، جس کو خارش تھی، ان میں سے ایک نے کہا: ''یہ بھی ذاتِ خداوندی ہے، اس نے جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے ہاں سب کے سب اسی کی ذات کے اندر ہے بعض لوگوں سے کہا گیا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں کیوں حرام ہے؟ اس محقق نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں''۔(۱)

ابن عربی اور مسئلہ وحدۃ الوجود

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ۶۳۸ھ کو جو شیخ اکبر کے نام سے شہرۂ آفاق ہیں کو اس مسئلہ کے بانی اور موسس کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، جن کی تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم اس بارے میں بہت مشہور ہیں، کیا یہ بھی اس مسئلہ میں ان کے غالی معتقدین کی طرح تشدد آمیز اور حدود شرع سے ہٹ کر اعتقاد رکھتے تھے یا یہ حق پرست اور توحید کے حقیقی شناور تھے۔

ان کے حوالہ سے علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

''ابن عربی ان لوگوں میں سے (ان کے شاگردوں کے مقابلے میں) اسلام سے قریب تر ہیں' اوران کا کلام بہت سے مقامات پر نسبتاً بہتر ہے، اس لئے کہ وہ مظاہر اور ظاہر میں فرق کرتے ہیں، امرونہی اور شرائع احکام کو اپنی جگہ رکھتے ہیں، مشائخ نے جن اخلاق وعبادات کی تاکید کی ہے، ان کے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اس لئے بہت سے عابد وصوفی ان کے کلام سے سلوک کو اخذ کرتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے حقائق کو اچھی طرح نہیں سمجھتے، ان میں سے جو ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور ان کی موافقت کرتے ہیں، ان پر ان کے کلام کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے۔(مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر المحی مندرجہ جلاء العینین :۵۷)''۔(۲)

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت : ۴/۲۷۹-۲۸۰ (۲) بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت : ۴/۲۷۸

حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ اکبر کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ فقیر شیخ محی الدین کو مقبولین میں سمجھتا ہے، لیکن ان کے وہ علوم (جو جمہور کے عقائد اور کتاب وسنت کے ظواہر کے خلاف ہیں) ان کو خطا اور مضر سمجھتا ہے لوگوں نے ان کے بارے میں افراط وتفریط کی راہ اختیار کی ہے اور وہ میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں، ایک جماعت شیخ پر زبان طعن وملامت دراز کرتی ہے اور ان کے معارف وحقائق کی بھی تغلیط کرتی ہے، دوسری جماعت نے شیخ کی مکمل تقلید اختیار کی ہے اور ان کے تمام معارف وحقائق کو برسرحق سمجھتی ہے اور دلائل وشواہد سے ان کی حقیقت ثابت کرتی ہے، اس میں شک نہیں کہ دونوں فریقوں نے افراط وتفریط کی راہ اختیار کی ہے اور میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں عجیب معاملہ ہے شیخ محی الدین مقبولین حق میں نظر آتے ہیں اور ان کے اکثر معارف وتحقیقات نے جو اہلِ حق کے خلاف ہیں خطا و نا صواب نظر آتے ہیں''۔(۱)

اکثر علماء نے شیخ ابن عربی کی ان شطحیات کو غلبۂ حال پر محمول کر کے انہیں معذور قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے بھی ان کی برأت پر مستقل ایک رسالہ بنام ''تنبیہ الغبی بتبرئة ابن عربی'' لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں :

''شیخ ابن عربی کے بارے میں قولِ فیصل یہ ہے کہ ان کے ولی ہونے کا اعتقاد رکھا جائے، لیکن ان کی کتابوں کے مطالعہ کو ناجائز قرار دیا جائے کیونکہ خود انہوں نے فرمایا ہے کہ ''ہم ایسے لوگ ہیں کہ ہماری کتابیں (مذاق ناشناس لوگوں کیلئے) دیکھنا ناجائز ہے۔ یحرم النظر الی کتبنا ......اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے بعض ایسی اصطلاحات مقرر کر رکھی ہیں جن سے وہ ان کے معروف معنی کے سوا کچھ اور معنی مراد لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کے الفاظ کو معروف معنی پہنائے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔ امام غزالیؒ نے بھی یہ بات اپنی بعض کتابوں میں لکھی ہے''۔(۲)

شیخ ابن عربیؒ کے بارے میں یہ بڑا معتدل فیصلہ ہے، حضرت تھانویؒ نے بھی ان کی برأت

(۱) مکتوب ۲۶،ص۱۲، بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت : ۲۹۲/۴-۲۹۵

(۲) شذرات الذہب لابن العماد : ۹۱/۵

میں ایک رسالہ لکھا ہے بنام ''تنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی'' اس میں بھی انہوں نے تقریباً یہی موقف اختیار کیا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ شیخ اکبر کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان بیباکانہ اقوال اور اباحیت وفوضویت (اخلاقی انارکی) کی ذمہ داری شیخ اکبر جیسے عارف ومحقق پر یا ان کی کتابوں پر عائد ہوتی ہے، جو بغایت درجہ متبع سنت، عابد، زاہد، مرتاض ومجاہد اور نفس سے شدید محاسبہ کرنے والے، مکاید وشیطان اور غوائل نفس سے بدرجۂ اتم واقف تھے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ان کا رسالہ ''روح القدس'') لیکن ان کے یہاں اس طرح کے غریب اور موحش اقوال ملتے ہیں، جن سے رائے کا پربت بنا لینے والوں کو مسالہ ہاتھ آتا ہے......مثلاً یہ کہ ''عہدِ موسوی کے گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی، ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسرِ حق تھا ''انا ربکم الاعلی'' بلکہ وہ عین تھا، اس طرح کے دیگر اقوال ذکر کیے ہیں۔

حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں :

''شیخ اکبر کے یہ سب اقوال الرد الأقوم علی ما فی کتاب فصوص الحکم اور ''الفرقان بین الحق والباطل'' سے ماخوذ ہیں اور امام نے ان کو فصوص الحکم سے اقتباس کر کے لکھا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ شیخ اکبر کے علوم سے اشتغال رکھنے والوں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شیخ کی کتابوں بالخصوص ''فصوص الحکم'' میں کثرت سے الحاقات واضافات کئے گئے ہیں (اس لئے ان مسائل کی صحیح نسبت ابن عربیؒ کی طرف نہیں کی جاسکتی)''۔(۱)

فضائلِ اعمال اور جاہل صوفیاء پر نکیر

صرف شیخ یا پیر کی دُعا پر عمل کے بغیر اعتماد کرنا نادانی ہے

حضرت شیخ زکریا صاحبؒ نے حکایاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ابوداؤد کی یہ روایت نقل کی ہے:

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت : ۲۸۱/۴-۲۸۲

اس کے فائدے کے ذیل میں اعمال کی اہمیت کی طرف توجہ دلایا ہے اوران لوگوں پرنکیر فرمائی ہے جوصرف پیر یا بزرگ کی دعاؤں پر تکیہ کئے رہتے ہیں اور بغیر عمل کے اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں انہیں اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے جس میں ان صحابیؓ رسول ﷺ کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی مسواک وغیرہ رکھنے کی خدمت پر مامور تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

ایک مرتبہ حضوراکرم ﷺ نے میری خدمات سے خوش ہوکر فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے؟ اُنہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! جنت میں آپ کی رفاقت، آپ ﷺ نے فرمایا اور کچھ؟ کہ بس یہی چیز مطلوب ہے' آپ نے فرمایا: ''اچھا میری مدد کیجیو سجدوں کی کثرت سے''۔

فائدہ: اس میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ صرف دعا پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھنا چاہئے، بلکہ کچھ طلب اورعمل کی بھی ضرورت ہے اور اعمال میں سب سے اہم نماز ہے کہ جتنی اس کی کثرت ہوگی اتنے ہی سجدے زیادہ ہوں گے، جو لوگ اس سہارے بیٹھے رہتے ہیں کہ فلاں بزرگ فلاں پیر سے دعا کرائیں گے' سخت غلطی ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس دنیا کو اسباب کے ساتھ چلایا ہے اگرچہ بے اسباب ہر چیز پر قدرت ہے اور قدرت کے اظہار کے واسطے کبھی ایسا بھی کرتے ہیں، لیکن عام عادت یہی ہے کہ دنیا کے کاروبار اسباب سے لگار کھے ہیں، حیرت ہے کہ ہم لوگ دنیا کے کاموں میں تو تقدیر پر اور صرف دُعا پر بھروسہ کر کے کبھی نہیں بیٹھتے، پچاس طرح کی کوشش کرتے ہیں، مگر دین کے کاموں میں تو تقدیر اور صرف دعا پر بھروسہ کرتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اللہ والوں کی دُعا نہایت اہم ہے مگر حضور ﷺ نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ سجدوں کی کثرت سے میری مدد کرنا۔(۱)

جماعت کا اِہتمام وظائف ونوافل کی کثرت سے اہم ہے

حضرت شیخؒ نے باجماعت نماز کی اہمیت وفضیلت اوراس کے ترک پر مختلف وعیدوں کا ذکر کرنے کے بعد ان جاہل صوفیوں پر بھی تنبیہ فرمائی ہے کہ جن کے یہاں اوراد واذکار اور نوافل کی کثرت کا تو خوب اہتمام ہوتا ہے، لیکن جماعت کی نماز کی پرواہ نہیں کرتے۔ جہاں تک باجماعت نماز کی ادائیگی کا سوال ہے تو یہ امر واجب ہے، جس کا مقام ان اوراد و نوافل سے کہیں بلند تر ہے۔

چنانچہ شیخ صاحبؒ فرماتے ہیں:

(۱) حکایاتِ صحابہ : ۴۳-۴۴

''جاہل صوفیہ میں وظیفوں اور نفلوں کا تو زور ہوتا ہے، مگر جماعت کی پرواہ نہیں ہوتی، اس کو وہ بزرگی سمجھتے ہیں حالانکہ کمال بزرگی اللہ کے محبوب کی اتباع ہے، ایک حدیث میں وارد ہے کہ تین شخصوں پر حق تعالیٰ شانہ لعنت بھیجتے ہیں، ایک اس شخص پر جس سے نمازی (کسی معقول وجہ سے) ناراض ہوں اور وہ امامت کرے، دوسرے اس عورت پر جس کا خاوند اس سے ناراض ہو تیسرے اُس شخص پر جو اذان کی آواز سنے اور جماعت میں شریک نہ ہو''۔(۱)

غیر مسنون الفاظِ صلوٰۃ وسلام (جس میں دوسرے معنیٰ کا وہم ہو) سے کراہت کا اظہار

دُرُودِ شریف نہایت ہی اہم اور بابرکت چیز ہے، اس سے انسان کے بے شمار گناہ معاف اور بے انتہاء درجے بلند ہوتے ہیں، اس لئے آیات واحادیث میں حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے، خود آنحضرت ﷺ کا اِس اُمت پر اس قدر بڑا احسان ہے کہ آپ پر درود بھیجنے میں بخل یا تامل سے کام لینا بڑی بے مروّتی اور احسان ناشناسی ہے، لیکن درود کے حوالہ سے اس بات کا بڑا اہتمام رہے کہ اِسی درود کو ورد میں رکھا جائے جو احادیث سے ثابت ہے، غیر مستند نامعتبر درود سے جس کی ایجاد غالی صوفیوں نے کی ہے اس سے بالکلیہ احتراز کیا جائے، جو اکثر وبیشتر کفریات وشرکیات یا کم ازکم موہم شرک الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں، اسی غیر مستند اور غیر مسنون درود اور صلوۃ وسلام سے کراہت کا اظہار کرے۔

حضرت شیخؒ رقم طراز ہیں :

''یقیناً اس شخص کے ظلم میں کیا تردد ہے جو نبی کریم ﷺ کے اتنے احسانات پر بھی نبی کریم ﷺ پر درود نہ پڑھے، حضرت گنگوہی کی سوانح عمری ''تذکرۃ الرشید'' میں لکھا ہے کہ حضرت عموماً متوسلین کو درود شریف پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے کہ کم ازکم تین سو مرتبہ روزانہ پڑھا جائے اور اتنا نہ ہوسکے تو ایک تسبیح میں تو کمی نہ ہونی چاہئے، آپ فرمایا کرتے تھے جناب رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے، پھر آپ ﷺ پر درود بھیجنے میں بھی بخل ہو تو بڑی بے مروّتی کی بات ہے، درود شریف میں زیادہ تر وہ پسند تھا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ الفاظ صلوۃ وسلام جو احادیث میں منقول ہیں، باقی

---

(۱) فضائلِ نماز : ۵۴-۵۵

دوسروں کے مولفہ درودتاج، لکھی درود عموماً آپ کو ناپسند تھے، بلکہ بعض الفاظ کو دوسرے معنی کا موہم ہونے کے سبب خلافِ شرع فرماتے تھے''۔(۱)

کسی ایک نیکی پر مغفرت ہوجانے کے واقعات سے مغالطہ میں نہ پڑنے کی تنبیہ

فضائلِ اعمال میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے بے شمار واقعات خصوصاً فضائل درودشریف میں ایسے لکھے ہیں جس میں کسی ایک نیکی پر مغفرت ہوجانے کا ذکر ہے، محض کسی ایک نیکی سے مغفرت اور بخشش کے بارے میں مغالطہ میں نہ پڑنے اوراس کو مشکل اور مستبعد نہ سمجھنے پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں اوراوّلاً اِس بارے میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

''علامہ سخاویؒ بعض تواریخ سے نقل کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بہت گنہگار تھا۔جب وہ مرگیا تو لوگوں نے اس کو ویسے ہی زمین پر پھینک دیا۔اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اس کو غسل دے کراس پر جنازہ کی نماز پڑھیں میں نے اس کی مغفرت کردی،حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یااللہ یہ کیسے ہوگیا؟۔اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ اس نے ایک دفعہ توراۃ کھولا تھا،اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دیکھا تھا تواس نے ان پر درود پڑھا تھا تو میں نے اس کی وجہ سے اس کی مغفرت کردی۔(القول البدیع)

اس طرح کے متعدد واقعات لکھنے کے بعد حضرت شیخ فرماتے ہیں :

''اس قسم کے واقعات میں کوئی اشکال نہیں، نہ تو ان کا یہ مطلب ہے کہ ایک دفعہ درود شریف پڑھ لینے سے سارے گناہ کبیرہ اورحقوق العباد سب معاف ہوجاتے ہیں اور نہ اس قسم کے واقعات میں کوئی مبالغہ یا جھوٹ وغیرہ ہے یہ مالک کے قبول کرلینے پر ہے، وہ کسی شخص کی معمولی سی عبادت، ایک دفعہ کا کلمہ طیبہ قبول کرلے جیسا کہ فصل اول کی حدیث ۱۴میں ''حدیث البطاقہ''(جس میں یہ ذکر ہے کہ ایک شخص کے ننانوے دفتر گناہ کے ہوں گے جو حدنگاہ تک پھیلے ہوئے ہوں گے،اس کو اپنے کیے کی سزا کا یقین ہوجائے گا، پھراللہ عزوجل کی طرف سے یہ ارشاد ہوگا کہ آج تجھ پر کسی طرح کا ظلم نہ ہوگا، پھرایک کلمہ والا پرزہ نکالا جائے گا اوراُسے ان ننانوے گناہوں کے دفتروں کے مقابلہ میں تولا جائے گا تو اس کے اس کلمہ کوایک مرتبہ اخلاص کے ساتھ

(۱) فضائلِ درود : ۷۲

کہنے کی وجہ سے وہ پرزہ بھاری ہو جائے گا اور اس کی مغفرت کردی جائے گی) رواہ الترمذی وقال حسن غریب، وابن ماجہ، وابن حبان في صحیحہ والبیھقی والحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم میں گذر چکا ہے کہ اُس کی برکت سے اُس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَایَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ ''بیشک اللہ تعالیٰ اس شخص کی تو مغفرت نہیں فرماتے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے (یعنی مشرک وکافر کی تو مغفرت نہیں) اس کے علاوہ جس کو چاہیں گے بخش دیں گے'' اس لئے ان قصوں میں اور اس قسم کے دوسرے واقعات میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کوکسی کا ایک دفعہ کا درود پڑھنا پسند آجائے، وہ اس کی وجہ سے سارے گناہ معاف کردے وہ بااختیار ہے' ایک شخص کے کسی کے ذمہ ہزاروں روپئے قرض ہیں، وہ قرض دار کی کسی بات پر جو قرض دینے والے کو پسند آگئی ہو یا بغیر ہی کسی بات کے اپنا سارا قرضہ معاف کردے تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ اسی طرح اللہ جل شانہ اگر کسی کو محض اپنے لطف وکرم سے بخش دے تو اس میں کیا اشکال ہے''۔

فضائلِ حج میں ذکر کردہ واقعات عشقِ الٰہی پر مبنی ہیں

اس دولت سے تہی دامن کو نہ اِن واقعات سے اِستدلال کرنا چاہئے اور نہ اعتراض۔

حضرت شیخ نے فضائل حج میں عشق ووارفتگی، محبت ودلسوزی توکل واعتماد علی اللہ کے بے شمار واقعات ذکر کئے ہیں، عموماً اس قسم کے واقعات کو اس کے نہایت دشوار اور عقلاً غیر ممکن الوقوع ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کیا جاتا ہے، حضرت شیخ نے عشق الٰہی پر مبنی ان بے شمار واقعات کا ذکر کیا ہے ان واقعات کی تعداد ستر کے قریب ہے اور آخیر میں یہ فرمایا ہے کہ جو اس کوچے کی حقیقت سے واقف اور عشقِ خداوندی کی لذت سے بہریاب ہوتے ہیں ان سے ان واقعات کا پیش آنا کوئی محال نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اوّل یہ کہ یہ احوال وواقعات جو گذرے ہیں وہ عشق الٰہی اور محبت پر مبنی ہیں اور عشق کے قوانین عام قوانین سے بالاتر ہیں:

مکتبِ عشق کے انداز نرالے دیکھے اُس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

عشق کے ضوابط کسی اُصول کے ماتحت ہوتے ہیں اور نہ یہ پڑھنے لکھنے سے آتے ہیں بلکہ عشق پیدا کرنے سے آتے ہیں۔

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

اپنا کام کوشش اور سعی کر کے اس سمندر میں کود پڑنا ہے، اس کے بعد ہر محنت آسان ہے اور ہر مشقت لذیذ ہے، ہر وہ چیز جو عشق سے بے بہرہ ہے لوگوں کیلئے مصیبت اور ہلاکت ہے، وہ اس سمندر کے غوطہ لگانے والوں کیلئے آسان اور لطف وفرحت کی چیز ہے اس سمندر میں غوطہ لگانے والے انجام اور عواقب کی مصلحت بینیوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔

عبث ہے جستجو بحرِ ظلمت کے کنارہ کی   بس اِس میں ڈوب ہی جانا ہے اے دل پار ہو جانا

لہٰذا ان واقعات کو اسی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس رنگ میں رنگے جانے کی کوشش کرنا چاہیئے، لیکن جب تک عشق پیدا نہ ہو اس وقت تک نہ تو ان واقعات سے استدلال کرنا چاہیئے اور نہ ان پر اعتراض کرنا چاہیئے، اس لئے کہ وہ عشق کے منجملہ میں صادر ہوتے ہیں، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص محبت کا پیالہ پی لیتا ہے وہ مخمور ہو جاتا ہے اور جو مخمور ہوتا ہے اس کے کلام میں بھی وسعت آجاتی ہے اگر اس کا وہ نشہ زائل ہو جائے تو وہ دیکھے کہ جو کچھ اس نے غلبہ میں کیا ہے وہ ایک حال ہے حقیقت نہیں اور عشاق کے کلام سے لذت تو حاصل کی جاتی ہے اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔احیاء العلوم:۳۰''۔(۱)

توکل کی حقیقت اور اُس کے مراتب اور اولیاء کے اسباب نہ اختیار کرنے کے واقعات کا صحیح مصداق

حضرت شیخ صاحبؒ کے ان واقعات کے ایک دوسرے پہلو یعنی اِن بزرگان دین کے توکل اللہ پر اعتماد اور اس پر کامل بھروسہ کے تعلق سے جو واقعات گذرے ہیں اُس سے توکل کی حقیقت، اس کے مراتب اور اولیاء کے اسباب نہ اختیار کرنے کے واقعات کا صحیح مصداق بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) فضائلِ حج : ۲۸۸

''ان واقعات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان میں توکل کی وہ مثالیں گذری ہیں جو ہم جیسے نااہلوں کے عمل میں تو درکنار ذہنوں سے بھی بالاتر ہیں۔ اِن کے متعلق یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ توکل کا منتہا ہی یہی ہے جو اِن واقعات سے ظاہر ہوتا ہے اور پسندیدہ ہے اور اس کے کمال پر پہنچنے کی سعی اور کم سے کم تمنا تو ہونا ہی چاہئے، لیکن جب تک یہ درجہ حاصل نہ ہو اس وقت تک ترک اسباب نہ کرنا چاہئے''۔

ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے اور اگر کوئی شخص خالص توکل کا ارادہ کرے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ مستقیم الحال ہو، اسباب چھوڑ کر پریشان نہ ہو، بلکہ اللہ جل شانہ کے سوا کسی دوسرے کا خیال بھی اس کو نہ آوے اور جن حضرات نے ترکِ اسباب کی مذمت فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کا حق ادا نہیں کرتے، بلکہ دوسرے لوگوں کے توشہ دانوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔(مرقاۃ:۳۰)

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ اگر تم اللہ جل شانہ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو تم کو ایسی طرح رزق عطا فرمائے جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو اللہ کی طرف بالکلیہ منقطع ہو جائے تو حق تعالیٰ شانہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور اسے ایسی طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا، ایک اور حدیث میں ہے جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ مستغنی ہو وہ ایسا بن جائے کہ اس کو اللہ جل شانہ کی عطاء پر اس سے زیادہ بھروسہ ہو جتنا اس مال پر ہوتا ہے جو اپنے پاس موجود ہے۔(احیاء)

اس کا اندازہ ان دو قصوں سے ہوتا ہے جو احادیث میں مشہور ہیں۔ ایک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشہور قصہ کہ جب غزوۂ تبوک کیلئے چندہ کیا گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کچھ گھر میں تھا سب کچھ لے آئے اور جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو فرمایا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ آیا ہوں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک سونے کی ڈلی انڈے کے برابر پیش کی اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ایک معدن سے مل گئی ہے، اُس

کو اللہ کے راستے میں دیتا ہوں، اِس کے سوا میرے پاس کوئی چیز نہیں، حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا۔ ان صاحب نے دوسری اور تیسری مرتبہ اسی طرح اصرار سے پیش کیا، حضورِ اکرم ﷺ نے اس کو لے کر ایسے زور سے پھینکا کہ اگر ان کے لگ جاتی تو زخمی کر دیتی اور یہ ارشاد فرمایا: کہ بعض آدمی اپنا سارا مال صدقہ کر دیتے ہیں، پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے واسطے بیٹھ جاتے ہیں۔ (ابوداؤد)

ان صاحب کا اعتماد علی اللہ اور توکل حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں کیا ہوسکتا تھا، اس واسطے آپ ﷺ وہاں سب کچھ قبول فرمالیا اور یہاں ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ توکل کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ تو ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی مقدمہ میں کسی ہوشیار و ماہر تجربہ کار کو وکیل بنالے کہ وہ ہر چیز میں اس وکیل کی طرف رجوع کرتا ہے، لیکن اس کا یہ توکل فانی ہے، کبھی ہے اس کو اپنے توکل کا شعور اور احساس ہے۔ دوسرا درجہ جو پہلے سے اعلیٰ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ ناسمجھ بچہ کا اپنی ماں کی طرف کہ وہ ہر بات میں اسی کو پکارتا ہے اور جب کوئی گھبراہٹ یا تکلیف کی بات اس کو پیش آتی ہے تو سب سے پہلے اس کے منہ سے اماں نکلتا ہے، ان ہی دونوں کی طرف حضرت سہیلؒ نے اشارہ کیا ہے جبکہ ان سے کسی نے پوچھا کہ توکل کا ادنیٰ درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ امیدوں کا ختم کر دینا، پھر سائل نے پوچھا کہ درمیانی درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اختیار کا چھوڑ دینا پھر سائل نے پوچھا کہ اعلیٰ درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کو وہ پہچان سکتا ہے جو دوسرے درجہ پر پہنچ جائے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تیسرا درجہ جو سب سے اعلیٰ ہے وہ یہ کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ ایسا ہو جائے جیسا کہ مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں کہ اس کی اپنی کوئی حرکت رہتی ہی نہیں، اسی درجہ پر پہنچ کر اللہ جل شانہ سے مانگنے کا بھی محتاج نہیں رہتا وہ خود ہی بلا طلب اس کی ضرورت کا تکفل کرتا ہے، جیسا کہ نہلانے والا خود ہی میت کی ضروریاتِ غسل کو پورا کرتا ہے۔

اس پر یہ اشکال کہ ''حضورِ اقدس ﷺ کا عام طریقہ اسباب کے اختیار کا تھا صحیح ہے، لیکن حق یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے شان یا شان وہی حالت تھی جس کو حضور ﷺ نے اختیار فرمایا، اگر حضورِ اقدس ﷺ کے حالات ان واقعات کی نوعیت کے ہوتے تو امت بڑی سخت ابتلاء میں پڑ جاتی۔ حضور اقدس ﷺ کو امت پر شفقت کی وجہ سے اس کا بہت اہتمام تھا کہ ایسی چیز اختیار نہ

فرمائیں جس میں امت کو مشقت ہو۔

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ حضوراقدس ﷺ چاشت کی نماز نہ پڑھتے تھے اور میں پڑھتی ہوں، بیشک حضوراقدس ﷺ بعض عمل باوجودیکہ حضور ﷺ کی خواہش اس کے کرنے کی ہوتی تھی، اس خوف سے چھوڑ دیتے تھے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہوجائے۔(ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد کا مطلب کہ حضور ﷺ نہیں پڑھتے تھے اور میں پڑھتی ہوں اہتمام اور دوام ہے کہ جس شدت اہتمام سے حضرت عائشہؓ پڑھتی تھیں حضور ﷺ اتنے اہتمام سے نہ پڑھتے تھے ورنہ بیسوں روایات میں حضور ﷺ کا چاشت کی نماز پڑھنا وارد ہوا ہے اور یقیناً حضوراقدس ﷺ روحی فواہ وابی وامی اگر اتنے شدت اہتمام سے پڑھتے تو یہی چیز اس کو واجب بنادیتی۔تراویح کے حوالہ سے بھی یہی بات ہوئی۔آپ ﷺ نے چندرات پڑھیں، پھر جب آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے شدتِ اہتمام اور اشتیاق کو دیکھا تو فرضیت کے اندیشے سے دوبارہ ادا نہیں فرمائی۔

صاحبِ روض لکھتے ہیں:

جب منفعت (نفع حاصل کرنا) اور دفع مضرت (نقصان کو ختم کرنا) کے اسباب کا اختیار کرنا ہی طریقۂ جمہور انبیاءؑ اور جمہور اولیاءؒ کا ہے، لیکن اس سے ان اولیاء کرام پر جو مضرتوں سے نہ بچے تھے اور اپنے لئے اسباب نہ اختیار کرتے تھے اعتراض نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ حضورِاقدس ﷺ شریعتِ مطہرہ پر چلانے والے تھے، اس لئے ایسے سہل راستہ پر چلاتے تھے جس پر عوام وخواص سب چل سکیں اور اگر قافلوں کا چلانے والا کسی ایسے مشکل راستہ پر قافلہ کو لے جائے جس پر وہ خود تو روانی وقوت سے چل سکتا ہو لیکن قافلہ کی اکثریت اس راستہ کی متحمل نہ ہو تو وہ قافلہ والوں کے اوپر مہربان شمار نہ ہوگا اور حضورِاقدس ﷺ کی عالی شان خود حق سبحانہٗ وتقدس نے بتائی:

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ (التوبة:۱۲۸)

پوری آیت شریفہ کا ترجمہ اور مطلب یہ ہے :"(اے لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبرؐ تشریف لائے ہیں جو تمہاری ہی جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے۔تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ بات تو سب کے ساتھ ہے، پھر بالخصوص) مؤمنین کے ساتھ تو بڑے شفیق اور مہربان ہیں"۔

پس اگر قافلہ کے قوی لوگ کسی مصلحت سے سخت راستہ کو اختیار کرلیں تو قافلہ کا لے جانے

والا ان کو نہ روکے گا۔(روض)

یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ ائمہ کو طویل نماز پڑھانے پر نہایت شدت سے ڈانتے تھے اور یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جو امام ہے وہ ضرور ہلکی نماز پڑھائے اور جو اپنی تنہا نماز پڑھے وہ جتنی چاہے لمبی نماز پڑھے۔

پھر آگے فرماتے ہیں:

بعض اوقات واقعات میں ایسی شدت ملتی ہے جو سرسری نظر میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور بظاہر یہ ناجائز معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق یہ بات ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ واقعات بمنزلۂ دوا کے ہیں اور دوا میں طبیب صادق بسا اوقات سنکھیا بھی استعمال کرایا کرتا ہے، لیکن اس کا استعمال طبیب کی رائے کے موافق ہو تو مناسب ہے بلکہ بسا اوقات ضروری، لیکن بدون اس کے مشورہ کے ناجائز اور موجبِ ہلاکت، اِسی طرح ان واقعات میں جن حاذق طبیبوں نے ان دواؤں کا استعمال کیا ہے ان پر اعتراض اپنی نادانی اور فن سے ناواقفیت پر مبنی ہے، لیکن جو خود طبیب نہ ہو اور کسی طبیب کا اس کو مشورہ حاصل نہ ہو، اس کو ایسے اُمور جو شریعتِ مطہرہ کے خلاف معلوم ہوتے ہوں اختیار کرنا جائز نہیں ہیں، البتہ فن کے ائمہ پر قواعد سے واقف لوگوں پر اعتراض میں جلدی کرنا بالخصوص ایسے لوگوں کی طرف جو خود واقفیت نہ رکھتے ہوں غلط چیز ہے اور ہلاکت میں اپنے آپ کو ڈالنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے، اگر دینی مصلحت اُس کی متقاضی ہو تو پھر مباح سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔(۱)(۲)

☒☒☒

(۱) فضائل اعمال

(۲) اکابر تبلیغ کے تصوف کی حقیقت جاننے کے لئے مطالعہ کریں ''تزکیہ واحسان اور اکابرِ تبلیغ''۔

تفسیر وقرآنیات

کتاب	مصنف
احکام القرآن	ابوبکر جصاص رازیؒ
بیضاوی	قاضی ناصر الدینؒ
التفسیر المنیر	دکتور وھبہ زھیلی
تفسیر ابنِ کثیر	علامہ ابنِ کثیرؒ
تفسیر کبیر	علامہ فخر الدین رازیؒ
تفسیر مظھری	علامہ ثناء اللّٰہ پانی پتیؒ
تفسیر طبری	محمد بن جریر طبریؒ
الدر المنثور	جلال الدین سیوطیؒ
روح المعانی	علامہ محمود آلوسیؒ
برھان فی علوم القرآن	بدر الدین زر کشیؒ
احکام القرآن	محمد ابن ادریس الشافعیؒ
بیان القرآن	مولانا اشرف علی تھانویؒ
تفسیر عثمانی	علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

حدیث وشروحات

کتاب	مصنف
صحیح بخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ
صحیح مسلم	امام مسلم بن حجاج قشیریؒ
سنن ترمذی	امام محمد بن عیسٰی ترمذیؒ
سنن ابو داؤد	امام سلیمان بن اشعثؒ

کتاب	مصنف
سنن نسائی	امام احمد بن شعیب نسائیؒ
سنن ابنِ ماجه	امام محمد بن یزید الربعیؒ
مؤطا مالك	امام انس بن مالك
مؤطا محمد	امام محمد بن حسن الشیبانیؒ
سنن بیهقی	امام احمد بن حسین بیهقیؒ
سنن دارمی	امام عبد اللّٰه بن عبد الرحمنِ تیمیؒ
مستدرك حاكم	محمد بن عبد اللّٰه نیشاپوریؒ
مسند احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبلؒ
مشكوة المصابيح	محمد بن عبد اللّٰه خطیبؒ
مصنف ابن ابی شیبه	ابوبكر محمد بن ابی شیبهؒ
مصنف عبد الرزاق	عبد الرزاق صغانیؒ
كنز العمال	علاء الدین متقی هندیؒ
طبرانی(صغیر، كبیر)	سلیمان بن احمد طبرانیؒ
دارِ قطنی	علی بن عمر دار قطنیؒ
مجمع الزوائد	ابوبكر الهیثمیؒ
شرح الاذكار	محمد بن شرف نوویؒ
الادب المفرد	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ
مسند بزار	....
الجامع الصغیر	علامه جلال الدین سیوطیؒ
الترغیب و الترهیب	عبد الغظیم بن عبد القویؒ
شرح السنة	علامه جلال الدین سیوطیؒ
فتح المغیث	محمد بن عبد الرحمنؒ
عارضة الاحوذی	حافظ ابنِ عربیؒ
عیون الاثر	ابن سید الناسؒ
المتفق والمفترق	خطیبِ بغدادیؒ
صحیح ابنِ حبان	ابنِ حبانؒ
الاجوبة الفاضلة	شیخ ابو فتح ابو غدةؒ
المغنی عن حمل الاسفار	عبد الرحیم حسینی عراقیؒ
شرح المناوی	علامه مناویؒ

کتاب	مصنف
جامع الاصول	علامہ ابنِ اثیرؒ
حصن حصین	امام الجزائریؒ
فیض القدیر	علامہ مناویؒ
جمع الوسائل	ملا علی قاریؒ
کتاب الروح	علامہ ابنِ قیمؒ
الکفایۃ	خطیبِ بغدادیؒ
فتح الباری	احمد بن علی بن حجر عسقلانیؒ
اوجز المسالک	شیخ الحدیث زکریاؒ
بذل المجہود	مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ
المنہاج	یحییٰ بن شرف نووی
فیض الباری	علامہ انور شاہ کشمیریؒ
فتح الملہم مع تکملہ	علامہ شبیر عثمانیؒ، مولانا تقی عثمانی
قواعد التحدیث	علامہ جمال الدین قاسمی
التعلیق المجدد	عبد الحئ لکھنویؒ
معارف الحدیث	مولانا منظور نعمانیؒ
منتخب احادیث	مولانا یوسف صاحبؒ

فقہ،سوانح وتاریخ

کتاب	مصنف
بدایۃ المجتہد	ابنِ رشد مالکیؒ
رد المحتار	ابنِ عابدین شامیؒ
البحر الرائق	ابن نجیم مصریؒ
کتاب الاصل	محمد ابن الحسن شیبانیؒ
البدایۃ والنہایۃ	ابنِ کثیرؒ
الاصابۃ	ابنِ حجرؒ
الاستعاب	ابنِ عبد البرؒ
المغنی	احمد بن محمد قدامہ مقدسیؒ
فتح القدیر	علامہ ابنِ ہمامؒ
رسائل ابنِ عابدین	علامہ عابدین شامیؒ
الحاوی للفتاویٰ	علامہ جلال الدین سیوطیؒ

اعلام الموقعين	علامه ابنِ قيمؒ
طبقات ابنِ سعد	ابنِ سعدؒ
حلية الاولياء	علامه ابو نعيمؒ
شرح السير الكبير	امام سرخسیؒ
زاد المعاد	علامه ابنِ قيمؒ
مؤلفاتِ نجدی	محمد بن عبد الوهاب نجدیؒ
رحمة اللّٰه الواسعة	مفتی سعيد احمد پالن پوری
حياة الصحابه	مولانا محمد يوسف صاحبؒ
الفتاویٰ الحديثيه	ابنِ حجر الهيثمی
درالعلوم ديوبند،مدرسة توجيهية	عبيد اللّٰه الاسعدی
أوليس فی سبيل اللّٰه الا من قتل	رفيق امجد قاسمی

اردو کتب ورسائل

انفاس العارفین	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
مکتوبِ امامِ ربانیؒ	مجددِ الفِ ثانیؒ
تفہیماتِ الٰہیہ	شاہ ولی اللہؒ
صراطِ مستقیم	شاہ اسماعیل شہیدؒ
فتاویٰ رشیدیہ	مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ
فتاوی محمودیہ	حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ
فتاوی دارالعلوم زکریا	حضرت مولانا مفتی عبدالباری ومولانا محمد الیاس
فتاوی فریدیہ	مفتی محمد فرید صاحب دامت برکاتہم
جامع الفتاوی	مرتب: حضرت مولانا مفتی مہربان علی صاحب
فتاوی مفتی محمود	مولانا مفتی محمود، جامعہ قاسم العلوم، ملتان
شریعت وطریقت	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ
مسائلِ تصوف	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ
التشرف فی احادیث التصوف	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ

نشر الطیب	مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ
الاعتدال فی مراتب الرجال ''اسلامی سیاست''	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
شریعت وطریقت کا تلازم	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
کفایۃ المفتی	مفتی کفایت اللہ صاحبؒ
دینی دعوت	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
تزکیہ واحسان	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
تاریخ دعوت وعزیمت	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ
فتاویٰ رحیمیہ	مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ
فتاویٰ حقانیہ	مولانا عبدالحق صاحبؒ
تسکین الصدور فی احوال الموتیٰ والقبور	حضرت مولانا ابوالزاہد سرفراز خان صفدر صاحبؒ
ازالۃ الریب فی علم الغیب	سرفراز خان صفدر صاحبؒ
الکلام المفید فی اثبات التقلید	سرفراز خان صفدر صاحبؒ
طائفہ منصورہ	سرفراز خان صفدر صاحبؒ
تجدید تعلیم وتبلیغ	مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ
ملفوظات مولانا محمد الیاس	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور بریلوی حضرات	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
دین وشریعت	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
تصوف کیا ہے؟	مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ
تصوف ایک تعارف	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ
آئینۂ سلوک	حضرت نثار احمد خان صاحبؒ
حضرت تھانویؒ کے سیاسی افکار	مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
ایک عالمی وبین الاقوامی کتاب	مفتی شاہد صاحب مدظلہ
فہرستِ تالیفاتِ شیخ	مفتی شاہد صاحب مدظلہ

کتاب	مصنف
دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم وادراک	مولانا شاہد صاحب سہارنپوری مدظلہ
ذکرِ زکریا	فیروز اعظمی
دعوتِ دین، مسائل کا حل	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ
طالبات کی دینی وعصری درسگاہیں	مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی
تبلیغ کا شرعی مقام	احمد نور محمد قادری صاحب
فضائلِ اعمال پر اعتراضات کے جوابات	مفتی عبدالکریم صاحب
مجموعہ رسائلِ غیر مقلدیت	جمعیۃ علماءِ ہند
محاضرات ردِّ رضاخانیت	مفتی امین صاحب پالنپوری
تبلیغ بالیقین کارِ نبوت ہے	فرید بک ڈپو
تصحیح الخیال ترجمہ تحقیق المقال	مولانا عبداللطیف بہرائچی مدظلہ
ملفوظات مولانا یوسف صاحبؒ	مفتی روشن شاہ صاحب قاسمی
اکابر کا سلوک واحسان	حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ
عقائد الاسلام	مولانا ادریس کاندھلویؒ
اِرشادات ومکتوبات، مولانا الیاسؒ	مولانا افتخار فریدی
آپ بیتی	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ
سماع الموتی	حضرت مولانا ابوالزاہد سرفراز خان صفدر صاحب
الیواقیت الغالیۃ	شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری مدظلہ
نوادر الحدیث	شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری مدظلہ
نوادر الفقہ	شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری مدظلہ
تزکیہ واحسان اور اکابرِ تبلیغ	حضرت قطب الدین ملا دامت برکاتہم
تبلیغی جماعت اور مشائخِ عرب	حضرت مولانا الیاس گھمن صاحب